رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی
عید سعید
Pdf by Roadsign
www.pkdigest.com

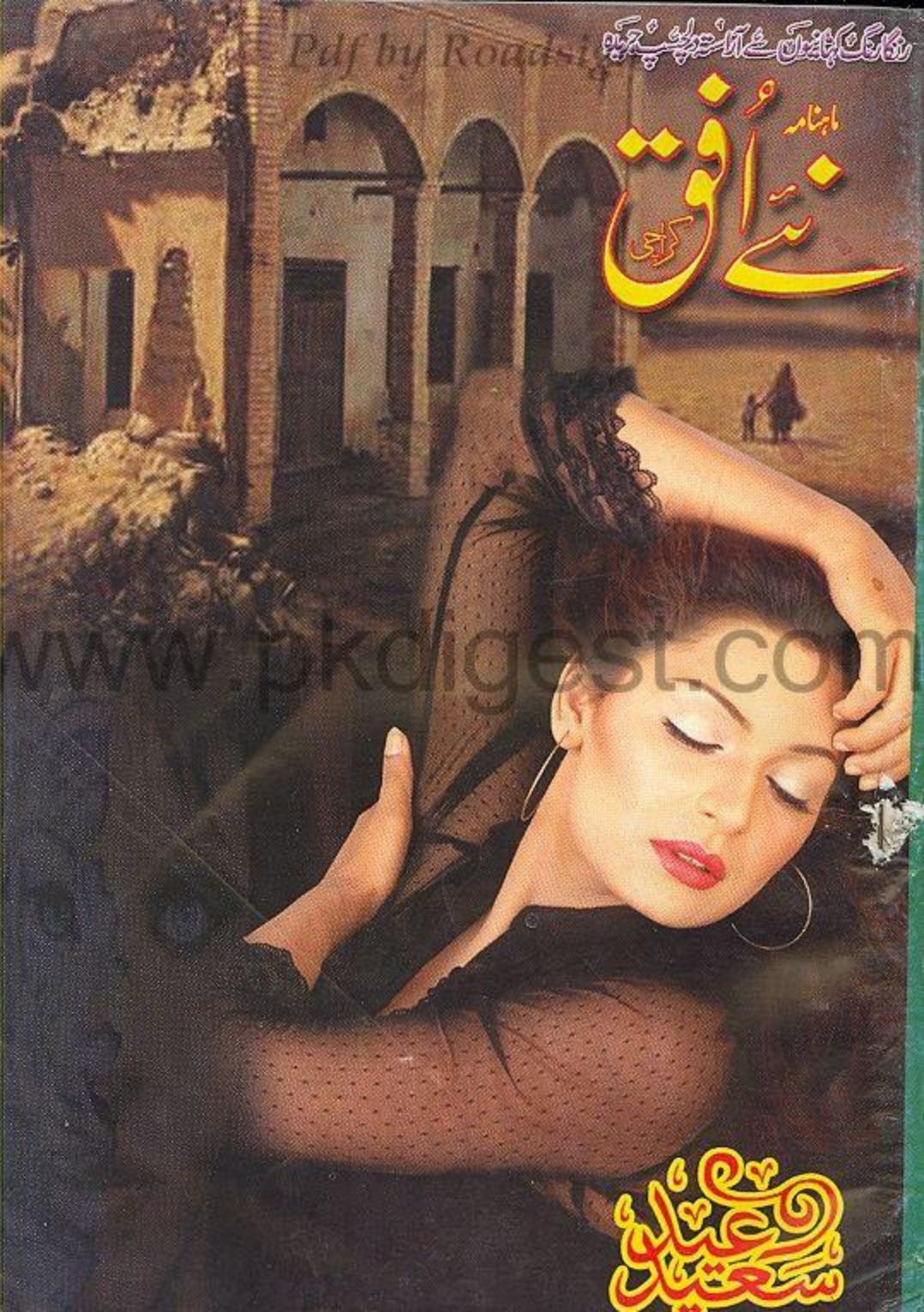

8 دستک — مشتاق احمد قریشی
10 گفتگو — عمران احمد
20 اقراء — طاہر احمد قریشی
22 احوال قارئین — اسرار احمد
24 ابن عطاش — ادریس آزاد
60 نقلی چور — راحیلہ تاج
71 پرمیشور — یعقوب جمیل
76 زہر — محمد فاروق انجم
114 لاٹھی — ریاض بٹ
122 ہوشیار — محمد بلال
128 زنجیر — شہناز بانو

پبلشر: مشتاق احمد قریشی، پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ کراچی 74400

162 ادھورے خواب — طاہرہ جبیں تارا
169 چمگادڑ — راضیہ نور الامین
174 آلۂ قتل — نجم فاروق ساحلی
190 آزمائش — شباب اکبر
220 دشت جنوں — شہنی ارشاد
234 رشتہ — ایم الیاس
245 بزم سخن — روبین احمد
248 خوشبوئے سخن — محمد احمد شہزاد
251 ذوق آگہی — عفان احمد
254 بلیک واٹر — جریمی سکاہل
☆ کترنیں — ادارہ

خط و کتابت کا پتہ: "نئے اُفق" پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200، فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے اُفق پبلی کیشنز ای میل: infoufaq@aanchal.com.pk

Pdf by Roadsign

دستک

مشتاق احمد قریشی

اس طرح تو ہوتا ہے.....!

گزشتہ دنوں دیارِ غیر میں حکمراں جماعت کے اپنے ایک قریبی اور سینئر رکن نے اپنی ہی جماعت کے سربراہ کے خلاف اپنے شدید ترین جذبات کا عملی اظہار کرتے ہوئے ان کی جانب بطور احتجاج جوتا اچھال دیا۔ کچھ عینی شاہدین کے مطابق جوتا پھینکا ہوا اور کچھ کے مطابق نہیں ہوا۔ جہاں تک اس احتجاج کی خبریت کا تعلق ہے اخبار نویس تو اخبار نویس ہوتا ہے اور جب وہ خود شاہد ہو تو پھر مصدقہ خبر وجود میں آتی ہے۔ جوتا تو چلا ہی چلا تھا تو پھر خبر بنی بھی، خبر چلی بھی اور خوب چلی۔ ردِ عمل کے طور پر حکمراں جماعت نے اپنے تحمل و برداشت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا اور داڑھی میں تنکے کے مصداق اپنے شدید ردِ عمل کا مظاہرہ سندھ اور خصوصاً کراچی میں کیا۔ اخبارات کو نذرِ آتش کیا گیا۔ اخبار اور ٹی وی چینل کے دفاتر کے کچھ گھیراؤ جلاؤ کی کوشش کی گئی۔ مغلظات کا اظہار ہوا ہر طرح کے غیر اخلاقی ردِ عمل کا اظہار کیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی خبروں کو نہ اچھالا جائے۔ یعنی جو خبر ان کی مرضی و منشا کے مطابق ہو تو شائع کی جائے ورنہ نہ کی جائے یعنی وہ خود اپنی خبروں کے بائیکاٹ کی فرمائشیں کر رہے ہیں۔ ایسی ہی تجاویز اخباری تنظیموں کی جانب سے ہونے والے مذمتی اجلاسوں میں بھی کئی ارکان نے پیش کیں، لیکن اخبار ہو یا نیوز چینل یہ اس کی اخلاقی اور صحافتی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ہر خبر پر نظر رکھے۔ ہر خبر کو خبر کی ہی طرح اپنے دیکھنے، پڑھنے والوں، تک پہنچائے تب ہی مقابلے کی دوڑ میں ثابت قدم رہا جا سکے گا کیونکہ اگر اخباری تنظیمیں اور اخباری ادارے یا نیوز چینلز ایسا کرنے لگیں کہ من پسند خبر کو شائع کریں اور جس میں کسی قسم کا خطرہ ہو یا دباؤ کا شکار ہونے کا یا کسی ردِ عمل کی کوئی صورت نظر آتی ہو اسے روک دیا جائے یعنی اپنے خار میں قارئین کو بے خبر رکھا جائے تو پھر مطالبہ کرنے والوں میں اور اخباری اداروں میں کیا فرق رہ جائے گا۔

ایسا تو ہر دور میں ہوتا آیا ہے کہ جب کبھی کسی اخبار نے حکمرانِ وقت یا ان کی جماعت کے خلاف کچھ حقیقت آشکار کر دی تو ردِ عمل میں ایسا ہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ چونکہ بڑے اخبارات کی ذمہ داری بھی بڑی ہوتی ہے اور ان کا اپنے کاروباری حریفوں سے مقابلہ بھی سخت ہوتا ہے اور یہ ان کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں سے کچھ نہ چھپائیں وہ جیسا دیکھیں، محسوس کریں خبر کے طور پر، اپنی رائے کے طور پر اپنے قارئین کے سامنے رکھ دیں یہ نہیں کہ ہر آنکھیں دکھانے، ڈنڈا اٹھانے والے کے سامنے قلم جھکا دیں اور ان کی مرضی میں راضی ہو جائیں ایسا کرنے تمام اخبارات جو حکمرانوں کی مرضی کے طابع رہے، بہت بڑے بڑے نام ہونے کے باوجود تہہ خاک جا سوئے۔ ماضی کی کون سی حکومت ایسی گزری ہے چاہے وہ دورِ آمریت کا ہو یا جمہوریت کا۔ سب کے سب ایک ہی قطار میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ سب حکمرانوں نے جب ان کی مرضی کے خلاف اخبارات نے کوئی خبر شائع کی وہیں ان پر ان حکمرانوں کی گرفت تنگ ہوئی ہے۔ شاید ہی وطنِ عزیز کی تاریخ کا کوئی ایسا دور حکمرانی ہو جس میں آزادی اظہار کی واقعی آزادی ملی ہو۔ نام نہاد آزادی کا تو سب ہی حکمران اور حکمراں جماعتیں واویلا کرتی آئی ہیں،

لیکن حقیقی اظہار کی آزادی کسی نے نہیں دی اس طرح جمہوری حکومتیں بھی آمریت کی صف بستہ نظر آتی ہیں۔

حکمراں جماعت کا دورِ اوّل جب ان کے شہید اوّل حکمران تھے۔ اس وقت بھی ایسا ہی جوتا اُچھالے جانے کا واقعہ کراچی میں لالو کھیت میں سپر مارکیٹ کی افتتاحی تقریب کے موقع پر ہوا تھا، لیکن وہ واقعی عوامی لیڈر تھے انہوں نے کسی بدمزگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ بات کو فوراً دوسرا رخ دے کر واقعہ کو سنبھال لیا تھا، لیکن اس بار دیارِ غیر میں جوتا اُچھالے جانے کو جس طرح انا کا مسئلہ بنا لیا ہے اور شدید ردِ عمل کا اظہار کیا جا رہا ہے گو کہ ایسا اس وقت بھی ردِ عمل ہوا تھا۔ پھر میاں نواز شریف کے دورِ حکمرانی میں بھی اخبارات کی خبروں کی حقیقت پر پردہ ڈالنے کی مذموم کوشش میں بھی ہر طرح کا جبر کیا گیا۔ پھر موجودہ حکمران جماعت کے دوسرے دور میں بھی ایسا ہی کیا گیا۔ میاں صاحب کے دوسرے دورِ حکمرانی میں بھی اس واقعے کو دُہرایا گیا۔ اب ایک بار پھر بلکہ تیسری بار حکمران جماعت نے ذرائع ابلاغ کو اپنی مخالفت کی دعوت دے دی ہے۔ کیا حکمرانوں یا ان کے حواریوں یعنی مشیروں کا یہ خیال یا اندازہ ہے کہ ان کے اس طرح کرنے سے اخبارات ڈر جائیں گے یا بند ہو جائیں گے اب تک تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اخبارات خصوصاً بڑے اور اہم اخبارات اپنی اشاعت کے پچاس اور ساٹھ سال وہ بھی مسلسل اشاعت کے مکمل کر چکے ہیں۔ جب کہ حکمران جماعتیں جو جمہوریت کی دعویداری اور علمبرداری کا تاثر دیتی رہی ہیں۔ کبھی اپنی مدت انتخاب پوری نہیں کر سکیں وہ صحافت اور اہل صحافت کو تو کیا زخم خوردہ کرتیں خود اپنے ہی زخم چاٹتی رخصت ہوتی رہی ہیں۔ ہر حکمران وقت جو شیشے کے گھر میں بیٹھا ہوتا ہے وہ اپنے طور محفوظ حصاروں میں بند ہونے کے باعث خود کو جتنا محفوظ سمجھتا ہے کوئی اور اتنا محفوظ نہیں ہوتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اور ان کے حواری بلا سوچے سمجھے ذرائع ابلاغ پر بے دھڑک چڑھ دوڑتے ہیں۔ انہیں یہ خدشہ نہیں ہوتا کہ ہمارے شکار بھی پلٹ کر کر کوئی جوابی کارروائی کر سکتے ہیں اور ایسا ہمیشہ ہوتا ہے جب جب حکمران جماعتوں اور حکمرانوں نے ذرائع ابلاغ پر انگلی اُٹھائی ہے یا پتھر پھینکا ہے تب تب اخبارات جو بظاہر ایک دوسرے کے مدِ مقابل نظر آتے ہیں ہر ایسے موقع پر یک جا و یکجہت ہو جاتے ہیں اور ایک نظر نہ آنے والی قوت کا مظاہر بن جاتے ہیں ایسا اس بار بھی ہوا ہے۔ تمام ذرائع ابلاغ یک سمت ہو کر یک جا ہو گئے ہیں اور تو اور حکمرانوں کے حلیف اور حریف بھی ذرائع ابلاغ کے ہم خیال ہو گئے ہیں حکمرانوں کی اللہ خیر کرے ایک چھوٹی سی بات کو بتنگڑ خود حکمران جماعت نے بنا دیا ہے، اگر ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا جاتا تو عوام کی ہمدردیاں جواب ذرائع ابلاغ کو میسر آ رہی ہیں۔ وہ حکمرانوں کو میسر آ سکتی تھی اور ان کی اعلیٰ ظرفی صبر و تحمل اور برداشت کا اور واقعی آزادی اظہار کا حقیقی اظہار بھی ہوتا یوں دنیا بھر میں ملک و قوم کی جگ ہنسائی اور رسوائی نہ ہوتی بس انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ خود کردہ را علاج نیست۔ اللہ پاکستان کی حفاظت فرمائے زمینی اور آسمانی آفات سے محفوظ فرمائے دراصل یہ وقت توبہ استغفار کرنے کا ہے، یک جا ہو کر اپنے خالق و مالک کی طرف رجوع ہونے کا ہے۔ یقیناً یہ زمینی، آسمانی عذاب ہمارے اعمال کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ اللہ ہماری، ہمارے ملک و قوم کی حفاظت فرمائے اور اس مشکل گھڑی میں ہم پر ہمارے وطن پر اپنا رحم اور کرم خاص فرمائے۔ ہمیں معاف فرمائے اور اپنے رحم و فضل سے نوازے۔ آمین

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

گفتگو

عمران احمد

فرمانِ رسولؐ

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر لوگ جان لیں کہ اذان میں اور پہلی صف میں کیا (ثواب) ہے پھر قرعہ ڈالنے کے بغیر اسے نہ پائیں تو ضرور قرعہ ڈالیں اور اگر جان لیں کہ اول وقت نماز پڑھنے میں کیا (ثواب) ہے تو بے شک سبقت کریں اور اگر جان لیں کہ عشاء اور صبح کی نماز (باجماعت) میں کیا (ثواب) ہے تو ضرور ان دونوں (کی جماعت) میں آئیں اگرچہ گھٹنوں کے بل چل سکیں۔ (بخاری: کتاب الاذان)

عزیزانِ محترم ....سلامت باشد

رمضان المبارک اور عید آزادی مبارک ہو۔

جس وقت آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں گے رمضان المبارک کی بہاریں ہر طرف بکھری ہوئی ہوں گی۔ رمضان المبارک جو رحمتوں اور نعمتوں کا مہینہ ہے، صبر و استقامت کا مہینہ ہے لیکن افسوس کہ ہم اس مہینے کو بس روایتی انداز میں مناتے ہیں، اس کی روح اس کے سبق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے آج قتل و غارت، طوفانی بارشیں اور سیلاب کسی عذاب کی طرح ہم پر مسلط ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو بڑا رحیم و کریم ہے وہ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہوں اب آپ ایک ماں کی محبت کے بارے میں سوچیں اگر اس کے بچے کو ایک کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ تکلیف سے رات جاگ کر گزار دیتی ہے۔ تو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والی ہستی کس طرح اپنے بندوں کو تکلیف پہنچا سکتی ہے لہٰذا بات مہنگائی کی ہو، ٹارگٹ کلنگ کی ہو یا سیلاب کی ہم انہیں قدرتی آفات قرار نہیں دے سکتے یہ سب ہماری کوتاہیوں کا، ہمارے عمل کا ردعمل ہے۔ کوشش کریں اس ماہ ہم اپنے اعمال کو درست کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ طیارہ کے حادثے میں جاں بحق ہونے والے، دیگر حادثات میں جاں بحق ہونے والوں اور بالخصوص سیلاب میں جاں بحق ہونے والوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) اب آیئے اپنے تبصرہ نگاروں کی طرف

قمر جہاں، حیدر آباد سے محترم جناب عمران صاحب سلام مسنون۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ مشتاق قریشی صاحب کی دستک تو ہر اعتبار سے جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ کیا ہمارے حکمران بے حس ہیں یا تمام حسیات سے عاری ہیں جو ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ محض چکنا گھڑا بنے ہوئے ہیں یا پھر ان کو خدا کو منہ نہیں دکھانا۔ مستقل سلسلوں میں شہناز بانو کی "زنجیر" بہترین رہی۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کے قلم کو اور طاقت بخشے۔ ایم کے مجاہد کی "بے گناہ" نے بھی دکھی کر دیا۔ واقعی ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ انجم فاروق کی "زہر" بھی بہترین رہی۔ ابن صفی کے بارے میں راشد اشرف کی تصنیف بہترین تھی۔ معلومات میں اضافہ ہوا۔ اسعد علی کی "مردِ نامرد" بھی اچھی تصنیف تھی۔ ریاض بٹ کی "سادہ لوح" بھی دل کو لگی۔ دوسرے حصے کا انتظار ہے۔ عبداللہ عاطر کی "جیون رنگ" بھی زبردست تھی۔ محبت، پیار اور خلوص کے جذبوں کی دھوپ چھاؤں لیے ہوئے سرور شاذ کی "لازوال" پڑھ کر دل کو بہت تکلیف پہنچی لیکن تصنیف کے اعتبار سے بہترین تھی۔ خوش بوئے سخن میں فریدہ جیلانی کی نعت عمدہ تھی۔ اس کے علاوہ پروفیسر واجد نگینوی کی غزل بہترین تھی سید آکاش بخاری اور فریدہ خانم کی غزلیں بھی اچھی تھیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ میری پہلے سے بھیجی ہوئی کہانی، نظم اور غزل کو اس ماہ شاملِ اشاعت کر کے شکریہ کا موقع دیں۔ عین نوازش ہوگی۔ خدا آپ کے اہل و عیال، جملہ اسٹاف، تمام مصنفین، قارئین اور کل مسلمانانِ عالمِ اسلام کو اپنی امان میں رکھے۔ ہمارے اس وطن اور وطن کے رہنے والوں سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہماری دعاؤں کو مستجاب کرے۔ آمین۔

فریدہ فری، لاہور سے رقم طراز ہیں۔ السلام علیکم! پچھلے ماہ میں نے خط بھی لکھا تھا اور اپنی تحریریں بھی بھیجی تھیں، مگر جواب ہی نہیں ملا۔ بک شاپ جہاں سے میں اور بھی رسائل منگواتی ہوں ایک مرتبہ نئے افق لیا پڑھ کر بے حد اچھا لگا اس کی کہانیاں بے حد اچھی اور سلسلے بہت ہی معیاری ہیں۔ میں کئی اور میگزین میں بھی لکھتی ہوں۔ پاکیزہ، آنچل، حنا، دوشیزہ اور ریشم میں میری شاعری اکثر شائع ہوتی ہے۔ اب میں اس کو ریگولر پڑھا کروں گی اس میں فریدہ خانم کی غزل اچھی لگی۔ تمام اسٹاف اور قارئین کو دعا اور سلام۔

جاوید احمد صدیقی، راولپنڈی کینٹ سے کہتے ہیں۔ اچھے عمران جی السلام علیکم اسلامت تاقیامت نکھرا نکھرا کھلا کھلا خوب صورت رنگوں والا آنکھوں کو تراوٹ دینے والا ٹائٹل ہمارا نئے افق 19 تاریخ کو ہی مل گیا۔ رمضان المبارک آپ کو بھی مبارک ہو۔ فہرست سے گزرے دل خوش ہوگیا۔ دستک پڑھ کر دل پھر غمگین ہوگیا۔ خودکشیاں اور پھر اربابِ اقتدار کی بے حسی! خودکشی میں بھی ہم دوسرے نمبر پر آ گئے ہیں۔ حضور پاک کی حدیث شریف کا ان پر کیا اثر ہونا ہے اگر پڑھ بھی لیں تو بڑی بات ہے۔ آج کل افسوسناک معاہدے ہو رہے ہیں اور ہمارے ایک وزیر کروڑوں دوسرے رشوت کے طور پر نگر نگر جا کر مخصوص طبقہ میں بانٹ رہی ہیں۔ مگر غریب، بھوکے اور خودکشیاں کرنے والے خاندانوں کو چند لاکھ بھی دینے نصیب نہیں ہیں۔ گفتگو تغیر و آن سر آنکھوں پر

بحوالہ اللہ بھرے صرف آٹھ تھے۔ طویل ترین تبصرے تھے۔ محمد فہد اور محمد سفیان کے بھی مگر بڑے اچھے اور خوب تر۔ ہاں ہر ایک نے سیاسی تبصرہ کیا ہے اور آٹھ تبصروں میں آدھے آدھے تو سیاست اور موجودہ حالات پر لکھا گیا تھا۔ محمد فہد کھری کھری باتیں کیا ہوں گی؟ ذرا مثال دینا۔ تمھیاں نہ بڑھ جائیں۔ ہاں جناب تبصرہ تو یہ بھی میں نے بڑے مزے مزے لے کر پڑھا ہے۔ ہاں یہ جگہ فرزند ارجمند کی لت کیوں لگا رکھی ہے۔ سب کو یاد کیا ہے آپ نے بڑا اچھا لگا۔ ہاں آپ کی نیچر زرٹریننگ کیسی رہی؟ آپ کی طرح دوسرے قارئین نے بھی میرے ساتھ ان غیر حاضر تبصرہ نگاروں سے التماس کی ہے کہ ایک ماہ بعد ملنے کی تمنا رکھتے ہوئے پھر بعد آپ لوگوں کی آمد سے محروم رہ جائیں۔ عبداللہ عاطر پہلے تو تبصرہ اور خوب صورت تبصرہ کرنے پر مبارک باد اور اس سے بھی بڑھ کر اتنی اچھی کہانی لکھنے پر بھی۔ غیر حاضری نہ کیا کرو یار! ہاں اس دفعہ اپنی شاعری سے محروم کیا ہے کیوں؟ طاہرہ جبیں تارا صاحبہ رسالوں کے ٹائٹل بھی اس قسم کے اسلامی آنے شروع ہوں گے؟ آپ کیا امید رکھتی ہے۔ محض خواب میرے تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ اس دفعہ کہانی کی غیر حاضری ہوگئی نا! آپ کا تبصرہ بھی سیاست سے بھرپور تھا۔ انجم فاروق ساحلی آپ سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ آپ بہترین لکھاری ہیں لیکن آپ اور محمد فاروق انجم دونوں ہی قارئین کو پردے میں رکھ رہے ہیں اور عجیب گورکھ دھندہ بنا رکھا ہے۔ آپ نے اس دفعہ فوٹو کیوں نہیں دی؟ کچھ ہے نا دال میں کالا۔ آپ چکر پر چکر چلا رہے ہیں۔ اگلے شمارے میں اپنا فوٹو چھپوا دیجیے ورنہ بھئی الٹ پلٹ ہے۔ ہمارے باذوق قاری ہونے پر آپ کا شکریہ۔ ویسے عثمن آباد کے کچھ حضرات شک و شبہ میں مبتلا ہیں تو یہ تو آپ خود ہی ایسی حرکتیں کر رہے ہیں کہ اگلا کنفیوژ ہی ہوگا نا۔ حسنین بلوچ آپ نے فرداً فرداً سب کو یاد کیا بڑا اچھا تبصرہ تھا اور آپ کی تحریر کا منتظر بھی ہوں۔ ہاں ہمیں یاد رکھنے کا شکریہ! آپ کے لیے سمیع آکاش کے خوب دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنا کرم کرنے والا ہے۔ محترمہ قمر جہاں صاحب کی سیاست کی باتیں خوب تھیں اور عمران صاحب سے گلے شکوے بالکل بجا ہیں واقعی عمران صاحب یہ عنوان کا قتل کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ وگرنہ وضاحت کیجیے نا۔ ایک غزل میری تو رکے عنوان سے صفحہ نمبر 203 زین الدین شانی لاہور کے نام سے شائع ہوئی ہے یہ تو ہیں آپ کی غزل؟ یہی ہی کے نام ہے۔ این شاہین تبصرہ طویل سیاسی اور بھرپور تھا۔ ویری گڈ۔ بھئی ایک دفعہ یاد کرتا بھول گیا ہوں گا پھر بھی بے حد معذرت۔ محمد سفیان کا تبصرہ بے حد لمبا اور ٹھیک تھا۔ خوب غور سے پڑھا آپ کی جوابات دینے والی تجویز سے میں سو فی صد متفق ہوں۔ عمران جی غور کر کے عمل بھی کریں۔ ہاں تینوں شکوے دور ہو جائیں گے۔ دیکھیں جعلی لوگ، جعلی ڈگریاں، جعلی معاہدے اور خدانخواستہ جعلی سامانِ معاشرے کو تباہ نہ کریں گے تو اور کیا کر سکتے ہیں۔ پھر بھی ووٹ تو ہم ہی دیتے ہیں لمحہ فکریہ ہے۔ لیجیے یہ شہناز بانو صاحبہ ارشاد قریشی صاحب، زاؤ چاند صاحب، جناب صابر لنگاہ صاحب، عالیہ انعام صاحبہ، ریحانہ سعیدہ صاحبہ، آکاش بخاری اور دیگر حضرات کہاں ہیں؟ اقرا تو دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اب چلتے چلتے ذرا کہانیوں پر ایک نظر ابن عطاش تو نہایت توجہ اور دل سے پڑھا گیا۔ ایک ایسا سلسلہ تھا کہ مدتوں یاد رہے گا۔ اس ماہ کی منفرد اور دل کو چھو جانے والی تحریر یادِ ابن صفی تھی۔ ہم جیسے عمروں کے لوگوں کی یادوں کے دریچے ایسے وا ہوئے کہ کئی گھنٹے اسی یادِ ماضی میں ڈوبے رہے۔ راشد اشرف آپ کا ایک ایک لفظ ایک ایک جملہ دل میں اترتا چلا گیا۔ بہترین معلومات اور ابن صفی کی زندگی کے کئی پہلوؤں سے آگاہی ہوئی۔ کاش پیار دو کے بڑے بڑے جغادری بھی اپنی جھوٹی انا کو پسِ پشت رکھ کر ابن صفی مرحوم کو جائز مقام دیں۔ یہ لوگ کے ممالک میں ایسا ادب لکھنے والوں کو سر کے خطاب سے نوازا گیا۔ اور یہاں کے چھوٹے قد کے لوگ 50، 100 کی تعداد میں ادبی رسالے چھاپ کر فخر کر رہے ہوتے ہیں۔ کاش کاش یہ سب ہو جائے جس کی تمنا راشد صاحب نے کی ہے۔ ابوضیا اقبال ایک اور شاہکار جاسوسی ناول لے کر ہمارے دل جیتنے کے لیے آ گئے اور دل جیت بھی لیے۔ اس کے لیے عمران صاحب بھی مبارک کے مستحق ہیں۔ اسعد بھائی آپ اکاؤنٹس کے بندے ہو کر بڑے بڑے لکھاریوں پر بھاری ہیں۔ سرور شاذ کی حاضری بڑی اچھی لگی۔ اچھی کہانی تھی۔ زنجیر تو غضب کی جا رہی ہے۔ شہناز بانو بڑے صاف ستھرے انداز سے کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں اور کہانی تانا بانا بھی زبردست ہے۔ زہر زبردست اور بے حد مزے کی جا رہی ہے۔ پھر فاروق انجم نے زبردست داستان والا ناول لکھا ہے۔ لڑائی جھگڑے اور نوک جھونک کا حسین امتزاج قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ کہانی میں جگہ جگہ سسپنس تھرِل اور جاسوسی کے حوالے سے مزہ آ جاتا ہے۔ بلیک واٹر آخری صفحات کی انمول داستان رہی۔ جنرل شفیق احمد کے رواں اور انتہائی خوب صورت، متوازن بھرپور ترجمے نے اور بھی اس ہمنگر داستان کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ انتہائی گہرائی میں جا کر لکھی جانے والی معلومات تو ایسے لگتی ہیں جیسے امریکہ کے خفیہ ادارے کے اندر گھس کر اچک لی گئی ہے۔ اتنی خوف ناک وردہ کہ بے حس ظالم سرگرمیوں کی حامل یہ تنظیم دشمن تو دشمن اپنے بھی لوگوں کو وقت آنے پر نہیں معاف کرتی۔ فوجی اڈے اور مسلمان ملکوں کے خلاف حالیہ اور مستقبل کے منصوبے بے حد خوف ناک ہیں۔ عمران جی آپ زنجیر، زہر اور بلیک واٹر جیسی سلسلے وار کہانیوں کے انتخاب پر مبارک باد کے مستحق ہیں اور یقیناً آپ کی مجلسِ ادارت بھی۔ ہم سب قارئین کی طرف سے مبارک اور صحت و عمرِ خضر کی دعائیں لیں۔ آیئے روبینہ احمد کی بزمِ سخن میں شکریہ۔ انجم مسز بشیر احمد، ریاض بٹ، طاہرہ اسلم اور معینا شوکت اس دفعہ ٹاپ پر ہیں۔ ویسے بھی صنفِ نازک بزم پر چھائی رہیں کہ تناسب کے حساب سے یہ 23 ہیں اور صاحبان صرف 13۔ ساتھ آگے بڑھو۔ خوش بوئے سخن میں شہزاد بہترین انتخاب لائے ہیں۔ فریدہ جیلانی ناز کی نعت زبردست تھی۔ مبارک باد، آکاش بخاری، واجد نگینوی، قدیر رانا اور طاہرہ جبیں تارا ٹاپ پر تھی۔ بڑی خوب صورت شاعری ملی پڑھنے کو۔ ذوق آگہی میں مسکان احمد کا انتخاب بہت اچھا لگا۔ لطائف بھی اچھے بہت اچھے رہے۔ میرا لکھا ہوا ایک لطیفہ اور دو عدد اقوال خاص شائع (آخری تین) کرنے پر بے حد شکریہ۔ آئندہ کے لیے بھی عمران جی مواد اچھا خاصا بھجوا رہا ہوں امید ہے وقتاً فوقتاً حوصلہ افزائی ہوتی رہے گی۔ ویسے ٹاپ آف دی ماہ فریدہ جیلانی (علاوہ نعت شریف کے) کا بھیجا ہوا واقعہ پراسرار بندے دل کی گہرائیوں تک تڑپا گیا۔ ان سیٹ یا فلرز میں صفحہ 207 پر نازسلوش ذشے اور صفحہ 153 پر ریحانہ سعیدہ کی شاعری شاندار رہی اور بہترین بھی۔ ہاں ان لفظوں میں دونوں ہی کے نظریے اپنی اپنی جگہ دل کو تڑپا دینے والے ہیں۔ ویری گڈ یو تھ صنفِ نازک۔ اختتام کرتا ہوں اور مشتاق احمد، طاہر احمد، اسرار احمد اور تمام احبابِ مجلس کو سلام دعائیں۔ اللہ حافظ

محمد وقاص احمد وکی، سٹی جتوئی ضلع مظفر گڑھ سے کہتے ہیں۔ محترم عمران صاحب آداب افق امید ہے خیریت سے

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ بھی خیریت سے ہوں گے اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تندرست اور خوش و خرم رکھے آمین۔ اور اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے ٹائٹل اس مرتبہ بہت خوب صورت تھا۔ اس مرتبہ کرسی صدارت ملک فہد لے گئے میری طرف سے دل کی گہرائیوں سے مبارک باد اور تبصرہ بھی خوب تھا اور محترمہ ایس شاہین صاحبہ سلام اور عرض ہے کہ جگنو! تو گئی ہے چاہے 20 ویں نمبر پر ہی پھر بھی میں عمران صاحب کا شکر گزار ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ قارئین محفل گفتگو میں کم ہو رہے ہیں محترمہ ناز سلوش ڈشتے صاحبہ کافی دنوں سے غیر حاضر ہیں اور اس مرتبہ تو سیدہ آکاش بخاری بھی غیر حاضر تھے۔ میری تمام قارئین سے درخواست ہے کہ ہر ماہ محفل گفتگو میں غیر حاضر نہ ہوں۔ ان کی حاضری سے سب کی خیریت معلوم ہوتی ہے اور ایک بات جو میں تمام قارئین کو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ مجھے لگتا ہے کہ تمام قارئین حکومت اور حکمرانوں سے ناراض ہیں۔ خفا ہیں۔ گلے شکوے سب کو حکومت سے ہیں یہ سب حکمرانوں کا قصور نہیں ہمارے اعمال کا قصور ہے کیونکہ حدیث نبوی ہے کہ جیسے ہمارے اعمال ویسے ہمارے لیے حکمران۔ (الحدیث) ہم خود نماز تو پڑھتے نہیں مگر حکمران کو حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسا ایمان دار اور سچا چاہتے ہیں۔ ہم خود انصاف کرتے نہیں اور حکمران حضرت عمر فاروقؓ جیسا عادل اور نڈر چاہتے ہیں اور خود صدقہ، خیرات، زکوٰۃ ادا کرتے نہیں اور حکمران حضرت عثمان غنیؓ جیسا سخی چاہتے ہیں۔ ہم خود جہاد کرنے سے کتراتے ہیں کفار اور غیر ملکیوں یہودیوں کو للکارنے سے ڈرتے ہیں اور حکمران حضرت علیؓ جیسا نڈر بہادر مانگتے ہیں۔ یہ ہمیں حکمرانوں یا حکومت نے تو نہیں کہا کہ ہم رشوت، چوری، ڈکیتی، زکوٰۃ ادا نہ کرنا، نمازیں قضا کرنا، صبح تلاوت کی جگہ ٹی وی دیکھنا، بڑوں کی بے ادبی، والدین کی نافرمانی کرنا۔ غرض ایسے ہزاروں گناہ ہیں جو ہم سے سرزد ہوتے ہیں جن کو ہم خاطر میں نہیں لاتے اور یہ بے انصاف، بزدل، لٹیرے حکمران ہمارے اعمال کی وجہ سے ہیں۔ ہم خود کچھ عمل نہیں کرتے اور سارا الزام حکومت پر دیتے ہیں اور جب ہم خود پر اپنے اہل خانہ پر اپنے دوست احباب پر کنٹرول کریں گے تو ہمارے حکمرانوں کو حکومت سنبھالنے میں آسانی ہو جائے گی۔ جب ہم اپنا کاروبار کا مکمل ٹیکس ادا کریں گے تو حکومت کو قرض نہیں اٹھانا پڑے گا۔ جب ہم اپنے بچوں کو بہادر بنائیں گے تو ملک کی سرحد پر کوئی غیر مسلم میلی آنکھ سے نہیں دیکھے گا اور ہم خود کو ایک ذمہ دار شہری ثابت کریں تو ان شاءاللہ یہ تمام گلے شکوے ختم ہو جائیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ہمارے صدر صاحب اور وزراء کرام کے دلوں میں ملک کا احساس پیدا فرمائے اور اس ملک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور تمام دشمنوں کے شر سے بچائے آمین اور اس مرتبہ شمارہ بھی بہت خوب کہانیوں سے لبریز تھا۔ اس مرتبہ بزم سخن اور خوش بو سخن بھی لاجواب تھا لگتا ہے قارئین نے محبت کی ہے اور راؤ چاند کی غزل بہت اچھی لگی۔ ملک فہد صاحب میں ہمیشہ انتخاب پر انتخاب ضرور لکھتا ہوں۔ یہ محترم عمران صاحب کی مہربانیاں ہیں کہ میرے نام پر شائع کر دیتے ہیں۔ یہ گلا آپ ان سے کریں مجھ سے نہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو خوش و خرم رکھے آخر میں اب اجازت چاہوں گا۔ والسلام۔

عبدالرئوف عدم، راولپنڈی سے فرماتے ہیں۔ محترم عمران بھیا السلام علیکم! نئے افق کے تازہ شمارے کے سرورق کی دوشیزہ کو اپنے بجائے کہیں دور افق پر دیکھتے ہوئے پایا تو ہم نے بھی آگے بڑھ جانا مناسب سمجھا۔ مشتاق احمد قریشی کی دستک ہمیشہ کی طرح جاندار تھی۔ گفتگو کے صفحات بڑھ گئے لیکن لکھنے والے کم ہو گئے۔ صرف آٹھ احباب محفل پر راج کرتے ہوئے نظر آئے۔ ہم نے بھی تبصرہ کیا تھا مگر شاید وہ ڈاک والوں کی گاڑی کی سست رفتاری کے باعث آپ تک نہیں پہنچ پایا۔ محمد فہد بھائی ایک "کھری کھری" سنانے کا سلسلہ شروع کرنے والی تجویز سے ہم اتفاق کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں بھی کھری کھری سنانے کو دل چاہتا ہے لیکن اس کے لیے گفتگو کے صفحات مناسب نہیں۔ طاہرہ جبیں تارا! آپ کی بات درست ہے اگر اسلامی سزاؤں کا نفاذ ہو جائے تو جرائم کی بیخ کنی بے حد آسان ہو جائے۔ آپ کی اگلی کہانی کا انتظار ہے۔ حسنین نوید آپ ہماری دعاؤں میں شامل ہو۔ ایس شاہین آپ کی باتیں بے تکی نہیں ہیں بلکہ پکی اور کھری ہیں۔ ایسے ہی لکھا کریں اور آپ کی دوست کو 12 اگست سالگرہ مبارک۔ محمد سفیان آپ نے زلف محبوب سے بھی کئی گز طویل تبصرہ لکھا لیکن اس میں کسی کہانی کے متعلق کوئی تبصرہ نہیں ہے۔ حالانکہ یہ صفحات دوستوں سے گفتگو کے ساتھ کہانیوں پر تبصرے کے لیے مخصوص ہیں تاکہ ہمارے قلم کار حضرات کو اپنی کہانیوں کے متعلق پڑھنے والوں کی رائے کا علم ہو سکے۔ انجم فاروق ساحلی نے اپنے تعارف میں اپنی تعریفوں کا اچھا خاصا پل باندھ دیا۔ راشد اشرف نے ابن صفی مرحوم کی یادوں کو تازہ کیا۔ یہ مضمون ابن صفی کی عظمت ان کے کارناموں اور ان کے ادبی مقام کو اجاگر کرتا ہوا ذہنوں پر تادیر رہنے والے نقش چھوڑ گیا۔ اس بار شمارے کی تمام کہانیاں لاجواب اور ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ صائمہ ناصر کی "راہ حق" بہت خوب صورت تحریر ہے۔ جو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ کسی نے واقعی مسلمان ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ایم کے مجاہد کی "بے گناہ" عمدہ کہانی ہے۔ جلیل خان جیسے بے گناہ لوگ جانے کب تک اندھی گولیوں کا نشانہ بنتے رہیں گے۔ ریاض بٹ کی "سادہ لوح" ان کی پچھلی تفتیشی کہانیوں کی نسبت زیادہ پسند آئی۔ دلچسپ اور تجسس سے بھرپور کہانی کے پہلے حصے کے اختتام پر شرافت کے ہاتھوں اس کے پڑوسی کے قتل نے تحریر کو زیادہ سنسنی خیز بنا دیا۔ اگلے حصے کا انتظار ہے۔ زین نقوی کی "چھٹکارا" میں بتایا گیا کہ شہرت کس طرح آدمی کو تباہ کر دیتی ہے۔ محمد سلیم اختر کی "جیوے پاکستان" میں خوب صورت انداز کا استعمال کیا گیا مصنف کی جانب سے۔ عبداللہ عاطر کی "جیون رنگ" میں قربان نے اپنی ہمت سے اپنی اہمیت منوالی۔ اسعد علی کی مرد ماہر شمارے کی سب سے خوب صورت تحریر ہے۔ آخر میں ناز سلوش ڈشتے سے کہنا ہے کہ اپنی خیریت سے آگاہ کریں۔ اب اس قول کے ساتھ اجازت کہ "حملہ کرنے والا کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے لیکن الزام عائد کرنے والے کی زبان نہیں لہٰذا حریفوں کو بکواس کرنے دیجیے۔"

ایس شاہین، کراچی۔ السلام علیکم! جناب محترم عمران احمد بھائی اس دفعہ شمارہ 17 جولائی کو ملا۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ گفتگو میں فہد صاحب صدارت کی کرسی سنبھالے نظر آئے بھیا مبارک ہو اور سلام پیش خدمت ہے۔ اس دفعہ ٹوٹل آٹھ لیٹر شامل ہوئے اور دونوں بھائی صاحبان کے لیٹر طویل ترین تھے۔ جبکہ ہم نے تو سوچا کہ اس دفعہ صرف ہمارا لیٹر ہی طویل ہوگا لیکن فہد بھیا اور سفیان بھائی صاحب نے تو (خیر) کافی لوگ غائب نظر آئے۔ سب واپس شامل گفتگو ہوں حاضر غیر حاضر سب کو سلام اور دعائیں اس مرتبہ سرور شاذ بھیا کی اسٹوری شامل ہوئی "لازوال" بھیا آپ بھی تو شامل ہوں نا گفتگو میں اور ذوبیہ بھائی آپ بھی راؤ صاحب آپ تو مکمل طور پر غائب ہو گئے۔ اس مرتبہ آپ کی غزل شامل ہوئی اچھی لگی چاند بھیا شامل ہوتے رہا کریں اور مزید اچھی اچھی غزلیں لکھیں اور بھیجیں۔

اس مرتبہ سارے سلسلے شاندار، جاندار اور مزے دار تھے۔ پچھلی مرتبہ کے سب شکوے دور ہو گئے۔ فاروق صاحب کی "زہر" زبردست ہے۔ شہناز بانو آپی کی "زنجیر" بہت اچھی جا رہی ہے۔ شہناز آپی ہر ماہ گفتگو میں حصہ لیا کریں نا۔ حسنین صاحب دعاؤں کا شکریہ مزید دعائیں بھی کیا کریں سب کے لیے اور باقی سب بھی ہمارے لیے دعا کریں۔ ناظم بخاری صاحب آپ کی اسٹوری غائب کیوں؟ قریشی صاحب آپ اس مرتبہ کہاں غائب ہو گئے۔ سر کوئی بات بری لگی ہو تو معذرت۔ اس بار میری بھی حوصلہ افزائی کی گئی شکریہ۔ ان شاءاللہ مزید اچھی چیزوں کے ساتھ حاضر ہوں گی اگر شامل ہوں گی تو حوصلہ بڑھ جائے گا اور پھر اسٹوری لکھنا بھی اسٹارٹ کر دیں گے۔ عمران بھیا میرے بھیا احمد بھی اسٹوری بھیجنا چاہتے ہیں۔ لیکن ڈرتے ہیں کہ کہیں ردی نہ کر دی جائے۔ اس بار کچھ ساتھیوں کے سلام شامل کیجیے۔ جناب احمد صاحب، بادل، صابر صاحب، سعدیہ اور حنا کی جانب سے نئے افق کے تمام کارکنان کو سلام قبول کیجیے گا۔ اگلے شمارے میں یہ سب خود شامل ہوں گے اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتی ہوں اللہ حافظ سب کی دعاؤں کی طالب گار۔

ناظم بخاری، ضلع لودھراں۔ محترم عمران احمد قریشی صاحب آداب و تسلیمات! پروردگار جہاں کی رحمتیں ہمیشہ آپ کا احاطہ کیے رہیں آمین۔ پچھلے ماہ اس لیے نئے افق کے صفحات پر محفل گفتگو میں شرکت نہ کر سکا کہ مجھے اپنا محبوب ماہنامہ بہت لیٹ ملا۔ پہلے میں شیخوپورہ کے قریب فیروز وٹواں شہر میں تھا۔ وہاں نئے افق دستیاب نہیں تھا۔ سو جولائی کی دس تاریخ کو شیخوپورہ جا کر لانا پڑا۔ "جنون" کی اشاعت پر سچ مچ آپ کا شکر گزار اور مقروض کہ مجھ سے جیسے لفظوں تک سے نابلد شخص کو آپ نے لفظ برتنے کا سلیقہ سکھایا۔ ویری تھینکس ابھی تو میں نے آپ سے اور بھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اب آتے ہیں محفل گفتگو کی جانب ان تمام دوستوں کی خدمت میں خلوص بھرا سلام اور دعائیں۔ جو دل میں رہتے ہیں نئے افق سے وابستہ ہیں اور نئے افق جن سے وابستہ ہے۔ محمد فہد! پیارے بھائی آپ بہت باکمال ہیں پوچھیے کیوں؟ کیونکہ آپ ہر ماہ نئے افق میں اپنی حاضری کو یقینی بنائے ہوئے ہیں مگر..... آپ کا تبصرہ شمارے پر کم اور سیاست پر زیادہ ہوتا ہے۔ جسے پڑھ کر طبیعت کچھ اکھڑی اکھڑی ہو جاتی ہے اور باقی رہ گئی کھری کھری کی بات تو ہمارے اردگرد اتنا کھرا کھرا بکھرا پڑا ہے کہ مزید کسی کھری کھری کی محفل میں گنجائش نہیں۔ میں ملکی حالات اور سیاست سے نظریں چرائے رہتا ہوں اگر ان سے نظریں چار کروں تو ذہن چھلنے لگتا ہے جی چاہتا ہے ناانصافی کرنے والے تمام لوگوں کو نیست و نابود کر دوں مگر مجھ جیسے اور آپ جیسے افراد کچھ نہیں کر سکتے تو صرف جھنجھلا کر رہ جاتے ہیں۔ تو پھر خوامخواہ خود کو دکھی کرنے کا فائدہ؟ طاہرہ جبیں تارا! عزیزم سسٹر تھینکس کہ آپ کو "جنون" پسند آئی۔ ورنہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ آپ جیسے باذوق قاری اسے پسندیدگی کی سند بخشیں گے۔ ایس شاہین! آپ کے نام کے ساتھ جو کچھ ہی غلط فہمی ہوگی تھی بقول آپ کے وہ اب دور ہو گئی ہوگی اور ہاں آپ نے ارشاد قریشی صاحب کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے چاند جتوئی کو علمی ادبی طور سے "چھوٹا" نہیں کہا تھا۔ بلکہ ان کی عمر کے حوالے سے یہ بات کی تھی کیونکہ ان کی عمر انیس ہیں یا شاید اس سے بھی کم ہے۔ امید ہے کہ آپ کی بھی غلط فہمی دور ہو گئی ہوگی۔ اصغر علی ناصر! میری تحریروں کو پسند کرنے کا شکریہ مگر مجھے آپ سے ایک شکوہ ہے۔ آپ نے انجم فاروق ساحلی کے بارے میں جو بات کی۔ وہ مجھے ذرا بری لگی۔ جب کہ عمران صاحب نے بھی کہا تھا کہ اب اس ٹاپک کو ختم ہو جانا چاہیے۔ آپ انجم فاروق ساحلی کے قلم کی پختگی دیکھیں۔ کیا اتنا پختہ قلم کار کسی کی نقل تحریر چرا سکتا ہے؟ ہاں یہ الگ بات کہ کبھی کبھار انسان سے لاشعوری طور پر غلطی ہو جاتی ہے آپ سے بھی ہو سکتی ہے مجھ سے بھی۔ ان سے بھی ہوگی تو کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی غلطی مان لی تھی۔ پھر اس بات کو بار بار دہرانے کا فائدہ؟ انجم فاروق ساحلی انگنت کہانیوں کے خالق ہیں اور آپ.....؟ شاید صرف "انجان رشتہ" کے مصنف ہیں۔ میری باتوں کا برا مت مانیے گا پلیز۔ انہیں دل سے تسلیم کیجیے گا۔ انجم فاروق ساحلی صاحب! آپ نے ناچیز کو باذوق قارئین میں شمار کیا۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ میں کہاں اور ذوق کہاں۔ ویسے آپ کا تعارف بہت اچھا تھا۔ سچ مچ مگر ادھورا ادھورا سا لگا۔ تشنگی سی محسوس ہوئی۔ آپ ذرا اور تفصیل سے لکھتے۔ آپ کی کہانیاں جاسوسیانہ مزاج کی ہوتی ہیں۔ میں ایسی کہانیاں نہیں پڑھتا مگر آپ کی کہانی ضرور پڑھ لیتا ہوں۔ کیونکہ آپ کے قلم میں پختگی ہے۔ اپنی تحریروں سے "جاسوسی" کو بھی تو نوازیے نا۔ سلوش ڈشتے! سچ مچ محفل میں لوٹ آؤ۔ ورنہ میں سب کو بتا دوں گا کہ آپ آج کل کہاں اور کیا کر رہی ہیں۔ اس بار محفل سے تمام پرانے دوست و احباب غائب تھے۔ شہناز بانو، نجمی، ارشاد ابن مقبول، جاوید احمد صدیقی، سرور شاذ، ذوبیہ شاذ، اصغر علی ناصر، عاصم ناصر، آکاش بخاری، ایم کے مجاہد، عبدالرؤف عدم، اسعد علی، الفت عابد، ارشاد قریشی، ریاض بٹ اور وہ احباب جن کے نام فی الحال ذہن میں نہیں آ رہے جبھی آپ سب کی خدمت میں خلوص بھرا سلام اور دعائیں۔ آپ سب محفل میں لوٹ آئیں کہ آپ کے دم سے ہی تو اس محفل کی رونق ہے۔ اور ہاں پچھلے کئی مہینوں سے سیدہ ثنا عروج کہاں غائب ہیں؟ پیاری سسٹر محفل میں لوٹ آؤ یا اپنی کوئی تحریر ہی عمران صاحب کو بھجوا دو کہ کسی طرح تو آپ کی حاضری ہو اور یہ عالیہ انعام الٰہی بھی غائب ہیں۔ جبھی آپ بھی محفل میں لوٹ آئیں نا۔ کیا پھر ایک سال کے لیے غیر حاضری کا پروگرام بنا لیا ہے۔ ہم تو آپ کے تبصروں کے لیے ترس گئے ہیں۔ کہانیاں اس مرتبہ صرف دو ہی پڑھ سکا ہوں "لازوال" سرور شاذ کی تحریر بھی ان کی سابقہ تحریروں کی طرح بہت مضبوط اور بہترین تھی۔ افسانہ اور کہانی وہ جو بھی لکھیں اپنا آپ منوا لیتے ہیں۔ بہت اچھے شاذ بھائی اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ دوسری تحریر ہے "زہر" جو کہ سلسلے وار کہانی ہے۔ دوسروں کو یہ کہانی پسند آئی ہو یا نہ آئی ہو۔ مگر مجھے بہت پسند آئی۔ پہلی قسط سے ہی مصنف کی کہانی پر گرفت مضبوط رہی ہے۔ پلاٹ بھی بہت زبردست ہے اور انداز تحریر بھی بھلا۔ یہ تحریر قارئین سے اپنا آپ منوا لے گی کہ بقول محسن نقوی جو چیز ہے اسے یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں اور جو چیز نہیں ہے اس پر بحث فضول ہے۔ پچھلے دنوں فیصل آباد جانا ہوا تو "زہر" کے مصنف محمد فاروق انجم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے اپنے دولت خانے پر لے گئے۔ اتنی خاطر مدارت کی اتنے خلوص سے پیش آئے کہ میں تو سچ مچ ان کی محبتوں کا، مہمان نوازی کا مقروض ہو کر رہ گیا۔ میں تقریباً دو گھنٹے تک ان کے اس کمرے میں بیٹھا رہا۔ جہاں ان کے ساتھ کافی ماہناموں کے مدیر آ کر بیٹھتے رہے ہیں۔ میں نے ان کے وہ تمام رسائل دیکھے۔ جو الماری میں لگے ہوئے تھے۔ جن میں ان کی کہانیاں شائع ہوئی تھیں۔ دو چار کتابی شکل میں ان کے ناول بھی دیکھے۔ ان کے لکھنے کی ٹیبل دیکھی۔ جہاں کمپیوٹر اور پرنٹر بھی موجود تھے۔ کمرہ بھی نہایت خوب صورت اور آرام دہ تھا۔ ان سے دو گھنٹے تک صرف ادبی و علمی اور ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی۔ وہ اپنی تعارف والی تصویر کے حساب سے زیادہ

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

خوب صورت تھے۔ عمران کی چالیس کے لگ بھگ تھی مگر چالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے تھے۔ بہت ینگ تھے بہت خلیق تھے۔ ان [illegible] بھی ملاقات ہوئی جنکی عمر دس بارہ کے لگ بھگ تھی۔ ان سے ملنے کے بعد احساس ہوا کہ دنیا میں اچھے مخلص انسان بھی ہوتے ہیں۔ ان سے فون پر صرف ایک دو بار بات ہوئی تھی اور تیسری بار میں ان سے ملنے پہنچ گیا تھا۔ مجھے زحمت سے بچانے کے لیے انہوں نے مجھے لاری اڈے سے خود پک کیا تھا۔ دو گھنٹے کی مختصری ملاقات کے بعد مجھے اجازت لینا پڑی۔ یہ میری مجبوری تھی۔ وہ ایسا نہیں چاہتے تھے مگر میری ضد کے آگے مجبور ہو گئے اور میں اپنے گھر لوٹ آیا اور آج میں خط لکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں کیا آئندہ بھی میری کبھی ان جیسے کسی مخلص شخص سے ملاقات ہوگی یا نہیں اور اگر ہوگی تو کیا میں ان کا خلوص بھول پاؤں گا۔ والسلام

ارسلان علی' باغبان پورہ لاہور۔ تمام پڑھنے والوں کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! اگست کا شمارہ 22 جولائی کو ملا اور 22 جولائی کو ختم کر کے خط لکھنے بیٹھ گیا کہ میری طرف سے دیر نہ ہو کیونکہ گفتگو میں میرے علاوہ کئی ساتھی غیر حاضر تھے یا تو آپ نے پالیسی چینج کر دی ہے۔ یا میرا خط تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل اس دفعہ کافی بہتر تھا۔ اس دفعہ نظر ہوئی جگہ پھولوں نے لے لی ہے جو بہار سے پہلے بہار کی آمد کا پتا دے رہے ہیں۔ مشتاق صاحب سوال تو بہت ہیں ڈرون حملے کیوں ہو رہے ہیں؟ ملک میں کرپشن کا دور دورہ کیوں ہے؟ کھانے پینے کی اشیاء مہنگی اور اشیائے تعیش سستی کیوں ہیں؟ لینڈ مافیا کی طرف سے غریبوں کے خریدے گئے پلاٹوں پر قبضہ کیوں کیا جاتا ہے؟ جعلی ڈگری والے اسمبلیوں میں اور ڈگری والے سڑکوں پر کیوں ہیں؟ پاکستان کے انتہائی منافع بخش ادارے دن بدن کمزور کیوں ہو رہے ہیں؟ داتا دربار جیسی مقدس جگہ پر حملے کیوں کیے جا رہے ہیں؟ ایسے میں ایک نیا سوال کھڑا ہو گیا ہے کہ ایک ماہ میں دو دو سو خودکشیاں کیوں ہو رہی ہیں؟ اس کا جواب یہ نہیں کہ ہماری آبادی اگر جاپان کی طرح بڑھ رہی ہے تو ہم جاپان کی طرح ترقی کرتے بلکہ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اگر چین کے ماؤزے تنگ اور جواہر لال جیسے زیرک حکمران ملتے تو ہم بھی اپنے ملک کا مال یورپ کی منڈیوں تک لے جاتے 1915ء میں سنگاپور کو "لی کوآن یو" جیسا حکمران ملا۔ تین دہائیوں پہلے ملائیشیا کو مہاتیر محمد ملا اور دبئی کو 35 سال پہلے زید بن سلطان ملا۔ آج ان ملکوں کی ان حکمرانوں کے پہلے اور بعد کی صورت حال کو ملاحظہ فرمائیں اب جی مسلمان اگر اپنی سالانہ زکوٰۃ ہی ادا کر دیں تو عالم اسلام میں کوئی بھوکا نہ مرے۔ برونائی دارالسلام کے سلطان کی دولت میں ہر سیکنڈ بعد 90 پونڈ کا اضافہ ہو رہا ہے اور اس کے محل کے کمروں کی تعداد ایک ہزار سات سو اٹھاسی ہے۔ جو کہ 1932 کاروں کا مالک ہے۔ جس کی ملکیت میں 747 بوئنگ کا دو طیارہ ہے۔ جس کی سجاوٹ کے لیے 12 کروڑ ڈالر لاگت آئی ہے۔ جس کی بیٹی کی شادی کے 14 روزہ جشن میں 140 لاکھ ڈالر پھونک دیے جاتے ہیں۔ اس جیسے رب کی نعمتوں میں کھیلنے کھیلنے والے چند بادشاہ سرمایہ دار اور تاجر اگر اپنی زکوٰۃ ایمان داری سے ادا کریں تو کوئی ماں اپنے بچے کو بیچنے سے لگ کر دریا میں نہ کودے۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی اس بات سے میں متفق ہوں کہ دوسروں سے پہلے ہمیں خود کی اصلاح کرنی چاہیے اگر ہم لوگ صرف ہمسایوں کے حقوق ادا کرنے شروع کر دیں قرآن و سنت کے مطابق تو یہ معاشرہ اور ملک کیا عالم اسلام تبدیل ہو سکتا ہے۔ اقراء میں طاہر قریشی صاحب نے بھی یہ بات قرآن و حدیث کے ساتھ بیان کی ہے کہ بغض اور کینہ ہمارے معاشرے کے لیے کتنا بڑا ناسور ہے [illegible] کل آخر منفصل محبت نامے تھے مجھ سمیت کئی لوگوں کی غیر حاضری تھی (اب اس کی وجہ پتا نہیں کیا ہے) احمد فہد صاحب کرسی صدارت پر بیٹھے ہیں۔ بھائی آپ کا "کھری کھری" کا آئیڈیا پسند آیا۔ اللہ آپ کو انٹرویو (اگر نوکری کا ہے) میں کامیاب کرے۔ اور آپ پکے لاہوری ہو جائیں پھر تو ملاقاتیں ہوتی رہیں گی خاکسار بدذات آدمی ہوں۔ ایڈریس کی آپ کو سمجھ نہیں آئی ہوگی۔ فون نمبر 0322-4770455 دے رہا ہوں آپ کے فون کا انتظار رہے گا۔ عبداللہ عاطر کا تبصرہ بہت شاندار تھا آپ کی کہانی بھی بہت جاندار تھی مسز طاہرہ کے شعر کے انتخاب پر میں خود بھی عمل کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ اچھی بات یاد رکھیں اور بری باتیں بھول جائیں۔ یقین جانیں زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انجم فاروق ساحلی حسنین نوید بلوچ' قمر جہاں' این شاہین اور محمد سفیان ملک صاحب حاضر تھے۔ سفیان بھائی کو بھی میری طرح قوم کا کافی خیال ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم کرے جو لوگ غیر حاضر ہیں وہ جلد از جلد اس کا ازالہ کریں۔ احوال قارئین میں انجم فاروق ساحلی صاحب نے کوزے کو دریا میں بند کر دیا ہے۔ جتنا بھی بتایا ہے جامع اور بہترین بتایا ہے۔ کہانیوں میں پیارا ابن صفی پہلے نمبر پر رہی۔ الفاظ کے تار جڑ جاذ کردار نگاری ادبی جملے محاورے اور ادبی لطیفوں میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ جاسوسی ناول کے آپ بانی تھے اور اگر آپ کے ناولوں میں جاسوسی کے عنصر کو ختم کر دیا جائے تو سنجیدہ اور مزاحیہ ادب اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ آپ کا عمران اور کرنل فریدی کا کریکٹر شرلک ہومز اور جیمز بانڈ دونوں پر بھاری ہے۔ آپ کے ناول ایوب خان سمیت بہت سے حکمران پڑھتے رہے ہیں اور مارکیٹ میں آنے سے پہلے ہی اس کی بکنگ ہو جاتی تھی اور دوسری ادب میں آپ کا نام ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ اس کے بعد بلیک واٹر کی تحریر بہت اچھی لگی۔ فریدہ جیلانی' ناز سیدہ' کاشی بخاری اور محمد صابر جاوید بھٹہ کا کلام پسند آیا۔ "لازوال" مرد و شاد کی بہت اچھی جذباتی تحریر تھی۔ "مرد نامرد" میں گھروں کی بربادی کے اسباب پر اچھی روشنی ڈالی ہے آپی شہناز بانو کی زنجیر ماشاءاللہ بہت ترقی کر رہی ہے۔ زین نقوی صاحب کی "جھوٹا" پڑھی تو میرا اپنا دل بھی موبائل کے ساتھ یہی کرنے کو چاہتا ہے۔ سرکاری نوکری میں جتنے فون آتے ہیں اور ہر کسی کا اصرار ہوتا ہے کہ فون پر اس کے مطلب کی بات کی جائے چاہے وہ جھوٹی ہی کیوں نہ ہو سچ بولیں تو کوئی قائل ہی نہیں ہوتا ریاض بٹ کی سادہ و لوح پچھلی تحریروں کی طرح بہت اچھی تھی۔ محمد فاروق انجم کی "زہر" کی ابتدا بہت ہی اچھی ہوئی ہے۔ "بے گناہ" میں معاشرے کی بے حسی کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ معاشرے کے ایسے ناسور جو چودراہٹ قائم رکھنے والے چودھریوں کے پیچھے لگ کر اپنے ہی بے گناہ بھائیوں کو قتل کر رہے ہیں اور ان کے لواحقین کے دلوں میں نفرت کے بیج بو رہے ہیں۔ "شکست رفتہ" ابو تانیہ کی تیسری اچھی کہانی لگی ہے۔ صائمہ اختر کی "راوقن" اور محمد سلیم اختر کی "جیوے پاکستان" بتا رہی ہے کہ ہم جا کہاں رہے ہیں اور ہمیں جانا کہاں چاہیے۔ ادریس آزاد کی "ابن عطاش" کا اختتام بھی اچھا رہا آج بھی ہمارے اندر حسن بن صباح کی طرح قرآن و حدیث کی تشریح کر کے فرقہ واریت کو فروغ دے کر لندن میں بیٹھ کر عالم اسلام میں خصوصاً ٹین ایجرز میں اسلام سے متعلق شکوک و شبہات پیدا کر کے ہماری جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ اس دعا کے ساتھ اختتام کروں گا تمام بیمار بہن بھائیوں کو اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے تمام مظلوموں کی اللہ تعالیٰ مدد فرمائے اور جس کسی پر بھی تہمت

لگی ہے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ انصاف فرمائے۔

فقیر محمد بخش لنگاہ' خانیوال۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! اعدیل علی صاحب و برادرم عمران احمد صاحب! آپ نے سچ کہا کہ ساٹھ یا پچاس ساٹھ سال کی عمر کے بعد گورنمنٹ سروس سے بھی فارغ کر دیا جاتا ہے کہ یہ فرد اب ملازمت کے قابل نہیں رہا۔ A,G آفس اور ہمارے محکمہ کے سینئر کلرک کی نااہلی کی وجہ سے یہ اعزاز بخشی مجھے سروس سے ریٹائرمنٹ پر بھیجنے کا اشتہار لگ گیا ہے اور ہمارے محکمہ فشریز کے بعد دوسرے ADF صاحب جن کا نام میں نہیں لکھنا چاہتا مجھ فقیر پر کچھ زیادہ مہربان ہیں کہ علاج معالجہ کی سہولت کی مد میں تو میری کوئی بھی مدد نہیں کر سکتے جب کہ شوگر کی زیادتی نے میرے جسم کے مختلف حصوں کو زخمی کر کے رکھ دیا ہے اور وہ مدد بھی سرکاری طور پر سرکاری فنڈ سے ہے کہ مجھے ریٹائرمنٹ لینے پر مجبور کرتے رہتے ہیں کیونکہ میں اپنی ذاتی تنخواہ سے ان صاحب کی کوئی بھی ڈیمانڈ پوری نہیں کر سکا تھا اور ان کی ڈیمانڈ کا پورا کرنا ہی میرے بس سے باہر ہے جیسے گاڑی فری یا اے سی کا لے کر دینا ان سب حالات کا سامنا کرتے اور بیماریوں سے لڑتے ہوئے مجھے یہ خیال آیا کہ میں فقیر محمد بخش لنگاہ کافی عرصہ سے آپ کے ماہنامہ بلکہ ہم سب کے ماہنامہ نئے افق میں تراش خراش گفتگو بزم سخن خوشبوئے سخن ذوق آگہی کی بزموں میں لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جب کہ سچی کہانیوں کے سلسلے میں بھی لکھا جس کی مد میں کوئی خاص آپ کی طرف سے پذیرائی نہ مل سکی پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں آپ بھی نوٹس دے کر ادبی دنیا سے ریٹائر نہ کر دیں۔ جس پر دلی صدمہ اٹھانا پڑے۔ خود ہی یہ آخری محبت نامہ لکھ کر اپنے ریٹائر نئے افق ہونے کا اعلان کرتا ہوں آگے چل کر میرے فرزند محمد شفاعت حسین صابر لنگاہ و محمد ثقلین صابر لنگاہ اس محبت بھرے خاندان محفل گفتگو نئے افق میں شامل ہونے کی کوشش کریں گے۔ عزت سے نوازنا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جب کہ کافی عرصہ پہلے سے ارسال شدہ محبت نامہ احوال قارئین محمد ثقلین صابر لنگاہ جس کو تاحال اشاعت میں جگہ دے کر آپ نے ہماری بہت بہت عزت افزائی کی ہے اس کے لیے بھی ہم سب ممبر بہت بہت شکر گزار ہیں۔ یہ سب حالات ہیں اشاعت میں شامل کرنا یا نہ کرنا آپ کی اپنی مرضی پر منحصر ہے اور یہی کچھ میرے یعنی فقیر لنگاہ کے خیر خیریت سے ہونے کی اطلاع و آگاہی ہے اور ساتھ ہی استدعا ہے کہ آپ سب عزیزان میرے حق میں دعائے صحت و خیر و برکت کریں شکریہ اور آپ سب کی خیر خیریت کے لیے صدق دل سے دعا گو ہوں کہ آپ سب بطفیل خداوند کریم اور بطفیل محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم خیر خیریت سے ہوں اور اللہ پاک آپ کو خوشیاں عطا فرمائے (آمین)۔ یہ محبت نامہ میں آپ کو مورخہ 16-07-2010 کو لکھ رہا ہوں جب کہ نیا شمارہ نئے افق اگست 2010 ابھی مارکیٹ میں نہیں آیا۔ دل سے اس کی آمد کا انتظار ہے اور رہے گا بشرط زندگی۔ اس محبت نامہ میں گزرے وقت کی عکاسی کرنے کی کوشش کروں گا اگر محبت نامہ شامل اشاعت کیا گیا تب بھی شکریہ اور اگر ردی کی ٹوکری کی مقدر کر دیا گیا تب بھی کوئی ناراضگی نہ ہوگی۔ پھر بھی شکریہ۔ سب سے پہلے درگاہ مبارک سیدنا حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ المعروف حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ لاہور پر خودکش حملوں نے جہاں دل پر سخت تکلیف دہ وار کیا۔ خبریں سن کر اور ٹی وی پر دیکھ کر رو دیں پر دل میں یہ بات بھی آئی کہ مساجد امام بارگاہوں کے بعد اب درگاہوں پر خودکش حملوں [illegible] کنٹرول [illegible] نہیں رہی تو اس کام کو کنٹرول کون کرے گا۔ حکومت وقت میں کیا صرف [illegible] کا کام ہو سکتا ہے۔ جبکہ لوڈشیڈنگ پر بھی کنٹرول نہیں اور بل اتنے آجاتے ہیں کہ ان کی ادائیگی محال ہو کر رہ جاتی ہے کہ روٹی پیٹ کا سوال آ جاتا ہے۔ پر یہی دعا کر سکتا ہوں کہ اہل اقتدار ہستیوں کو خداوند کریم راہ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے اور ملک پاک کو امن کا گہوارہ بنا کر اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔ آپ سب کو میری ان باتوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔ نئے افق کے سرورق کی سجاوٹ کو دوبالا کرنے کے لیے مقصود صاحب کوئی خاص کارنامہ سر انجام دے کے خیال کریں۔ ماہنامہ نئے افق کے سلسلہ بقلم مشتاق احمد قریشی صاحب وحشک کو بڑے دل آواز انداز میں سجاوٹ ملتی آ رہی ہے واقعی سبق آموز باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں اگر کوئی سبق حاصل کرنا چاہے۔ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی اقراء ترتیب طاہر احمد قریشی صاحب ایک ایمان افروز دینی اسباق سے آگہی کا سلسلہ ہے جو ایمان کو تازگی بخشتا ہے کیا کہنے اردو۔ نئے افق اگر وہ گزری ہوئی اقساط کو کتابی شکل میں دوبارہ بحال کر کے مارکیٹ میں پیش کرے شکریہ۔ محترمہ شہناز بانو صاحبہ کی ایکشن سے پُر سلسلہ وار داستان زنجیر سے زن زر زمین کی تکون سے شروع کیا گیا مختلف مناظر سے روشناس کراتی ہوئی بڑی خوب صورتی اور میلان کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے۔ باقی بانو صاحبہ کا قارئین کے سنگ گفتگو میں شامل ہونا ایک اعزازی بات ہے جس کا شکریہ و مبارک باد۔ محترم شیخ ارشاد صاحب کی بہرحال کوئی نہ کوئی سچ بیانی جو کہ حقیقت کا روپ نظر آتی اور انتظار کیا جاتا ہے۔ شیخ ارشاد کی سچ بیانیوں کو کتابی شکل میں شائع کرنا نئے افق کی کارکردگی کا ایک نمونہ ہوگا۔ باقی موصوف نے گفتگو میں شامل ہو کر ہم جیسے قارئین کو اپنا سمجھا جس کے لیے شکریہ و شکریہ۔ نئے افق میں احوال قارئین میں بہن بھائیوں کا مختصر انٹرویو کا سلسلہ چلا کر بہت خوب صورتی سے قارئین کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔ دوستیاں ہوئیں ملاقاتی سلسلے بنے بہت اچھا سلسلہ رہا کہ ایک دوسرے سے متعارف گفتگو کے دروازے وا ہوئے۔ جناب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی سلسلہ وار داستان صحرا گرد کو بڑے خوب صورت انداز میں آغاز سے انجام تک مطالعہ کروایا۔ کتابی شکل کے لائق ہے۔ مگر صحرا گرد کے اختتام کے بعد تاحال بھٹی صاحب کی کوئی اور کاوش مطالعہ کے لیے پیش نہ کی جا سکی۔ وجہ؟ بھٹی صاحب کو سلام محبت عرض ہے۔ یعقوب جمیل صاحب راحیلہ تاج اور اسرار احمد صاحب کے تراجم کو نئے افق نے سجاوٹ بخشی اس طرح بخشی کہ مطالعہ کے اوقات کار میں وقت گزرنے کا پتا نہ چلا۔ جناب بیدار بخت صاحب کی سلسلہ وار کہانیاں اور محمد زمان خان صاحب کی سلسلہ وار چیلنج اور جناب الماس ایم اے صاحب کے تاریخ سے شناسائی کے سلسلوں نے جہاں نئے افق کو جلا بخشی وہیں پر ہم جیسے قارئین کو بھی سبق ہمت اور وقت کی اونچ نیچ بتائی۔ مبارک باد۔ بزم سخن خوشبوئے سخن ذوق آگہی کے لیے جہاں قارئین بہن بھائیوں کا انتخاب محنت شامل رہی ہے وہیں پر مدیر روبینہ احمد محمد احمد شہزاد اور عثمان احمد صاحب کی لگن بھی شامل ہے۔ ان بزموں کا شدت سے انتظار کیا جاتا ہے۔ مگر ایک بات افسوس سے کہنی پڑ رہی ہے کہ موصوف قارئین بہن بھائیوں کے نام و ایڈریس غلط لکھنے میں ان اناڑی ہیں۔ اگر ہم کھلی آنکھوں سے پڑھیں تو غلطی نہ ہو کیا خیال ہے۔ سچ بیانیاں اگر دیکھی جائیں تو ہر لکھنے والے نے بہت خوب لکھیں مگر جن صاحبان کی لکھی گئی تحریروں کا فقیر صابر نے شدت سے انتظار کیا وہ ہیں سیدہ فیضان' عروج صاحبہ' طاہرہ وحید' ستارا صاحبہ

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

محمد سرور شاز صاحب، فریدہ جیلانی صاحبہ، انجم فاروق ساحلی صاحب، نازسلوش ذشے صاحبہ، محمد فاروق انجم صاحب، یار محمد شیرازی صاحب، امیر حمزہ صاحب، قمر جہاں صاحبہ، عبداللہ شاہد صاحب، محمد سلیم اختر صاحب، ایم الیاس صاحب میری طرف سے ان سب بہن بھائیوں کو بہت بہت دعا میں سلام محبت۔ دیگر نئی قسط شدہ داستان فاروق انجم صاحب کے بارے ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آگے جا کر کیا رنگ دکھائے گی۔ برادرم عمران احمد صاحب ہمراہ قارئین، بہن بھائیوں گفتگو کی اعزازی محفل کو جن عزیزوں نے جلا بخشی ان سب کو میری طرف سے بہت بہت سلام محبت اور دعائیں باقی دلشاد حسین صاحب، محمد علی قریشی صاحب، چوہدری نور الٰہی صاحب کو بھی سلام محبت اور دعائیں کے بعد عرض یہ ہے کہ میں نے اپنی طرف سے کوشش کر کے بہت کم لکھا باقی جن بہن بھائیوں کے نام رہ گئے ہیں ناراضگی معاف ان سب کو بھی بہت بہت سلام محبت اور دعائیں کے بعد والسلام۔

ریاض بٹ، ازحسن ابدال سے منتظر ہیں کہ سلام خلوص دل قبول کریں۔ حسینہ سرورق مسکرا رہی ہیں۔ لگتا ہے اسے لوڈشیڈنگ ختم ہونے کی نوید مل گئی ہے۔ اس کے بعد صفحہ پلٹا تو شربت فولاد کو اپنا منتظر پایا۔ اس بڑھاپے میں یہ ایک نعمت ہے۔ اس کے بعد فہرست پر نظر ڈالی۔ پھر دستک تک پہنچے۔ مشتاق احمد قریشی صاحب آپ ہر ماہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں۔ ہمیں جھنجوڑنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن شاید ہم برف کے وہ تودے بن گئے ہیں جنہیں گرم الفاظ بھی پگھلانے سے قاصر ہیں۔ یہ بے حسی کی انتہا ہے۔ خدا ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین ثم آمین۔ شہناز بانو اگر میں آپ کے تبصرے اور کہانی "زنجیر" کی تعریف نہ کروں تو زیادتی ہوگی۔ آپ اچھا لکھتی ہیں کوئی بھی رائٹر تمام قارئین کو مطمئن اور خوش نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں جو رائٹر اکثریت کو خوش کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ اس کی خوش قسمتی اور کامیابی کی دلیل ہے۔ ارسلان علی صاحب آپ کے خیالات اور جذبات کی میں دل کی گہرائیوں سے قدر کرتا ہوں۔ آپ نے جو کچھ لکھا، بہت پُر اثر لکھا۔ میرے بھائی کس کس بات پر کڑھیں۔ کس کس کا رونا روئیں۔ ہمارے حکمران مصلحت کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔ ابن مقبول جاوید بھائی میرا تبصرہ اور کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ جیسے دوستوں نے اگر اسی طرح حوصلہ بڑھایا تو میرا قلم رواں رہے گا۔ بہت خوب فقیر محمد صابر لنگاہ صاحب میرا قطعہ پسند کرنے کا شکریہ۔ اگر میری کہانیاں آپ پڑھتے ہیں۔ تو ان پر بھی اپنی رائے سے نوازتے رہئے۔ شمعی ارشاد بہن میری کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ بھی اچھا لکھتی ہیں۔ محمد فہد صاحب اس بار بھی آپ کا خط اور خیالات اچھے ہیں اسی طرح لکھتے رہیں۔ جو چیزیں شائع ہونے سے رہ گئی ہیں اگر قابل اشاعت ہوئیں تو ان شاء اللہ ضرور شائع ہو جائیں گی۔ اصغر علی ناز بھائی یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ آپ نے میرے تبصرے اور کہانی ماسٹر مائنڈ کو پذیرائی بخشی۔ سید عبداللہ شاہد بھائی شاید آپ نے میری کہانی بلکہ کہانیوں کو دھیان سے نہیں پڑھا۔ باقی رہی بات زبانی جمع خرچ کی تو عرض ہے کہ جاسوسی کہانی اور تفتیشی کہانی کا مزاج علیحدہ علیحدہ ہے۔ جاسوس کی طرح تھانیدار لنگوٹی باندھ کر مجرموں سے دو دو ہاتھ نہیں کرتا۔ (سوائے ڈاکوؤں اور بڑے مجرموں کے)۔ میری کہانیوں کے مجرم چار دیواری کے مجرم ہیں۔ جو کسی بات، کسی ناانصافی، کسی زیادتی کی وجہ سے جرم کر بیٹھتے ہیں۔ پھر اگر آپ میری کہانیاں توجہ سے پڑھتے تو آپ کو پتا چل جاتا کہ صرف زبانی جمع خرچ نہیں ہوا۔ بلکہ شوکی کی پوری مشنری سرگرم عمل تھی۔

www.pkdigest.com

نیو سینٹرل جیل سے سید آکاش بخاری کا نامہ آپ لکھتے ہیں کہ محترم عمران احمد صاحب آداب عرض۔ خالق دو جہاں آپ پر اور تمام قارئین پر اپنی خصوصی رحمت نازل فرمائے۔ سرورق اچھا تھا۔ محترمہ شہناز بانو صاحبہ آپ نے سب کو یاد رکھا۔ محترمہ جہاں تک میری رہائی کا تعلق ہے تو اس ضمن میں وثوق سے کچھ کہنا عبث ہے کیونکہ کبھی تو لگتا ہے کہ جلد ہی آزادی مقدر ہوگی مگر کبھی یہ دو تین سال تک مزید جاتی دکھائی دیتی ہے کیونکہ حکومت ایک بندے کو بچانے کے لیے تو آرڈیننس جاری کر دیتی ہے اور منشیات والوں کو بھی 6.6 سال معافی مل جاتی ہے مگر ہمیں سنگین جرائم میں ملوث بتا کر اس حق سے محروم رکھا جاتا ہے اور یہ جرائم چاہے ہم نے کیے ہی نہ ہوں لیکن پولیس نے اپنی روایتی اور تشدد پسند طریقہ تفتیش سے ہمارے نامہ اعمال میں لکھ دیے ہوں۔ بہرکیف اس بار آپ نے زنجیر کو پھر اپنی سابقہ پوزیشن پر لا کھڑا کیا ہے۔ امید ہے آنے والی اقساط میں انڈیا میدان کارزار بنے گا۔ بھائی عبدالرؤف عدم صاحب آپ کے حوصلہ افزا دعا کس نے مجھے نئی توانائی عطا کی ہے یونہی دعاؤں میں یاد رکھیے گا ممنون ہوں گا۔ بھائی ارسلان علی آپ کا تبصرہ بھی خوب تھا۔ سلام اور مبارک باد قبول فرمائیں۔ نہایت محترم مقبول احمد صدیقی صاحب اصل میں وہ محمد ارشاد قریشی صاحب سے غلطی سے صدیقی صاحب لکھا گیا معذرت خواہ ہوں۔ دعا میں دینے کا بہت شکریہ۔ آپ کا تبصرہ زبردست رہا۔ انکل صابر بخش لنگاہ صاحب دعاؤں میں یاد رکھنے کا از حد شکریہ۔ باقی ماں کی عظمت پر کہا گیا شعر میرا انتخاب نہیں بلکہ میرا اپنا شعر تھا یعنی میں نے خود ہی کہا تھا۔ بھائی عبداللہ شاہد افسوس کہ میرا لیٹر آپ کو نہیں ملا۔ حالانکہ میں نے بڑی تفصیل سے خط لکھا تھا چلیے آپ کا پتا میرے پاس محفوظ ہے۔ دوبارہ کوشش کروں گا۔ بھائی ریاض بٹ بابا آپ لوگ بھی بھلا بھلانے والی چیز ہیں کبھی کبھار بوجہ مجبوری ایسا ہو جائے تو معاف کر دیا کریں۔ پیاری بہنا شمعی یہ آپ نے کیسا جملہ لکھ دیا ہے میں آپ کو قطعاً نہیں بھولا اور نہ ہی یہ اب ممکن ہے آپ ہمیشہ میری دعاؤں میں شامل رہتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو لشے سے پوچھ لیجئے گا۔ امی کیسی ہیں؟ انہیں کہیے گا کہ آپ کا بیٹا آپ کے قدموں پر ہاتھ رکھ کر سلام کہتا ہے اور ساتھ دعا کی استدعا بھی کرتا ہے۔ فقیر شیر نعیم اکبر، محمد صابر حسین آتے رہا کریں بھائی محمد فہد یار اس بار تو لگتا ہے سب ناراض ہیں۔ بھائی میں کسی کو بھی نہیں بھولا بس کبھی کبھار زنداں کی پابندیاں آڑے آ جاتی ہیں آپ تو سمجھتے ہیں یار...... بہرکیف اب ماشاءاللہ تبصرہ شاندار بھی کر رہے ہو اور جاندار بھی۔ جہاں تک رحمٰن ملک کی معافی کا تعلق ہے تو یار یہ اپنوں کو نوازنے میں تاخیر نہیں کرتے اور یہاں سالہا سال سے بے قصور بھی جیلوں میں سڑ رہے ہیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں حالانکہ موجودہ حکمران خود جیلوں میں رہے ہیں اور انہیں بخوبی علم ہے کہ ان اسیران میں اکثر بے گناہ لوگوں کی ہے۔ جو وڈیرہ شاہی اور پولیس گردی کا شکار ہوئے ہیں لیکن انہیں کون یاد دلائے۔ سلمیٰ غزل صاحبہ بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کے لیے پُرخلوص دعائیں قبول فرمائیں۔ مالک اقدس آپ کے خواب پورے فرمائے اور آپ کے بیٹے کو آپ کا فرماں بردار بنائے آمین۔ ہو سکے تو اس بیٹے کے لیے بھی دعا کر دیا کریں۔ حسنین نوید بلوچ صاحب وعلیکم السلام۔ خدا کے واسطے آپ پرانا کرم فرمائیں آمین۔ محمد ارشاد قریشی صاحب بات وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں دراصل بات دوسری ہے جو ابھی تک نہ ہی آپ سمجھے ہیں نہ انکل صابر۔ بھائی ایم کے جاجا آپ ہی انہیں یہ بات سمجھا دیجئے گا۔ ریاض حسین قمر

صاحب [illegible] شکریہ۔ محمد سفیان ملک آپ کی تنقید نما اصلاح یا اصلاح نما تنقید اچھی لگی مگر لگتا ہے آپ میرے تبصرے غور سے نہیں پڑھتے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ وقت اختتام تبصرہ سب سے سلام کر کے جاؤں مگر کبھی اگر ایسا نہ ہو سکا ہو تو معذرت رہی ناگواری کی بات تو اس طویل اسیری نے جتنی قوت برداشت مجھے عطا کی ہے آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ باقی میرے لیے گفتگو میں شامل احباب سب قابل احترام ہیں مگر ہر ایک کا اپنا مقام و مرتبہ ہے کیونکہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک ہی گھر میں رہتے سگے بھائیوں میں بھی ایک جیسا پیار نہیں ہوتا امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے دعاؤں میں اسی طرح یاد رکھا کریں شکریہ۔ بھائی اصغر علی ناصر میں ٹھیک ہوں تبصرہ و غزل پسند کرنے کی نوازش۔ آپ نے بھی بہت خوب تبصرہ کیا ہے جیتے رہیں۔ محمد وقاص احمد وکی صاحب ایسے ہی خوش رہا کرو میرے ویر۔ بھائی ناظم بخاری یاد آوری کا شکریہ۔ غزل پسند کرنے کا بھی شکریہ آپ کے تبصرے نے بھی دل موہ لیا۔ اقراء میں طاہر احمد قریشی صاحب نے حسد کے بارے میں احادیث مبارکہ کا ترجمہ و تشریح کی واقعی حسد بُری لعنت ہے اور حاسد اپنی لگائی آگ میں خود ہی جلتا رہتا ہے۔ احوال قارئین میں اس بار راشد علی شباب سے ملاقات ہوئی تعارف تو زبردست رہا مگر لگتا ہے ابھی بہت کچھ رہ گیا ہے۔ چلیے یہ بھی بہت ہے۔ ویسے عمران صاحب کوئی چار پانچ ماہ ہونے کو ہیں میں بھی بمعہ تصویر تعارف ارسال کر چکا ہوں کم از کم اتنا تو بتا دیں کہ ملا ہے یا نہیں۔ ابن عطاش ادریس آزاد کی ترتیب دی گئی زبردست تحریر ہے۔ خوشبوئے سخن میں ابن مقبول صاحب کا نعتیہ انتخاب خوب تر تھا۔ قدیر رانا کی غزل بھی لاجواب رہی۔ سلمیٰ غزل صاحبہ کو آپ کی غزل میں ایک تسلسل تھا مگر چوتھے شعر میں قافیہ دل کیسے آ گیا؟؟ اس طرف توجہ دیں۔ محمد سفیان ملک آپ نے بھی اچھی کوشش کی ہے مگر شاعری صرف قافیہ ردیف کا نام نہیں ہے انسان کی تخیلاتی پرواز بھی خوب ہونی چاہیے۔ راغب عثمان کیانی یار تم تو اچھے شاعر بنتے جا رہے ہو۔ وقاص وکی بھائی تمہاری غزل بھی اچھی لگی رانا حنیف عاطر کی غزل بھی کمال کی تھی۔ حسنین بلوچ یہ کاشف صاحب کون ہیں جو میرا چراغ گل کرنے کے چکر میں ہیں۔ صابر حسین کی غزل بھی اچھی رہی۔ محمد فہد تمہاری غزل کا پانچواں شعر قافیے کے اعتبار سے درست نہیں۔ فقیر صابر بخش لنگاہ نے اردو کا نوحہ خوب کہا۔ قمر جہاں مشق سخن جاری رکھیں۔ آخر میں تمام حاضر اور غیر حاضر قارئین کو سلام اور دعائیں والسلام۔

اللہ دتہ عابد، منچن آباد سے عمران احمد صاحب قادر کریم کی رحمتیں، نعمتیں اور برکتیں لمحہ بلمحہ ماہ بہ ماہ بارش سدا آپ پر برستی رہیں (آمین)۔ السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ٹائٹل خوب صورت ہے۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک بے مثال تھی۔ موجودہ دور کی اہم ضرورت۔ مگر اسے محسوس کون کرے۔ گفتگو کی محفل میں جانے سے پہلے میں اپنی غیر حاضری کی وضاحت کرتا چلوں۔ اس دفعہ میری F.A کی [illegible] تھی۔ پچھلے اس کی مصروفیات، دوسرا میں اپنا خواب پورا کرنے اور خیالی پلاؤ کو حقیقی پلاؤ کر دکھانے میں مگن تھا۔ اب خدا کا شکر ہے کہ میں عابد انڈسٹری بنانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ یہ سب میرے والدین کی دعا اور میرے بہترین دوستوں کے مستقل ساتھ کا نتیجہ ہے۔ سرور شاز، امیر حمزہ، چاند علی احمد بلوچ اور نوید اسلم کا میں بے حد مشکور ہوں۔ جنہوں نے مجھے بروقت مشورہ اور راہ نمائی دی۔ ان دنوں میں عابد انڈسٹری کو کامیاب انڈسٹریز کی صف میں شامل کرنے کے لیے کوشاں ہوں۔ ہمارا فرسٹ برانڈ اس وقت مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ باقی ابھی تیاری کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔ عنقریب ہمارے برانڈز کے اشتہارات کو نئے افق کے صفحات کی زینت بنائیں گے۔ [illegible] عمران احمد سے رابطہ کرنے کے بعد [illegible] ہم اس محفل میں آتے رہیں گے۔ شمعی باجی میں اپنے دوستوں، عزیزوں اور مدد کے طلب گاروں کے لیے ہر وقت فارغ ہوں۔ جاوید احمد صدیقی صاحب اگر میرے پاس پلہ ہوتا تو میں ضرور محمد فہد کی بات پلے باندھ لیتا۔ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب آپ مجھے صاحب مت لکھا کریں۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ پلیز۔ بھائی ناظم بخاری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نمبر ان کریں۔ حماس اصول عوامی آپ اپنے نئے نام کے ساتھ کب جلوہ افروز ہو رہے ہو۔ ہم آپ کی آمد کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔ میرپور کی نازسلوش ذشے صاحبہ آپ کہاں ہیں۔ بھائی جلد واپس آ جاؤ دوسرا جرم غریب بچوں کو ہنر سکھانے کا ادارہ بنا رہی تھیں اس کا کیا بنا؟ بھائی عبداللہ شاہد میں بردار آپ کا نمبر ٹرائی کرتا ہوں لیکن ملتا نہیں۔ نوید اسلم صاحب آپ کی طرف دو دعوتیں پھر رہی ہیں۔ کب کھلانے کا ارادہ ہے۔ یا صرف ترسانے کا ارادہ ہے۔ اصغر علی ناصر یاد رکھنے کا شکریہ۔ ارسلان علی، محمد فہد، سفیان ملک، محمد ارشاد قریشی کے تبصرے بھی خوب تھے۔

سید عبداللہ شاہد، حیدر آباد سے کہتے ہیں کہ محترم جناب عمران احمد السلام علیکم امید ہے بفضل خدا تعالیٰ بخیر ہوں گے۔ گفتگو کی محفل میں نئے انداز سے حاضر خدمت ہوں۔ گفتگو کے صفحات میں سب سے پہلے سورۂ مریم کی آیات سے دل و ذہن کو روشن کیا۔ پھر آگے بڑھے۔ اس بار مختصر سی تمہید میں آپ نے پاکستان کی دگرگوں ہوتی معیشت کے بارے میں اظہار خیال فرمایا آپ نے ہمارے حکمرانوں اور سیاست دانوں سے تکلیف کردہ اس عام آدمی کی حقیقت کو درست لفظوں میں بیان کیا۔ خدائے لم یزل سے دعا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو عام آدمی میں چھپا اور خلوص تمام زبوں حال عام پاکستانی دکھائی دے جائے کہ وحدت پاکستان کے دم سے ہی ہم میں دم خم ہے آمین۔ جولائی کے شمارے میں گفتگو کے شرکائے محفل کی تعداد خوش آئند تھی۔ نئے افق کے نئے دوستوں میں فقیر شیر اکبر نعیم قصور سے نمائندگی کرتے آ پہنچے۔ پرانی شناسائی کام آ گئی۔ نعیم اکبر صاحب میری جانب سے موسٹ ویلکم۔ امید ہے تمہاری بہترین کہانیاں بھی پڑھنے کو ملیں گی۔ تمہارے لیے نیک تمنائیں اور دعائیں۔ اس مرتبہ محترمہ شہناز بانو کی موجودگی سے محفل خوش ذرا اپنے پرانے جوبن پر نظر آ رہی تھی اور مزہ دے رہی تھی۔ شہناز جی آپ مسند اول پر متمکن خوب جچتی ہیں۔ ایسی شخصیت جو زندگی کی کٹھن ریاضتوں اور انتھک محنتوں سے گزر کر اتنی فخر اور سرفرازی سے بہرور ہو۔ کسی بھی محفل کے لیے صدارت کے تقاضوں کو بحسن و خوبی انجام دیتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے آپ سر فہرست بہت امارت اور باوقار دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کی صحت اور درازی عمر کے لیے دعا گو ہوں۔ مزید آپ نے شوہر خاکسار کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ صاحب کہہ رہے تھے کسی کو کیا پتا بھگت تو ہم رہے ہیں اتو میں آپ کی اجازت سے ان کی خدمت میں عرض کرتا چلوں کہ محترم نیک بیوی اللہ کی بہترین نعمتوں میں سے ایک قرار دی گئی ہے۔ دو میاں بیوی کی رفاقت زندگی بھر کے لیے خصوصی وحیط ہوتی ہے۔ بے شک انسان تنوع پسند جبلت کا مالک ہے لیکن گھر گرہستی آباد ہونے کے بعد ازدواجی رشتہ اٹوٹ ہو جاتا

Pdf by Roadsign

ہے۔ اب اس میں کسی قسم کی تبدیلی ہرگز ممکن نہیں ہے۔ اب میاں بیوی کے لیے گھر اور بچوں کی خوشیاں ہیں جن کے سہارے باقی زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ کیا خیال ہے شہناز بانو صاحبہ؟ شوہر محترم کے جواب سے ضرور مطلع کیجئے گا۔ اس بار نمبر دو پر عبدالرؤف عدم صاحب مترا رہے نظر آرہے تھے۔ میں نے احوال قارئین کے پہلے تعارف میں آپ کی محض تصویر ہی ملاحظہ کی تھی۔ جسے آپ نے ملاقات سمجھ کر لفظ مبالغہ کو بھی شرمادیا۔ ویسے تو معقول آدمی دکھائی دیتے ہو۔ پھر غیر معقولیت کے جراثیم کیوں پھوٹنے لگے ہو؟ حسب موقع نئے افق نے زہر کے پیالے (تحریر محمد فاروق انجم بعنوان زہر) کا بھی بندوبست کروایا ہے۔ تو کیا خیال ہے عبدالرؤف عدم صاحب؟ ارسلان علی صاحب کا بھی جامع تبصرہ پسند آیا۔ ابن مقبول صدیقی صاحب یاد آوری کا بہت شکریہ۔ آپ کے فون کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب بندہ ناچیز آپ کی محبتوں کا اسیر اور دعاؤں کا طلب گار ہے۔ شمشی ارشاد جی میں تمہاری محفل میں مستقل حاضری دیکھ کر اپنی آمد جاوداں کو کم کرلیتا ہوں۔ تمہارے کوالی پن نے دل پر خوب چرکا لگایا۔ محمد فہد تمہارے بھرپور تبصرے نے مزہ دیا۔ خدا کرے تمہارا زورِ قلم اور بڑھے۔ محمد ارشاد قریشی غزل کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کی تجاویز پر عمران بھائی کو غور کرنا چاہیے۔ سلمیٰ غزل صاحبہ کو بیٹے کے داخلے پر میری جانب سے مبارک باد۔ اصغر علی ناصر آپ سے فون پر گفتگو ہوئی۔ آپ کا تبصرہ بھی شاندار تھا۔ تمہاری نئی کاوشوں کے مجھ سمیت تمام قارئین منتظر ہیں۔ بھائی ابن لودھراں تمہاری بدگمانی حد سے بڑھ کر ہے۔ میں نے نگاہِ مصطفیٰ کے حوالے سے لبیک کا جس جذبے کے تحت تذکرہ کیا تھا، وہ محض اللہ جانتا ہے اور آپ کا منافقت کا ظاہری کہنا کے بارے میں، میں صرف اپنے اللہ سے صبر و استقامت کی دعا کرتا ہوں۔ ویسے عمران بھائی کے پاس اس بات کا صائب جواب رکھا ہے جستجو ہے تو دریافت کرسکتے ہیں۔ آخر میں وہ تمام دوست احباب جن کے نام لکھنے سے رہ گئے ہیں۔ ان کے لیے خیر و سلامتی کی دعائیں۔ عمران بھائی تازہ وارد دل کا منتظر ہوں آخر اس تحریر کو کب شائع کریں گے؟

عبداللہ عاطر، منگلا کینٹ سے۔ عمران احمد صاحب اللہ کریم سے آپ ادارے اور قارئین کرام کی صحت و خوش حالی، سکون اور شر سے حفاظت کے لیے دعا گو ہوں۔ آپ نے اپنی گفتگو میں صحیح فرمایا کہ عام آدمی کا کھوج لگانا چاہیے کہ وہ کون ہے جو ہر بجٹ سے مستفید ہوتا ہے جہاں تک معاشرے میں لوگوں کا تعلق ہے ان کی زندگی بمصداق نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن ہے۔ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے فائدہ اُٹھانے والا صرف خواص کا طبقہ ہے۔ ذرا غور فرمائیے ملک میں وزیراعظم ہاؤس کا یومیہ خرچ 14 لاکھ روپے ہے جب کہ لوگ بھوک کے ہاتھوں خودکشیاں کررہے ہیں۔ لیکن صرف حکمران طبقہ ہی مورد الزام نہیں آتا عوام بھی شامل ہیں۔ ایک عالم کا بیان کہ ہم حکمران کو تو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں لیکن اپنی اصلاح کی ذرا فکر نہیں کرتے۔ اگر 14 کروڑ عوام ٹھیک ہوجائیں تو صرف چند لاکھ حکمران کیسے ٹھیک نہ ہوں گے۔ مشتاق احمد قریشی نے دستک "عذاب الٰہی کی تشریح" میں عوامی رویے کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ اللہ کریم ہمیں راہ راست پر لائے تاکہ ہمارے دن بدلیں۔ طاہر قریشی صاحب اللہ کریم ہمیں حسد جیسی موذی روحانی بیماری سے محفوظ فرمائے آمین۔ جزاک اللہ آپ معاشرتی مسائل کے متعلق جو احادیث شریف ترتیب دیتے رہتے ہیں۔ ان کی اشاعت ضرورت ہے کہ معاملات میں ہم بہت ہی کمزور ہیں۔ شہناز بانو صاحبہ کا مدلل اور مفصل خط پڑھا تبصرہ خوب تھا البتہ آپ کے شوہر نامدار کے ریمارکس "کسی کو کیا پتا کہ محبت تو ہم رہے ہیں" سے کیا مطلب لیا جائے۔ دوسرا یہ کہ "خاص خاص دوست" غائب ہیں کیا آپ بتائیں گی کہ اس خاص خاص کے درجے پر آدمی کب فائز ہوتا ہے شکریہ۔ ارسلان علی صاحب آپ کا تبصرہ خوب صورت تھا آپ نے حقائق کا خوبی سے احاطہ کیا۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ محترم فقیر محمد صابر لنگاہ "بزم سخن" میں شعر تبصرے کی پسندیدگی اور دوسرے حوالوں سے مبارک باد کا شکریہ اور مزید دعاؤں کی استدعا۔ اللہ کریم آپ کو اپنے حفظ و پناہ اور صحت و عافیت کے ساتھ رکھے آمین۔ بہن شمشی ارشاد میں نے تو کبھی نہیں لکھا کہ آپ نے کسی بھی نظم پر تنقید کی ہے بلکہ میں نے نازسلوش ذشے نے حقیقت بیان کرتے ہوئے جو اپنے بارے میں اپنے تبصرے میں آپ کے حوالے سے لکھا تھا وہی حوالہ میں نے دیا تھا دوبارہ دہرا دیتا ہوں تاکہ آپ کی غلط فہمی دور ہو۔ نازسلوش ذشے نے لکھا تھا "شمشی جی جس نظم پر آپ نے تھوڑی تنقید کی ہے وہ میری نہیں تھی بلکہ میرے پاس ایس ایم ایس آئی تھی" البتہ یہ ضروری نہیں کہ جو شاعری کرے صرف وہی تنقید کرسکتا ہے کہ شاعری کرنا اور بات ہے اور شعر فہمی اور چیز ہے۔ اصلاح کے حوالے سے اچھی تنقید آپ ضرور کیا کریں آپ تو خود بھی بہت اچھی قلم کار ہیں آپ کی کہانی "مستقبل شناس" اچھی کہانی تھی البتہ عنوان کی سمجھ نہیں آئی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے آمین۔ محمد فہد صاحب آپ کا سلام قبول وعلیکم السلام۔ راغب عثمان کیانی صاحب شاعری پسند کرنے کا شکریہ۔ ریاض حسین قمر صاحب تبصرہ اور شاعری پسند کرنے کا شکریہ۔ اصغر علی ناصر صاحب آپ کو میری گفتگو پسند آئی شکریہ شاعری بھی پسند کرنے کا شکریہ۔ محمد وقاص آپ کی تجویز صائب ہے۔ بزم سخن میں ریاض بٹ، حکیم شبیر احمد، فرید وفری، نادیہ نور، کائنات اور رضیہ قریشی کے اشعار پسند آئے۔ خوش بو سخن میں راغب عثمان کیانی کی غزل خوب صورت تھی۔ قومی زبان ہے کہاں فقیر محمد بخش صاحب کی اچھی کاوش تھی۔ ہمیں اپنے معمولات میں اردو کو اپنانا چاہیے اور غلامی کا طوق یعنی انگریزی کو اپنے گلے سے اُتار کر ذہنی آزادی کا ثبوت دینا چاہیے۔ ریحانہ سعیدہ صاحبہ کی غزل کے حوالے سے ایسی چاہت کا کیا فائدہ؟ ذوق آگہی کی تحریریں معلومات افزا تھیں۔ ریحانہ سعیدہ کی تحریر "بدلتے رشتے" اچھی کہانی تھی سبق آموز تھی۔ ارشد علی شہاب صاحب کی کہانی "آخر کب" میں ایک تلخ حقیقت بیان کی گئی ہے۔ یقیناً عزت عورت کا انمول گوہر ہے۔ کیا آزادی نسواں کا نعرہ صرف اس کو گنوانے کے لیے لگایا جارہا ہے؟ کیا آزادی نسواں عورت کو بے لباس کرنے کی تحریک ہے اور جو عورت کے حقیقی مسائل ہیں ان پر نظر تو خال خال ہی جاتی ہے یہ کس کا ایجنڈا ہے۔ قمر جہاں کی کہانی "مجبور" بہت زبردست تھی کا شاخسانہ ہے اور ان واقعات میں سے ایک ہے جو کہ بے شمار میڈیا یا چینل سے بوجوہ پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔ فریدہ جیلانی کی تحریر "سکون قلب" اچھی تاثراتی کاوش تھی۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ نازسلوش ذشے کی تحریر انکل جی مناسب تحریر تھی۔ روبین احمد صاحب اور عثمان احمد "بزم سخن" کے لیے میرے پسندیدہ اشعار اور "ذوق آگہی" کے لیے میری تحریروں کا ذخیرہ آپ کے ہاں موجود ہوگا۔ اگر آپ تحریر فرمادیں کہ ان کے شائع کرنے کی ترتیب کیا ہوتی ہے تو عنایت ہوگی۔ محترم محمد احمد شہزاد صاحب آپ ہاں میری طرف سے ایک نظم "دولڑکی تھی یا عورت تھی" ایک غزل ایک نظم اشاعت کی منتظر ہوگی۔ محترم عمران احمد

www.pkdigest.com

صاحب آخر میں ایک گزارش کہ گفتگو میں سب دوست شریک ہوتے ہیں ان کو ایک دوسرے کے سوالات کے جواب بھی مل جاتے ہیں۔ تاہم جو باتیں آپ کے حوالے سے جواب طلب ہوتی ہیں ان کا جواب نہیں مل پاتا۔ جس کی شدید کمی محسوس ہوتی ہے کیا ہی اچھا ہو کہ ادارے سے آپ کو کوئی جواب طلب بات ہو اس کی وضاحت مل جائے۔ بے شک مختصر ہی کیوں نہ ہو۔ امید ہے آپ اس موضوع پر ضرور روشنی ڈالیں گے شکریہ۔

ملک ظفر شاہین جھمٹ، نیو سنٹرل جیل ملتان سے۔ محترم جناب عمران صاحب السلام علیکم! ماہ جولائی کا شمارہ 23 کو ملا۔ چیتے کو دیکھ کر خوف آیا لیکن مسکراتی دوشیزہ نے گلے میں لاکٹ، بالیاں اور بن بجریا کھلی زلفیں پیاسی آنکھوں کے ساتھ استقبال کیا۔ خوشی سے ورق پلٹے دستک سے مستفید ہوا۔ سورہ مریم پڑھ کر آفاقی سبق سے لطف اندوز ہوا۔ ماہ مئی کے شمارہ کی دوشیزہ خوب صورت تھی بہت پیاری لگی۔ عمران بھائی کی باتیں سچ بھلی لگیں۔ شہناز بی بی کا تبصرہ معیاری تھا۔ عبدالرؤف عدم نے یاد نہیں کیا۔ ارسلان علی نے لاہور سے تنقیدی تبصرہ خوب لکھا۔ ثانیہ شعیب کی جوڑی مولا ہمیشہ سلامت رکھے۔ ابن مقبول سائیں جی بھلا دیے ہیں آپ کا مشکور ہوں۔ بزرگ ایسے ہی تو کرتے ہیں نا۔ انکل صابر جی آپ نے بھی اپنے شاہین کو بھلا دیا تھینک یو۔ سید عبداللہ شاہد، ریاض بٹ، محمد فہد، ارشاد قریشی نے بزرگوں کی روایت برقرار رکھی۔ ہاشم بخاری جی تمہارا جنون بہترین کاوش ہے۔ حسنین جاوید تم بھی خوب آئے ویری گڈ۔ اداس دل کے ساتھ اگلے صفحہ پر گئے اقراء سے مستفید ہوا۔ ارشد علی شہاب کا تعارف پڑھا خوب لگا۔ اب کی بار میں بھی چند دوستوں کی سفارش پر اپنا تعارف بمعہ تازہ تصویر عمران بھائی کو بھجوا رہا ہوں۔ دیکھیں کس سن میں عزت بخشتے ہیں۔ لیٹ آوری ماسٹر کے دوسرے امتحان میں شمولیت کی غرض سے مصروف رہا۔ میں نے ایک خط جس میں شمشی باجی کے لیے ایک چھوٹی سی پیاری کہانی تراش کر بھجوائی تھی اور ساتھ ہی تبصرہ بھی تھا۔ شاید عمران بھائی کو مناسب نہیں لگا یا پھر ڈاک کبوتر نے نہیں پہنچائی۔ ہوسکے تو عمران بھائی مجھے بتلادیں خط ملا تھا کہ نہیں؟ اگر نہیں ملا تو میں دوبارہ وہ کہانی لکھ کر روانہ ڈاک کردوں گا۔ آپ شمشی ارشاد بی بی کو بھجوادینا ہوسکتا ہے وقت نکال لیں۔ جنہوں نے اب کی بار بھائی کو یاد کیا سلام بھی نہیں بھیجا...... اچھا خیر ناز سلوش ذشے نے بھی وش نہیں کیا لیکن اصغر علی ناصر جی نے پیار یاد شکریہ بھیا۔ قدیر رانا جی کو پیار، سید تنویر عباس کاظمی کو پیار، آکاش بھائی نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ شاہین کو کبھی وش نہیں کرنا......؟ انجم فاروق کی زہر آلود نصیحت آمیز کہانی ہے۔ بزم سخن میں شگفتین صابر لنگاہ، حسنین نوید بلوچ نے سرگودھا جیل سے خوب قطعہ لکھا مبارک ہو بھئی۔ خوش بو سخن میں صدیقی صاحب کا انتخاب پیارا لگا۔ سلمیٰ غزل نے غزل اعزاز لکھی۔ سفیان ملک نے غزل پیاری لکھی۔ فہد کی غزل اچھی رہی۔ قومی زبان پر کلام انکل جی نے خوب لکھا۔ قمر جہاں بھی اچھی رہیں۔ یادرفتہ حسام بٹ نے خوب لکھی ہے۔ مستقبل شناس ابھی ابھی پڑھی ہے۔ کیا خوب قلم کاری ہے۔ باقی زیر مطالعہ ہے۔ جام شیریں نے پیاس بجھادی ہے۔ دعاؤں کے ساتھ اجازت والسلام۔ بائے بائے...... ٹاٹا......!!!

سنٹرل جیل بہاولپور سے محمد صابر جاوید بھٹہ لکھتے ہیں کہ جناب عمران صاحب! جناب سلام مسنون اس ذات لاشریک سے دعا ہے کہ سلمان بن بھائی جان ہے دنیا کے کسی بھی کونے میں سکونت پذیر ہوں شاد و آباد ہوں۔ ماہ جولائی کا شمارہ جس کا انتہائی بے صبری سے انتظار تھا۔ وقت معینہ سے کافی لیٹ (21 جون کو) ملا لیکن پھر بھی ہمارے لئے خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ہم تک اس کو پہنچا تو دیا۔ گویا بے وقت ہی سہی اگر نہ بھی پہنچا ہے تو ہم کیا کرلیتے ہم بھی باقی عوام کی طرح صرف رو دھو ہی لیتے۔ دوستوں کے بہت ناموں میں سب سے پہلے تو کرسی صدارت سنبھالی شہر قائد سے میری نہایت ہی قابل ساتھی محترمہ شہناز بانو مبارک باد قبول فرمائیں جناب..... جناب فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب سلام مسنون سب سے پہلے تو اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ آپ کو صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے بعد از جناب یادگزاری کے لیے شکریہ۔ ہوسکے آپ اور میں ہم نام ہیں امید ہے اسی طرح آپس میں سلسلہ بنائے رکھیں گے۔ جناب ارشاد قریشی صاحب خاکسار کی جانب سے گلدستہ عقیدت قبول ہو۔ حوصلہ افزائی کے لیے فقیر آپ کا ممنون ہے جناب کچھ گوش گزار کرنا چاہتا ہوں امید ہے بُرا نہیں مانیں گے۔ جناب بات یہ ہے کہ ادب کی محفل میں سب برابر ہوتے ہیں اگر کسی کو مقام ملتا بھی ہے تو حروف کے تانے بانے کے باعث ورنہ کسی کی شکل اتنی اچھی یا بُری نہیں ہوتی کہ اس کو کوئی اعزاز دیا جائے۔ امید ہے آگے اس طرح کے حروف کا استعمال کرکے ادب کی دنیا کو بدنام کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ ادارے کی جانب سے ایسے دوستوں کو کارڈز انٹرویو ہونے چاہئیں۔ محمد سفیان ملک روجھ، جناب فقیر کی جانب سے گلدستہ سلامی قبول فرمائے۔ جناب حوصلہ افزائی کے لیے ناچیز آپ کا مشکور ہے اور ملکی سلامتی کے حوالے سے آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہے۔ محمد فہد صاحب ناچیز کی جانب سے چھوٹے بھائی کے لیے بے انتہا پیار اور ڈھیر ساری دعائیں حوصلہ افزائی کے لیے جناب کی شکرگزاری اور لگتا ہے جناب ملکی سلامتی کے حوالے سے کافی پریشان رہتے ہیں دعا ہے اللہ رب العزت آپ کی دلی مرادیں پوری کرے۔ جناب سید آکاش بخاری صاحب فقیر کی جانب سے محبتوں بھرا سلام۔ امید ہے جناب کے مزاج گرامی بھلے چنگے ہوں گے اور رب کریم سے دعا ہے کہ صدا مسکراتے رہو۔ جناب کی کمی کو دلی طور پر محسوس کیا امید ہے اگلی بار حاضری دے کر عوامی پریشانیاں دور فرمائیں گے۔ جناب حسنین بلوچ صاحب خاکسار کا محبتوں بھرا سلام سب سے پہلے تو اس ذات وحدہٗ لاشریک سے دعا ہے کہ جلد آپ کی اسیری کے دنوں کا خاتمہ ممکن بنائے ویسے جناب آپ میرے سسرالی شہر کے ہمسایہ شہر سے ہو امید ہے رشتہ بنائے رکھیں گے۔ جناب اصغر علی ناصر صاحب سلام مسنون ناچیز آپ کی بات (رشوت کے حوالے سے جرات کی......) سے متفق ہے اور حوصلہ افزائی کے لیے انتہائی مشکور ہے امید ہے آگے رابطہ بنائے رکھیں گے۔ محترمہ ناز سلوش ذشے صاحبہ سلام مسنون جناب کی کمی کو دلی طور پر محسوس کیا ہے اور کرم محفل دوستاں کے لیے بھی وقت نکال لیے۔ جناب کی کہانی "انکل" کافی پر مزاح رہی۔ اس کے علاوہ باقی تمام حاضر و غیر حاضر تمام ساتھیوں کو فقیر کی جانب سے گلدستہ سلام قبول ہو۔

Pdf by Roadsign

احوال قارئین

اسعد علی

اسرار احمد

تمام قارئین کی خدمت میں محبت بھرا سلام قبول ہو۔ مجھ سے کہا گیا اپنے بارے میں بتانے کے لیے' میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا لکھوں۔ کیوں کہ آج تک کبھی کسی کو اپنے بارے میں اپنی زبان سے کچھ بتانے کی نوبت ہی نہیں آئی' میرے دوست و احباب میری ذات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پھر بھی کوشش کرتا ہوں۔

میں پانچ ستمبر کو دنیا میں آیا۔ مجھ سے بڑے صرف ایک بھائی ہی ہیں۔ بہن کوئی نہیں ہے' یعنی ہم صرف دو ہی بھائی ہیں۔ میں سی اے کی تعلیم حاصل کررہا ہوں۔ جون میں میرے ماڈل ای کے ایگزام ہونے والے ہیں آپ سب دعا کریں کہ میں کامیاب ہوجاؤں۔ اس کے بعد ماڈل ایف کا ایگزام باقی رہ جائے گا' آج کل آرٹیکلز شپ کررہا ہوں۔

لکھنے کا شوق اپنی والدہ محترمہ کو دیکھ کر ہوا' میری والدہ بھی ایک مصنفہ ہیں۔ بچپن ہی سے انہیں لکھنے اور پڑھنے میں مشغول پایا۔ میں باتیں بہت کرتا ہوں' شرارتی مزاج ہے۔ بقول امی کے' کہ اگر میں گھر پر موجود نہ ہوں تو بہت سناٹا ہوتا ہے۔

امی ہی کے کہنے اور فورس کرنے پر لکھا' حالاں کہ میری اسٹڈیز اور مصروفیات ایسی ہیں کہ مجھے کسی اور ایکٹویز کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ مگر پھر بھی دن بھر کی تھکن کے بعد جب بستر پر لیٹتا ہوں تو کتاب ہاتھوں میں ہوتی ہے۔

میری تربیت میں زیادہ ہاتھ امی کا ہے' گھر کا ماحول بھی دینی ہے' امی نے بچپن میں عام کہانیاں سنانے کے بجائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور صحابہ کرام کی باتیں بتائیں۔ قرآن میں قوموں پر عذاب کے واقعات کہانی کی صورت سنایا کرتی تھیں۔ نماز اس وقت سکھائی جب مجھے شعور بھی نہیں تھا۔ کوشش کرتا ہوں کہ مجھ سے ایسی کوئی غلطی سرزد نہ ہو جس پر اللہ کی گرفت آئے۔

اپنے والدین سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور تمنا ہے کہ ساری زندگی ان کی اتنی خدمت کروں کہ کچھ تو حق ادا ہو۔

اپنی پڑھائی سے جب بھی ٹائم ملتا ہے' وہ وقت دوستوں میں گزارنا پسند کرتا ہوں۔ باہر کھانا کھانے جاتا ہوں یا پھر ساحل سمندر پر۔ خوش لباس ہوں۔ صفائی پسند ہوں۔ جھوٹے اور منافق لوگوں سے نفرت ہے' کوشش کرتا ہوں کبھی کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤں' اگر کسی کو میری کسی بھی قسم کی ضرورت ہوتی ہے اس کے کام ضرور آتا ہوں۔

پہلے مجھے غصہ بہت جلدی آجاتا تھا' مگر شعور آنے کے بعد غصہ کم سے کم کرتا ہوں کہ اس کے نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ زندگی میں ایک بہن کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے' کیوں کہ اپنے سارے کام خود کرنے پڑتے ہیں۔ امی سے کروانا پسند نہیں کرتا۔

نئے افق کے قارئین بہت اچھے ہیں۔ ان سب کی محبتوں کا احسان مند ہوں۔ آپ سب جب تک میری کہانیاں پسند کرتے رہیں گے میں لکھتا رہوں گا۔ آگے کہہ نہیں سکتا کہ کب تک یہ سلسلہ جاری رکھ سکوں گا' کیوں کہ زندگی کا شیڈول بہت ٹائٹ ہے۔

شادی اپنی امی کی پسند سے کروں گا' امی کی رائے اور پسند مجھے اپنی ہر خوشی سے زیادہ عزیز ہے' حالاں کہ ان کی جانب سے مجھے اجازت ہے کہ میں اپنی پسند بیان کروں۔

مجھے چٹ پٹے کھانے بہت پسند ہیں' خوب کھاتا ہوں مگر اسمارٹ رہتا ہوں۔ نئے افق میں مجھے شہنی ارشاد کی اسٹوریز بہت پسند ہیں۔ ان سے دوستی بھی ہے' اس کے علاوہ عثمان کیانی صاحب کا بہت مشکور ہوں' وہ مجھے ای میل کرتے ہیں۔ ان کی شاعری بہت اچھی ہوتی ہے' جناب جاوید صدیقی صاحب اور عالیہ انعام الٰہی کا بھی مشکور ہوں۔ آپ لوگ میری تحریروں کو سراہتے ہیں۔

مجھے بارش بہت پسند ہے' بارش میں لانگ ڈرائیونگ بہت پسند ہے' مگر اس کے بعد امی کی ڈانٹ بھی سننی پڑتی ہے۔ فارغ وقت میں کبھی کبھی ٹی وی دیکھ لیتا ہوں۔ یا پھر نیٹ پر بیٹھ جاتا ہوں اور کبھی کبھی امی سے قرآن کا علم بھی سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

آئندہ زندگی کے بارے میں یہی پلان ہے کہ زندگی میں کچھ ایسے کام کر جاؤں جو اللہ کی مخلوق کی فلاح کے لیے ہوں۔ دوسروں کے ساتھ ہمیشہ مخلص رہتا ہوں اور اپنے لیے بھی یہی بات پسند کرتا ہوں کہ دوسرے بھی میرے ساتھ مخلص ہوں۔

آپ سب سے التجا ہے کہ مجھے اپنی دعاؤں میں ضرور شامل رکھیں خاص طور پر بہنیں..... کیوں کہ بہنوں کی دعاؤں میں خلوص ہوتا ہے' ہوسکتا ہے کہ کچھ دنوں آپ سب کو میری کوئی نئی تحریر پڑھنے کو نہ ملے کیوں کہ ایگزام کی تیاری میں مصروف ہوں۔ میری کامیابی کے لیے بھی ضرور دعا کیجیے گا۔

پتا نہیں آپ سب کو میرا تعارف کیسا لگے گا' میری جو سمجھ میں آیا میں نے لکھ دیا۔ آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ اپنے دن بھر کے شیڈول میں تھوڑا سا وقت اپنے رب کے لیے بھی ضرور نکالیں' اس سے باتیں کریں وہ بے حد مہربان اور بہت محبت کرنے والا ہے۔ آپ سب کا دوست۔

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

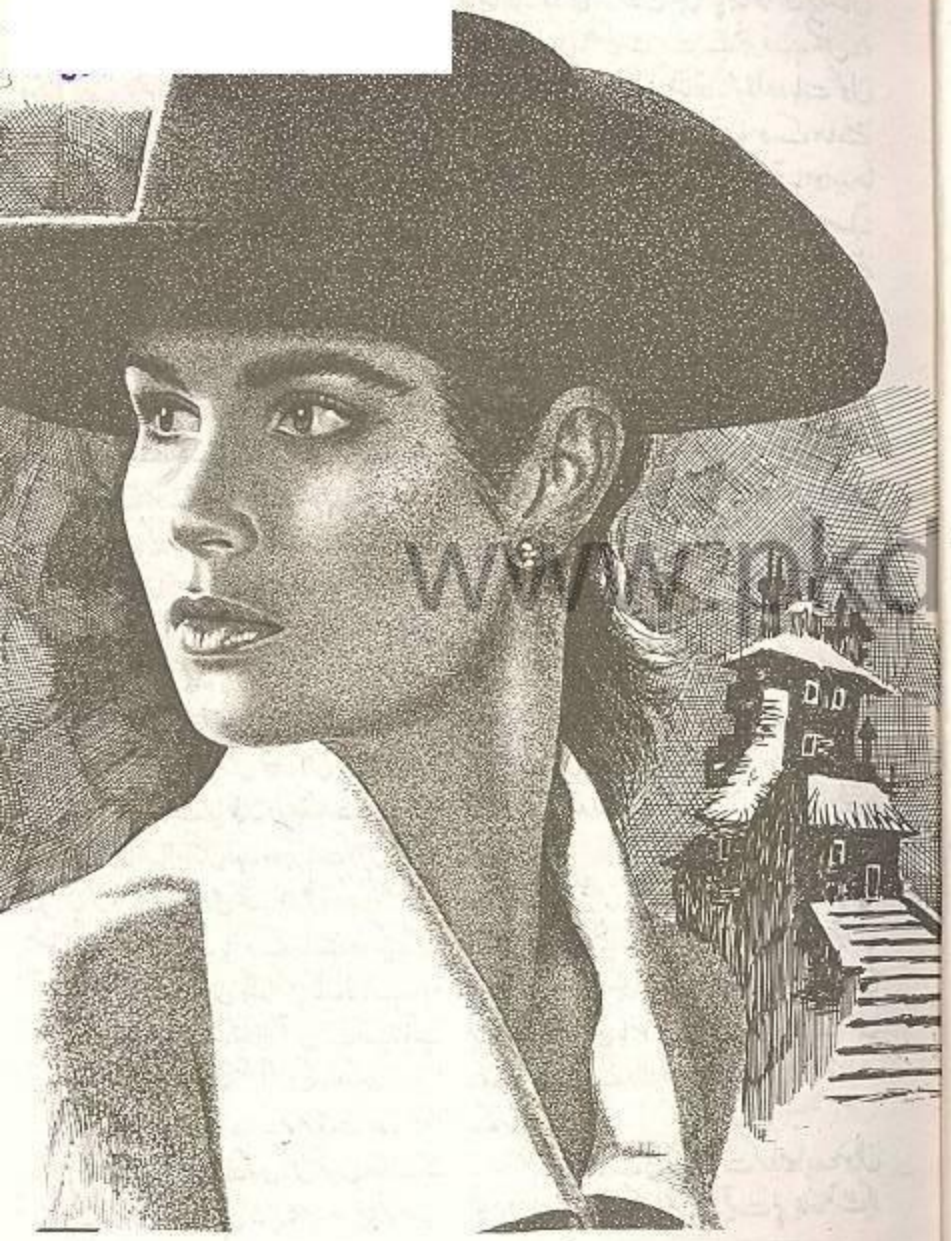

قسط نمبر 4

ابن عطاش

ادریس آزاد

تاریخ ایسا موضوع ہے جس سے ہر مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والا گہری دل چسپی رکھتا ہے کیوں کہ یہ جدلیاتی اصول ہے کہ مستقبل کی بنیادیں ہمیشہ ماضی کے کھنڈرات پر ہی رکھی جاتی ہیں۔ ہم ماضی سے سیکھ کر ہی آگے بڑھ سکتے ہیں' لیکن سیکھنے کا عمل اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہم ماضی کو خواہ وہ جیسا بھی ہو تلخ یا شیریں حقائق کے تناظر میں نہیں دیکھتے اور تسلیم کرتے۔ اسی لیے تاریخ نویسی کو انتہائی پیچیدہ مشکل اور متنازعہ فن بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ متنازعہ اس لیے کہ محقق بھی کسی نہ کسی سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا قلم جانبدار بن جاتا ہے۔ جب کہ مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ مکمل غیر جانبدار ہو۔ اس لحاظ سے مسلمان مورخین نے دنیا بھر سے ہٹ کر کام کیا ہے یعنی انہوں نے قلم چلاتے ہوئے کبھی کسی مسلم حکمراں کے غلط فیصلوں کی وکالت نہیں کی اگر منگولوں نے بغداد کو تاراج کیا تو مورخین نے منگولوں کو اگر جارح قرار دیا تو خود مسلمانوں اور اس دور کے مسلم حکمرانوں کے کردار کو بھی ہدف تنقید بنایا یعنی اپنے قلم اور فن کے ساتھ انصاف کیا۔ جب کہ یہ خوبی کسی مغربی یا غیر مسلم مورّخ میں نظر نہیں آتی۔

زیرِ نظر ناول تاریخ اسلام کے سب سے بڑے فتنہ حسن بن صباح کے گرد گھومتا ہے۔ جس نے اپنے فدائیوں کی مدد سے اسلام ہی کا نام لے کر مسلمانوں کو جس طرح آگ و خوں میں نہلایا اور بڑی بڑی نابغۂ روزگار ہستیوں کو موت کے گھاٹ اتارا اس کی مثال نہیں ملتی۔

آج بھی یہ فتنہ ماضی کے جھروکوں سے نکل کر ایک بار پھر ہمارے سامنے آکھڑا ہوا ہے۔

www.paksociety.com

تاریخ پسند قارئین کے لیے ادریس آزاد کا دلکش و منفرد تحفہ

کزخستان دراصل چینی ترکستان تھا۔ یعنی چین کی سرحد پر ایشیائے کوچک کے آخری ترکوں کا بسیرا۔ کراختائیوں کے ماتھے چینیوں کی طرح چوڑے ہموار اور خوبصورت ہوتے تھے لیکن ان کی ناک چپٹی نہیں ہوتی تھی۔ آریاؤں کی طرح نوک دار اور ستواں ناک ان کا تیر کی درشتھا۔ لائیتس کے بے پناہ حسن کی بھی یہی وجہ تھی۔ کزخستان کے تاجر اور سوداگر سلطنت سلجوق کے تمام شہروں میں آزاد گھومتے تھے۔ کیونکہ سلاطین سلجوق کراختائیوں کے مذہب اور ملک سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرتے تھے۔ سلطان محمد کے زمانے تک تو اہل کزخستان آزادانہ طور پر سلجوقی سلطنت میں آیا جایا کرتے تھے۔

لائیتس کے سامنے باسو کھڑا تھا۔ بدھ مت مذہب کا پیروکار ایک کراختائی سوداگر جو لائیتس کے باپ کا پرانا دوست بھی تھا۔ باسو نے لائیتس کو مسلمانوں والے حلیے میں دیکھا تو جیسے اس کے جسم سے جان نکل گئی۔ اس نوجوان کو انہوں نے چار سال پہلے لاما بننے کے لیے روانہ کیا تھا لیکن یہ تو لاما بننے کے بجائے مسلمان بن گیا؟ آخر یہ کیسے ہوگیا.....؟ باسو سخت پریشان تھا۔ اس نے تفصیلی نگاہوں سے لائیتس کی جانب دیکھا اور پھر لائیتس کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے بازار کے ایک کنارے کی طرف لے جانے لگا۔

یہاں ایک برآمدہ تھا اَدھیڑ عمر باسو لائیتس کو کھینچتے

Pdf by Roadsign

دیا لیکن یہ سلطان محمد کی بھول تھی پانچ سو تو کیا پانچ ہزار سپاہیوں کی مدد سے بھی باطنیوں کے ناقابلِ تسخیر قلعوں کو مسمار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جس قلعہ کو تباہ کرنے کے لیے سلطان نے پانچ سو سپاہیوں کی منظوری دی اس قلعے کے اندر ہمہ وقت تین ہزار سے پانچ ہزار تک جاں نثار باطنی مقیم رہتے تھے۔ دراصل یہ سب کچھ سعد الملک کے مشورے سے ہوا تھا۔ وہی پہلے اصفہان فوج بھیجنے کی مخالفت کرتا رہا اور پھر اس نے خود بادشاہ کو پانچ سو سپاہی بھیجنے کی سفارش کی۔ یہ فی الحقیقت اونٹ کے منہ میں زیرہ ڈالنے والی بات تھی' باطنیوں کے ناقابلِ تسخیر قلعوں کا ایک سلسلہ تھا' باطنی شہروں پر قابض ہو کر نہ رہتے تھے۔ وہ پہاڑیوں اور بلند مقامات پر موجود فوجی نوعیت کے قلعوں پر قبضہ کر لیتے اور اپنے مرد و زن سمیت وہیں رہتے۔ مقبوضہ قلعوں کا یہ سلسلہ اصفہان سے لے کر "قزوین" تک ایک لڑی کی صورت پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ ممکن نہیں تھا کہ بادشاہ کی صرف پانچ سو نفوس پر مشتمل فوج قلعہ دژکوہ کا کامیاب محاصرہ کرتی۔ ابوسلیم بغدادی اگرچہ اتنی تھوڑی تعداد میں فوج کی منظوری سن کر مطمئن نہ تھے لیکن انہوں نے امید کا دامن نہ چھوڑا اور یہ سوچ کر کہ اصفہان کے گورنر سیف الدولہ کے لیے یہ اجازت ہی کیا کم ہے کہ وہ قلعہ دژکوہ پر حملہ کر دے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ ابوسلیم دربارِ سلطنت میں وارد ہی محض اجازت نامہ لینے کی غرض سے ہوئے تھے۔ اصفہان میں حاکم شہر کے پاس اپنی اتنی فوج تھی کہ اگر اسے دارالسلطنت سے قلعہ دژکوہ پر حملے کی اجازت مل جاتی تو وہ ازخود یلغار کر کے قلعہ دژکوہ کے باطنیوں کو شکست دے سکتا تھا۔ یہی سوچ کر ابوسلیم چپ ہو رہے۔ تین روز بعد ان کی روانگی طے پائی لیکن کون جانتا تھا کہ ان تین روز میں کیا ہونے والا ہے۔

دراصل شیخ الجبل نے ابوسلیم بغدادی کی شدید مخالفت کا شہرہ سن کر دو ماہ قبل ہی ابوسلیم بغدادی کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن خوش قسمتی سے ٹھیک اس روز جس روز ایک خطرناک فدائی ابوسلیم کے قتل کا حلف اٹھائے ابن عطاش کے سامنے نمودار ہوا تھا..... ادھر ابوسلیم بغدادی اصفہان سے رے کی جانب چل دیئے تھے۔ شیخ الجبل کا حکم یہ تھا کہ ابوسلیم کو مجمع عام میں قتل کیا جائے تاکہ باطنیوں کی شدید مخالفت کرنے والوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں۔ ابوسلیم باطنیوں کے شدید ترین مخالف تھے۔ وہ حسن بن صباح کے ہم عصر تھے اور باطنیوں کے بارے میں بعض ایسی باتیں بھی جانتے تھے جو فی الحقیقت باطنیوں کی کمزوریاں کہی جا سکتی تھیں۔ ابوسلیم کی خبریں اصفہان سے آئے روز قلعہ الموت پہنچتی رہیں۔ یہاں تک کہ شیخ الجبل کو ابوسلیم کے قتل کا حکم صادر کرنا پڑا..... اور ایک قیمتی فدائی اس کام کے لیے مقرر کیا گیا کہ وہ مجمع عام میں ابوسلیم بغدادی کا سر کاٹ دے..... آج سے تین روز بعد ابوسلیم بغدادی اصفہان جانے والے تھے..... لیکن کل کیا ہونے والا تھا یہ کسی کو خبر تھی۔

اگلے روز جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ مدرسہ نظامیہ کے طلبہ نے ابوسلیم بغدادی کی اصفہان واپسی کی خبر سنی تو مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اس جمعۃ المبارک کے موقع پر مدرسہ نظامیہ کی بڑی جامع مسجد میں درویش صفت ابوسلیم بغدادی کا آخری خطاب رکھا جائے۔ وہ اس خطاب کو آخری اس لیے کہہ رہے تھے کہ اس کے بعد ابوسلیم واپس اصفہان چلے جاتے لیکن خالقِ کائنات نے ابوسلیم کے اس خطاب کو حقیقی آخری خطاب میں بدل دیا۔

جامع مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ سب سے اگلی

صف میں لائیتس بڑے پُراشتیاق انداز میں بیٹھا تھا۔ اب اس کا نام لائیتس لاما کی بجائے "لائیتس احمد" ہو چکا تھا اور اپنے لیے یہ نام اس نے خود پسند کیا تھا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ احمد کا لاحقہ جوڑ دیا تھا۔ طلبہ کے چہروں پر اشتیاق دکھائی دے رہا تھا۔ سارا مدرسہ ابوسلیم کو بے حد پسند کرتا تھا۔ ایک تو ان کی مسکراتی ہوئی شخصیت اور دوسری سادگی۔ ان دو چیزوں نے مل کر انہیں بے پناہ ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ مدرسہ کے طلبہ نے بڑی محبت کے ساتھ ابوسلیم کو خطبۂ جمعہ کے لیے آمادہ کیا تھا۔ خطاب کا وقت ہوا تو ابوسلیم نمودار ہوئے' وہ طلبہ کی بھیڑ میں سے گزر کر منبر کے نزدیک آ گئے لیکن کسی کو پتا ہی نہ چلا۔ دراصل ان کا سادہ لباس اور درویش مزاجی انہیں عام انسانوں میں گھلا ملا ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی۔ سب طلبہ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ ابوسلیم منبر پر تشریف لائے اور 'مذہب باطنی' کے عقائد اور ان کی ریشہ دوانیوں پر روشنی ڈالنے لگے۔ ٹھیک اس وقت جب وہ حسن بن صباح کے واقعات سنا رہے تھے مجمع میں سے ایک لمبا تڑنگا نوجوان' جو حلیے سے مدرسہ نظامیہ کا ہی طالب علم دکھائی دیتا تھا' کسی تیر کی طرح نکلا اور پلک جھپکنے کی دیر میں منبر تک جا پہنچا' ایک لمحے کے لیے تو کسی کی سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ لائیتس بری طرح بوکھلا گیا اور بے اختیار اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا لیکن اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتا خطرناک فدائی اپنا کام کر چکا تھا۔ فدائی کا نوکدار خنجر ابوسلیم کی گردن پر کسی تیز دھار چھری کی طرح چل چکا تھا۔ جمعہ کی نماز کے لیے آیا ہوا سارا مجمع یک لخت ہکا بکا رہ گیا۔ ہر شخص جہاں تھا ایک بار تو وہیں کسی پتھر کی طرح جم گیا۔ یہ صرف لائیتس تھا جو آسمانی بجلی کی طرح حملہ آور فدائی پر جھپٹا اور اسے زمین پر گرانے میں کامیاب ہو گیا لیکن فدائی بھی گویا چھلاوا تھا' وہ آنِ واحد میں دوبارہ اٹھا اور اگلی صف کے سامنے سے ایک طرف کو بھاگ نکلا۔ لائیتس کے پاس وقت صرف لمحوں میں تھا..... اسے ابوسلیم کی مدد کے لیے جانا چاہیے تھا یا قاتل فدائی کے تعاقب میں؟ اس نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا کہ ابوسلیم کو بچانے کے لیے تو سیکڑوں نوجوان موجود ہیں لیکن فدائی کے تعاقب میں کوئی نہیں' تو وہ فدائی کے تعاقب میں لپکا۔ فدائی کی رفتار سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے جیسی تھی۔ لائیتس کو اپنی آخری حد تک زور لگانا پڑا۔ لائیتس کسی چیتے کی طرح لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا دوڑتے ہوئے فدائی کے عقب میں جا پہنچا۔ فدائی اس وقت تک مسجد کے صحن کی چھوٹی سی دیوار عبور کرنے کے لیے چھلانگ لگا گیا۔ وہ دیوار کے اوپر سے کسی پرندے کی طرح اڑتا ہوا دوسری طرف جا گرا لیکن لائیتس تو پہلے ہی کسی چیتے سے زیادہ چست نوجوان تھا۔ لائیتس نے اس سے بھی لمبی چھلانگ لگائی' اور دیوار کے اوپر سے اڑتا ہوا ٹھیک فدائی سے ایک لمحہ بعد اسی جگہ جہاں تھوڑی دیر پہلے فدائی گرا تھا' آ رکا..... اب لائیتس فدائی سے صرف دو چار قدم ہی پیچھے تھا۔ فدائی کو اپنی جان بچانے کے لالے تھے۔ وہ اپنا تمام تر تجربہ صرف کرتے ہوئے فرار ہو رہا تھا لیکن لائیتس کو ابوسلیم کے قاتل کو پکڑنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھی اپنی زندگی کی سب سے زیادہ تیز دوڑ اس وقت لگا رہا تھا۔ مسجد بہت پیچھے رہ گئی اور وہ دونوں دوڑتے ہوئے کافی دُور تک نکل آئے۔ فدائی جان بوجھ کر ایسے راستوں پر دوڑ رہا تھا' جہاں آنے جانے والوں کی تعداد کم تھی۔ یہ وہی فدائی تھا جو تقریباً ایک ماہ قبل ابنِ عطاش کے پاس آیا تھا اور اس نے ابنِ عطاش کو دعوت خانے سے متعلق شیخ الجبل

www.pkdigest.com

Pdf by Roadingz

کا پیغام دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا تھا کہ اسے ابوسلیم بغدادی کے قتل پر مامور کیا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اسے ابوسلیم بغدادی کو مجمع عام میں قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے فدائی بھاگتا بھاگتا ایک ایسی گلی میں آ پہنچا جو بالکل سنسان پڑی تھی۔ اس گلی میں پہنچتے ہی وہ تھوڑا سا دوڑنے کے بعد یک لخت رک گیا لیکن لائیتس کو اس کے اس طرح یک لخت رکنے کی ذرا بھی توقع نہ تھی۔ چنانچہ لائیتس فوری طور پر خود کو نہ روک سکا اور کسی طوفان کی طرح فدائی کے پاس سے نکلتا چلا گیا۔ بہت ممکن تھا کہ فدائی کا خنجر اس کا پیٹ چاک کر دیتا لیکن لائیتس نے عین وقت پر اپنا رخ کسی قدر موڑ لیا تھا۔ وہ فدائی کے پہلے حملے سے تو بچ گیا لیکن فدائی کا لمبا اور نوکدار خنجر اب لائیتس کے سامنے کسی شیش ناگ کی طرح چمک رہا تھا۔ دونوں بری طرح ہانپ رہے تھے۔ اس قدر تیز دوڑنے کی وجہ سے دونوں کے دل بھی بے پناہ رفتار کے ساتھ دھڑک رہے تھے۔ لائیتس قطعی طور پر خالی ہاتھ تھا جبکہ فدائی کے ہاتھ میں وہی سرخ دستے والا خنجر چمک رہا تھا جس سے اس نے ابوسلیم بغدادی کی جان لی تھی۔ اب وہ لائیتس کے سامنے کھڑا کسی جانور کی طرح ہانپ رہا تھا اور تقریباً یہ حالت لائیتس کی بھی تھی۔ چنانچہ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کا وزن تولتے رہے اور ہانپتے رہے۔ یہ توقف بھی محض دو چار ثانیے پر ہی موقوف تھا' کیونکہ جونہی لائیتس کی نگاہ ابوسلیم بغدادی کے اس پاکیزہ خون پر پڑی جو ابھی تک فدائی کے خنجر کی نوک سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا تو لائیتس کے ذہن میں غصے کی آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔

لائیتس اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا یوں فدائی پر حملہ آور ہوا کہ اس کی دونوں ٹانگیں فدائی کے سینے پر پڑنے والی تھیں اور وہ خود فدائی کے خنجر سے محفوظ تھا۔ یہ کراختائیوں کے اچھل کر حملہ کرنے کا ایک خاص انداز تھا۔ لائیتس کو یوں اچھلتا دیکھ کر فدائی حیرت کا شکار ہوا ہی تھا کہ لائیتس کی دونوں لاتیں فدائی کے سینے پر پڑیں۔ فدائی کو اتنے زور کا دھچکا لگا کہ وہ کسی ستون کی طرح دھڑام سے زمین پر آ گرا۔ فدائی نے فوراً اٹھنے کی کوشش کی لیکن اب لائیتس اسے دوبارہ یہ موقع دینے والا نہیں تھا۔ لائیتس نے اپنی جگہ پر کسی بندر کی طرح قلابازی کھائی اور اڑتا ہوا' گرتے ہوئے فدائی پر آ رہا' یہ ایک خطرناک حرکت تھی۔ کیونکہ فدائی کے ہاتھ میں تیز دھار خنجر تھا لیکن لائیتس فدائی کے ہاتھ میں مضبوطی سے تھمے خنجر کو بھولا نہیں تھا۔ وہ اسی طرح فدائی پر گرا کہ نیچے آتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ فدائی کی خنجر والی کلائی پر پڑا اور دوسرا کہنی سے مڑا فدائی کے چہرے پر۔ یہ اتنی زوردار ضرب تھی کہ فدائی کی ناک ٹوٹ گئی اور اس کا چہرہ لہو سے بھر گیا۔ اب لائیتس کا بایاں ہاتھ فدائی کی کلائی پر تھا۔ لائیتس نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور خنجر فدائی کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور زمین پر گرتا چلا گیا۔

اب دونوں نہتے تھے۔ لائیتس نے سمجھا کہ اس نے فدائی پر قابو پالیا ہے لیکن ٹھیک اسی وقت اسے اپنی پشت پر فدائی کے گھٹنے کی اتنی زوردار ضرب لگی کہ وہ اچھل کر دور جا گرا۔ اب فدائی کے لیے لڑنا غیر ضروری تھا۔ اس کا خنجر دور پڑا تھا چنانچہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ...... اور ایک بار پھر لمبی گلی میں دوڑ لگا دی۔ لائیتس کو بھی یہی توقع تھی چنانچہ وہ پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ اپنی جگہ پر اچھلا اور دوڑتے ہوئے فدائی کو پلک جھپکنے کی دیر میں پیچھے سے جالیا۔ اگلے لمحے لائیتس کا ہاتھ فدائی کے گریبان کی پشت پر تھا۔

www.pkdigest.com

دوڑتا ہوا فدائی ایک جھٹکے سے نہ صرف رکا بلکہ زمین پر آ گرا۔ اب لائیتس اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ لائیتس نے اس کو لاتوں پر رکھ لیا لیکن فدائی بھی آسانی سے مات کھانے والا نہیں تھا۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ الٹی قلابازی کھائی تو اس کی دونوں ٹانگیں زور سے لائیتس کے کولہوں پر آ لگیں' قریب تھا کہ لائیتس بھی گر پڑتا لیکن اس نے بڑی ہمت کر کے خود کو سنبھالا اور ڈگمگا کر سیدھا ہو گیا۔ اب ایک مرتبہ پھر دونوں آمنے سامنے تھے۔ فدائی کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس کی ناک بری طرح پھٹ چکی تھی اور وہ کسی خونخوار درندے کی طرح غرا رہا تھا لیکن لائیتس اسے کوئی موقع نہ دینا چاہتا تھا۔ لائیتس نے سیدھا ہوتے ہی اس پر تابڑ توڑ مکے برسانے شروع کر دیے۔ فدائی لائیتس کے ہر مکے سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس میں اسے کامیابی بھی ہو رہی تھی کہ اچانک لائیتس کا ایک زوردار مکا اس کے منہ پر پڑا اور اسے یوں لگا جیسے کسی نے ہتھوڑے کی مدد سے اس کا جبڑا توڑ دیا ہو۔ وہ چاروں خانے چت زمین پر آ گرا غالباً اس کی آنکھوں کے سامنے ستارے ناچ رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فوری طور پر اٹھ نہ سکا۔ لائیتس کے لیے اتنا موقع کافی تھا چنانچہ لائیتس نے پوری مہارت کے ساتھ اپنے پیر کی ایک ٹھوکر فدائی کی کھوپڑی پر اتنی زور سے ماری کہ فدائی کے ہوش جاتے رہے۔ فدائی بے ہوش ہو چکا تھا۔

✿✿✿

ابوسلیم بغدادی کی شہادت عالم اسلام کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ تھی۔ مدرسہ نظامیہ میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ سلطان خود بہ نفس نفیس مدرسہ نظامیہ میں ابوسلیم بغدادی کی میت اور جائے حادثہ دیکھنے کی غرض سے وارد ہوا تھا۔ سلطان کے ہمراہ اس کا وزیر سعد الملک بھی تھا۔ مدرسہ میں طلبہ سے باتیں کرتے ہوئے سلطان نے خواہش ظاہر کی کہ اسے لائیتس احمد سے ملوایا جائے جس نے خطرناک فدائی کو جان پر کھیل کر اسیر کیا تھا۔

باطنی فدائی زندہ گرفتار نہیں ہوا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ گرفتار ہونے سے پہلے خودکشی کر لیا کرتے تھے لیکن بدقسمتی سے یہ فدائی گرفتار ہونے سے پہلے لائیتس کی زوردار ضرب کھا کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے زندہ سلامت گرفتار کر لیا گیا تھا' سلطان کے محافظ دستے نے بے ہوش فدائی کو فوری طور پر ہر ایسی چیز سے محروم کر دیا جس کی مدد سے وہ ہوش میں آنے کے بعد خودکشی کی کوشش میں کامیاب ہوتا' اور اس وقت فدائی' شاہی قید خانے میں داروغہ شاہی کی خاص نگرانی میں موجود تھا۔

سلطان کی خواہش پر لائیتس دو قدم آگے بڑھا اور سلطان کے سامنے پہنچ کر خلاف معمول السلام علیکم کہا۔ سلاطین سلجوق کے دربار میں بادشاہ کے سامنے تعظیم دینے کا رواج تھا۔ لائیتس نے عربوں کے سے انداز میں السلام علیکم کہا تو سلجوقی سلطان محمد مسکراہٹ کے ساتھ چونکا۔ یہ ایک نئی بات تھی۔ اس نے بھی اسلامی انداز میں وعلیکم السلام کہا اور لائیتس سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا' لائیتس کو مسلمان بادشاہ کا یہ انداز اتنا اچھا لگا کہ وہ سلطان پر فریفتہ ہو گیا۔ سلطان نے مسکراتے ہوئے لائیتس سے بات کی۔

”ماشاءاللہ......! تمہاری جرأت اور بہادری قابلِ داد ہے۔ ہمارے عہد میں یہ پہلا باطنی فدائی ہے جو زندہ گرفتار کیا جا سکا ہے۔ ہم گزشتہ سات سال سے اگر کسی دشمن کی طرف سے پریشان ہیں تو وہ باطنی ہیں...... ابوسلیم بغدادی عالم اسلام کی متاع تھے' ان کی

Pdf by Roadsign

موت پورے عالم کی موت ہے لیکن تمہارے اقدام سے شاید ہم اس فدائی سے کچھ اگلوانے میں کامیاب ہوجائیں۔ فی الحقیقت ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے دربار میں کالی بھیڑیں کون کون سی ہیں۔ اگر ہمیں فدائی سے یہ راز معلوم ہوگئے تو ہم سمجھیں گے تم نے پوری سلطنت سلجوق پر احسان کیا ہے...... کیا تم اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتے ہو......؟ ہم تمہارا وظیفہ مقرر کرنا چاہتے ہیں۔“

لائیتس نے سلطان کی بات سنی تو پہلے بڑے مہذب انداز میں سلطان کا شکریہ ادا کیا اور پھر کہا۔

”سلطان معظم! اس کی ضرورت نہیں۔ میں ابوسلیم بغدادی مرحوم کا منہ بولا بیٹا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں ان کے کمرے میں ان کے ساتھ مقیم تھا۔ میں مدرسہ کا باقاعدہ طالب علم نہیں ہوں۔ مجھے ابھی ایک دو ذاتی کام نمٹانے ہیں اس کے بعد میں جامعہ نظامیہ بغداد میں جاکر باقاعدہ طور پر تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

سلطان کے چہرے پر بڑے خوشگوار تاثرات تھے۔ وہ بڑی میٹھی آنکھوں کے ساتھ لائیتس کی جانب دیکھ رہا تھا لیکن اس کے پہلو میں کھڑا سعد الملک نہ جانے کیوں لائیتس کو سلگتی ہوئی نظروں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ لائیتس نے سعد الملک کی آنکھوں سے نکلنے والی تپش کی لہریں اپنے چہرے پر محسوس کیں اور دل ہی دل میں بری طرح چونک گیا۔ کیونکہ حاکم شہر اصفہان سیف الدولہ کی باتوں سے لے کر ابوسلیم بغدادی کی بتائی ہوئی تمام باتوں تک لائیتس نے یہی سن رکھا تھا کہ سعد الملک اصفہان کی جانب فوج بھیجنے کے حق میں نہیں۔ آج جب اس نے سعد الملک کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت کے شعلے دیکھے تو اس کے دل میں شک کا بیج پکنے لگا۔

اسے سلطان کی ابھی کہی ہوئی بات یاد آئی کہ وہ دربار میں موجود کالی بھیڑوں سے آگاہ ہونا چاہتا ہے۔ نہ جانے کیسے لائیتس کے دل میں ایک عجیب لہر آئی اور اس نے سلطان کی خدمت میں عرض کیا۔

”سلطان معظم! ابوسلیم بغدادی مرحوم کی یہی آرزو تھی کہ سلطنت سلجوق باطنیوں کے وجود سے پاک ہو جائے۔ وہ عمر بھر اسی مساعی میں مصروف رہے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ سلطان معظم کے پہلو میں بھی باطنیوں کے آلۂ کار ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ مجھے تو کچھ اندازہ نہیں کہ وہ ایسا کس لیے کہا کرتے تھے لیکن میں نے چاہا کہ میں ان کی شہادت کے بعد ان کا یہ قول آپ تک پہنچادوں۔ چنانچہ میں نے یہ جسارت کی۔“

لیکن بادشاہ اس کی بات سن کر زیادہ نہ چونکا۔ وہ خود جانتا تھا کہ اس کے آس پاس باطنیوں کے کارندے اور جاسوس موجود ہیں۔ البتہ سعد الملک کی آنکھیں لائیتس کی بات سن کر یک لخت پھیلی پڑنے لگیں۔ لائیتس نے دراصل یہ بات کی ہی اسی لیے تھی تاکہ وہ سعد الملک پر پیدا ہونے والا اپنا شک دور کرسکے۔

سعد الملک باطنی تھا۔ حالانکہ وہ سلطنت سلجوق کا وزیر اعظم تھا لیکن بادشاہ سمیت سلطنت کا ہر شہری یہی سمجھتا تھا کہ سعد الملک ایک سچا مسلمان اور محب وطن وزیر ہے۔ سعد الملک باطنی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ابوسلیم بغدادی کے کہنے پر اصفہان کے لیے فوج بھیجنے کی مخالفت کرتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اصفہان میں موجود باطنیوں کے منصوبہ پر کوئی آنچ آئے یا ابن عطاش کے کام میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو۔ دراصل اس کے دل میں ایک یہ خیال بھی تو تھا کہ اصفہان پر قبضہ مکمل ہوتے ہی شیخ الجبل اسے اصفہان کا گورنر

بنادے گا اور اس طرح گویا پہلی باطنی سلطنت کا وہ حکمران بن جائے گا۔ ایک لحاظ سے باطنی سلطنت تو بارھویں صدی میں...... مصر میں بھی قائم تھی کیونکہ عقائد کے لحاظ سے مصر کا فاطمی خلیفہ بھی باطنی ہی تھا۔ لیکن مصر کے فاطمی یا قرامطی حسن بن صباح کی طرح اتنی گہری زیرزمین سرگرمیوں میں ملوث نہیں تھے۔ بے شک قرامطی یا فاطمی جن کا مرکز مصر میں تھا، کردار کے لحاظ سے سازشی، دغاباز، جھوٹے اور منافق تھے لیکن حسن بن صباح کی جماعت چند قدم اور آگے بڑھ گئی اور یہ لوگ دوسرے مسلمانوں کے خفیہ قاتل بن گئے۔ عالم اسلام پر دسویں، گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں صدی جہاں اسلامی علوم کی معراج پر تھی وہاں عالم اسلام کے لیے ان ایام میں سب سے زیادہ پریشانی گھر کے دشمنوں یعنی باطنیوں کی طرف سے ہی تھی۔ یہ باطنی قرامطی، فاطمی، ہفت امامی اور حشیشین کے نام سے جانے جاتے تھے۔

سلطان لائیتس سے قول کر متاثر ہوا اور اس نے لائیتس کو پیش کش کی کہ وہ جب چاہے کسی بھی قسم کی استعانت کی غرض سے قصر سلطانی میں آسکتا ہے۔

غروب آفتاب سے کچھ دیر بعد ابوسلیم بغدادی کے جسم کو سپرد خاک کردیا گیا۔ اب لائیتس ذاتی طور پر شش و پنج کا شکار تھا کہ کیا کرے؟ ایک تو ابوسلیم کی شہادت سے اصفہان کی طرف فوج بھیجنے کا کام بھی کھٹائی میں پڑجانے کا اندیشہ تھا، اور دوسری طرف لائیتس اسلامی سلطنت کے وزیر سعد الملک سے بھی بری طرح بدظن ہوچکا تھا۔ حالانکہ قلعہ الموت کی طرف روانہ ہونے کے لیے اس کی تیاری مکمل تھی لیکن وہ موجودہ حالات کی وجہ سے گومگو کا شکار تھا کہ فوری طور پر اپنی مہم پر روانہ ہوجائے یا کچھ دیر اور رکے۔

آج کی رات وہ کمرے میں اکیلا تھا، اس کے محبوب استاد اور شیخ مکرم ابوسلیم بغدادی کا جسم آج منوں مٹی تلے میٹھی نیند سوچکا تھا۔ لائیتس کو آج تنہائی بڑی شدت سے کھل رہی تھی اور اس کو نیند اپنی آنکھوں سے کوسوں دور محسوس ہورہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹنے کے بجائے کمرے کے فرش پر ٹہل رہا تھا اور مسلسل موجودہ حالات کی سنگینی، اصفہان کی طرف جانے والی فوج اور سعد الملک کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ابوسلیم بغدادی کا ادھورا چھوڑا ہوا کام اب اس کے سر آپڑا ہے۔ ان تفکرات میں اسے یہ تو یکسر ہی بھول گیا کہ ایک روز پہلے اس کے ہم قبیلہ کراختائی سوداگر نے اسے دیکھا اور پہچان لیا تھا۔

رات بڑی آہستگی کے ساتھ بیتتی چلی جارہی تھی اور لائیتس گہری سوچوں میں گم کمرے کے فرش پر سر جھکائے ٹہل رہا تھا...... معاً اسے کمرے سے باہر کھٹکا سنائی دیا۔ یہ غالباً قدموں کی آواز تھی۔ اس وقت مدرسہ نظامیہ میں ہر کوئی سوچکا تھا۔ یہ شاید آدھی رات کا وقت تھا۔ قدموں کی آواز نزدیک آتے آتے لائیتس کے دروازے پر آکر رک گئی۔ آواز سے لگتا تھا کہ جیسے آنے والے افراد تعداد میں ایک سے زیادہ تھے۔ لائیتس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی اور اس کی چھٹی حس پوری طرح بیدار ہوگئی۔ اس نے برق رفتاری کے ساتھ کمرے میں رکھی اپنی شمشیر اٹھائی اور اسے بے نیام کرکے دائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ ٹھیک اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔

”ٹھک ٹھک ٹھک۔“

دستک کی آواز کے ساتھ ہی ایک جانی پہچان آواز ابھری۔

”لائیتس احمد! دروازہ کھولو میں داؤد ہوں، تمہارا ہم جماعت...... مجھے تم سے استاد ابوسلیم کے بارے میں کوئی ضروری بات کرنی ہے۔“

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign.

میں ایک مسہری پر لیٹا مدرسہ کے طبیبوں سے مرہم پٹی کروا رہا تھا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ گہرے زخم آئے تھے اور شفاخانے تک پہنچتے پہنچتے اس کا کافی خون بھی بہہ گیا تھا۔ چنانچہ طبیبوں کی دی ہوئی دواؤں کے اثر اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے لائیتس کے دماغ پر غنودگی چھانے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سو چکا تھا۔

اگلے روز باطنی قاتلوں کے لائیتس پر حملے کی خبر پورے شہر میں پھیل گئی۔ سلطان محمد بن ملک شاہ اگلے روز بھی خود بنفس نفیس چل کر مدرسہ نظامیہ میں آیا اور مدرسہ کے شفاخانے میں جا کر لائیتس سے ملاقات کی۔ اس نے مدرسہ کی انتظامیہ کو ہدایت کی کہ اس نوجوان کو قصر سلطانی کے شاہی شفاخانے میں پہنچا دیا جائے۔ کیونکہ لائیتس کی حالت دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خاصا ملول ہوا تھا۔ سلطان لائیتس کے بارے میں حکم دے کر واپس چلا گیا۔

اور پھر ٹھیک اسی وقت جب ایک شاہی گھوڑا گاڑی میں لائیتس کو قصر سلطانی کے شاہی شفاخانے کی طرف لے جایا جا رہا تھا..... مدرسہ کے صدر دروازے سے ایک خوبرو نوجوان مدرسہ میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ رئیسہ محل نادرہ بیگم کا قاصد تھا اور اس کے خاص اعتماد کا آدمی۔ کافی دن ہوئے رئیسہ محل نے لائیتس کی طرف سے کوئی خبر نہ سنی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ لائیتس اپنی مہم پر روانہ ہوا یا ابھی تک مدرسہ نظامیہ میں ہی موجود ہے۔ دراصل لائیتس نے خود رئیسہ محل سے رابطہ کرنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ رئیسہ محل باطنیوں کی نگرانی میں ہے لیکن رئیسہ محل جب کئی دن تک اس کے خیالات میں ڈوبی رہی تو بالآخر تڑپ اٹھی اور اس نے اپنے بااعتماد خادم کو لائیتس کا حال احوال معلوم کرنے کی غرض سے روانہ کر دیا۔ یہ قاصد اپنے ساتھ مزید اشرفیاں اور قیمتی چیزیں بھی لایا تھا۔ لائیتس کی سواری قصر سلطانی کی جانب نکل گئی جبکہ نوجوان مدرسہ میں داخل ہو کر کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنے لگا جو اسے لائیتس کی بابت بتاتا اسی اثناء میں اسے مدرسہ کا ایک طالب علم اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ نادرہ کا خادم بھی اس کی جانب بڑھا اور اس کے نزدیک پہنچ کر نادرہ کے خادم نے جب اس سے لائیتس کی بابت دریافت کیا تو طالب علم کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک دکھائی دی۔ طالب علم نے سر سے پاؤں تک نادرہ کے خادم کو شک بھری نگاہوں سے دیکھا لیکن زیادہ پوچھ گچھ کرنے کے بجائے بڑے عامیانہ سے انداز میں خادم سے کہا۔

"یہاں ایک دن میں دو عظیم انسانوں پر حملہ کر دیا گیا ہے۔ کل خطاب جمعہ کے وقت ابوسلیم بغدادی شہید کر دیے گئے اور آج رات وہی نوجوان جس کا تم پوچھتے پھر رہے ہو باطنی قاتلوں کے حملے سے بال بال بچ گیا' وہ بری طرح زخمی اور لہولہان ہے' تم نے ابھی جس سواری کو یہاں سے نکلتے دیکھا اس میں زخمی لائیتس کو ہی شاہی شفاخانے کی جانب لے جایا جا رہا تھا لیکن تم کون ہو؟"

"میں کرختستان سے آیا ہوں' لائیتس کے گھر سے لائیتس کے لیے رقم اور کچھ سامان لایا ہوں۔"

نادرہ کے خادم نے انتہائی پریشانی کے عالم میں وہی رٹا رٹایا جملہ بولا جو اسے نادرہ بیگم نے سکھایا تھا۔ خادم کی حالت غیر تھی۔ وہ جس قیمتی انسان سے ملنے آیا تھا اس کے زخمی ہونے کی خبر پاتے ہی وہ بری طرح گھبرا گیا۔ اس نے طالب علم کا ہاتھ تھاما اور کہا۔

"بھائی! خدا کے لیے مجھے تفصیل کے ساتھ بتاؤ کیا واقعات پیش آئے تاکہ میں لائیتس کے باپ کو مطمئن کر سکوں۔ میں ان کا خاندانی خادم ہوں۔"

اب طالب علم کا شک دور ہو چکا تھا' وہ نادرہ کے خادم کے ساتھ چل کر گھاس کے میدان میں جا بیٹھا اور نادرہ کے خادم کو لائیتس کے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعات کی تفصیل بتانے لگا۔

❀❀❀

وقتی طور پر لائیتس کے سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اب وہ شاہی شفاخانے میں داخل تھا' قصر سلطانی کے طبیب اس کا پوری توجہ کے ساتھ علاج کرنے لگے۔ سلطان محمد کو اس نوجوان کے ساتھ خصوصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی لیکن یہی بات سعد الملک کے لیے سخت ناپسندیدہ تھی۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ لائیتس کی آنکھوں میں اس کے لیے شک ہے اور وہ کسی قیمت پر نہیں چاہتا تھا کہ یہ نوجوان زندہ بچ جائے۔ ادھر ابوسلیم کی شہادت کے بعد اصفہان جانے والی فوج کو بھی روک لیا گیا تھا۔ البتہ حاکم اصفہان کی جانب سلطان نے یہ پیغام روانہ کر دیا تھا کہ اپنے طور پر قلعہ دژکوہ کے باطنیوں کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی جائے' حکومت کی طرف سے اجازت ہے۔ سلطان نے جس وقت یہ پیغام ایک مکتوب کی صورت قاصدوں کے حوالے کیا' سلطان کے پاس سعد الملک اور چند دیگر مصاحب بھی موجود تھے۔

سلطان محمد کے پیغامبر اسی روز اصفہان کے لیے روانہ ہوئے لیکن وہ زندہ اصفہان نہ پہنچ سکے۔ بلکہ سعد الملک کے خاص کارندوں نے انہیں راستے میں ہی ہلاک کر دیا اور خود ان کی جگہ لے لی۔ اب ان کے پاس ایک نیا فرمان تھا جس کے مطابق حاکم اصفہان کو قلعہ دژکوہ پر حملہ کرنے سے سختی کے ساتھ روک دیا گیا تھا اور فرمان میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر حاکم اصفہان نے قلعہ دژکوہ پر یلغار کی تو اسے اس کے عہدے سے معزول کر دیا جائے گا۔ چنانچہ یہ جعلی پیغامبر جعلی پیغام لیے حاکم اصفہان کی طرف چل دیے۔

لائیتس تیزی کے ساتھ روبہ صحت ہو رہا تھا لیکن سعد الملک بھی اس تاک میں تھا کہ کسی طرح لائیتس کو شفاخانے میں ہی ہلاک کر دیا جائے۔ اب لائیتس آسانی کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب اسے اس شفاخانے سے فارغ کر دیا جائے لیکن طبیبوں کے مشورے سے سلطان نے اسے کچھ دن اور وہیں قیام کا مشورہ دیا۔ وہ دن بھر اپنے بستر سے اٹھ کر شفاخانے کی عمارت اور اس سے متصل خوبصورت باغ میں ٹہلتا رہتا' ابھی تک اس کے جسم پر پٹیاں بندھی تھیں۔ طبیب اسے زیادہ چلنے پھرنے سے منع کرتے تھے لیکن وہ طبیبوں کی بات زیادہ نہیں مانتا تھا اور دن بھر طرح طرح کے خیالات دل میں لیے شفاخانے کے باغ میں ٹہلتا رہتا۔

ادھر اصفہان میں بہ یک وقت دو بری خبریں پہنچیں۔ ایک حاکم شہر کے پاس جسے جعلی پیغامبروں نے سلطان محمد کا جعلی فرمان سنا کر بے پناہ مایوس کر دیا جبکہ دوسری بری خبر نادرہ بیگم کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس کا خادم واپس آ چکا تھا اور اس نے اس حسینہ عالم کو اس کے محبوب پر گزرنے والی تمام داستان کہہ سنائی' خادم سے لائیتس کے زخمی ہونے کا سن کر نادرہ اپنی جگہ تڑپ اٹھی' وہ والہانہ انداز میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنے خادم سے تمام واقعے کی تفصیلات بتانے کو کہا' اس کے لیے جتنی بری خبر لائیتس کے زخمی ہونے کی تھی اس سے کہیں زیادہ بری خبر درویش صفت ابوسلیم بغدادی کی شہادت کی تھی۔ نادرہ تمام حالات سن کر پتھر کی طرح گم صم ہو گئی' اس نے خادم کو کمرے سے چلے جانے کے لیے کہا اور خود انتہائی بے چینی کے عالم میں کمرے کے فرش پر ٹہلنے لگی وہ جلد سے جلد کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ تقریباً ایک ساعت تک کمرے میں ٹہلتی رہی' اور پھر اچانک

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

کسی فیصلے پر پہنچ کر رک گئی۔ اس نے ٹہلنا بند کردیا' اس کے چہرے پر بے پناہ اضطراب' حسین آنکھوں میں آنسو اور سینے میں ایک نیا عزم تھا۔ اس نے فی الفور اپنے محبوب کے پاس پہنچنے کا فیصلہ کیا' بھلا یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ لائیتس زخموں سے چور شفاخانے میں پڑا ہوتا اور وہ اپنی اس شان دار حویلی میں آرام سے زندگی گزارتی۔ اگلے لمحے وہ رے کی جانب کوچ کا تہیہ کرچکی تھی۔

لائیتس کا معمول یہی رہا' وہ صبح نماز سے فارغ ہو کر شفاخانے کی عمارت سے نکلتا اور قصر سلطانی کے باغ میں سے ہوتا ہوا محل کی لمبی روش پر ٹہلنے لگتا' اسے کچھ خبر نہ تھی کہ سعد الملک اس کو محل میں ہی قتل کروادینے کے درپے ہے۔ آج اسے شفاخانے میں آئے ہوئے پندرہ دن ہوچکے تھے وہ بری طرح اکتا چکا تھا۔ اس کے چھوٹے زخموں سے پٹیاں اتار لی گئی تھیں لیکن گہرے زخموں کے ٹانکے نہیں کھولے گئے تھے۔ شفاخانے کے جراحوں نے اسے بتایا تھا کہ اس کے گہرے زخموں سے ٹانکے سات دن تک مزید نہیں کھولے جاسکتے۔

یہ صبح صبح کا وقت تھا' وہ محل کی لمبی روش پر ٹہلتا ہوا..... اتفاق سے محل کے صدر دروازے تک آپہنچا۔ محل کے دربانوں نے اسے دور سے دیکھا تو ان میں سے ایک دوڑ کر اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''ارے! آپ یہاں کیوں آگئے؟ یہ صدر دروازہ ہے کسی نے آتے جاتے آپ کو دیکھ لیا تو ہم سب کو ڈانٹ پڑے گی۔''

لائیتس اس کی بات سن کر مسکرادیا اور کہنے لگا۔

''نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں ہوگا' میں اب ٹھیک ہوں۔ شفاخانے کے بستر پر پڑے پڑے میں اکتا جاتا ہوں تو تھوڑا سا ٹہل لیتا ہوں۔ آج خلاف معمول اس طرف نکل آیا۔ تم کہتے ہو تو واپس چلا جاتا ہوں۔''

لائیتس نے دربان کی بات مان کر واپس مڑنا ہی چاہا تھا کہ دربان لجاجت سے بولا۔

''دیکھیے معزز مہمان! آپ میری بات کا برا نہ مانیے' آج دراصل صدر دروازے پر چہل پہل رہے گی۔ کیونکہ گزشتہ شام کو سلطان سے ملنے کے لیے کرختستان کا ایک وفد آیا ہے۔ اسی لیے میں نے قدرے بے صبری کے ساتھ آپ کو جانے کے لیے کہہ دیا۔''

لیکن لائیتس کے پاؤں تو رک چکے تھے' بلکہ اسے اپنے پیروں تلے سے دھرتی کی چادر سرکتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ کرختستان کا وفد؟ یہ خبر تو اس کے لیے کسی زوردار دھماکے سے کم نہ تھی۔ اس کے جسم سے تو گویا جان ہی نکل گئی۔ کرختستان کے وفد کا مطلب تھا' سلجوقی سلطنت کی سرحدات کے بڑے بڑے سرداروں اور لاماؤں کی آمد' اسے یقین ہوگیا کہ یہ سب لوگ اس کے باپ کی محنت کے نتیجے میں اکٹھے ہوئے ہوں گے۔ وہ اپنی اہمیت خوب جانتا تھا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے سرحدی سرداروں کا وفد تو کیا کرختستان سے پورا لشکر بھی آتا تو بعید نہیں تھا۔ وہ کراختائیوں کے نزدیک اپنی حیثیت خوب جانتا تھا' کراختائیوں کے وفد کا سلطان سلجوق کے پاس آنا' سوائے اس کے اور کیا مقصد ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے مقدس لاما یعنی لائیتس کی واپسی کا مطالبہ کرتے' وہ ابھی گم صم کھڑا تھا کہ دربان نے پھر کہا۔

''حضور! آپ ناراض مت ہوں۔ آج یہ وفد فارغ ہوجائے تو کل بے شک آپ اس روش پر آجایا کیجیے۔''

معاً لائیتس نے ایک خیال کے تحت کہا۔

''ناراضگی کی بات چھوڑو! یہ بتاؤ کہ کراختائیوں کا وفد کتنے افراد پر مشتمل ہے اور کیا تم اس وفد کی آمد کا مقصد جانتے ہو۔''

دربان ایک لمحے کے لیے حیران ہوا لیکن پھر ادب سے بولا۔

''ان کی آمد کا مقصد تو میں نہیں جانتا البتہ وہ کم از کم پچاس افراد تھے جو گزشتہ شب قصر سلطانی کے مہمان خانے میں ٹھہرے۔''

اسی اثناء میں دربان کو پیچھے سے کسی نے آواز دی اور وہ معذرت خواہانہ انداز میں واپس چل دیا۔ اب لائیتس ٹہلتا ہوا شفاخانے کی طرف واپس آرہا تھا لیکن اس کے دماغ میں چکیاں چل رہی تھیں وہ سوچ رہا تھا کہ آخر اس مسئلے کا حل کیا ہوگا؟ کیا اسے سلطان اس وفد کے ہمراہ واپس بھیج دے گا یا اسے ایک مسلمان سمجھتے ہوئے خود فیصلہ کرنے کا اختیار دے گا؟ یہ بات سچ مچ بہت اہم تھی کیونکہ سرحدی قبائل اور سرحدی سرداروں کی قدر و قیمت سے سلطان محمد خوب واقف تھا۔ لائیتس بری طرح پریشان ہوگیا۔ اچانک اسے ایک خیال آیا کہ یہ وفد اس کے لیے آیا ہی نہ ہو۔ ہوسکتا ہے یہ سرحدی قبائل اپنے بعض دوسرے مسائل کی وجہ سے سلطان سلجوق کے پاس حاضر ہوئے ہوں اور اس خیال کی ایک معقول وجہ بھی تھی وہ یہ کہ ابھی چند ہی روز پہلے تو اسے ایک کراختائی سوداگر نے دیکھا تھا' کیا اتنے کم دنوں میں کراختائی سوداگر کا کرختستان جانا اور وہاں سے اتنا بڑا وفد لے کر آنا ممکن تھا؟ اس کا ملک کرختستان تو بہت زیادہ دور تھا غالباً مہینوں کی مسافت پر' یہی سوچ کر ایک دم لائیتس کو اطمینان محسوس ہونے لگا اور پھر وہ خود ہی اپنے پاگل پن پر مسکرادیا۔ جس کی وجہ سے وہ اس وفد کی آمد سے ڈر گیا تھا۔ لائیتس مطمئن ہوا اور حسب معمول ٹہلتا ہوا شفاخانے کی عمارت میں جا پہنچا لیکن آج وہ بری طرح بے چین ہوگیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وفد میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو اسے پہچانتے ہوں گے۔

دن کا اجالا پوری طرح پھیل گیا تو سلطانی دربار کے نقیب نے دربار لگائے جانے کی صدا بلند کی۔ لگ بھگ ایک ساعت تک لوگ دربار میں جمع ہوتے رہے اور اپنی اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھتے گئے۔ سب سے آخر میں کرختستانی وفد داخل ہوا۔ جن کے لیے مہمانوں کی نشستیں خالی تھیں۔ چنانچہ سب کراختائی اپنی اپنی نشستوں پر جم گئے۔ سب سے آخر میں نقارچی نے نقارہ بجایا اور سلطان کی آمد کا اعلان ہونے لگا۔ سلطان محمد بن ملک شاہ جس کی سلطنت چین سے بحیرہ روم تک پھیلی ہوئی تھی۔ اطلس و کمخواب کے بھاری پردوں کے عقب سے نمودار ہوا۔ تمام اہالیان دربار سلطان کے احترام میں اٹھ کھڑے ہوگئے۔ سلطان اپنی مسند پر براجمان ہوا تو سب لوگ بیٹھ گئے اور دربار سلطانی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ سلطان کے حکم پر کراختائی وفد کے سردار کو بات کرنے کی اجازت دی گئی جو ایک دبلا پتلا اور دراز قد عمر رسیدہ کراختائی تھا جس کے بدن پر سر سے پیر تک سرخ لباس تھا اور گردن میں موٹے منکوں سے بنی ایک مالا لٹک رہی تھی۔ وہ سر سے ننگا تھا اور اس کے سر پر ایک بال نام کو بھی نہیں تھا۔

یہ کراختائیوں کا سب سے بڑا لاما تھا جس کی عمر یقیناً سو سال سے تجاوز کرچکی تھی۔ بوڑھا لاما اٹھ کر کھڑا ہوا اور کپکپاتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

''میں کرختستان کا سب سے بڑا لاما' سلطانِ مشرق و مغرب شمال و جنوب کی خدمت میں پرنام کرتا ہوں۔ میں اپنے لوگوں کی طرف سے سلطان

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

سے عرض کرتا ہوں کہ ہم سلطنتِ سلجوق کے پڑوس میں اس طرح پرامن طریقے سے رہ رہے ہیں کہ ہماری تمام تر ہمدردیاں منگولوں کے بجائے سلطان سلجوق کے ساتھ ہیں۔ حالانکہ سلطان معظم خوب جانتے ہیں کہ ہمارے پڑوسی چینی منگول' رشتے کے حساب سے ہمارے چچازاد بھائی ہیں' لیکن ہم منگولوں کے ہم مذہب نہیں ہیں۔ وہ آسمان کی پوجا کرتے ہیں جبکہ ہم عظیم بدھا کی پرستش کرتے ہیں۔ ہم نے ان کے ساتھ اپنا ہر ناتا توڑ کر خود کو سلطنتِ سلجوق سے جوڑ رکھا ہے۔ ہم سلطان معظم کی مہربانیوں سے سلطنتِ سلجوق کے پڑوس میں ایک اطمینان بھری زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمیں چند روز قبل تک سلطانِ معظم سے کوئی شکوہ نہیں تھا لیکن اب ہم تمام کراختائی قبائل کی طرف سے سلطانِ معظم کی خدمت میں ایک شکایت لے کر آئے ہیں۔"

اتنا کہہ کر عمر رسیدہ لاما خاموش ہوگیا۔ حاضرینِ دربار سناٹے میں آ گئے۔ سلطان کی پیشانی پر حیرت اور تفکر کی بدولت بل پڑ گئے۔ وہ لاما کی بات سن کر ششدر رہ گیا تھا۔ آخر چین اور سلطنتِ سلجوق کی درمیانی سرحد پر دریائے جیحوں کے اس پار ان لوگوں کو کیا پریشانی لاحق ہوئی تھی کہ یہ اپنی شکایت لے کر دارالسلطنت تک آئے۔ سلطان بے حد حیران تھا کہ آخر یہ لوگ کیا کہنے والے ہیں لیکن وہ خاموش رہا۔ اس کی منتظر نگاہیں عمر رسیدہ لاما پر ٹکی ہوئی تھیں۔ عمر رسیدہ لاما نے پھر کہنا شروع کیا۔

"سلطانِ معظم! شاید ہمارے مذہب بدھ مت کے بارے میں جانتے ہوں' ہمارے مذہب میں کبھی کبھی لاما پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی مثال مسلمانوں کے اثنا عشریوں کے لاما جیسی ہوتی ہے۔ یہ ایشور کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں اور ہر لاما کی آمد سے سیکڑوں سال پہلے اس کے آنے کی پیشگوئیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ ہمارے کرختستان میں پچھلے دو سو سال کی پیشگوئیوں کے نتیجے میں ایک لاما نے جنم لیا۔ یہ تمام اہل کرختستان کے لیے عزت اور فخر کی بات تھی۔ چنانچہ کرختستان کی تمام آبادی کی نگاہیں اس پیدا ہونے والے بچے پر لگی ہوئی تھیں۔

سلطانِ معظم! ہمارا ایمان ہے کہ لاما کو ایشور کسی بہت بڑے کام کے لیے زمین پر بھیجتے ہیں۔ لیکن ہر لاما کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہمارے مذہبی سفروں کو سرانجام دے۔ ان سفروں کے دوران اسے ہر معبد میں' کہ جہاں جہاں سے وہ گزرتا چلا جائے' انتہائی محنت کے ساتھ بعض ریاضتیں' مشقتیں اور تپسیا میں سکھائی جاتی ہیں۔ ہمارا وہ لاما کرختستان سے چل کر چین کے صوبہ تبت پہنچا اور تب سے اس نے خراسان کے شہر بامیان تک کا سفر کیا' لیکن بامیان پہنچنے کے بعد ہمارا نوجوان مقدس لاما کہیں کھو گیا۔"

اتنا کہہ کر عمر رسیدہ لاما پھر چپ ہوگیا۔ سلطان سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سعدالملک کے چہرے پر بھی حیرت اور تجسس کے بے پناہ آثار تھے۔ تمام حاضرینِ دربار ہمہ تن گوش ہو کر عمر رسیدہ لاما کی باتیں سن رہے تھے۔ کچھ توقف کے بعد بوڑھا لاما پھر کہنے لگا۔

"ہمیں ایک ماہ قبل یہ خبر ملی کہ ہمارا مقدس لامانہ صرف یہ کہ آپ کے دارالسلطنت میں ہے بلکہ وہ مسلمان ہو کر مدرسہ نظامیہ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

سلطانِ معظم! آپ ہمارا جو یہ وفد دیکھ رہے ہیں یہ آج سے تین ماہ پہلے مقدس لاما کی تلاش میں کرختستان سے روانہ ہوا تھا۔ مجھے ہمارے مخصوص علوم کی وجہ سے ایشور نے یہ بتا دیا تھا کہ پیشگوئیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والا لاما بامیان میں کھو چکا ہے اور اسے تلاش کرنا اب ہماری ذمہ داری ہے۔ چنانچہ میں

کرختستان کے سرداروں کو لے کر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا' یہ میری زندگی کی آخری چنوتی ہے۔ جونہی میری یہ چنوتی پوری ہوگی میں ایشور کے پاس چلا جاؤں گا۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ مجھے پیدا ہی اس نوجوان لاما کی حفاظت کے لیے کیا گیا۔ بامیان میں جب ہمیں یہ خبر ملی کہ لاما مارے کے مدرسہ نظامیہ میں موجود ہے تو ہم فوراً وہاں سے چل پڑے لیکن جب ہم یہاں پہنچے تو ہمیں پتا چلا کہ ہمارا لاما شاہی شفاخانے میں اپنے زخموں کی وجہ سے زیرِ علاج ہے۔ ہم گزشتہ تین ماہ سے سفر میں ہیں اور بالآخر آج ہم اس جگہ پہنچ چکے ہیں جہاں ہمارا لاما موجود ہے۔

اب ہماری سلطانِ معظم سے یہ درخواست ہے کہ ہمارا لاما ہمارے حوالے کر دیا جائے تاکہ ہم اطمینان سے واپس لوٹ جائیں' ہمیں ڈر ہے کہ اگر سلطنتِ سلجوق نے ہمارے مقدس لاما کو ہمارے حوالے نہ کیا تو شاید ہم تاتاری یلغاروں کو آپ کی سرحدات پر نہ روک سکیں۔"

سلطان عمر رسیدہ شخص کی ایک ایک بات سن کر ہر قدم پر حیران ہوتا رہا۔ یہ تو اسے پہلے ہی معلوم تھا کہ لائیتس احمد بدھ مت سے اسلام کی طرف آیا لیکن یہ بات اس کی سوچ میں بھی نہ تھی کہ لائیتس بدھ مت اور کراختائیوں کے نزدیک اتنی زیادہ اہمیت کا حامل ہے' وہ سوچ میں پڑ گیا اور پریشان ہوگیا کہ اب کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ وہ جانتا تھا کہ لائیتس نے اسلام قبول کر لیا ہے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اہالیانِ دربار میں بڑے بڑے جید مسلمان علماء بھی موجود ہیں یکایک اسے محسوس ہوا کہ یہ مسئلہ بے حد نازک ہے کیونکہ وہ اگر کراختائیوں کے حوالے ان کے مقدس لاما کو نہیں کرتا تھا تب بھی اس کے لیے مشکل تھی کیونکہ وہ عمر رسیدہ کراختائی لاما کی واضح دھمکی سن چکا تھا اور یہ بھی بہت مشکل بات تھی کہ وہ ایک دین دار مسلمان کو دربار میں بیٹھے فقیہانِ ملت اور علمائے دین کی آنکھوں کے سامنے کافروں کے حوالے کر دیتا۔ سلطان بری طرح سٹپٹا گیا اور خاموش نگاہوں سے دربار میں بیٹھے اپنے معزز اراکینِ سلطنت کی جانب دیکھنے لگا۔ اس نے پورے دربار میں ایک طائرانہ نظر گھماتے ہوئے کہا۔

"میں معزز وفد کی کسی بھی بات کا جواب دینے سے پہلے اپنے دربار کے معزز اراکین سے مشورہ کرنا چاہوں گا۔ اراکین دربار کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ اس مسئلہ پر اپنی اپنی بصیرت کے مطابق روشنی ڈالیں۔"

کچھ ہی دیر بعد مشاورت کا سلسلہ شروع ہوگیا لیکن ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ شہر رے کے بزرگ گورنر نے کھڑے ہو کر سلطان کی خدمت میں عرض کیا۔

"سلطانِ معظم کی خدمت میں گزارش ہے کہ اہالیانِ دربار کی مشاورت میں معزز وفد کے اراکین کو بٹھا کر ان کو تکلیف نہ دی جائے۔ ہوسکتا ہے بعض علمائے دین کی رائے سے وفد کے معزز ارکان کی دل شکنی ہو چنانچہ میری گزارش ہے کہ مشاورت کا عمل مکمل ہونے کے بعد کرختستان کے معزز وفد کو دوبارہ دربار میں حاضری کی تکلیف دی جائے۔"

سلطان کو اپنے گورنر کا مشورہ پسند آیا' لیکن اس سے پہلے کہ وہ وفد کی خدمت میں باہر جانے کی درخواست کرتا سعدالملک نے بات کرنے کی اجازت چاہی۔ سلطان نے اجازت دی تو سعدالملک اپنی نشست پر اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا۔

"سلطانِ معظم! میری رائے میں وفد کا یہاں رہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ہماری تمام تر گفتگو اراکینِ وفد

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

کے سامنے ہونی چاہئے تاکہ انہیں ہماری مجبوریوں اور اخلاص کا پتا چل سکے۔" یہ مشورہ بھی برا نہیں تھا۔ چنانچہ سلطان نے وفد کو وہیں بیٹھا رہنے کی اجازت دے دی۔ کچھ دیر بعد سعد الملک نے پھر بات کرنے کی اجازت چاہی اور کہنے لگا۔

"سلطانِ معظم! ہماری سلطنت فی زمانہ انتہائی نازک حالات سے گزر رہی ہے۔ سلطنت کے اندر خطرناک باطنیوں کی صورت میں اتنے دشمن پیدا ہو چکے ہیں کہ سلطنت کی سرحدات کی طرف سے ہماری توجہ ہٹ چکی ہے۔ ایسے عالم میں کراختائی قبیلہ کے لوگ ہمارے لیے اللہ کی دی ہوئی ایک نعمت سے کم نہیں۔ میں سلطانِ معظم کی خدمت میں درخواست کروں گا کہ ان کے مقدس لاما کو ان کے ہمراہ بھیجنے کے فیصلے پر غور فرمایا جائے۔"

لیکن مدرسہ نظامیہ کے وہ بزرگ علماء جو عمائدین سلطنت میں شامل تھے اس کے حق میں نہ تھے۔ سب نے متفقہ طور پر ایک بزرگ عالم کو کھڑا کر کے اپنی طرف سے یہ کہا:۔

"شریعت اسلامی اور قرآن و حدیث ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم ایک سچے اور دین دار مسلمان کو کافروں کے حوالے کر دیں۔ ہم پر فرض ہے کہ محض ایک مسلمان کا ایمان یا عزت یا جان بچانے کے لیے بڑے سے بڑا اقدام کرنے سے بھی دریغ نہ کریں۔ ہم سلطانِ معظم سے گزارش کریں گے کہ ہمارے ہونہار طالب علم لائیٹس احمد کو کرختستان نہ بھیجا جائے تاکہ وہ اور اس کا ایمان سلامت رہے۔"

علماء کا نمائندہ اپنی نشست پر بیٹھا تو وزیر سلطنت سعد الملک پھر اٹھ کر کہنے لگا:

"ایک شخص کی اہمیت سلطنت کی اہمیت سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اشخاص جماعتوں کے محتاج ہوتے ہیں، جماعتیں اشخاص کی محتاج نہیں ہوتیں۔ اسلام میں شخصیت پرستی حرام ہے، علمائے کرام کو یہ مسئلہ اس پہلو سے بھی دیکھنا چاہئے۔"

کراختائی وفد اس بحث کے دوران اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ رئیس العلماء نے پھر کھڑے ہو کر کہا:۔

"وزیر سلطنت سعد الملک کو شرعی معاملات پر رائے دینے سے پہلے شرعی علوم حاصل کرنا واجب آتے ہیں۔ اسلام نے قوم کے ایک ایک فرد کو الگ الگ اہمیت دی ہے۔ قوم کا ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہوتا ہے، لائیٹس احمد اس وقت کراختائی قوم کا فرد نہیں، بلکہ شریعت اسلامی کی رو سے وہ اب مسلمان قوم کا فرد ہے۔"

رئیس العلماء کی بات سے سعد الملک جز بز ہو کر رہ گیا۔ سلطان اپنی جگہ ابھی گومگو کے عالم میں ہی تھا۔ اسی اثناء میں شہر کے سب سے بڑے حکیم، طبیب اور جراح جو اپنے علم کی بدولت نہ صرف روسا میں شامل تھے بلکہ دربار سلطنت کے عمائدین میں بھی شامل تھے، اپنی جگہ پر اٹھ کھڑے ہوئے اور رئیس العلماء سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"میں رئیس العلماء سے مخاطب ہو کر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فقہ اسلامی نام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل پیرا ہونے کا۔ کیا فقہائے ملت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت سے واقف نہیں جس کی رو سے کافروں کے ایسے رشتے داروں کو جو مسلمان تھے، ایک معاہدہ کے تحت کافروں کے حوالے کر دیا گیا تھا..... سلطانِ معظم! میرا اشارہ صلح حدیبیہ کی طرف ہے۔"

رے کے سب سے بڑے طبیب جنہیں رئیس الاطباء کا درجہ حاصل تھا کی بات سن کر اہالیان دربار پر

www.pkdigest.com

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

(سورۃ البقرہ۔۲)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود براہ راست اہل ایمان کو مخاطب کر کے بتا دیا کہ نجات حقیقی اور اس کا حصول کیسے ممکن ہے؟ بھٹکی ہوئی انسانیت کیسے راہ حق اور اہل ایمان صراط مستقیم پا سکتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام حیات کیسے مستحکم ہو سکتا ہے؟

یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اے ایمان والو!

وہ راستہ جس کے مسافر جنت مقیم ہوں گے

مؤلف

مشتاق احمد قریشی

نئے افق گروپ آف پبلیکیشنز

Pdfby Roadsign

سناٹا چھا گیا۔ سلطان کے چہرے پر بھی ایسے آثار دکھائی دیے جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو سننے کے بعد وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہو لیکن اس سے پہلے کہ سلطان کچھ کہتا رئیس العلماء پھر اٹھے اور سلطان سے مخاطب ہوئے:۔

''سلطانِ معظم! حکیم شہر نے بلاسند بات کی ہے۔ ہمیں ائمہ فقہ کے ہوتے ہوئے تقلید سے روگردانی کی اجازت نہیں' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے تو یہ بھی ثابت ہے کہ محض ایک شخص کا ایمان اور جان بچانے کی غرض سے پوری مسلمان قوم دستِ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بیعت کرتے ہوئے قسم کھائے کہ وہ اس شخص ایک مسلمان کو بچانے کی خاطر مر مٹیں گے۔ سلطانِ معظم! میرا اشارہ بیعت رضوان کی طرف ہے' جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کفار کے چنگل سے چھڑانے کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے آخر دم تک لڑنے کا عہد لیا تھا اور حکیم شہر کو یہ بھی یاد ہونا چاہیے کہ اس بیعت میں یا اس حلفیہ اقرار میں رب العالمین نے خود حصہ لیا تھا۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے ...... یداللہ فوق ایدیھم ...... اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔''

رئیس العلماء کا جواب حکیم شہر کو لاجواب کر گیا۔ اہالیانِ دربار بڑی دلچسپی اور خوش گوار حیرت کے ساتھ اس بحث کو سن رہے تھے۔ سلطان ایک مرتبہ پھر گڑبڑا گیا۔ کراختائی وفد کے چہروں پر بیزاری بھی اور کسی قدر برافروختہ بھی تھے۔ اسی اثناء میں سعد الملک نے گفتگو میں پھر حصہ لیا:۔

''سلطانِ معظم! ائمہ فقہاء کی بات بھی رئیس العلماء نے خوب کہی' سلطانِ معظم! جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے تو میں نے قرآن حکیم میں یہ پڑھا ہے کہ مسلمانوں پر اللہ کی' اللہ کے رسول کی اور پھر مسلمان حکمران کی اطاعت واجب ہے۔ اس حکم کی موجودگی میں امام کا درجہ خود سلطانِ معظم کے اپنے پاس ہے۔ جبکہ حکیم شہر نے بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے دلیل دی اور رئیس العلماء نے بھی ایسا ہی کیا۔ جب اس طرح کی صورت حال ہو تو مسلمان حکمران جو کہ اولی الامر ہے خود فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ کیا رئیس العلماء یہ چاہتے ہیں کہ ہم وفد کو انتظار کروائیں اور بغداد سے فتویٰ منگوائیں۔''

یہ بات کہتے ہوئے سعد الملک نے جان بوجھ کر کراختائی وفد کی جانب دیکھا تھا' انتظار کی بات سن کر اہل وفد کے چہروں پر غصہ دکھائی دینے لگا۔ جسے سلطان بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ سلطان کا دل بھی اسی طرف مائل تھا کہ وہ کراختائی وفد کے حق میں فیصلہ کرے۔ کیونکہ اس کی نظر میں ایک معمولی نوجوان اتنا اہم نہیں تھا جتنی کہ اس کی سلطنت لیکن ابھی وہ مضطرب تھا' وہ علمائے دین کی نفرت مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے سعد الملک کی بات پر رئیس العلماء کی جانب دیکھا۔ رئیس العلماء نے اٹھ کر کہا۔

''سلطانِ معظم کو کسی شرعی مسئلہ میں حکم لگانے کا اختیار صرف اس صورت میں مل سکتا ہے جب کسی مسئلہ پر قرآن وحدیث کی قطعی رائے موجود نہ ہو۔ جبکہ یہ قرآن وحدیث اور سلف صالحین کے عمل سے ثابت ہے کہ کسی ایک مسلمان کو بچانے کے لیے پوری مسلمان قوم کو لڑنا چاہیے' سلفِ صالحین کے عمل میں ہمارے سامنے تسخیر ہند کا واقعہ موجود ہے جب 91 ہجری میں ایک مسلمان لڑکی کی پکار پر دمشق سے اسلامی فوجیں چل کر دیبل (کراچی) کے ساحل پر آن اتری تھیں ...... میری سلطانِ معظم سے درخواست ہے کہ لائیتس احمد کو بچانے کے لیے یہی

www.pkdigest.com

طرز عمل اختیار کیا جائے۔''

رئیس العلماء کی بات سے سلطان کی آنکھوں میں غصے کی جھلک دکھائی دی دراصل رئیس العلماء نے یہ کہہ دیا تھا کہ شرعی معاملات میں سلطان کو بولنے کی کوئی اجازت نہیں۔ یہی بات سلطان کو ایک اجنبی وفد کے سامنے اچھی نہ لگی۔ سلطان ابھی رئیس العلماء کی بات پر توجہ ہی کر رہا تھا کہ حکیم شہر اور طبیب سلطانی نے پھر بات کرنے کی اجازت چاہی۔

''سلطانِ معظم! رئیس العلماء کی بات درست نہیں' سلطانِ معظم کو ایسے معاملات میں فیصلہ کرنے کا مکمل اختیار ہے۔ ایک حدیث میں ہے ...... ان السلطان ظل اللہ فی الارض ...... سلطان زمین پر اللہ کا سایہ ہے ...... ایک اور حدیث میں ہے ...... من اھان السلطان فقد اھانہ اللہ ...... جس نے سلطان کی توہین کی اس نے اللہ کی توہین کی ......''

یہ احادیث سلطان نے زندگی میں پہلی مرتبہ سنیں۔ اسے یوں لگا جیسے حکیم شہر نے اسے بے پناہ طاقت سے نواز دیا ہو۔ اب سلطان نے اپنی نشست پر پہلو بدلا اور رئیس العلماء کی جانب دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

''اب آپ کیا فرماتے ہیں؟''

رئیس العلماء اپنی جگہ سے اٹھے اور کسی قدر غصیلے لہجے میں بولے:۔

''سلطانِ معظم! حکیم شہر ضعیف احادیث پیش فرما کر ایک مسلمان حکمران کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان احادیث کے بارے میں محدثین کی رائے محفوظ ہے لہٰذا ایسی احادیث دربار سلطنت میں پیش کرنا دیانتداری نہیں۔''

رئیس العلماء کا لہجہ سلطان کو بالکل پسند نہ آیا۔ چنانچہ سلطان نے یک لخت ہاتھ بلند کیا اور حاضرینِ مجلس کو خاموش رہنے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔

''حاضرینِ مجلس کی مشاورت سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس طرح کے حالات میں مسلمان حکمران کو اپنی طرف سے فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ یہ بات ہمارے سامنے قرآن وحدیث ہر دو اطراف سے آ گئی ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ کا حل ہماری رائے میں یہ ہے کہ اس نوجوان لائیتس احمد کو جو کہ اب مسلمان ہو چکا ہے' اعلیٰ تر مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے رشتہ داروں کی حوالے کر دینا چاہیے' یہی ہماری رائے ہے اور یہی ہمارا حکم۔''

سلطان اتنا کہتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب دربار برخاست کر دیا جائے' کراختائی وفد کے اراکین خوشی سے ایک دوسرے کے ساتھ بغلگیر ہو رہے تھے۔ بوڑھا لالاما اپنی فتح پر خوشی کی شدت سے کپکپا رہا تھا' مسلمانوں کے بادشاہ نے ان کا مقدس لالاما کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

دربار شاہی کی عمارت سے قدرے دور شاہی شفاخانے کے باغ میں لائیتس 'سیب کے ایک درخت کے نیچے بیٹھا اسی وفد کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ وہ اس تمام تر کارروائی اور تمام تر فیصلے سے بے خبر تھا' جو آج اہل دربار کی مشاورت کے بعد بادشاہ نے سنایا' لائیتس اپنی جگہ مطمئن تھا کہ بازار میں ملنے والا کراختائی سوداگر اتنی جلد کرختان نہیں پہنچ سکتا کہ وہاں سے چند دنوں میں کراختائی وفد چل بھی پڑے اور یہاں تک پہنچ بھی جائے لیکن یہ اس کی بھول تھی۔

دربار برخاست ہونے کے بعد سعد الملک نے تخلیے میں سلطان کو ایک عجیب مشورہ دیا:۔

''سلطانِ معظم! وہ نوجوان مدرسہ نظامیہ کے استادوں کا چہیتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے استادوں کی شہ پر یہاں سے بھاگ نکلے۔ اگر وہ

Pdfby Roadsign

بھاگ گیا تو ہمارے لیے بہت بڑی مشکل کھڑی ہوجائے گی۔ کیونکہ بالآخر ہمارے لیے سلطنت کی سرحدات کی حفاظت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔"

سلطان نے معنی خیز نظروں سے سعدالملک کی جانب دیکھا اور سنجیدہ لہجے میں پوچھا:۔

"وزیر سلطنت! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، کھل کر بات کریں؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سلطان معظم اس نوجوان کو حراست میں لینے کا حکم صادر فرمادیں تاکہ کل یا پرسوں جب اسے ان کراختائیوں کے حوالے کیا جائے تو اس وقت تک وہ کہیں فرار نہ ہوسکے۔"

بادشاہ نے تفہیمی انداز میں ایک لمبی ہوں..... کی اور زور سے سر ہلایا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے سعدالملک کا مشورہ مان لیا ہے۔

سعدالملک ایک پرانا باطنی تھا اور محفل میں مذہبی گفتگو کرنے والا رے شہر کا سب سے بڑا طبیب حکیم شہر اسحٰق بیگ بھی فی الحقیقت حسن بن صباح کے قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ گویا ابوسلیم بغدادی کی وہ بات سچ تھی کہ بادشاہ کے پہلو میں بھی ہمہ وقت باطنی موجود رہتے ہیں۔ حکیم شہر اسحاق شاہی طبیب تھا اور بادشاہ کی نظر میں اس کی بڑی عزت تھی۔ سعدالملک نے چند دن پہلے حکیم شہر سے مل کر لائیتس کو شفاخانے میں مارڈالنے کی بات کی تھی لیکن حکیم شہر نے سعدالملک کو ایسا کرنے سے منع کیا تھا۔ دراصل حکیم شہر اسحٰق کا باطنیوں کے نزدیک رتبہ بہت بڑا تھا اور عام طور پر شاہی شفاخانے میں اس کی آمد نہیں ہوتی تھی۔ یہی سوچ کر اس نے سعدالملک کو منع کیا کہ اگر وہ اب اچانک شفاخانے میں جاکر لائیتس کا قتل کرتا ہے تو لائیتس کی موت کا سیدھا شک حکیم شہر پر ہی جائے گا لیکن اتفاق سے سعدالملک کی مشکل خود ہی آسان ہوگئی تھی اور وہ اس طرح کہ لائیتس کو لینے کے لیے اس کے قبیلے کے لوگ آپہنچے تھے۔ سعدالملک نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہوا وہ خطرات جو اس نوجوان کی وجہ سے پیدا ہوگئے تھے اب اس کے چلے جانے سے ٹل جائیں گے۔ چنانچہ اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ لائیتس کو کرختانی لاماؤں کے ساتھ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اسی روز بے خبر لائیتس کو شاہی دستے کے سپاہیوں نے اچانک کچھ بتائے بغیر گرفتار کرلیا۔ شفاخانے کے طبیب چلاتے رہے کہ مریض کے زخم پھٹ جائیں گے لیکن کسی سپاہی نے ان کی ایک نہ سنی اور چند لمحوں میں ہی لائیتس کو شاہی شفاخانے سے شاہی قید خانے میں پہنچادیا گیا۔

اور پھر ٹھیک اس روز جب کرختان کا وفد اپنے مقدس قیدی کو ہتھکڑیاں ڈالے اپنے ساتھ لے کر رے شہر سے روانہ ہوا..... رے شہر میں اس دیوانی لڑکی کی سواری داخل ہوئی۔ جو اصفہان سے پاگلوں کی طرح سفر کرتی ہوئی اپنے محبوب کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے دارالسلطنت دوڑی چلی آئی تھی۔

❀❀❀

رئیسہ محل نادرہ بیگم دارالسلطنت میں داخل ہوئی اور اپنی حویلیوں میں جانے کے بجائے سیدھا شاہی محل کی طرف بڑھی۔ وہ بیقرار تھی۔ وہ شاہی محل کے شفاخانے میں زیرعلاج اپنے محبوب لائیتس سے ملنے آرہی تھی۔ اسے اپنے خادم کے ذریعے معلوم ہوچکا تھا کہ لائیتس نے ابوسلیم بغدادی کی دعوت پر اسلام قبول کرلیا ہے۔ شاہی محل میں پہنچ کر نادرہ بیگم کو یہ روح فرسا خبر سننے کو ملی کہ آج صبح ہی کراختائی لاماؤں کا ایک وفد لائیتس کو لے کر کرختان کی جانب کوچ کرگیا ہے۔ نادرہ کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو امڈ پڑے..... یہ تقدیر نے اس کے ساتھ کون سا کھیل کھیلنا شروع کردیا تھا، جب ابھی وہ بچی تھی تو باپ مرگیا، ذرا سمجھدار ہوئی تو بھائی بچھڑ گیا اور پہاڑ جیسی ذمے داریاں اس کے سر پر آن پڑیں۔ ایک مخلص اور من پسند نوجوان ملا تو اس نے ساتھ رہ کر..... ساتھ نبھانے سے ہچکچاہٹ ظاہر کی اور پھر جب وہ اسلام قبول کرکے سچ مچ اپنا ہوگیا تو اچانک ایسے اجنبی دیسوں کی جانب چل دیا جہاں سے لائیتس کی واپسی کی امید کم ہی تھی۔ نادرہ تڑپ کر محل سے نکلی اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ دارالسلطنت میں موجود اپنی ایک حویلی میں چلی گئی۔ رے میں بھی نادرہ کی اپنی حویلیاں تھیں۔ جہاں صرف اس کے ملازم ہی مقیم رہتے۔ ہر حویلی کا ایک پرانا نمک خوار ملازم نگران ہوتا۔ اب جس حویلی میں عمادالدولہ کی بیٹی داخل ہوئی اس کے نگران کا نام عثمان نیشاپوری تھا۔ یہ ادھیڑ عمر شخص اپنے بیوی بچوں سمیت نادرہ کی حویلی میں رہتا تھا اور رے کے زیادہ تر لوگ یہی سمجھتے تھے کہ وہی اس عالیشان حویلی کا مالک ہے۔ عثمان نیشاپوری بڑا مخلص انسان تھا۔ وہ عمادالدولہ کے زمانے سے اس خاندان کا نمک خوار تھا۔ نادرہ اسے ہمیشہ چچا کہہ کر پکارتی تھی۔ وہ جب بھی دارالسلطنت آتی اسی حویلی میں قیام کرتی، آج وہ حویلی میں داخل ہوئی تو عثمان نیشاپوری اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کیونکہ اس کی بیٹیوں جیسی مالکن کے چہرے پر اداسی کے گمبھیر سائے ثبت تھے۔ آج مدت بعد نادرہ رے آئی تھی، وہ نادرہ کی سواری دیکھتے ہی خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ وہ لپک کر آگے بڑھا لیکن یہ دیکھ کر اس کے دل پر گھونسا پڑا کہ نادرہ کا چہرہ بری طرح اترا ہوا تھا۔ عثمان نیشاپوری سے رہا نہ گیا اور اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"کیا بات ہے بیٹی! تمہیں کیا پریشانی لاحق ہے؟ تمہارا چہرہ اتنا اترا ہوا کیوں ہے؟ تم اس قدر اداس کیوں ہو؟"

لیکن نادرہ کچھ نہ بولی وہ عثمان نیشاپوری کو ادب سے سلام کرتی ہوئی اندر چلی گئی اور اپنی خاص خواب گاہ میں جو اکثر اس کے انتظار میں سجی رہتی تھی، جاکر بستر پر اوندھے منہ گر پڑی۔ عثمان نیشاپوری اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آگیا اور انتہائی شفقت بھرے لہجے میں نادرہ سے مخاطب ہوا۔

"بیٹی تمہیں کیا ہوا؟ اپنے چچا کو نہیں بتاؤ گی؟ تم مجھے کمزور مت سمجھو! میں تمہارے لیے وہ کچھ کرسکتا ہوں جو کوئی نہیں کرسکتا۔"

عثمان نیشاپوری کی بات سن کر نادرہ کے دل میں اچانک امید کی کرن پیدا ہوئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔ اب اس کی پُراشتیاق نظریں عثمان نیشاپوری پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کہنے لگی۔

"عثمان چچا! کیا آپ سچ مچ میرے لیے کچھ کرسکتے ہیں؟"

عثمان نیشاپوری نادرہ کی آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کی تاب نہ لاسکا اور تڑپ کر نادرہ کے نزدیک آگیا..... نادرہ کے قریب پہنچ کر وہ اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اسی مشفقانہ لہجے میں بولا۔

"ہاں بیٹی! میرے خون کے ایک ایک قطرے پر تمہارا حق ہے۔ تم عثمان نیشاپوری کو کمزور نہ سمجھو! تمہیں جس نے دکھ پہنچایا ہے مجھے بتاؤ، میں اس کی آنکھیں نکال کر تمہارے قدموں میں ڈال دوں گا۔"

نادرہ کی آنکھوں میں امید کی کرن اور گہری ہوگئی۔ وہ پُراشتیاق لہجے میں ایک بار پھر بولی۔

"چچا کیا میں تم پر اعتماد کرکے تم سے اپنے دل کی بات کہہ سکتی ہوں؟ چچا اس وقت میرا دنیا میں اپنا کوئی بھی میرے پاس نہیں۔"

عثمان نیشاپوری نادرہ کی بات سن کر اندر سے کٹ گیا۔ اس نے جذبات سے لبریز لہجے میں جواب دیا۔

"بیٹی تم کیسی باتیں کررہی ہو، تم مجھ پر اپنے باپ

www.pkdigest.com

Pdf by Request

کی طرح اعتماد کرو میں نمک حرام نہیں۔ تمہارے لیے اور تمہارے راز کی حفاظت کے لیے اپنا خون کا آخری قطرہ تک بہادوں گا۔" نادرہ سر جھکا کر خاموش ہوگئی' وہ سوچ رہی تھی کہ نیشاپوری کو اپنے دل کی بات بتادے' جب سے اس کے دل میں لائیتس نے گھر بنایا تھا اس نے کسی کے سامنے اپنے دل کی بات نہ کی تھی۔ وہ اکیلی روتی رہی' اکیلی تڑپتی رہی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ مگر آج اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ نیشاپوری نے اس کے زخم پر مرہم رکھنا چاہی تو وہ موم کی طرح پگھلنے لگی۔ نادرہ نے اپنی تمام کہانی اپنے خاندانی ملازم' عثمان نیشاپوری کے سامنے دہرادی۔ نیشاپوری ہر ہر بات پر چونکتا اور حیران ہوتا رہا اور آخر میں جب نادرہ نے اپنی کہانی مکمل کی تو ادھیڑ عمر اور دھان پان نیشاپوری کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہہ رہی تھی۔ اس نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔

"بیٹی! تم اتنی سی بچی ہو کر اتنے بڑے بڑے دکھ سہتی رہیں اور میں یہاں تمہاری حویلی میں مالک بن کر بیٹھا اپنے بچوں کے ساتھ تمہاری دولت پر گل چھرے اڑاتا رہا۔ میں تم سے شرمندہ ہوں بیٹی لیکن اب میں اپنی اس شرمندگی کا کفارہ ادا کروں گا' تم فکر مت کرو' کراختائیوں کا قافلہ ابھی زیادہ دور نہ گیا ہوگا۔ ہم اتنی تیز رفتاری سے سفر کریں گے کہ جلد ہی انہیں پالیں گے' اور پھر ہم اس کے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کی منت سماجت کریں گے کہ وہ ہمارے مسلمان نوجوان کو چھوڑ دیں۔"

عثمان نیشاپوری نے آنسو بہاتے ہوئے سادگی سے کہا لیکن نادرہ جھٹ سے بولی۔

"نہیں چچا! اس طرح ہم اسے حاصل نہیں کر سکتے وہ لوگ بہت سخت مزاج ہیں۔ لائیتس ان کے لیے ایک مقدس پیشوا ہے وہ ہماری منت سماجت کو خاطر میں نہیں لائیں گے۔ ہمیں کوئی اور طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ چچا تم یہ بتاؤ کراختان کس طرف ہے؟"

یوں لگتا تھا گویا نادرہ کے لیے اب لائیتس کی بازیابی اپنے بھائی نعیم کی بازیابی سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ نادرہ خود کرختان جانے کا سوچنے لگی۔ نیشاپوری نے نادرہ کی بات سنی تو مستعدی سے جواب دیا۔

"کرختان یہاں سے شمال مشرق میں واقع ہے۔ یہ چین اور سلطنتِ سلجوق کی سرحد پر ہے۔ آج کل سلطنتِ کرختان کا الحاق سلطنت سلجوق کے ساتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان نے اسے کراختائیوں کے حوالے کر دیا ہے۔"

نادرہ کچھ سوچنے لگی اور پھر کچھ دیر بعد بولی۔

"چچا! تم نیشاپور کے رہنے والے ہو نا۔"

"ہاں بیٹی! نیشاپور ہی میرا وطن ہے۔"

"چچا نیشاپور بھی اسی سمت میں واقع ہے نا؟"

"ہاں بیٹی! کرختان جانے کے لیے نیشاپور سے گزر کر جانا پڑتا ہے۔"

نادرہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ گرمجوشی سے عثمان نیشاپوری کے نزدیک ہوگئی' اور جذبات سے معمور لہجے میں بولی۔

"چچا! ہمیں تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے نیشاپور چلے جانا چاہیے۔ اتنی تیز رفتاری سے کہ ہم ان سے پہلے نیشاپور جا پہنچیں۔ ہم نیشاپور میں کوئی تدبیر اختیار کر سکتے ہیں۔ ہم کرائے کے سپاہیوں سے بھی مدد لے سکتے ہیں اور نیشاپور کے گورنر سے بھی' میرا خیال ہے کہ انہیں راستے میں روکنا مناسب نہیں ہوگا۔"

اب عثمان نیشاپوری گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ نادرہ کی بات صاف اور معقول تھی' یہ سوچ کر عثمان نیشاپوری کی آنکھیں چمکنے لگیں کہ اسی بہانے اتنے طویل عرصہ بعد اسے اپنا وطن دیکھنا نصیب ہوگا۔ عثمان نیشاپوری نے اسی وقت نادرہ کی بات پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور بڑے جذباتی انداز میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ جلد سے جلد گوچ کی تیاری کے انتظامات کرنا چاہتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد عثمان نیشاپوری واپس آیا تو اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ تھا۔ وہ نہ صرف ایک تیز رفتار سفر کرنے کے لیے بہترین انتظامات کر کے لوٹا تھا بلکہ اس کے ذہن میں ایک دو عجیب اور خوش کن خیال ابھرے تھے جن کی وجہ سے وہ جوش وجذبات سے لبریز دوڑتا ہوا نادرہ کے کمرے میں آیا۔

"بیٹی! ہمیں ابھی سفر پر روانہ ہونا ہوگا۔ میں نے بہت اچھا انتظام کر لیا ہے اور ایک خوشی کی بات یہ ہے کہ میرے ذہن میں دو خیال آئے ہیں ایک تو یہاں سے نیشاپور جانے کے لیے ہم ایک مختصر راستہ بھی اپنا سکتے ہیں' جو قدرے دشوار گزار ہے لیکن مختصر ہے اور دوسری اہم بات یہ کہ نیشاپور میں ایک بزرگ میرے بڑے مہربان ہیں' میں جب نیشاپور میں ہوتا تھا تو ان کی بے پناہ خدمت کرتا تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑے ہیں لیکن میری بات کو ٹالیں گے نہیں' وہ ہمارے بہت کام آسکتے ہیں۔"

نادرہ اشتیاق بھری آنکھوں سے عثمان کی بات سنتی رہی' جب اس کی بات ختم ہوئی تو نادرہ نے پوچھا۔

"کون ہیں وہ؟"

"عمر خیام نام ہے ان کا' سنا ہے بہت بڑے ریاضی دان اور ماہر علم نجوم ہیں۔ نظام الملک طوسی نے اپنے زمانے میں انہیں ہر دنیاوی قید سے آزاد کر دیا تھا۔ نظام الملک نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ وہ وہیں نیشاپور کے نزدیک ایک باغ میں مقیم ہیں۔ ان کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ہیں وہ داناؤں کے دانا ہیں' تم یقین جانو وہ ہمیں ایسا راستہ بتائیں گے کہ کوئی مشکل ہی نہ رہے گی۔"

رئیسہ محل عمر خیام کا نام سن کر بری طرح چونکی' وہ اس نام سے اچھی طرح واقف تھی۔ یہ نام اس نے متعدد مرتبہ ابوسلیم بغدادی شہید سے سنا تھا۔ اس کے دل میں عمر خیام کی بے پناہ قدر تھی' جونہی نادرہ بیگم نے ان کا نام سنا اسے یوں لگا جیسے سچ مچ اس کے درد کی مسیحائی وہی کریں گے۔ ابوسلیم بغدادی نے اسے عمر خیام کی عاشقانہ طبیعت' کثرت شراب نوشی اور شعر وادب کی صلاحیتوں کے بارے میں بھی بتا رکھا تھا۔ نادرہ نے عثمان کی بات پر خوشی کا اظہار کیا' اور اپنے نئے سفر پر روانہ ہونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

❀❀❀

دو کوہانوں والے اونٹوں پر سوار کراختائیوں کا پچاس افراد پر مشتمل قافلہ تیز رفتاری کے ساتھ شمال کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہ لوگ گزشتہ تین ساڑھے تین ماہ سے لائیتس لاما کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ دراصل لائیتس کے موروثی محافظ لاما کو خواب میں یہ بتایا گیا تھا کہ ان کا مقدس اوتار کہیں کھو گیا ہے۔ اس نے لائیتس کی پیدائش سے لے کر جوانی تک اسے اپنی نظروں کے سامنے پالا پوسا تھا اور اس کی ایک ایک عادت کو سنوارنے کے لیے نہ جانے کتنی محنت کی تھی۔ اس نے 20 سال کی عمر تک لائیتس کو ایک لمبے سفر پر روانہ ہونے کی پرکھ شادی تھی اور اس نے حکم دیا تھا کہ وہ اپنا یہ سفر تن تنہا مکمل کر کے لوٹے۔ آج اس قافلے کو رے سے روانہ ہوئے تیسرا دن تھا۔ ابھی تک کراختائی سرداروں نے بڑے لاما کے حکم پر

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

لائیتس کی ہتھکڑیاں نہ کھولی تھیں۔ لائیتس کا باپ بھی اس قافلے کے ہمراہ تھا اور اس کے دونوں چھوٹے بھائی بھی' جو اب گبرو جوان ہو چکے تھے۔ اس قافلہ کے ہمراہ تھے۔ خواتین میں بوڑھے لاما کی پوتی' اس کی دو بہنیں اور ایک دو خادمائیں بھی اس قافلہ کے ہمراہ تھیں۔ اگرچہ بڑا لاما لائیتس کی بازیابی کے بعد مکمل طور پر مطمئن ہو چکا تھا لیکن اس نے پھر بھی واپسی کا سفر تیزی سے جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ کیونکہ وہ جلد از جلد لائیتس کو اس کی اصل ذمہ داریاں سونپنا چاہتا تھا۔ بڑے لاما کا خیال تھا کہ لائیتس کو اپنے مقام پر بٹھاتے ہی وہ مکت ہو جائے گا۔

دو کوہان والے بال دار اونٹوں کا یہ قافلہ دن بھر سفر کرتا اور غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے جیسی بھی جگہ ملتی پڑاؤ ڈال لیتا۔ اس علاقے میں سخت سردی تھی۔

آج تیسرے روز کی شام جب قافلے کے پڑاؤ کا اعلان کیا گیا تو بڑا لاما...... لائیتس کے پاس آیا۔ وہ ان تین دنوں میں پہلی مرتبہ لائیتس کے سامنے آیا تھا۔ قافلہ کے تمام لوگ لائیتس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ جب بھی لائیتس کے سامنے آتے پہلے اس کے حضور سجدہ ریز ہوتے اور پھر اٹھ کر مطلب کی بات کرتے۔ بڑا لاما آیا تو اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ لائیتس کے لیے عمدہ خیمہ نصب کیا جاتا تھا۔ جونہی بڑا لاما خیمے میں داخل ہوا اس نے پہلے لائیتس کے سامنے سجدہ کیا اور پھر اٹھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اب اس کے دونوں ہاتھ لائیتس کے سامنے جڑے ہوئے تھے اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے بڑی دردناک آواز میں کہا:۔

''بدھا کے اوتار! تم زمین کے باشندے نہیں' تم آسمانوں سے اترے ہو' مجھے معاف کر دینا' میں نے تمہیں ہتھکڑی لگائی' لیکن میں مرنے کے بعد عظیم بدھا کی سامنے اس بات پر شرمندہ نہیں ہونا چاہتا کہ میں تمہاری صحیح طور پر حفاظت نہیں کر سکا اور تمہیں حقیقی لاما نہ بنا سکا۔''

خیمے میں دو ہٹے کٹے کراختائی سپاہی موجود تھے۔ جو جتنی دیر خیمے میں رہتے فرط ادب کی وجہ سے لائیتس کے سامنے ایک بات بھی نہ کرتے۔ لائیتس اگر ان سے کچھ پوچھتا تو وہ فرط ادب سے کانپنے لگتے اور مختصر سے مختصر جواب دے کر چپ ہو جاتے۔ اس کے علاوہ ان تین دنوں میں لائیتس کے نزدیک کوئی نہ آیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا باپ دروازہ بھی۔ اس نے اپنے خاندان اور بھائی بہنوں کو دور سے ہی دیکھا تھا۔ سب لوگوں کو بڑے لاما کا حکم تھا کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر لائیتس کے سامنے نہ جائیں۔ دراصل لائیتس کا مقام ان لوگوں کی نظر میں اتنا اونچا تھا......

اتنا اونچا تھا کہ وہ اسے خدا کا اوتار سمجھتے تھے اور چونکہ انہوں نے مجبوراً خدا کے اوتار کو ہتھکڑیاں پہنائی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دل میں خود کو مجرم تصور کرتے تھے۔ یہی حال سب کا تھا۔ حتیٰ کہ لائیتس کے بھائی اور بہنوں کا بھی۔ اس عرصہ میں لائیتس کے بدن کو کسی نے چھوا تک نہیں تھا۔ اس کے بدن پر اون کا گرم لبادہ اور سر پر ابھی تک مسلمانوں والا عمامہ بندھا تھا۔ بڑا لاما لائیتس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے بعد اب دوزانوں ہو کر بیٹھا اپنے کیے کی معافی طلب کر رہا تھا۔ مسلمان لائیتس کو بڑے لاما کی حرکت پر ترس آنے لگا۔ یہ کیسے لوگ تھے جو اپنے جیسے ایک انسان کے حضور سجدہ کرتے تھے اور صرف سجدہ ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اسے خدا کا اوتار سمجھ کر اس کی ناراضگی سے بھی بے پناہ ڈرتے تھے۔ لائیتس نے یہی بات سوچی اور مسکرا دیا اور مسکراتے ہوئے بڑے لاما سے کہنے لگا:

''یہ بتایئے! آپ نے میرے سامنے سجدہ کیوں کیا؟''

بڑے لاما نے حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور انتہائی معصوم لہجے میں جواب دیا۔

''سجدہ......! اس لیے کیا کہ تم ایشور کے اوتار ہو۔ ہمارے لیے تم ایشور کا درجہ رکھتے ہو۔''

بوڑھے کی بات ختم ہونے کی دیر تھی کہ لائیتس نے ایک زبردست قہقہہ لگایا جس کی گونج خیمے سے باہر بھی سنی گئی۔ اور پھر وہ کافی دیر تک ہنستا رہا۔ ہنستے ہنستے اس نے کہا۔

''بہت خوب......! مزے کی بات تو یہ کہ آپ نے اپنے خدا کو ہتھکڑی بھی لگا رکھی ہے۔''

یہ بات کہہ کر بھی لائیتس ہنستا رہا' بڑا لاما دیدے پھاڑے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بڑے لاما نے لجاجت بھرے انداز میں کہا۔

''ہمیں معاف کر دینا لاما! ہمارے دل میں تمہارے لیے برائی نہیں۔''

اچانک لائیتس کے دل میں ایک خیال آیا اور اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''بڑے لاما یہ بتایئے کہ میں ایشور کے اوتار کی حیثیت سے جب آپ کو کوئی حکم دوں گا تو کیا آپ مانیں گے؟''

لاما کے چہرے پر بے بسی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ اس نے دستِ تہہ سنگ آمدہ کے مصداق جواب دیا۔

''کیوں نہیں ایشور کے اوتار! تم جو حکم دو گے میں مانوں گا۔''

''تو پھر میرا حکم ہے کہ میری ہتھکڑیاں کھول دو۔ ابھی اور اسی وقت۔''

لائیتس کے لہجے میں بلا کا جلال در آیا تھا۔ اتنا جلال کہ بڑے لاما کا پورا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے فوراً اپنے لباس میں ہاتھ ڈال کر لوہے کی ایک چابی نکالی اور دوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے لائیتس کی ہتھکڑیوں کا تالا کھول دیا۔ کئی روز بعد لائیتس کی ہتھکڑیاں الگ ہوئی تھیں۔ اس کی کلائیوں پر بھی داغ پڑ چکے تھے۔ اس نے دونوں کلائیاں مسلتے ہوئے بڑی عجیب نظروں کے ساتھ بڑے لاما کی طرف دیکھا اور کہا۔

''اب میرا دوسرا حکم یہ ہے آپ میرے بھائیوں اور باقی رشتہ داروں کو یہاں بلوائیں۔'' بڑا لاما لائیتس کا حکم سنتے ہی اٹھا اور لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ باہر نکلنے ہی والا تھا کہ لائیتس نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

''بڑے لاما!! ٹھہریے...... ایشور کے اوتار کا یہ بھی حکم ہے کہ ان دونوں پہرے داروں کو بھی یہاں سے ہٹا دیا جائے۔''

بڑا لاما ٹھٹک کر رک گیا۔ پہرے داروں کو ہٹانے کی بات سے اس کی آنکھوں میں شک کے سائے لہرائے تھے۔ لائیتس نے بھی انہیں محسوس کیا لیکن لائیتس کے لہجے میں اتنی شدت کا جلال تھا کہ بڑا لاما اس حکم کی تعمیل سے بھی انکار نہ کر سکا۔ دونوں ہٹے کٹے نوجوان خیمے سے باہر چل دیئے۔ آج کئی دن بعد وہ خود کو قدرے آزاد محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی دونوں کلائیاں ملتے ہوئے خیمے میں ٹہلنے لگا۔ چند ثانیے بعد اس کا باپ اور باقی سب رشتہ دار خیمے کے دروازے پر نمودار ہوئے۔ لائیتس کا خیمہ سب سے الگ اور نمایاں تھا۔ ہر پڑاؤ میں اس کا خیمہ اسی طرح نصب کیا جاتا تھا۔ لائیتس کا باپ اور رشتہ دار خیمے کے نزدیک پہنچے تو لائیتس خود خیمے کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ کیونکہ خیمے میں اتنی جگہ نہ تھی کہ وہ سب

www.pkdigest.com

Pdf by Roidsigu

لوگوں سے مل سکتا۔ جونہی خیمے کے دروازے میں اس کے خاندان والوں نے اس کو دیکھا تو سب کے سب آن واحد میں اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ ان ساجدین میں لائیتس کا باوقار باپ درداس بھی شامل تھا۔ لائیتس کو یہ منظر سخت برا لگا۔ اس نے قہر آلود آواز کے ساتھ سب کو اٹھنے کا حکم دیا اور انتہائی درد بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

"کتنے نادان ہیں آپ لوگ! اپنے جیسے ایک انسان کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ میرا باپ بھی، جو میرے لیے احترام کی جگہ ہے اور مجھ پر واجب ہے کہ میں اس کی تعظیم کروں۔ وہ بھی میرے سامنے سجدہ کرتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے، آپ لوگوں نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا، پیدا ہونے سے پہلے ہی مجھے تقدس کی چادر اوڑھا دی۔

جب میں بچہ تھا تو پیار سے اپنی ماں کی گود میں بیٹھنا چاہتا تھا لیکن میری ماں بھی میری تعظیم کے لیے میرے سامنے جھکتی تھی۔ میں چھوٹا سا تھا تو بہنوں کے پیار کے لیے ترستا تھا لیکن میری بہنیں میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ پیدائش سے لے کر اب تک مجھے باپ کی شفقت نہیں ملی۔ باپ کی شکل میں، میں نے ایک مؤدب خادم کو پایا۔ میرے چھوٹے بھائی میرے جوان ہونے تک میرے سامنے ہی نہ آتے تھے۔ مجھ سے ڈرتے تھے کہ کہیں ایشور کا اوتار ان پر اپنا قہر نہ نازل کر دے۔

میں کہیں بھی جاتا میرے آگے پیچھے جھکنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کی ایک قطار ہوتی۔ میں نے کرختستان سے تبت تک کا ہزاروں میل لمبا سفر کیا۔ تبت سے خراسان تک ہزاروں میل میں نے پیدل طے کیے لیکن جہاں بھی مجھے میرا ہم مذہب ملا وہ میرے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ میں آپ کی یہ حالت دیکھتا ہوں تو میرا رونے کو جی کرتا ہے۔ یہ کیا زندگی ہے جو آپ لوگ گزار رہے ہیں، ابھی تک زمانہ قدیم کے انسانوں کی طرح غاروں میں رہتے ہو تم لوگ!

خدا کے لیے یہ جہالت چھوڑ دو۔ میں نے مسلمانوں کو دیکھا ہے، وہ دنیا کی جدید ترین قوم ہیں۔ ان کے علماء زمین کی پاتال سے لے کر آسمان کے ستاروں تک علوم پر دسترس رکھتے ہیں۔ ان کے پاس طاقت ہے، دولت ہے، عزت ہے، حکومت ہے اور شہرت ہے تمہارے پاس کیا ہے؟ میں مہاتما بدھ کی تعلیمات کا منکر نہیں، میں مہاتما بدھ کی عزت کرتا ہوں۔ انہیں اپنا استاد اور خدا کا برگزیدہ بندہ سمجھتا ہوں لیکن میں تمہاری طرح نہیں کہ بدھائی تعلیمات کو اپنی مرضی کا مفہوم پہنا دوں، اگر تم مجھے اتنا ہی احترام دیتے ہو، مجھے ایشور کا اوتار سمجھتے ہو میری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہو تو پھر میری بات بھی مانو.....! خدارا! بتوں کی پرستش چھوڑ دو! بدھا کی تعلیمات کا مقصد سب انسانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنا تھا لیکن تم بھانت بھانت کے بتوں کی پرستش کرتے ہو۔ تم کس طرح ایک ہو سکتے ہو۔

آج کتنے سال بعد میں اپنے بھائیوں اور بہنوں کی شکلیں دیکھ رہا ہوں لیکن میں کتنا بدنصیب ہوں کہ ان سے گلے بھی نہیں مل سکتا۔"

لائیتس کی طویل بات ختم ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اس کے خاندان کی عورتیں سسکیاں لے لے کر رو رہی تھیں۔ اس کے بھائیوں کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ حتیٰ کہ اس کے باپ کے چہرے پر بھی شفقت پدری دکھائی دے رہی تھی لیکن سب لوگ بڑے لاما کے ڈر سے اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ لائیتس کی سب باتیں سننے کے باوجود بھی اس کا کوئی رشتہ دار آگے بڑھ کر اس سے بغل گیر نہ ہوا۔

لیکن لائیتس یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بوڑھے لاما کی پوتی ساری بھیڑ میں سے نکل کر باہر آئی اور لائیتس کے نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی۔ بڑا لاما اور دیگر لوگ لڑکی کی اس حرکت پر ہکا بکا رہ گئے لیکن لڑکی نے کسی کی پروا نہ کی، یہ ایک دبلی پتلی تیکھے نین نقش والی اور چہرے مہرے سے ذہین لڑکی تھی۔ لائیتس بوڑھے لاما کی پوتی کی اس جرأت پر مسرور ہوا اور اس نے اسے کھلے دل سے شاباش دی۔

"سکانا.....! میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں، اس وقت جب میں اپنوں سے ملنے کے لیے ترس رہا ہوں صرف تم ہی ہو جس نے مجھے انسان سمجھا، ورنہ باقی لوگوں میں سے کوئی بھی مجھے انسان سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔"

بوڑھے لاما کی پوتی سکانا کی آنکھوں سے چھما چھم آنسو برس رہے تھے۔ وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔

"لائیتس.....! میں تمہیں انسان سمجھتی ہوں۔ تم دل چھوٹا مت کرو، میں تم سے محبت کرتی ہوں، تم ہمارے ساتھ خوش دلی سے کرختستان چلو، تمہاری باتیں بہت اچھی تھیں، تم وہاں سب لوگوں کو ان باتوں کی دعوت دو، مجھے یقین ہے بہت سے لوگ تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

لڑکی بول رہی تھی اور بڑے لاما کی بھنویں غصے سے سکڑتی چلی جا رہی تھیں۔ بڑے لاما کو اپنی زندگی بھر کی تپسیا برباد ہوتی دکھائی دی۔ اس نے جس لڑکے کو تیار کر کے خدا کا اوتار بنایا تھا وہ لڑکا خود خدا کا اوتار بننے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ انسان بننے پر بضد تھا۔ بڑا لاما پیچ و تاب کھاتا رہا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

شام کے سائے گہرے ہو گئے اور تاریکی بڑھ گئی تو لائیتس ٹوٹا دل لیے اپنے خیمے میں جا کر لیٹ گیا۔

بڑے لاما نے لائیتس کے خیمے کے اندر سے تو پہرے دار ہٹا لیے تھے لیکن اب پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں مستعد پہرے دار خیمے سے باہر جما دینے والی سردی میں موٹا اونی لباس پہنے لائیتس کی نگرانی پر مامور تھے۔

تقریباً ابھی رات کا پہلا پہر ہی تھا کہ پڑاؤ کے پہرے داروں نے یک لخت اپنی تلواریں بے نیام کر لیں اور کان کھڑے کر لیے۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے سلجوقی دارالسلطنت رے کی سمت سے گھڑ سواروں کا کوئی دستہ آ رہا ہو۔ یہ بہت سے گھوڑوں کے سموں کی آوازیں تھیں، آنے والوں کے گھوڑے پھوٹو ہاری زمین کی وجہ سے دلکی چال چلتے ہوئے آ رہے تھے۔ پہرے داروں کے سردار نے دوڑ کر نہ صرف بڑے لاما کو جگایا بلکہ آن کی آن میں چھوٹے بڑے سب بیدار ہو کر شمشیر بہ کف ہو کر پڑاؤ کے کنارے پہ آ کر ٹھہر گئے۔ انہوں نے گویا پڑاؤ کے سامنے اپنے جسموں کی دیوار بنا کر کھڑی کر لی تھی۔ وہ سب ڈر گئے تھے کہ کہیں ڈاکوؤں یا لٹیروں کا کوئی گروہ آ پہنچا تھا۔ کراختائیوں کا قافلہ شاہراہ کے پہلو میں ہی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گھوڑوں کے چلنے کی آواز سن کر ہی سارا پڑاؤ بیدار ہو گیا۔

لیکن یہ دیکھ کر کراختائیوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آنے والے گھڑ سواروں کا دستہ اپنی مخصوص رفتار سے چلتا ہوا شاہراہ پر سے گزرتا چلا گیا۔ گھڑ سواروں نے خیمے کے اس پڑاؤ کی جانب ایک لمحے کے لیے بھی رک کر نہ دیکھا۔ کراختائی حیران تھے کہ رات کی اس تاریکی میں یہ کون لوگ تھے جو اس قدر عجلت کے ساتھ شاہراہ نیشاپور پر آگے بڑھ رہے تھے۔ پچاس کراختائیوں کا قافلہ اگرچہ تیرھویں رات کی چاندنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا لیکن گزرنے والے گھڑ سواروں نے اہل قافلہ سے کوئی تعرض نہ کیا۔ چاند کی

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

تھا' اس کے قبضے میں آنے والا تھا۔ اصفہان پر قبضے کا مطلب تھا پورے ایران پر باطنیوں کا قبضہ۔ ابن عطاش شہر میں خوف و ہراس پھیلانے والے اپنے کارکنوں کو ہر رات نئی ہدایات دیتا اور یہ کہتا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اصفہان کے تمام غیر باطنیوں کو یہاں سے نکال دو۔ انہوں نے میرے باپ عبدالملک عطاش کو بے عزت کر کے اس شہر سے نکالا تھا۔ اب میں کسی ایک غیر باطنی کو بھی اس شہر میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میری کوشش ہے کہ اصفہان ہفت امامیوں کا مرکز عظیم بن سکے۔ تا کہ مصر کی فاطمی خلافت کو ایران میں ایک مضبوط حکومت میسر آ سکے۔"

ابن عطاش کی سرگرمیاں پہلے سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ جاری تھیں۔ ہر ہفتے یا پندرہ دن بعد قلعہ دژکوہ سے قلعہ الموت کی جانب نئے نوجوانوں کی کھیپ روانہ کی جاتی۔ اصفہان کے چاروں طرف میں موجود عسکری نوعیت کے تقریباً تمام قلعے اب ابن عطاش کے زیر فرمان تھے۔ ان حالات میں حاکم شہر سفارت پر سفارت' ایلچی پر ایلچی' اور قاصد پر قاصد روانہ کرتا رہا' لیکن دارالسلطنت میں سلطان کے کان پر جوں تک نہ رینگی..... اور رینگتی بھی کیسے' وہاں تمام جوئیں مارنے کے لیے سعدالملک جیسا کائیاں باطنی موجود تھا۔ اس کے نزدیک عام مسلمانوں کی حیثیت سچ مچ جوؤں اور کیڑے مکوڑوں جیسی تھی۔ سعدالملک اب پوری طرح مطمئن تھا' اس نے شاہی قید خانے میں موجود فدائی کو خفیہ طور پر یہ پیغام پہنچا دیا تھا کہ وہ کوتوال شہر کے سامنے کچھ عرصہ مزید زبان نہ کھولے اور اذیتیں برداشت کر لے جلد ہی اسے فرار کروانے کا اہتمام کر دیا جائے گا لیکن اس روز سعدالملک کی حیرت کا یک آسمان کو چھونے لگی جب سلطان نے بیٹھے بیٹھے بلاوجہ جلاد کو بلوا کر یہ حکم دیا کہ زیر حراست فدائی کو دربار میں لایا جائے اور تمام حاضرینِ دربار کے سامنے قتل کر دیا جائے۔ سعدالملک اپنی نشست پر یوں اچھلا جیسے اسے کسی بچھو نے ڈس لیا ہو۔ اس کا اس طرح اچانک اچھلنا بادشاہ اور دیگر درباریوں نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اب ضروری تھا کہ سعدالملک اپنی اس حرکت کی وضاحت کرے۔ چنانچہ اس نے کہا۔

"سلطانِ معظم! بات یہ ہے کہ ابھی ہم اس خطرناک فدائی سے بہت سے راز اگلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا یوں قتل کر دیا جانا ہمارے لیے غیر مفید ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ سلطان معظم کوتوال شہر کو تفتیش کے لیے چند دن مزید فراہم کریں۔"

لیکن آج سلطان کا مزاج بدلا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے۔ دربار میں حاکم اصفہان کی ایک اور سفارت آئی ہوئی تھی۔ جس میں علماء اور تاجر شامل تھے۔ ان لوگوں نے بادشاہ کو سب حالات کہہ سنائے اور بڑی انکساری کے ساتھ سوال کیا کہ

"آخر سلطان معظم باطنیوں کے قلعہ دژکوہ پر حملہ کرنے کیوں خلاف ہیں؟"

لیکن یہ بات سلطان کے لیے نئی تھی۔ سلطان کی آنکھیں غصے سے ابل پڑیں۔ اس نے اپنی مسند پر پہلو بدلا اور قہر آلود آواز میں کہا۔

"کون کہتا ہے کہ ہم نے قلعہ دژکوہ پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ہم نے حاکم اصفہان کو بیس روز پہلے ہی اپنا پیغام بھجوا دیا تھا..... تم لوگ کس طرح کی بات کر رہے ہو۔ کیا ہمارا پیغام حاکم اصفہان تک نہیں پہنچا؟"

اصفہانی وفد کے ارکان حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور آخر میں ایک بزرگ اصفہانی عالم نے آگے بڑھ کر اسی حیرت کی ساتھ کہا۔

"نہیں سلطان معظم! آپ کی ایسی کوئی سفارت اصفہان نہیں پہنچی۔ آپ کے قاصد جو پیغام لے کر حاکم اصفہان کے پاس آئے وہ یہ تھا کہ کسی قیمت پر بھی قلعہ دژکوہ پر حملہ نہ کیا جائے۔"

اب بادشاہ کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہو گیا۔ تمام اہالیانِ دربار بھی ششدر تھے۔ سلطان انتہائی بے چینی کے عالم میں بولا۔

"کیا؟ کیا کہا تم لوگوں نے؟ میرا پیغام راستے میں بدل دیا گیا۔ اوہ میرے خدا اس کا مطلب ہے کہ دربار سلطنت میں بھی خطرناک باطنی کارندے ہمہ وقت مصروف ہیں..... کوتوال شہر!"

سلطان نے کوتوالِ شہر کو پکارا۔

"کوتوال شہر.....! کیا آپ نے اس فدائی سے کچھ اگلوایا۔ جسے ابوسلیم بغدادی کی شہادت کے موقع پر ایک بہادر نوجوان نے گرفتار کیا تھا؟"

کوتوال شہر تھر تھر کانپنے لگا اور پھنسی ہوئی آواز میں عرض گزار ہوا۔

"نہیں سلطان معظم! وہ شخص بے حد سخت جان ہے۔ میں ہر طرح کا حربہ استعمال کر چکا ہوں لیکن اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔"

تب سلطان نے بپھر کر اتنی بلند آواز کے ساتھ جلاد کو حکم دیا کہ دربار میں موجود ہر شخص کی سانسیں رک گئیں۔

"ہم جلاد کو حکم دیتے ہیں کہ اس بے مقصد اور بے مصرف فدائی کو یہاں ہمارے سامنے لا کر ابھی اور اسی وقت تہہ تیغ کیا جائے۔"

یہی وہ حکم تھا جسے سننے کے بعد سعدالملک اپنی نشست پر بری طرح اچھلا تھا اور اب وضاحت کے طور پر کہہ رہا تھا کہ ہمیں اس فدائی کو ابھی نہیں مارنا چاہیے بلکہ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اس سے باطنیوں کے راز اگلوا سکیں..... دراصل سعدالملک کو ایک فدائی کی قیمت کا احساس تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس قیمتی جاں نثار باطنی کی جان یوں اچانک ضائع ہو جائے لیکن آج سلطان کسی کی کوئی بات سننے والا نہیں تھا۔ سلطان محمد بن ملک شاہ سلجوقی سلطنت کا واحد بادشاہ تھا جو باطنیوں کی حرکتوں سے اس قدر عاجز آیا کہ اس نے اپنی تمام تر توانائیاں صرف اور صرف باطنیوں کا قلع قمع کرنے پر صرف کر دیں۔ اس نے اسی وقت ابوسلیم بغدادی کے قاتل فدائی کو پابہ زنجیر دربار میں لانے کا حکم دیا۔ سب اہالیانِ دربار سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ آج سلطان محمد کے چہرے پر جاہ و جلال کی ایک نئی لہر دوڑ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا گویا آج سے اس نے باطنیوں کے خلاف نئے عزم اور نئے ارادے باندھ لیے ہوں۔ اس کا وزیر سلطنت سعدالملک اپنی نشست پر بیٹھا بار بار پہلو بدل رہا تھا' حکیم شہر الحق بھی دربار میں موجود تھا اور اس کی بھی تقریباً یہی حالت تھی۔ سلطان کے دربار میں اور بھی باطنی تھے۔ جو سب سلطان کے فیصلے سے کہ وہ فدائی کو ابھی قتل کرنے والا تھا' دل ہی دل میں سلطان کو گالیاں دے رہے تھے۔

کچھ دیر بعد زنجیروں میں جکڑے ہوئے فدائی کو لایا گیا۔ دربار میں موجود ہر شخص کی نگاہیں دروازے کی طرف اٹھیں۔ شاہی محافظ دستے کے سپاہی برہنہ شمشیریں ہاتھوں میں پکڑے اس خطرناک فدائی کو اپنے آگے آگے لیے چلے آ رہے تھے۔ فدائی سینہ تان کر چل رہا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اسے اپنی موت کا ذرہ بھر بھی دکھ نہ ہو اور اسے دکھ ہوتا بھی کیسے ایک فدائی کو تیار کرنے کے لیے اس کے ذہن کی کتنی تربیت کی جاتی تھی یہ بات بہت کم لوگ ہی جانتے تھے' وہ تو جنت دیکھ چکا تھا قلعہ الموت کی

www.pkdigest.com

Pdf by Roadigest

جنت۔ جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں اور سونے چاندی کے محلات تھے۔ لعل و جواہر سے آراستہ روشیں تھیں اور دنیا کا ہر پھل دار درخت وہاں ہمہ وقت پھل اٹھائے کھڑا تھا اور سب سے بڑھ کر جالی دار لباس پہنے وہ شفاف جسم کی مالک جوان العمر حوریں جن کے بدن پر نظر پڑتے ہی اہل جنت کی حالت آپے سے باہر ہونے لگتی تھی..... یہ فدائی تھا اور اسی جنت میں چند دن گزار کر آیا تھا۔ اب تو اسے یقین تھا کہ جونہی اس کی موت واقع ہوگی یہ سیدھا اسی جنت میں جا پہنچے گا۔ چنانچہ فدائی سینہ تانے بادشاہ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ سلطان کینہ توز نگاہوں سے اس خطرناک فدائی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو یہ ممکن ہے لیکن اس کے لیے تمہیں ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔"

فدائی نے سلطان کی بات کی کچھ پرواہ نہ کی اور سلطان کی آنکھوں میں اپنی سرخ آنکھیں گاڑتے ہوئے جواب دیا۔

"میں اپنا کام کر چکا..... اب تم اپنا کرو اے بیوقوف بادشاہ۔"

سلطان کی توقعات کے بالکل برعکس فدائی نے انتہا درجے کی ڈھٹائی اور بے ادبی سے جواب دیا۔ دربار میں بیٹھے سب لوگ اپنی اپنی جگہ فدائی کا جواب سن کر لرز گئے۔ اب معاملہ سلطان کی برداشت سے باہر تھا۔ چنانچہ سلطان نے جلاد کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس گستاخ جانور کا سر کاٹ دیا جائے۔"

..... اگلے لمحے جلاد آگے بڑھا اور اس کی تلوار لمبے تڑنگے فدائی کی گردن پر پڑی۔ پلک جھپکنے میں فدائی کا سر کٹ کر فرش پر لڑھکتا چلا گیا۔ اس کا دھڑ کسی ستون کی طرح دھڑام سے زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔ چند ثانیے بعد وہ ساکت ہو چکا تھا۔ اسی لمحے سلطان کی آواز دربار میں گونجی۔

"اس ناہنجار کا سر اور دھڑ بیچ چوراہے پر لٹکا دیے جائیں تاکہ لوگ عبرت پکڑ سکیں۔"

اس سزائے موت کے ساتھ دربار تو برخاست ہو چکا تھا لیکن سعد الملک کے دماغ سے غصہ ابھی تک نہ نکل پایا تھا۔ ایک تو اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اب سلطان کسی قیمت پر بھی اس کی بات نہیں مانے گا۔ اور اصفہان کی جانب بہرصورت لشکر روانہ کرے گا۔ اس کا یہ خیال درست تھا۔ سلطان نے بغیر کوئی فیصلہ کیے یہ دربار اسی لیے برخاست کیا تھا کہ وہ آج رات اپنے عزیز ترین دوست موید الملک کو بلوا کر اصفہان کے معاملہ پر پوری سنجیدگی کے ساتھ کوئی حتمی فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ موید الملک کون تھا؟ اس عظیم انسان کا بیٹا جس کی قلم ودوات سے سلجوقی سلطنت چلتی تھی۔ یہ نظام الملک طوسی کا بیٹا تھا اور سلطان محمد کا دوست۔ یہی نوجوان تو تھا جس نے بھائیوں کی کشمکش کے دوران ..... برکیاروق سے سلطان محمد کی جان بچائی تھی۔ موید الملک، سلطان محمد کے گہرے دوستوں میں سے تھا لیکن وہ دربار سلطنت میں کم حاضر ہوتا تھا۔ آج سلطان نے موید الملک کو بلوانے کا فیصلہ کیا اور یہ سوچا کہ وہ خود ایک بڑا لشکر لے کر اصفہان کی مہم پر روانہ ہو اور اصفہان کے اطراف میں پھیلے باطنیوں کے تمام قلعوں کو ایک ایک کر کے نیست و نابود کر دے۔

❀❀❀

وہ وادی اتنی حسین تھی کہ دیکھنے والی نگاہ اس پر جم کر رہ جاتی۔ یہ ایک سرسبز و شاداب پہاڑی سلسلے کے بیچوں بیچ کئی سو گز مربع کا ایک قطعہ مخملیں تھا۔ چاروں طرف خوشنما پھلوں سے لدے پیڑوں کا ناہموار سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ قدرت نے گویا زمین

کا یہ حصہ فردوسِ بریں کی مثل پیدا کیا تھا۔ بادِ ہوا کے دوش پر تیرتے ہوئے اس وادی کے اوپر سے گزرنے لگتے تو اس حسن کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک جاتے۔ اس سرزمین کا پتا پتا آبِ فردوس سے دھلا ہوا تھا۔ سبزے کی مخملیں چادر وادی کے مسطح میدان میں کسی سبز قالین کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ چاروں طرف دکھائی دینے والی مخملیں پہاڑیاں اور ٹیلے ہمہ وقت آسمان کی طرف منہ کیے گویا پرواز کر جانے کے لیے تیار رہتے۔ دور شمال مشرق میں برف پوش چوٹیاں تھیں جن سے مہر منور کی دھلی ہوئی کرنیں دن بھر وادی کے میدان میں ضوفشانی کرتی تھیں۔ پہاڑیوں کے بیچوں بیچ سے صاف شفاف پانی کے ندی نالے یوں گزرتے تھے گویا کسی نے موتیے کی لڑیاں بکھیر دی ہوں۔ ندی نالے ذرا آگے چل کر جب مخملیں میدان میں داخل ہوتے تو کسی فردوس سے نکلتی ہوئی آبِ جو کی شکل اختیار کر لیتے۔ پانی کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والے بھاری بھرکم پتھر اپنی پوری تگ و دو صرف کر کے بھی اس آبجوئے دلفریب کا راستہ نہ روک سکتے۔ ان سے ٹکرا کر پانی جب اچھلتا تو دودھ کی طرح جھاگ اڑاتی ہوئی ایک سفید موج کی شکل اختیار کر لیتا اور پھر موج جب فضائے معطر کو چوم کر دوبارہ نیچے آتی تو اپنے دونوں ہاتھوں سے پتھر کا چہرہ دھلا دیتی۔ پتھر لڑھک لڑھک کر اس آبِ سرمست کا راستہ روکتے رہتے اور پانی ان کا چہرہ دھلاتا رہتا۔

پتھروں نے گر کے پانی کی روانی روک دی
اور پانی ان پہ بیٹھی گرد کو دھوتا رہا

ندی کے کنارے استادہ اشجار کسی دیوقامت راج ہنس کی طرح پانی پر جھکے دن بھر اس شوخ ندی کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتے رہتے۔

اس وادی کی سرمست موجیں زمرد کی طرح چمکتے پتھروں سے ٹکراتیں تو یوں لگتا جیسے ہفت اقلیم کی دیویاں اس خاموش وادی میں بیٹھی بربط بجا رہی ہوں۔

پھولوں کی روش وادی کے مسطح میدان میں ندی کے پہلو سے نکل کر وسطی وادی میں یوں چلی گئی تھی گویا موجیں سر دھنتے دھنتے پھولوں میں بدل گئیں اور پھول وادی کی جانب بہہ نکلے۔ یوں گویا بربت سے آئی ہوئی جل پنا دیوی کے لیے کسی نے گل ہائے رنگا رنگ سے آراستہ قالین بچھا دیا ہو جس پر چل کر جل پنا ندی تک آتی ہو۔ روش کے پہلو بہ پہلو ہر دو سمتوں میں شیشے کی طرح چمکتے نیم دائروی تالاب تھے جن میں اس شفاف آبجو کا معطر پانی لہر در لہر گھومتا رہتا۔ تالاب کے اطراف واکناف کاسنی پھولوں کی چادر سے پیراستہ تھے غالباً جل پنا اسی تالاب میں اپنے یاقوتی بدن کو غسل دیتی تھی۔ پھولوں کی روش لکڑی سے بنے اس مکان تک چلی گئی تھی جو وادی کے عین وسط میں کسی نگینے کی طرح جڑا ہوا تھا۔ یہ پھولوں کی روش قطار در قطار دھی وسطی قطار میں پھولوں کے بجائے سبز سنگ مرمر کی جڑاؤ سلیں تھیں۔ جل پنا اپنے منقش جوتے میں سجا عنابی پیر سنگ مرمر کی سلوں پر رکھتی تو روش کے پھول مسکرا اٹھتے۔ سنگ مرمر کے اس تنگ سے راستہ کے اطراف میں قطار در قطار رنگا رنگ کے گلاب، چنبیلیاں، گیندے، لالہ وسوسن اور کاسنی پھول لہلہا رہے تھے۔ پھل دار پیڑوں کی شاخوں پر ننھی منھی خوش رنگ چڑیاں چوں چوں کرتی ادھر سے ادھر پھدکتی پھر رہی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ)

Pdf by Roadsign

نقلی چور

راحیلہ تاج

قارئین کی فرمائش پر انگریزی ادب سے انتخاب' جرم و سزا کی ایک انوکھی تحریر' ان ذہین مجرموں کا قصہ عجیب جو اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑتے مگر پھر بھی قانون کی گرفت سے نہیں بچ پاتے۔

مغربی جاسوسی ادب سے انتخاب ایک کہانی

کوئی بھی شخص پیدائشی طور پر مجرم نہیں ہوتا بلکہ حالات و واقعات' اس پر ہونے والے ظلم اور ناانصافی اسے مجرم بنا دیتے ہیں لیکن اگر ان پر توجہ دی جائے تو ایسے لوگ سدھر کر معاشرے کا ایک حصہ بن کر بہتر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُتر پردیش کی حکومت نے جو قدم اٹھایا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ لکھنو سینٹرل جیل میں انتظامیہ نے ایک درس گاہ قائم کی ہے جہاں قیدیوں کو تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ انہیں برے کاموں اور بری عادتوں سے دور رہنے اور ایک نیک اور اچھا انسان بننے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

جن قیدیوں کا جیل کے اندر اچھا سلوک ہوتا ہے' ان کی رپورٹ جیل انتظامیہ درس گاہ کے منتظمین کو بھجواتی ہے اور ایسی ہی اچھی رپورٹ کے حامل قیدیوں کو اس درس گاہ میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ لکھنو سینٹرل جیل کی طرح ابھی حال ہی میں بنگلور کی سب سے بڑی جیل ''پاراپاندا گراپارا'' کی انتظامیہ نے بھی ایسا ہی قدم اٹھایا ہے۔ 'پاراپاندا گراپارا' جیل کی خوبی یہ ہے کہ وہاں کا قیدی اپنی سزا کی مدت پوری کرنے کے باوجود باہر جانا نہیں چاہتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیل میں قیدیوں کو بہت لذیذ کھانا دیا جاتا ہے' جو باہر کی دنیا میں دن رات محنت مزدوری کرنے کے بعد بھی انہیں نصیب نہیں ہوتا۔ اس جیل میں قیدیوں کو دوپہر اور رات کے کھانے میں روٹیاں' گرم چاول اور دو طرح کی سبزیوں کے ساتھ دودھ اور مکھن سے تیار مشہور 'سامبر' ڈش بھی دی جاتی ہے جب کہ ہفتے میں ایک دن میٹھے کی ایک ڈش بھی ہوتی ہے۔

اس خبر کے آخر میں اخبار کے ایڈیٹر نے اپنی طرف سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بھارت کے تمام صوبوں کی حکومتیں اپنی جیلوں میں قیدیوں کو تعلیم و تربیت اور اچھے کھانے کی سہولتیں پیش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ معاشرے سے جرائم کا خاتمہ نہ ہو سکے۔

••○••○••

اس خبر کو پڑھ کر میرے دل میں امید کی ایک کرن پیدا ہونے لگی تھی کہ اگر ہر آدرش جیل میرے پیٹ کا مسئلہ حل کر دے تو کتنا اچھا ہو۔ میں اب ستر سال کا ہونے والا ہوں اور حکومت نے میری پنشن صرف ڈھائی سو روپے مقرر کی ہے۔ اس مہنگائی کے دور میں بھلا ڈھائی سو روپے میں کیسے گزارا ہو سکتا ہے؟

یہ تو اچھا ہوا کہ چند سال قبل بیوی بیمار پڑی اور بغیر دوا دارو کے چپ چاپ مر گئی۔ ایک بیٹا تھا جو اپنی ماں کی موت کے کچھ عرصہ بعد ہی سڑک کے ایک حادثے میں مارا گیا اور تب سے میں اکیلا ہی زندگی کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ مگر ان ڈھائی سو روپے میں پورے ایک مہینے تک زندگی سے لڑا نہیں جا سکتا۔ اب چونکہ بھوکا مرنے کی نوبت آ گئی تھی اس لیے میں نے 'پاراپاندا گراپارا' جیسی پرکشش جیل کا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

لیکن سب سے بڑا مسئلہ میرے سامنے یہ تھا کہ بغیر کوئی جرم کیے میں گرفتار ہو کر جیل نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے میرے لیے یہ ضروری تھا کہ میں کوئی جرم کروں اور گرفتار ہو جاؤں۔ لیکن میں نے زندگی میں کبھی چھوٹے سے چھوٹا جرم بھی نہیں کیا تھا۔ اب اس عمر میں مجھ سے ایسا کیا جرم ہو سکتا تھا؟ دکان کے تالے نہیں توڑ سکتا تھا' کانپتے ہاتھ سے کسی کی جیب بھی نہیں کاٹ سکتا تھا۔

ایک بار میرے ذہن میں یہ بھی خیال آیا کہ جس طرح جیل سے کبھی کبھی کوئی قیدی بھاگ بھی جاتا ہے اسی طرح کیا میں بھی اس دنیا سے بھاگ کر جیل کی دنیا میں نہیں پہنچ سکتا؟ اگر میں اپنے آپ کو ''اسمگل'' کر کے اندر پہنچ جاؤں تو کیسا رہے گا؟ میں نے سوچا کہ میں اگر ایسا کوئی منصوبہ بناتا ہوں اور اس میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو ٹھیک ہے اور اگر جیل کے اندر داخل ہوتے وقت کسی نے مجھے پہچان لیا کہ یہ جیل کا قیدی نہیں ہے تو بھی جیل کے اندر زبردستی یا چوری چھپے داخل ہونے کے جرم میں مجھے قید کی سزا ہو سکتی ہے۔ یعنی میرے منصوبے کی کامیابی یا ناکامی دونوں سے ہی مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ بہت سوچنے کے بعد میں نے ایسے ہی ایک منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا لیکن میرا یہ منصوبہ شروع ہونے سے پہلے ہی ناکام ہو گیا۔

ہوا یہ کہ چند قیدی جیل کے کھیت میں کام کرنے آئے تھے۔ انہیں کھیت میں پانی ڈالنا تھا اور سبزیاں اور پھل وغیرہ توڑنے تھے۔ میں وہاں پہلے سے ہی جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ ایک قیدی جب جھاڑیوں کی کٹائی کرتا ہوا میرے قریب آیا تو میں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ پہلے تو وہ مجھے جھاڑیوں میں چھپا ہوا دیکھ کر ڈر گیا۔ پھر وہ میرے قریب آ گیا تو میں نے دھیرے سے کہا۔ ''ڈرو مت بھائی۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میں تو تمہاری مدد کرنے آیا ہوں۔''

''کیسی مدد؟'' قیدی نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

''ارے بھائی اگر تم اس قید خانے سے نکل کر آزاد زندگی گزارنا چاہتے ہو تو میں تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اتارو اپنی وردی اور یہ ٹوکری قینچی مجھے دے دو۔ تم میرے کپڑے پہن کر بھاگ جاؤ' میں تمہاری جگہ قیدی بن کر جیل میں رہ لوں گا۔''

وہ قیدی بڑی حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر میرے سفید بالوں پر نظر پڑتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ تب ہی اس کا ایک ساتھی قیدی آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس دوسرے قیدی کو دیکھ کر پہلے والے قیدی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس بڈھے کو دیکھو یار اس پر بڑھاپے میں سنک سوار ہو رہی ہے۔ جیل جانے کا شوق ہو رہا ہے۔ کہہ رہا ہے تم بھاگ جاؤ میں تمہاری جگہ اندر چلا جاتا ہوں۔''

یہ سن کر دوسرا قیدی ہنس پڑا۔ پھر ہنستے ہوئے مجھ سے بولا۔ ''بابا جی تم جانتے ہو کہ یہ اس جیل کا قیدی کیسے بنا ہے؟''

''نہیں تو۔ کیسے بنا ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''اس کے بھائی پر قتل کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا اور وہ ضمانت پر رہا تھا مگر اس دوران اس کی موت ہو گئی۔ اور انہی دنوں اس 'پاراپاندا گراپارا' جیل میں قیدیوں کے لیے بہترین رہن سہن اور بہترین کھانے پینے کے انتظامات کا اعلان ہوا تھا' بس پھر کیا تھا یہ اپنے مرحوم بھائی کی جگہ عدالت میں حاضر ہو گیا اور قتل کا جرم قبول کر لیا۔ مرحوم بھائی سے اس کی صورت شکل بہت ملتی جلتی تھی اس لیے کسی نے بھی اسے نہیں پہچانا اور بھائی کے نام پر جرم کی سزا پا کر یہاں آ گیا اور اب یہاں موج اڑا رہا ہے۔''

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

اس قیدی کی بات سن کر میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ بھلا اتنا اچھا کھانا پینا اور اتنا اچھا رہن سہن چھوڑ کر یہ جیل سے باہر کیوں جائے گا؟ باہر تو اس کو کوئی بھیک بھی نہیں ملے گی..... اور اس طرح میرے اسمگل ہو کر جیل کے اندر جانے کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔

جرم کیے بغیر مجھے کوئی جیل میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن ستر سال کا بوڑھا بھلا ایسا کیا جرم کر سکتا تھا؟ سوچتے سوچتے میں نے پھر ایک آسان ترکیب ڈھونڈ نکالی۔ اس دن بارش ہو رہی تھی اور میں نے ایک ہوٹل میں جا کر خوب ڈٹ کر کھانا کھایا اور چائے پی اور بل ادا کیے بغیر باہر آنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ میرے سامنے کھانا رکھنے والا ٹیبل بوائے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے مالک کو پکارے گا اور ہوٹل کا مالک مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دے گا لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ بھیڑ کی وجہ سے کسی نے میری طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ میں ہوٹل کے دروازے پر کچھ دیر تک منڈلاتا بھی رہا کہ شاید اب بھی ٹیبل بوائے میری طرف توجہ دے لے لیکن میری یہ کوشش بھی بے کار گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں آدمی کے بجائے کوئی بلی تھا جس کی طرف کوئی دیکھتا ہی نہیں تھا۔ دروازے کے قریب ہی بھیگی چھتریوں کو رکھنے کے لیے لکڑی کا ایک ہینگر بنا ہوا تھا تاکہ ہوٹل کے اندر آنے والے گاہک اپنی بھیگی چھتریاں اس ہینگر پر لٹکا دیں۔ اس وقت بھی وہاں کچھ چھتریاں لٹک رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر ان میں سے ایک نئی اور پیتل کے خوبصورت ہینڈل والی قیمتی چھتری اٹھالی اور اسے ہاتھ میں تھامے وہیں منڈلانے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ شاید اس بار خدا میری دعا قبول کر لے گا اور چھتری کا مالک مجھے پکڑ لے گا۔

اچانک کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روکا۔ ”ارے چاچا جی یہ چھتری میری ہے۔ تم کہاں لے جا رہے ہو اسے؟“

”میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک دبلا پتلا جوان آدمی تھا۔ اس کے کپڑے گندے اور میلے تھے۔ شکل سے بھی وہ چرسی موالی لگ رہا تھا۔ میں اس کے سامنے اکڑ گیا' بات بڑھتے وقت کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ہوٹل کا مالک تھوڑی دیر تک تو ہمیں دیکھتا رہا پھر اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا اور اس چرسی جیسے شخص سے بولا۔ ”یہ قیمتی چھتری تیری نہیں ہے۔ مجھے تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تو یہاں اکثر چائے پینے آتا ہے۔ چل جا یہاں سے۔ یہ چھتری انہی بڑے صاحب کی ہے۔“

وہ جوان تھوڑی دیر تک بڑبڑاتا رہا۔ پھر ایک طرف چلا گیا۔ میں ہوٹل کے پاس سے ہٹ کر سامنے والے فٹ پاتھ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ بارش اب تھم گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ نوجوان چورا ہے پر کھڑے ہوئے پولیس مین کو لے کر ضرور آئے گا اور وہ مجھے چھتری کی چوری کے جرم میں گرفتار کر لے گا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ پولیس مجھے پکڑ کر پہلے تھانے لے جائے گی۔ پھر مجھے عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ عدالت میں میرے اقرار جرم کرنے پر جج مجھے چند ماہ کی قید کی سزا سنا کر جیل بھیج دے گا اور اس طرح میرے پیٹ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

لیکن کافی دیر تک نہ وہ آدمی واپس آیا اور نہ ہی کوئی سپاہی آیا۔ تب مجھے لگا کہ وہ چرسی جوان بھی شاید چور ہی تھا۔ اس نے یہ چھتری یقیناً کہیں سے اڑائی ہو گی جب ہی تو اس نے پولیس سے مدد نہیں لی تھی۔ بہر حال اب تو یہ چھتری میرے گلے پڑ گئی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ کئی ترکیبیں میرے دماغ میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ تب اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ خود ہی پولیس تھانے میں جا کر یہ بتا دوں کہ یہ

چھتری چوری کی ہے اور میں نے ہی چرائی ہے۔ یہ ترکیب مجھے ہر لحاظ سے اچھی لگی۔ اس لیے میں چھتری ہاتھ میں لے کر تھانے کی طرف چل پڑا۔ تھانے کے اندر ایک میز کے پیچھے ادھیڑ عمر حوالدار بیٹھا ایک رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ ”حوالدار صاحب..... یہ چھتری میں نے چرائی ہے.....“

حوالدار نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ ”کہاں سے اڑائی ہے؟“

”کیپٹل سنیما کے قریب گلزار ہوٹل میں سے۔“ میں نے کہا۔ ”اڑائی نہیں چرائی ہے۔“ میں نے لفظ ”چرائی“ پر زیادہ زور دے کر کہا تھا۔

لیکن پھر بھی حوالدار نے میری طرف دھیان نہیں دیا اور جلدی جلدی رجسٹر پر قلم چلاتا ہوا بولا۔ ”گلزار ہوٹل ہمارے تھانے والے علاقے میں نہیں پڑتا اس لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“

”تو پھر اس علاقے کا تھانہ کون سا ہے؟“ میں نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”ماروتی مارکیٹ تھانے میں جا کر رپورٹ کرو۔“

”لیکن میں تو آپ ہی کے علاقے میں رہتا ہوں۔“ میں نے آخری کوشش کی۔

”تو میں کیا کروں؟ جہاں سے مال چوری ہوا ہے اسی علاقے میں رپورٹ درج ہو گی۔“ اتنا کہہ کر وہ رجسٹر کے ورق پلٹنے لگا..... مجبوراً میں چھتری سمیت تھانے سے باہر نکل آیا۔ ایک عجیب سی الجھن تھی۔ چھتری کو اپنے پاس رکھنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ایک بار تو جی میں آیا کہ کسی بازار کے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر زور زور سے چلاؤں..... ”بھائیو..... دیکھو یہ چھتری چوری کی ہے۔ بہت قیمتی چھتری ہے لیکن میں اسے صرف پانچ روپے میں بیچ رہا ہوں..... صرف پانچ روپے میں۔“ میرا خیال تھا کہ سڑک پر آتے جاتے لوگوں کے ساتھ پولیس بھی میری طرف متوجہ ہو جائے گی اور چوری کی چھتری کی بات سن کر کوئی اسے پانچ روپے میں بھی خریدنے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔ اس کے علاوہ چھتری کی چوری کے جرم میں شاید پولیس گرفتار بھی نہ کرے کیونکہ آج کل پولیس چھوٹی موٹی چوری چکاری کی وارداتوں میں کسی کو گرفتار کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیل میں پہلے ہی گنجائش سے زیادہ قیدی بھرے ہوئے تھے اور اگر پولیس نے لوگوں کے سامنے مجھے پکڑ بھی لیا تو کوئی نہ کوئی نقطہ نکال کر مجھے کچھ دور لے جا کر چھوڑ دے گی۔ یہ ہی سب سوچ کر میں نے یہ آئیڈیا بھی ترک کر دیا اور ماروتی مارکیٹ کے تھانے کی جانب چل پڑا۔ تھانے کے اندر جا کر میں نے انسپکٹر سے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب میں اپنے ایک جرم کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔ یہ چھتری میں نے چرائی ہے۔“

انسپکٹر مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے؟ اور یہ چھتری چرائی ہے؟ ناممکن ماسٹر صاحب۔ آپ بھلے مجھے نہ پہچانیں مگر میں آپ کو پہچانتا ہوں۔ کوتوالی بلڈنگ کے پاس والے سرکاری اسکول کی دوسری کلاس میں بیٹھ کر جب میں قمیص کی آستین سے ناک پونچھا کرتا تھا تب آپ ہی تو مجھے سمجھاتے تھے۔ اور پانچویں جماعت میں ایک دن جب میں چھپ کر سگریٹ پی رہا تھا تو اس وقت آپ نے مجھے تھپڑ مارا تھا' اس لیے میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ یہ آپ کی دی ہوئی تعلیم کا ہی نتیجہ ہے کہ آج میں پولیس انسپکٹر کی کرسی پر بیٹھا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس انسپکٹر نے دوسری میز پر بیٹھے ہوئے حوالدار سے کہا۔ ”حوالدار اس چھتری کی تفصیل اور حلیہ وغیرہ لکھ لو..... ماسٹر صاحب مذاق کر رہے ہیں..... ویسے یہ چھتری آپ کو کہاں سے ملی ہے؟“

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

"مل نہیں ہے انسپکٹر صاحب۔ یہ میں نے آج ہی چرائی ہے۔" میں پوری سنجیدگی سے بولا۔

"آپ تشریف رکھیے۔" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور مجھے بتائیے کہ آج آپ پر مذاق کی دھن کیوں سوار ہوگئی ہے؟"

"یہ مذاق نہیں ہے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "یہ حقیقت ہے اور میں سچ بول رہا ہوں۔"

اتنے میں حوالدار چھتری کی تفصیل رجسٹر میں لکھ کر لے آیا اور انسپکٹر کے پاس آ کر سنانے لگا۔ "چھتری کا ٹریڈ مارک ہرن ہے' کپڑے کا رنگ سیاہ ہے۔ کپڑے کے نیچے اسٹیل کے تاروں کا جال ہے جب کہ چھتری کی ڈنڈی پیتل کی ہے مگر اندر سے پولی ہے۔ چھتری کا ہینڈل پیتل کا ہے اور انگریزی کے حرف U کی طرح مڑا ہوا ہے جس کی ایک جانب انگریزی میں تین حروف کھدے ہوئے ہیں۔ ایچ ایم پی......"

"کیا کہا؟" انسپکٹر چونک کر بڑبڑایا۔ "ایچ ایم پی۔ اس کا مطلب ہے یہ وہی چھتری ہے جس کی چوری کی رپورٹ پندرہ روز قبل درج کرائی گئی تھی۔ حاجی مراد پنجوانی نے یہ رپورٹ کی تھی اور اتفاق سے میں نے ہی اسے رجسٹر میں لکھا تھا۔" یہ کہہ کر انسپکٹر میری طرف گھوم گیا اور مسکرا کر بولا۔ "اب بتائیے ماسٹر صاحب' پندرہ روز قبل چوری ہو جانے والی چھتری کا آج چرایا جانا کیسے ممکن ہے؟ مگر خیر آپ فکر نہ کریں میں سنبھال لوں گا۔" اتنا کہہ کر انسپکٹر نے اپنی کیپ اٹھائی اور حوالدار سے بولا۔ "مجھے ذرا ایک تفتیش کے سلسلے میں جانا ہے۔ تم ماسٹر صاحب کو چائے وائے پلا کر رخصت کرنا اور جب یہ جانا چاہیں تو ان کا پتا وغیرہ لے لینا تاکہ ضرورت پڑنے پر ان سے رابطہ کیا جا سکے۔"

"بہتر ہے۔" حوالدار نے کہا۔

ٹھیک اسی وقت میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انسپکٹر نے فون کی طرف دیکھا اور اپنی کیپ میز پر رکھ کر فون کی جانب بڑھ گیا۔ ریسیور کان سے لگا کر وہ دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ انسپکٹر تو فون پر بات کر رہا تھا لیکن میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ یہاں بھی میرا داؤ خالی گیا تھا۔ نہ جانے کیوں سب ہی پولیس والوں نے مجھے جیل بھیجنے کا پروگرام ملتوی کر رکھا ہے؟

پہلے تو محض شک کی بنیاد پر لوگوں کو پکڑ کر ان پر جھوٹے اور الٹے سیدھے الزامات لگا کر جیل میں ٹھونس دیا جاتا تھا اور آج یہ لوگ ایک سچے چور کو بھی گرفتار کرنے کے بجائے تھانے میں عزت و احترام سے بٹھا کر چائے پانی سے اس کی خاطر تواضع کر کے اسے رخصت کر رہے ہیں۔ پولیس کی اس غیر ذمہ داری اور الٹی سیدھی حرکتوں کو دیکھ کر میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر مجھے جیل کے اندر سکونت اختیار کرنی ہے تو مجھے دنگا فساد' مار پیٹ' خون خرابہ' قانون شکنی' ڈاکا یا پھر قتل جیسی کوئی بڑی واردات ہی کرنا پڑے گی۔ چھتری وغیرہ جیسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی چوری سے میرے جیل جانے کا مسئلہ حل نہیں ہوگا اور اب مار دھاڑ کے بغیر کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

ابھی میں یہ سب باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک انسپکٹر نے ٹیلی فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا۔ پھر جب اس نے لائٹر جلا کر سگریٹ سلگایا تو اس وقت میرا جوش بام عروج پر پہنچ چکا تھا۔ مار دھاڑ...... مار دھاڑ اور بس مار دھاڑ۔ میرے سینے کے اندر سے یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ یکا یک میری مٹھیاں بھنچ گئیں اور دوسرے ہی پل اٹھ کر میں نے انسپکٹر کے گال پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ یہ ہی ایک طریقہ میری سمجھ میں آیا تھا اور میں نے اس پر فوری عمل بھی کر ڈالا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ کسی سرکاری وردی والے شخص کو مارنا کتنا بڑا جرم کہلاتا ہے۔ اس کے لیے مجھے لمبی سزا بھی ہو سکتی ہے اور بھاری جرمانہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور جرمانہ ادا نہ کر سکنے کی صورت میں مزید چھ آٹھ مہینے جیل میں قید رہنے کی سزا دی جا سکتی ہے۔

مجھے سو فیصد یقین تھا کہ چانٹا لگتے ہی انسپکٹر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دے گا لیکن یہ کیا؟ وہ تو کھسیایا ہوا میرے قدموں پر جھک گیا تھا اور شرمسار لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "مجھے معاف کر دیجیے ماسٹر صاحب...... مجھ سے بڑی بھول ہوگئی۔ پانچویں کلاس میں جب پہلی بار آپ نے سگریٹ پینے پر مجھے تھپڑ مارا تھا تو اس وقت میں نے آپ کے قدموں میں گر کر زندگی میں کبھی سگریٹ نہ پینے کی قسم کھائی تھی۔ میں اس قسم کو بھول گیا تھا مگر آج آپ نے مجھے یاد دلا دیا۔"

اس کے منہ سے سگریٹ کب کا فرش پر جا گرا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے قدموں پر سے اٹھا اور حوالدار سے بولا۔ "حوالدار ذرا دیکھنا تھپڑ مارنے کی وجہ سے کہیں ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں چوٹ نہ لگ گئی ہو۔ ذرا تیل وغیرہ کی مالش کروا دو۔" یہ کہہ کر وہ میری جانب مڑا اور بولا۔ "معاف کیجیے ماسٹر صاحب مجھے ذرا جلدی پہنچنا ہے۔ میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنا گال سہلاتا ہوا اپنے دفتر سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں دیر تک ہاتھ ملتا بیٹھا رہا۔ میرا یہ تیر بھی نشانے پر نہیں لگا تھا جس کا مجھے بے حد افسوس ہو رہا تھا۔ مجھے تو رہ رہ کر استاد اور شاگرد کے اس رشتے پر غصہ آ رہا تھا جس نے میرا بنا بنایا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ انسپکٹر کا بچہ وہ بھی ایک عجیب ہی آدمی نکلا۔ بھلا آج کے دور میں تو بیٹا باپ کو پوچھتا تک نہیں اور وہ ہے کہ ایک ٹیچر کے پاؤں چاٹ رہا ہے۔

جہاں دیکھیے وہاں چوری' ہیرا پھیری اور مار دھاڑ کا بازار گرم تھا۔ سارے شہر کے تھانوں کے سامنے لوگ لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے تھے۔ یہ سب لوگ میری طرح اپنے اپنے جرم کا اعتراف کرنے کے لیے قطار میں کھڑے تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ پولیس انہیں گرفتار کر کے لاک اپ میں بند کرنے کے بجائے لاٹھی چارج کر کے وہاں سے بھگانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

آدرش جیل...... یعنی پارا پاندا گراپارا جیل میں جانے کے لیے لوگ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے اور جو اصل اور عادی چور اچکے' مفرور اور جرائم پیشہ تھے' وہ اپنے خفیہ ٹھکانوں سے نکل کر اپنی داڑھی مونچھیں صاف کر کے اپنی اصل صورت میں شہر کی سڑکوں اور بازاروں میں سر عام بلکہ عین پولیس کی ناک کے نیچے گھوم رہے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ جیل میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے پولیس انہیں گرفتار نہیں کرے گی حالانکہ وہ دل سے یہ چاہتے تھے کہ پولیس انہیں پہچان کر گرفتار کر کے جیل میں ڈال دے۔ اور میری طرح بہت سے نقلی چور تو اپنے ہاتھ میں "مجھے پکڑو میں چور ہوں" کی تختی اٹھائے پولیس کمشنر کے دفتر کا گھیراؤ کر کے کھڑے رہتے تھے لیکن پولیس تھی کہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ بہت ہوا تو پولیس نے کسی پر مقدمہ چلا دیا۔ وہ بھی گرفتار ہونے والے کے شدید احتجاج پر...... اور پھر عدالت کے سامنے کوئی ثبوت پیش نہ کر کے مقدمہ خارج کرا دیا۔ آدرش جیل میں قیدیوں کی تعداد بہت زیادہ ہو چکی تھی جس کی وجہ سے سرکار کو ان کا خرچ چلانے میں دشواری پیش آ رہی تھی اور عدالت کے جج صاحبان کسی کو قید کی سزا سنانے کے بجائے صرف جرمانہ لگا کر مقدمہ نمٹا دیا کرتے تھے۔ خود ملزمان کے وکیل بھی اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ ان کے موکل

www.pkdigest.com

Pdf by Roads

کو جیل کی سزا نہ ہو اور صرف جرمانہ وصول کر کے چھوڑ دیا جائے۔ گویا موکل کے وکیل ایک طرح سے پولیس کے وکیل بنے ہوئے تھے۔

شناختی پریڈ کے دوران پولیس مجرم کے موجود ہونے کے باوجود عدالت میں یہ بیان دے دیتی تھی کہ کسی کو بھی پہچانا نہیں گیا ہے اس لیے اسے چھوڑ دیا جائے۔

زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ ہر کام میں تبدیلی آ گئی ہے۔ پہلے عدالت کے حکم سے اگر کسی کو رہا کر دیا جاتا تھا تو پولیس عدالت کے باہر ہی اس پر کوئی دوسرا الزام لگا کر دوبارہ گرفتار کر لیتی تھی لیکن اب عدالت میں کسی کو بے قصور کہہ کر رہائی کا حکم دیا جاتا تھا تو وہ ملزم خوشی خوشی گھر جانے کے بجائے وہیں ایک اور جرم کرنے کی کوشش کرنے لگتا تھا اور پولیس اس طرح آنکھ بند کر کے کھڑی رہتی تھی کہ جیسے اسے کسی سے کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔

عدالتوں میں جج ملزمان کو سزا دینے کے بجائے باعزت بری کیے جانے کا حکم سناتے تھے تو وہ ملزمان عدالت میں چلانے لگتے تھے۔ ”جج صاحب یہ انصاف نہیں ہے مذاق ہے‘ ہمیں انصاف چاہیے.....“

عدالت میں ایسا شور شرابہ کرنے والے کو عدالت قید کی سزا سنا دیتی تھی اور یہ قید عدالت کے اندر ہی عدالت کے برخاست ہونے تک ہوتی تھی۔

ادھر جیل کے اندر کے قیدی جو اپنی سزا کی مدت پوری کر رہے تھے‘ انہیں پولیس کی جانب سے نوٹس موصول ہونے لگے تھے۔ ”وجہ بتائیے کہ پولیس کیوں نہ آپ کو جیل میں اچھے چال چلن کی وجہ سے سزا کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی چھوڑ دے؟“

اس طرح کے نوٹس وصول کرنے والے قیدی جیل کے اندر سراپا احتجاج بن جاتے اور ان کی طرف سے رہائی کورٹ میں اپیلیں داخل ہونے لگیں کہ ہم نے جرم کیا ہے تو ہمیں اپنے جرم کی پوری سزا کیوں نہیں بھگتنے دی جاتی۔ ہم وقت سے پہلے رہا ہونا نہیں چاہتے۔

جیل جانے کے خواہش مند لوگوں نے شہر کی سڑکوں اور دیواروں پہ لکھ ڈالا تھا ’ہم نے چوریاں کی ہیں‘ ڈاکے ڈالے ہیں‘ ہم قاتل ہیں‘ لیکن اس کے باوجود پولیس ہمیں کیوں گرفتار نہیں کرتی؟ اس کے لیے پولیس سے جواب طلب کیا جائے‘ کیونکہ مجرموں کو اس طرح کھلے عام چھوڑ دینا انصاف نہیں‘ انصاف کا خون ہے..... آدرش جیل زندہ باد۔‘

شہر کی یہ حالت دیکھ کر میں بالکل ہی ناامید ہو گیا مگر جیل جانے کی خواہش اتنی شدید ہو چکی تھی کہ مجھے ایک اور ترکیب کا سہارا لینا پڑا۔ اس بار میں نے سڑک پر ایک الٹرا ماڈرن لڑکی کو دھکا دیا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کیونکہ مجھے پکا یقین تھا کہ لوگ مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں گے اور لڑکی کی شکایت پر مجھے جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ لیکن راہ چلتے لوگوں کے بجائے اس الٹرا ماڈرن لڑکی نے میرا پیچھا کیا اور اپنے ہاتھ میں موجود ایک موٹے اور بھاری رجسٹر سے میری کمر کی اچھی خاصی ٹھکائی کر دی۔ چونکہ اس لڑکی نے قانون اپنے ہاتھ میں لے کر غلطی کی تھی اس لیے آس پاس کھڑے لوگ اسے نفرت سے اور مجھے ہمدردی سے دیکھنے لگے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوا یہ بوڑھا اس لڑکی کو دھکا نہیں دے سکتا۔ اس لیے ان سب لوگوں نے میری طرف داری کی اور لڑکی وہاں سے چلی گئی۔

لیکن میں رجسٹر سے مار کھانے کے باوجود جیل کے دروازے تک نہیں پہنچ سکا جس کا مجھے پہلے سے بھی

زیادہ افسوس ہو رہا تھا۔ مگر اب میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جیل جانے کے لیے مجھے پولیس کا سہارا نہیں لینا چاہیے۔ اب میں ڈائریکٹ ہی جیل کے اندر گھس جاؤں گا..... یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے تیاری شروع کر دی۔ سب سے پہلے تو میں نے پندرہ روز تک اپنا شیو بڑھایا اور اس درمیان اپنی ایک پرانی سفید قمیص کو قیدی کی وردی کی طرح کاٹ لیا۔ پرانی پھٹی ہوئی شلوار کو نیچے سے کاٹ کر نیکر بنائی اور کالے رنگ میں لمبی لمبی دھاریاں بنا کر قمیض کے سینے پر قیدی کا نمبر تین سو بارہ بھی کالے رنگ سے لکھ دیا۔ پندرہ دن بعد جب میرا شیو ٹھیک ٹھاک بڑھ گیا تو میں نے وردی کو کاغذ میں باندھا اور جیل کے باہر کھیتوں کی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد جیل سے کام کرنے آئے ہوئے قیدی واپس جانے لگے تو میں ان میں شامل ہو گیا۔ وہ سب ایک قطار میں چلتے ہوئے جیل کے پھاٹک تک آ گئے۔ میں قطار میں سب سے آخر میں تھا۔ قیدی ایک ایک کر کے چھوٹے گیٹ سے اندر جانے لگے۔ گیٹ پر ایک سنتری رجسٹر لیے کھڑا تھا لیکن جب میری باری آ گئی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے روک دیا اور غصے میں بولا۔ ”اے بڈھے گنتی پوری ہو گئی‘ تو کہاں جا رہا ہے؟“

”مگر..... میں تو قیدی ہوں۔“ میں بڑبڑایا۔

”چل بھاگ یہاں سے..... جھوٹ بولتا ہے۔ جا یہاں سے ورنہ.....“ سنتری نے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو میں مجبوراً پیچھے ہٹ گیا۔ اپنی مسلسل ناکامیوں سے تنگ آ کر میں نے ایک آخری ترکیب لڑائی۔ پہلے تو میں نے گتے کا ایک پلے کارڈ بنایا اور اس پر کالے مارکر سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھا۔ مجرموں کو آزاد چھوڑنے والی اس نااہل حکومت کا تختہ الٹ دو۔“

پھر میں نے انگریزی شراب کی ایک خالی بوتل میں چائے کا پانی بھر لیا۔ اس بوتل پر وائٹ 69 کا لیبل تو پہلے ہی سے لگا ہوا تھا۔ اس لیے وہ شراب کی بوتل ہی لگ رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے ایک ہاتھ میں وہ پلے کارڈ اٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں نقلی شراب کی بوتل تھامے کسی بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑاتا ہوا سڑک پر چلنے لگا۔

”حکومت کا تختہ الٹ دو“ کا نعرہ ایک ایسا سنگین جرم تھا جس کے لیے عمر قید کی سزا مقرر تھی لیکن مجھے ڈر تھا کہ کہیں اسے ایک بوڑھے کی سنک سمجھ کر پولیس والے مجھے نظر انداز نہ کر دیں۔ اس لیے میں نے شراب کی بوتل بنا کر اپنے ہاتھ میں رکھ لی تھی کیونکہ سرعام شراب پینا اور سڑکوں پر لڑکھڑانا بھی ایک بڑے جرم کے زمرے میں آتا تھا۔

آخر میری امید بر آئی۔ حکومت کے خلاف لکھا ہوا نعرہ دیکھ کر اور شراب کے نشے میں سڑکوں پر شور مچاتے ہوئے دیکھ کر دو پولیس والوں کو مجھ پر رحم آ گیا اور انہوں نے مجھے پکڑ کر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ لیکن بھری عدالت میں‘ میں تو حیران ہی رہ گیا۔ جج صاحب کے سامنے سرکاری وکیل میرے خلاف دلائل دینے کے بجائے مجھے بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس کے دلائل سن کر اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ میری طرف دیکھے بغیر کہتا جا رہا تھا۔ ”می لارڈ..... اس بوڑھے آدمی کا ارادہ حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے لوگوں کو اکسانا نہیں تھا۔ یہ تو صرف شراب کے نشے میں بڑبڑا رہا تھا اور یہ پلے کارڈ بھی اس نے ہوش و حواس میں رہ کر نہیں لکھا ہے۔ اس لیے میں اسے سزا دینے کی درخواست نہیں کر سکتا۔“

سرکاری وکیل کے پرزور دلائل سن کر عدالت نے مجھے بے قصور قرار دے کر چھوڑ دیا حالانکہ پولیس کو یہ بات معلوم تھی کہ بوتل میں شراب نہیں ہے۔ پولیس کے ذریعے سرکاری وکیل بھی جانتا تھا کہ شراب کی بوتل

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

میں چاٹ کا پانی ہے اور اس سے یہ بات آسانی سے ثابت ہو جاتی ہے کہ میں نشے میں نہیں بول رہا تھا اور میں نے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کا جرم کیا تھا۔ لیکن اس پر سرکاری وکیل نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

گرچہ عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا لیکن اس کے باوجود میں اپنی بات پر اڑا ہوا تھا کہ میں بے قصور نہیں ہوں۔ میں کٹہرے میں کھڑے ہی چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔ ”لیکن جج صاحب شراب پی کر سڑکوں پر شور مچانا بھی تو جرم ہے، مجھے تو اس جرم کی سزا بھی ملنی چاہیئے۔“

میری یہ بات سن کر جج نے سوالیہ نظروں سے سرکاری وکیل کی طرف دیکھا۔ سرکاری وکیل سٹپٹا گیا کیونکہ وہ کہہ چکا تھا کہ میں نشے میں تھا اس لیے میرا بچاؤ کرنا اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ عدالت کو میری باتوں میں سچائی محسوس ہونے لگی تھی لیکن جج صاحب کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سرکاری وکیل بول پڑا۔ ”لیکن می لارڈ زیر سماعت مقدمہ دفعہ 144 کے تحت چلایا جا رہا ہے۔ یہ مقدمہ شراب نوشی اور شراب بندی کا نہیں ہے۔ اس لیے آپ کا فیصلہ ہی درست ہے البتہ شراب پینے کے الزام میں دوسرا مقدمہ قائم کیا جا سکتا ہے۔“

لیکن جج صاحب میری بات سے ہی متفق نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے قانون کے بال کی کھال نکالتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔ ”شراب کے نشے میں نہیں بلکہ شراب پی کر حکومت کا تختہ الٹنے کی ترغیب دینے کے جرم میں ملزم کو قصوروار ٹھہراتے ہوئے عدالت اسے.....“

”ہاں جج صاحب میں نے جان بوجھ کر یہ جرم کیا ہے۔“ میں ان کی بات کے درمیان میں ہی ایک اچھے شہری کی طرح بول پڑا۔ ”اس لیے مجھے کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیئے۔“

لیکن سرکاری وکیل نے پھر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب والا مجرم کا یہ پہلا جرم ہے اس لیے اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے میں کڑی سزا دینے کی درخواست نہیں کروں گا۔ اسے یا تو چھوڑ دیا جائے یا کم سے کم سزا تجویز کی جائے۔“

”مگر جناب والا یہ میرا پہلا جرم نہیں ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”چھتری چرانے سے لے کر اب تک 17 جرم کر چکا ہوں۔“

”می لارڈ یہ اس کی زبانی باتیں ہیں۔ پولیس کے پاس اس کے کسی بھی جرم کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔“ سرکاری وکیل نے پھر اعتراض کر دیا۔ لیکن پھر بھی جج صاحب نے مجھے پندرہ دن قید کی سزا عنایت کر دی۔ حالانکہ میں تو چار چھ مہینے کے لیے اندر جانے کی امید لگائے بیٹھا تھا مگر خیر بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی۔

یہ ہی سوچ کر پندرہ دن کی سزا لے کر میں اپنی خوابوں کی دنیا ”پارا پانداگرا پارا“ جیل میں آ گیا۔

جیل سپرنٹنڈنٹ نے میری عمر دیکھ کر اور میرے سابقہ پیشے کے بارے میں پوچھا اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں سرکاری اسکول کا ٹیچر رہ چکا ہوں تو اس نے مجھے ان پڑھ قیدیوں کو پڑھانے کے کام پر لگا دیا۔ میرے لیے یہ کام آسان تھا اس لیے میں ان پڑھ قیدیوں کو دو تین گھنٹے پڑھا دیا کرتا اور مزے سے جیل کا غذائیت سے بھرپور کھانا کھا کر سو رہتا۔

جیل کا سپرنٹنڈنٹ نیک اور رحم دل آدمی تھا۔ ایک بار جیل کی ایک دیوار کی مرمت کے لیے باہر بانس کی سیڑھی لگائی گئی تھی۔ لیکن جب اس سیڑھی پر چڑھ کر باہر سے نئی چور جیل کے اندر آنے لگے تو سپرنٹنڈنٹ نے ٹوٹی دیوار کی مرمت کا کام ختم ہوتے ہی اس سیڑھی کو جیل کے اندر کی ایک دیوار کے سہارے رکھوا دیا۔ اصل

میں سپرنٹنڈنٹ یہ چاہتا تھا کہ اس سیڑھی کا فائدہ اٹھا کر جو قیدی جیل سے بھاگنا چاہتا ہو وہ رات کے اندھیرے میں آرام سے بھاگ جائے لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر کسی قیدی نے سیڑھی کو نیچے لا کر رکھ دیا۔ کوئی بھی قیدی جیل سے فرار نہیں ہوا تھا۔ بھلا انہیں باہر جا کر پیٹ بھرنے کے لیے بھیک تھوڑی مانگنا تھی؟

ایک بار قیدیوں کو جیل سے بھاگ جانے کے لیے حکام نے یہ سہولت بھی فراہم کر دی تھی کہ جیل کی چہار دیواری کی ایک دیوار کی چند اینٹیں نکال کر اتنا راستہ بنا دیا تھا کہ ایک آدمی بڑی آسانی سے باہر نکل سکتا تھا۔ لیکن اگلے روز اندر موجود قیدیوں کی تعداد کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئی تھی۔ گنتی کرنے پر سپرنٹنڈنٹ کو پتا چلا کہ قیدیوں کی تعداد میں دو کا اضافہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ بھاگا تو کوئی نہیں تھا۔ دو اجنبی لوگ اندر گھس آئے تھے۔ یہ دیکھ کر خود قیدیوں نے تیسرے دن ہی اینٹوں اور سیمنٹ سے دیوار کے اس بڑے سے سوراخ کو بھر کر بند کر دیا کیونکہ انہیں جیل کے اندر زیادہ بھیڑ نہیں چاہیے تھی۔

جیل کے اندر کی ڈسپنسری میں زہر کی کچھ بھری ہوئی شیشیاں اس طرح بالکل سامنے رکھی تھیں کہ کوئی بھی ان کا استعمال کر سکتا تھا۔ ایک بوتل پر چپکے ہوئے کاغذ پر لکھا تھا ”یہ ایک قاتل زہر ہے۔ آرام سے مرنے کے لیے صرف دو قطرے ہی کافی ہیں۔“

لیکن اس بوتل میں سے ایک قطرہ بھی کم نہیں ہوا۔ بلکہ جب جیل حکام کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جو قیدی سزا کی مدت پوری کرنے کے بعد جیل سے رہا ہونے والے ہیں انہیں اپنی رہائی کی خوشی نہیں ہے بلکہ رہائی کے غم سے نڈھال ہو کر وہ ایک دن پہلے ہی خودکشی کر لینے کے منصوبے بنانے لگے ہیں تو انہوں نے ڈسپنسری سے فوراً ہی زہر کی شیشیاں ہٹا لیں۔

اس جیل میں قیدی جب شروع شروع میں لائے جاتے تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوتے تھے لیکن یہاں سے جاتے تو پہلوان ہوتے تھے۔ کتنے ہی بیمار اور پرانے مریض اس صحت افزا جیل میں آنے کے بعد بالکل تندرست ہو جاتے تھے کیونکہ یہاں اچھا اور غذائیت سے بھرپور کھانا دیا جاتا تھا اور اصلی اور قیمتی دوائیں بھی دی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر اور حکیم وغیرہ بھی اپنے مریضوں کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے کسی صحت افزا مقام پر جانے کی بجائے ”پارا پانداگرا پارا“ جیل جانے کا مشورہ دینے لگے تھے۔ جب انہیں اپنے کسی مریض کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے بھیجنا ہوتا تو خود ڈاکٹر اپنے اس مریض پر یہ کہہ کر عدالت سے رجوع کرتے تھے کہ اس مریض نے ان کے علاج کی نہ تو فیس دی ہے اور نہ ہی دواؤں اور انجکشن وغیرہ کی رقم ادا کی ہے۔ اس طرح عدالت اس مریض کو سزائے قید سنا کر جیل بھیج دیتی تھی۔

جیسے جیسے میری رہائی کا دن قریب آتا جا رہا تھا ویسے ویسے میرا بلڈ پریشر بڑھتا جا رہا تھا۔ رہائی کے بعد بھوکا مرنے کا خیال آتا تو دل کی دھڑکن تیز ہونے لگتی تھی۔ ایک اور نئی مصیبت کا تو مجھے آج ہی پتا چلا تھا اور وہ مصیبت یہ تھی کہ جیل کے اندر میرے اچھے چال چلن کی وجہ سے مجھے دو دن کی سزا معاف کر دی گئی تھی۔ یعنی پندرہ دن کی بجائے مجھے تیرہویں دن جیل سے رہا کر دیا جانا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر غصہ آتا ہے کہ کاش میں نے جیل کے اندر اپنا رویہ اچھا نہ رکھا ہوتا اور آئے دن جیل قوانین توڑتا رہتا تو اچھے چال چلن کا سرٹیفکیٹ تو نہ ملتا..... مگر جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا تھا۔

پھر بھی میں سوچ رہا تھا کہ باہر جا کر پھر کوئی جرم

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

رنے سے تو یہ ہی بہتر ہے کہ رہائی سے ایک دن پہلے یہاں جیل کے اندر ہی کسی سے مار پیٹ اور خون خرابہ کرلیا جائے تاکہ معافی کے دو دن تو واپس مل سکیں۔ مگر مار پیٹ کس سے کی جائے وہ بھی بلاوجہ؟ یہی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ لہٰذا میں نے یہ منصوبہ ترک کردیا اور کوئی دوسری ترکیب سوچنے لگا۔

جیل کے اندر قیدیوں کے لیے ایک بڑا سا تالاب بنا ہوا تھا جس میں قیدی نہاتے دھوتے تھے۔ میں نے اس تالاب میں چھلانگ لگادی۔ کیونکہ اقدام خودکشی بھی جرم ہے اس لیے مجھے یقین تھا کہ میری سزا دو چار مہینے کے لیے بڑھ جائے گی۔ میں نے جان بوجھ کر جیل سپرنٹنڈنٹ کے سامنے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ایسا کرنے سے عدالت کو اور کسی ثبوت کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی اور سپرنٹنڈنٹ کی چشم دید گواہی میرے کام آجائے گی۔ لیکن میری یہ کوشش بھی اس وقت ناکام ہوگئی جب خود سپرنٹنڈنٹ نے ہی تالاب میں چھلانگ لگا کر مجھے باہر نکال لیا اور کہا۔ ''ارے ماسٹر جی آپ تالاب میں کود کر کیوں مر رہے تھے؟ آج تو آپ کی رہائی کا دن ہے۔''

''میں مر نہیں رہا تھا۔'' میں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''صرف خودکشی کی کوشش کررہا تھا۔ کیونکہ اس جرم میں بھی اقدام قتل کے برابر سزا مل سکتی ہے نا؟''

میری بات سن کر سپرنٹنڈنٹ جیل ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے ہی بولا۔ ''میں آپ کی اس کوشش کا مقصد سمجھ گیا ہوں۔ کچھ دن اور جیل میں رہنے کے لیے ہی آپ نے ایسا کیا ہے..... مگر میرا خیال ہے کہ آپ کا پیر پھسل گیا تھا۔ ویسے بھی آپ بوڑھے آدمی ہیں۔ جیل سپرنٹنڈنٹ ہونے کے ناتے مجھے اختیار ہے کہ میں آپ کو مزید ایک دن پہلے رہا کردوں۔'' یہ کہہ کر وہ جیل داروغہ کی جانب مڑا اور کہنے لگا۔ ''داروغہ جی آج کے ڈسچارج رجسٹر ڈ میں ان کا نام بھی شامل کرلو..... اب یہ کل کی بجائے آج ہی ڈسچارج ہوں گے۔''

سپرنٹنڈنٹ کا یہ حکم سن کر میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ کیونکہ میری مصیبت کی ابتدا اب ایک دن پہلے ہی ہوچکی تھی۔

اب میں جیل کے باہر ہوں۔ باہر کی دنیا پہلے کی طرح رواں دواں ہے۔ دکانیں، بازار، دفاتر سب کھلے ہیں۔ شہر کی سڑکوں پر ٹریفک کی ریل پیل ہے۔ سرکاری دفاتر میں کام کرنے والوں کو تنخواہیں..... ٹی اے ڈی اے اور ہاؤس رینٹ وغیرہ باقاعدگی سے مل رہے ہیں لیکن میری پنشن جس پر میں پچھلے بیس برس سے گزارا کررہا تھا، وہ میرے جیل جاتے ہی بند ہوچکی ہے۔ اس کی وجہ مجھے یہ بتائی گئی ہے کہ چونکہ میں اب ایک سزا یافتہ مجرم ہوں اس لیے حکومت کی طرف سے میری پنشن بند کردی گئی ہے۔ کیونکہ قانون کے مطابق کسی سزا یافتہ شخص کو پنشن نہیں دی جاتی۔ میں اپنی کہانی ختم کررہا ہوں لیکن میری یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ یہ تو اس وقت تک جاری رہے گی جب تک میں زندہ ہوں۔ پنشن بند ہوجانے کے بعد تو اب صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ میں اپنے ہاتھ پاؤں موڑ کر کسی فٹ پاتھ کے کونے میں بیٹھ جاؤں اور بھیک مانگنے لگوں کیونکہ اس عمر میں نہ تو محنت مزدوری ہوسکتی ہے نہ ہی کوئی اور کام ہوسکتا ہے۔ گیا تھا ایک روٹی کے لالچ میں آدھی روٹی سے بھی ہاتھ دھوآیا ہوں۔

پرمیشور

یعقوب جمیل

ہندوؤں کے اس دیوتا کا قصہ جو صدیوں سے آنکھیں موندے سو رہا ہے اور اس کی پرجا مندروں کی گھنٹیاں بجا بجا کر اسے بے دار کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

ہندی ادب سے انتخاب، ادبی ذوق رکھنے والے قارئین کے لیے بطور خاص

جنگل بے حد خوف ناک اور انتہائی گھنا تھا۔ اتنا گھنا کہ سورج کی کوئی ایک کرن بھی اس کی دھرتی کو چھو نہیں پاتی تھی۔ دن ہو یا رات وہاں ہر وقت ایک بھیانک اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ اکیلے آدمی کی تو بات ہی کیا لوگ دس بارہ کا گروہ بنا کر بھی اس جنگل کے قریب سے گزرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔

پچھلے چند دنوں سے آس پاس کے دیہاتوں میں رہنے والے لوگ اب بہت پریشان اور ڈرے ڈرے سے رہنے لگے تھے۔ ان کے خوف کا یہ عالم تھا کہ وہ نہ تو رات کے وقت سکون، چین کی نیند سو سکتے تھے اور نہ ہی دن کو ایک سوئی سے اپنا کام کر سکتے تھے۔ ہر وقت انہیں ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا کہ عورتیں گھروں کے بند دروازوں کے اندر بھی سہمی سہمی سی رہنے لگی تھیں۔ وہ اپنے بچوں کو دن کے وقت بھی گھر سے کہیں دور جانے نہیں دیتی تھیں۔

گاؤں والوں کے اس خوف کی وجہ یہ تھی کہ جنگل کے آدم خور درندوں نے اب گاؤں کی آبادی کا رُخ کرلیا تھا۔ دن ہو یا رات وہ کسی وقت بھی دبے پاؤں بستی میں گھس آتے اور گاؤں والوں کے پالتو جانوروں کے ساتھ بچوں اور لوگوں کو بھی اپنی خوراک بنانے لگے تھے۔ خاص کر کے رات کے وقت تو شیر دندناتے ہوئے اور گرجتے ہوئے بستی میں داخل ہوتے اور کسی نہ کسی شخص کو دبوچ کر لے جاتے تھے۔ خونی درندوں کی وارداتیں جب حد سے بڑھ گئیں اور گاؤں والوں کو اپنی سلامتی خطرے میں نظر آنے لگی تو وہ سب اپنی جان بچانے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ بہت غور وخوض کے بعد انہوں نے تمام درندوں سے نپٹنے کا فیصلہ کرلیا۔ انہوں نے اپنی بستی کے چاروں طرف مورچے باندھ لیے اور لاٹھیاں، تلواریں، خنجر غرض کہ جو ہتھیار ان کے پاس تھے۔ وہ سب سنبھال کر وہ دن رات پہرہ دینے لگے، پھر ایک دن ان کی ہمت کام آگئی اور انہوں نے ایک شیر کو مار گرایا۔

خوف ناک اور خونخوار شیر کو ہلاک کرنے کے بعد انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ دو چار دن اور دو چار راتیں آرام وسکون سے گزر گئیں تو انہوں نے سوچا کہ جنگل کا سب سے خطرناک درندہ تو ہلاک ہوچکا ہے۔ اس لیے اس کا انجام دیکھ کر کوئی اور چھوٹا موٹا آدم خور ان کی بستی کی طرف آنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ خوف ودہشت کے سائے اب بھی ان کی بستی پر نہیں پڑیں گے۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔ ان کا سکھ چین بہت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا۔ کیونکہ ایک شیر کے مرنے کے بعد دوسرے شیروں نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ ان کا سکھ چین پھر غارت ہوگیا اور خوف کے سائے ایک بار پھر ان کے سروں پر منڈلانے لگے۔ ناکافی ہتھیاروں کی وجہ سے ان کے لیے شیروں جیسے خون

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

خوار درندوں کا مقابلہ کرنا جب ناممکن ہوگیا تو انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ سلسلہ اب شاید کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اب ان کے پاس صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنے پرمیشور' اپنے بھگوان اور اپنے پالن ہار سے دعا مانگی جائے اور آخر ایک دن سب نے مل کر ایک بڑی پوجا کی تیاری کی اور رو رو کر اپنے جنم داتا سے فریاد کی۔

''اے پرمیشور! ہم سب کے پالن ہار۔ تیرے سوا کون ہے جو ہماری مدد کرے گا؟ تُو نے ہی ہمیں جنم دیا ہے اب تُو ہی ہماری جان ان درندوں سے بچا سکتا ہے۔ پرمیشور ان درندوں کو دھرتی پر سے نیست و نابود کردے تاکہ ہم انسان بے خوف و خطر اپنی زندگی گزار سکیں۔ ورنہ یہ درندے تو ہماری نسل ہی ختم کردیں گے۔ پھر تیرا نام لینے والا بھی کوئی نہیں رہے گا۔''

پرمیشور نے گاؤں والوں کی فریاد کو دھیان سے سنا اور پھر جواب دیتے ہوئے کہا۔

''تم سب لوگ ہمت رکھو۔ میں تم لوگوں کی طرف سے غافل نہیں ہوں جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

پرمیشور کے اس جواب نے گاؤں والوں کی ہمت بڑھادی اور ان میں ایک نئی جان آگئی انہوں نے پھر کمر کس لی اور پھر پوری طاقت اور ہمت سے درندوں کے حملوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ شیروں کو جب اپنی خوراک کے حصول میں اپنی جان کا خطرہ پیش آنے لگا تو انہوں نے جنگل میں ایک اہم اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اپنی بقا کے لیے بھگوان پرمیشور سے فریاد کی جائے کیونکہ وہی پالن ہار ہیں اور وہی انہیں اس مصیبت سے نجات دلائیں گے۔ چنانچہ شیروں کے منتخب نمائندوں نے انسانوں کے ظلم و ستم کے خلاف اپنے پرمیشور سے پرارتھنا کی۔ ''اے پرمیشور! اے بھگوان! اے ہم سب کے پالن ہار! تو نے ہی ہمیں پیدا کیا ہے۔ ہم تیری بے زبان مخلوق ہیں' مگر تیرے انسانوں کے ہاتھوں سخت پریشان ہیں۔ ان کے پاس عجیب عجیب ہتھیار ہیں۔ جن کا مقابلہ ہم نہتے اور بے زبان جانور نہیں کرسکتے ہم بھوکوں مر رہے ہیں اور وہ ہمیں اپنی خوراک کا حصہ بھی لینے نہیں دیتے۔ انسان کی طرح ہم بھی تیری پیدا کی گئی مخلوق ہیں لیکن اب ہمیں ان سے بن باس لے کر بھاگنا پڑ رہا ہے۔ انسان ہماری نسل کشی پر تُلا ہوا ہے۔ وہ جنگل میں بھی ہمیں چین سے رہنے نہیں دیتا۔ پرمیشور ہماری جان بچا تو ہماری مدد فرما مالک!''

پرمیشور نے ان کی فریاد سنی اور انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں تم لوگوں کی تکالیف سے غافل نہیں ہوں۔ ہمت رکھو جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اسی بستی کا زمین دار ایک مقدمے میں پیشی کے لیے عدالت جارہا تھا۔ اپنے گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے پرمیشور کے سامنے بیٹھ کر پوجا کی اور پھر اپنا ماتھا ٹیک کر پرارتھنا کی اس نے پرمیشور سے کہا۔

''اے ہمارے ان داتا' اے ہمارے پالن ہار۔ میں نے ساری زندگی تیری پوجا کی ہے لیکن اب میری عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں اس بوڑھے اور مفلس کسان کو اس مقدمے میں شکست دینا چاہتا ہوں۔ پرمیشور میں چاہتا ہوں کہ اس کی وہ زرخیز زمین بھی میرے قبضے میں آجائے۔ مالک تو میری مدد کرنا۔''

''اچھا.....!'' پرمیشور نے کہا۔

بستی کا ایک نوجوان لڑکا اپنے امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہ روزانہ ہی صبح سویرے پرمیشور سے کہا کرتا تھا۔ ''اے ساری دنیا کے پالن ہار تو میری محنت کی لاج رکھنا بس تو مجھے امتحان میں پاس کردینا۔'' لیکن آج وہ نوجوان لڑکا امتحان میں پاس کردینے کی بجائے کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ آج وہ کہہ رہا تھا۔

''اے پرمیشور اگر آج تُو نے مجھے اسکالرشپ دلادی تو میں سوا سیر مٹھائی کا چڑھاوا تجھ پر چڑھاؤں گا میری مدد کرنا۔''

پرمیشور نے اس طالب علم کی یہ نئی مانگ سنی اور مسکرا کر کہا۔ ''اچھا.....!''

گاؤں کا ایک مکھیا ہری رام اسمبلی کا ممبر بننا چاہتا تھا اور اس کے لیے اس کو لوگوں کی حمایت اور ان کے ووٹوں کی ضرورت تھی۔ اس نے مندر کے بڑے پجاری کے ذریعے پرمیشور سے درخواست کی۔ بڑے پجاری نے مندر کا بڑا گھنٹہ بجا کر ہری رام کی جانب سے مٹھائیوں کے دو تھال چڑھائے اور پوجا کے بعد پرمیشور سے سفارش کی کہ ''ہری رام کو اس کے مقصد میں کامیابی عطا کی جائے انہیں اتنے ووٹ دلادیے جائیں کہ وہ الیکشن جیت جائیں۔''

''اچھا.....اچھا.....!'' پرمیشور نے اس بار ذرا کھسیائے ہوئے اور اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''الیکشن ہونے دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اتنا کہہ کر پرمیشور نے منہ پھیرا ہی تھا کہ اس کی سماعت سے ایک غریب کسان کی آواز ٹکرائی' جو روتے روتے کہہ رہا تھا۔ ''پرمیشور اب تو پانی کا اکال بھی پڑ گیا ہے۔ ہماری زمین سوکھ گئی ہے۔ پرمیشور ذرا ہم محنت کش لوگوں کی طرف ایک نظر ڈال دے کہیں ایسا نہ ہو کہ زمین خشک اور بنجر ہو جائے اور تیرے یہ سارے لوگ ایک ایک دانے کو ترس کر رہ جائیں۔ مالک پانی دے' بارش دے تاکہ مٹی سیراب ہو جائے اور ہم سب کو اناج نصیب ہو۔'' بوڑھا کسان فریاد کر رہا تھا اور پرمیشور حسب معمول خاموشی سے اس کی آہ و زاریاں سن رہا تھا۔ بوڑھا کسان جب بولتے بولتے چپ ہوگیا تو پرمیشور نے ایک گہرا سانس چھوڑتے ہوئے اس سے کہا۔

''اچھا.....!''

تب ہی پرمیشور ایک اور آواز سن کر چونک پڑا یہ کسی عورت کی آواز تھی جو ہاتھ جوڑ کر درخواست کر رہی تھی۔ ''پرمیشور برسوں کی منت سماجت اور دعاؤں کے بعد تُو نے میری گود بھر دی ہے' مگر اب میرا یہ بچہ بہت بیمار ہے۔ میں جیسے تیسے کرکے اس کا علاج کروا رہی ہوں۔ اس لیے میری تجھ سے یہ ہی درخواست ہے کہ میری خوشیاں چھین مت لینا اور اسے جلد سے جلد صحت یاب کردینا۔''

''اچھا.....!'' پرمیشور نے اپنا وہی مختصر جواب دیا۔

''پرمیشور.....!'' پہاڑ کی ایک اونچی چوٹی پر بیٹھے ہوئے ننگ دھڑنگ جٹا دھاری سادھو نے پکارا اور بولا۔ ''تو جانتا ہے بھگوان کہ میں پچھلے دس برسوں سے پہاڑ کی اس چوٹی پر بیٹھا تیری تپسیا کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں مالک کہ تُو ایک اکیلا ہے۔ تُو نے اتنی بڑی دنیا کو پیدا کیا ہے۔ جس میں اربوں' کھربوں انسانوں اور جانوروں کے علاوہ چرند پرند اور کیڑے مکوڑوں کے علاوہ دریاؤں اور سمندروں میں رہنے والی مچھلیوں اور دیگر آبی جانوروں کی تعداد بھی اربوں کھربوں میں ہے پرمیشور میں جاننا چاہتا ہوں کہ تو ان سب کو کیسے اور کہاں سے رزق فراہم کرتا ہے؟ تو کیسے اتنی بڑی

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

دنیا کا نظام چلاتا ہے؟

پرمیشور اتنے سالوں کی عبادت کے باوجود میں تیرے راز کو سمجھ نہیں پایا ہوں۔ میری مدد فرما بھگوان تاکہ میں تیرے اسرار کو سمجھ سکوں۔"

پرمیشور نے پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے ننگ دھڑنگ سادھو کی بات سنی پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا.....!"

گاؤں، گاؤں شہر، شہر اور ملکوں، ملکوں سے لگاتار آنے والی ان فریادوں کو سن کر پرمیشور کچھ تھک سے گئے تھے، مگر فریادوں کا سلسلہ کوئی آج کی بات نہیں تھی۔ فریادوں اور شکایتوں کا یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ تو روز اوّل سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ جب سے انہوں نے دنیا کی تخلیق کی تھی۔

"پرمیشور، پرمیشور.....! امریکا سے آتی ہوئی آواز نے ایک بار پھر پرمیشور کا چونکا دیا کوئی فریادی کہہ رہا تھا۔ "پرمیشور تو ہمارے حال پر رحم فرما، جاپانیوں نے ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ وہ ہمارا ستیاناس کر رہے ہیں۔ الیکٹرونک کی مصنوعات کی تیاری میں وہ ہم سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ان کی مصنوعات کے مقابلے میں ہماری چیزوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ ہماری مارکیٹ روز بہ روز تباہ ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں ان جاپانیوں سے بچا پرمیشور.....!"

"اچھا.....اچھا.....!" پرمیشور نے تنگ آئے ہوئے لہجے میں کہا۔

تب ہی ایتھوپیا سے فریاد سنائی دی۔ "پرمیشور ہم ایتھوپیا کے لوگ بھی آخر تیرے بندے ہیں، مگر ہمارے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں ہو رہا ہے؟ ہر سال مسلسل قحط سالی نے ہماری نسلوں کو موت کے منہ میں دھکیل رکھا ہے۔ آخر ہم کب تک پیٹ پر پتھر باندھ کر امریکا اور دوسرے گورے لوگوں کی امداد پر گزارا کرتے رہیں گے؟ پرمیشور ہم پر اب رحم فرما ہماری زمین کو پانی دے ہمارے پیٹ کے لیے اناج دے۔"

"اچھا.....!" پرمیشور نے اپنے معمول کے مطابق جواب دیا۔

"پرمیشور یہ تو نے ہم پر کیسا عذاب نازل کیا ہے؟" بھارت سے ایک آواز آئی۔ "ہماری مٹی تو بہت زرخیز ہے پرمیشور، مگر اب پچھلے چند سالوں سے کیا ہو رہا ہے مالک نہ گندم ہے، نہ چاول ہے، نہ دالیں ہیں اور اب تو پیاز جیسی چیز بھی ہمیں پڑوسی دیسوں سے مانگنا پڑتی ہیں۔ یہ کیسے حکمران ہمارے اوپر مسلط کر دیے ہیں تو نے؟ یہ سب اپنی اپنی لوٹ مار میں مصروف ہیں ان کے گھر ان کے بینک اور ان کے پیٹ تو بھرے ہوئے ہیں جب کہ ہم غریبوں کو نہ آٹا مل رہا ہے۔ نہ چینی، نہ تیل نہ چاول۔ ملک میں بے روزگاری ہے۔ مہنگائی اس قدر ہے کہ جینا تو کیا مرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو بیچنے کے لیے سڑکوں پر کھڑے ہو گئے ہیں لوگ خودکشی کرنے لگے ہیں، مگر ہمارے حکمرانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ پرمیشور ہمیں ان درندوں سے نجات دلا فنا کر دے ان چالیس چوروں کو۔"

"اچھا.....اچھا۔" پرمیشور نے اپنا پسینا پونچھتے ہوئے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

تب ہی ایک ساتھ کئی روتی ہوئی آوازیں پرمیشور کی سماعت سے ٹکرائیں۔ بنگال سے عورتیں، مرد اور بچے رو رو کر کہہ رہے تھے۔ "پرمیشور ہر سال سیلاب اور طوفان کی وجہ سے ہمارے ہزاروں لوگ مارے جاتے ہیں۔ ہمارے گھر بہہ جاتے ہیں۔ ہمارے کھیت ڈوب جاتے ہیں۔ پرمیشور ہم پر اب

رحم فرما سیلاب اور خوف ناک طوفان کی تباہ کاریوں سے ہمیں نجات دے بھگوان....."

"اچھا.....!" پرمیشور نے کہا۔

اس طرح گاؤں، گاؤں شہر، شہر اور ملکوں، ملکوں سے ہر لمحہ فریادیں آ رہی تھیں اور پرمیشور کے پاس اپنے لاکھوں کروڑوں بلکہ اربوں بندوں کی شکایتوں کا صرف ایک ہی جواب تھا۔ دنیا بھر کے چرند پرند، کیڑے مکوڑے، جانور اور انسان سب فریاد کرتے کرتے تھک چکے تھے، مگر اس کے باوجود ان کی فریادوں کا سلسلہ بند نہیں ہوا تھا اور انہیں امید تھی کہ ایک نہ ایک دن ان کی قسمت بدلے گی پرمیشور ایک نہ ایک دن ضرور ان کی مدد کرے گا۔

دوسری طرف پرمیشور بھی دنیا کے مسئلے مسائل کے جواب دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ اسے اگر یہ معلوم ہوتا کہ اس کی بنائی ہوئی دنیا میں ایسے ہزاروں لاکھوں مسائل پیدا ہوتے رہیں گے تو شاید وہ دنیا کی تخلیق ہی نہ کرتا۔

حاجت مندوں کی فریادوں میں ایک لمحے کی فرصت ملی تو پرمیشور نے چیخ کر اپنے خدمت گار کو آواز دی۔ خدمت گار جو قریب ہی گھڑا تھا لپک کر سامنے آ گیا۔ پرمیشور نے خدمت گار کو دیکھ کر ایک تھکی تھکی سی گہری سانس لی اور بوجھل لہجے میں پوچھا۔ "کیا تم سو رہے تھے؟"

"نہیں پرمیشور! آپ کے ساتھ ساتھ تو میں بھی صدیوں سے جاگ رہا ہوں دھرتی کے سب جاندار سونے ہی کب دیتے ہیں؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو میں نے دھرتی پر جانداروں کو پیدا کر کے بڑی بھول کی ہے۔" پرمیشور نے کہا۔ "خیر اب تم جلدی سے دھرتی سے ہمارا رابطہ منقطع کر دو۔ اس مائیک کا سوئچ بند کر دو جس سے حاجت مندوں کی فریادیں آتی ہیں۔"

"اچھا۔" کہہ کر خدمت گار نے رابطے کا سوئچ آف کر دیا۔

"اور سنو۔" پرمیشور نے تھکی تھکی سی آواز میں خدمت گار سے پوچھا۔ "کیا تمہارے گھر میں تھوڑا سا سرسوں کا تیل ہوگا؟"

"ہاں ہوگا مالک۔" خدمت گار نے ذرا چونک کر پوچھا۔ "مگر مالک آپ کو سرسوں کے تیل کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

"مجھے ضرورت ہے۔" پرمیشور نے کہا۔ "تم جا کر تھوڑا سا تیل لے آؤ۔"

"ابھی لاتا ہوں۔" کہہ کر خدمت گار چلا گیا، پھر ذرا دیر بعد ہی وہ ایک شیشی میں سرسوں کا خالص تیل لے کر آ گیا۔

پرمیشور نے تیل کی شیشی کو اپنے ہاتھ میں لے کر پہلے تو دو تین بار اسے سونگھا، پھر ہتھیلی پر تھوڑا سا تیل لے کر اپنے سر پر لگایا۔ پھر چند قطرے تیل کے اپنے ناک اور دونوں کانوں میں ٹپکائے اور فوراً ہی گہری نیند سو گئے۔ پرمیشور کو گہری نیند میں خراٹے لیتے دیکھ کر ان کا خدمت گار بھی ان کے قدموں کے پاس سو گیا۔

پرمیشور کی یہ نیند اتنی گہری ہے کہ وہ آج تک بے خبر پڑے سو رہے ہیں۔ دھرتی پر کیا کیا ہو رہا ہے انہیں اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ نیچے دھرتی پر ان کی مخلوق چیخ رہی ہے۔ چلا رہی ہے فریاد کر رہی ہے، مگر ان کے کانوں تک کسی کی آواز نہیں پہنچتی اور نہ ہی ان کی آنکھ کھلتی ہے۔

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

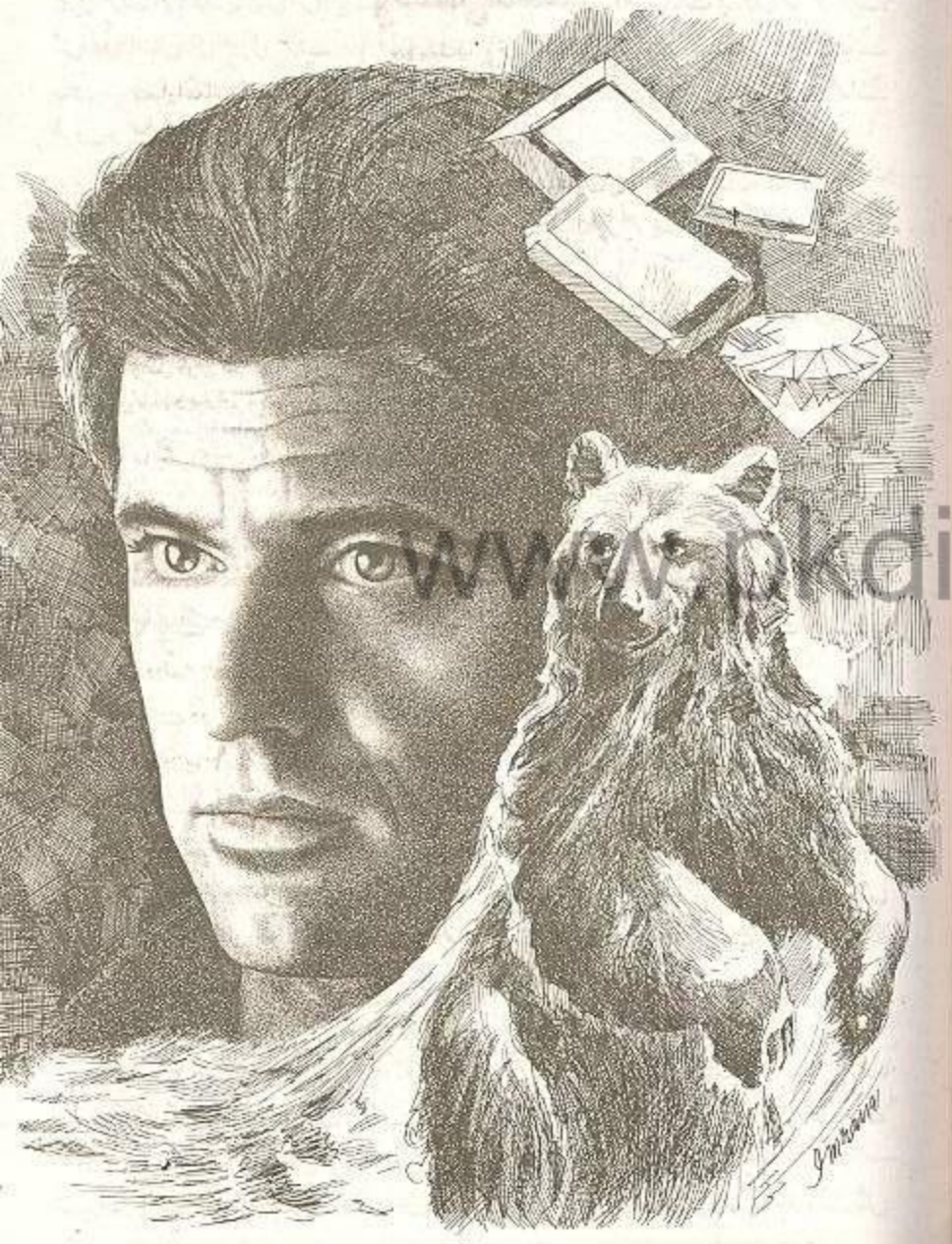

قسط نمبر 3

زهرخند

محمد فاروق انجم

ہمارا معاشرہ عبارت ہے منافقت سے' ہر شے منافقانہ رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ رشتے فریب زدہ' حرص و طمع کے خوش رنگ زہر میں بجھے ہوئے' جس سمت قدم بڑھاؤ دہکتی جہنم' جنت کے پردوں میں چھپی منتظر نظر آتی ہے۔ نرم و نازک پھول روح کو تازگی بخشنے کے بجائے اسے زخمی کرتے نظر آتے ہیں۔ داغ داغ اجالے مسافروں کو اندھیری کھائیوں تک لے جاتے ہیں۔ ہر نئی صبح کا سورج ایک نیا دکھ' ایک نیا فریب' ایک نیا جال لے کر طلوع ہوتا ہے۔ قدرت کے سارے رنگوں کو انسان کی منافقانہ اپنے ہی خون کی پیاسی فطرت نے گہنا کر رکھ دیا ہے۔

اس کی پیدائش بھی ایسی ہی فضا میں ہوئی تھی لیکن اس کی روح سچ کی متلاشی تھی۔ وہ فریب کی وادیوں میں حق کی تلاش میں سرگرداں تھا مگر پاپ کی نگری اسے اپنے رنگ میں رنگنے کو بے تاب تھی۔

ایک پُر ہوش' پُر جمال جواں ہمت کی روداد وہ آنے والے کل کو آج دیکھ کر بھی روک نہیں سکتا تھا۔

بزرگی کے پردے میں چھپے شیطانوں کا احوال واقعی ان کی نگاہوں میں انسانیت سسکیاں لیتی نظر آتی ہے۔ عقیدت کے رنگ میں رنگے معصوم انسانوں کا فسانہ عجیب وہ حقیقت جان کر بھی انجان بنے رہنے پر مجبور تھے۔

نئے افق کی نئی سلسلے وار کہانی' جس میں آپ کو معاشرے کے ہر طبقہ کا اصلی چہرہ نظر آئے گا

www.pkdigest.com

یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا اُلٹی ہوگئی ہے۔ سب کچھ اُلٹا دکھائی دے رہا تھا۔ زمین گھوم رہی تھی۔ درخت ، بھاگ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ میرا سر اَب بھی چکرا رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا تو کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ اُسی طرح اُلٹ پلٹ تھا، اور زمین گھوم رہی تھی۔ میرے اردگرد کوئی بھی نہیں تھا۔

مجھے یاد آیا کہ سکندر کے حکم پر میرے عقب میں کھڑے ایک آدمی نے میرے سر پر کوئی سخت چیز ماری تھی جس سے میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ اَب جو ہوش آیا تو جیسے میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے دماغ نے کام کرنا شروع کیا اور یہ بات مجھ پر عیاں ہوئی کہ مجھے درخت کے ساتھ اُلٹا لٹکا کر باندھا ہوا تھا اور میں جھولتے ہوئے گھوم رہا تھا۔ جس سے مجھے ہر چیز گھومتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے نگاہیں گھما کر اپنے دائیں بائیں دیکھا ، میں یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ابا جی کو بھی کہیں ساتھ ہی باندھا ہوا ہے لیکن وہ کہیں نہیں تھے۔

میرے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں کافی دیر تک بے ہوش رہا تھا اور جانے میں کب سے اس درخت کے ساتھ اُلٹا لٹکا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ نیچے لٹک رہے تھے اور میری اُنگلیاں زمین کو چھو رہی تھیں۔ میرے بے ہوش ہونے کی وجہ سے وہ لوگ شاید ابا جی کو اپنے ساتھ کہیں اور لے گئے تھے۔

''کوئی ہے...... کہاں ہو...... مجھے کھولو لڑنا ہے تو چوہے کی طرح چھپ کر کیوں لڑ رہے ہو۔ سامنے آؤ۔'' میں چیخا۔

Pdf by Roadsign

میری آواز پر کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے سوکھے پتوں کے چرچرانے کی آواز آئی۔ کوئی میری طرف آرہا تھا۔ پتا نہیں اس ویرانے اور جنگل میں کوئی انسان ہی میری طرف آرہا تھا یا کوئی جانور..... میری نگاہیں گھوم رہی تھیں۔ اور میں اس طرف دیکھنے کی کوشش کررہا تھا جس طرف سے سرسراہٹ مجھے سنائی دے رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا اور ابھی تک اس طرف سے کوئی بھی نمودار نہیں ہوا تھا۔

اچانک میں نے دیکھا کہ ایک آدمی جس نے اپنے ہاتھ میں لمبے پھل والا خنجر پکڑا ہوا تھا، وہ آیا اور کچھ فاصلے پر کھڑا ہوکر میری طرف دیکھنے لگا۔

"کیوں چلا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"مجھے کھولو۔" میں بولا۔ "میرے ہاتھ کھولو، مجھے آزاد کرو۔"

"بھاگنا چاہتے ہو؟" وہ آدمی تمسخر سے مسکرا کر میری طرف دو قدم بڑھا۔

"کہاں ہے وہ چوہا۔ اس کی گردن توڑ کر ہی یہاں سے جاؤں گا۔" میں بولا۔ "کہاں ہے وہ میرے سامنے لے کر آؤ اسے۔"

"تمہارے اندر بڑا جوش ہے۔ بڑی گرمی ہے تمہارے دماغ میں۔" وہ آدمی بولا۔

"ایک بار مجھے کھولو اور پھر اس کا اندازہ کرنا چاہو تو وہ بھی کرلو۔" میں نے کہا۔

"ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی ہے۔ ہمیں جو حکم مل رہا ہے وہ ہم پورا کررہے ہیں ورنہ میرے اختیار میں ہوتا تو تیری آنکھیں نکال دیتا۔" اس نے غصے سے مجھے گھورا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر بھی لہرایا۔ مجھے اس پر شدید غصہ آرہا تھا لیکن مجھے باندھ کر درخت سے اُلٹا لٹکایا ہوا تھا۔ اس لیے میں بے بس تھا۔

"تم کتے ہو۔" میں چیخا۔ میں نے اسے اس لیے کتا کہا تھا تاکہ وہ اس بات پر جوش کھا کر میرے پاس آئے اور مجھے اسے پکڑنے کا موقعہ مل جائے لیکن اس کے برعکس وہ اپنی جگہ کھڑا رہا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"اسے میں اپنی تعریف سمجھوں؟؟"

"تم اسے اپنی تعریف ہی کہہ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"تم آزاد ہونا چاہتے ہو۔ آزاد کردوں۔" اس نے پوچھا۔

"کھولو مجھے۔" میں دہاڑا۔

"چلو کھول دیتا ہوں۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس نے کہہ کر اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر میری طرف پوری قوت سے مار دیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ میں سمجھا کہ اس نے خنجر مجھے مارا ہے اور مجھے وہ زندگی سے آزاد کرنا چاہتا ہے۔

یک دم میں زمین پر آگرا۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے خنجر رسی پر مارا تھا اور رسی کٹ گئی تھی۔ میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے پیر کھولے اور اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ لیکن وہ آدمی اس جگہ موجود نہیں تھا۔ وہ کہیں چلا گیا تھا یا آس پاس ہی کہیں چھپ گیا تھا۔ وہ بڑی پھرتی سے کسی طرف بھاگا تھا۔

میں نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر کچھ فاصلے پر پڑا خنجر اُٹھالیا۔ پھر میں اسی طرف بھاگا جہاں ابھی کچھ دیر قبل وہ آدمی کھڑا تھا۔ آگے درخت تھے۔

اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں بھاگتا جارہا تھا۔ میں

پوری طرح سے چوکس بھی تھا۔ مجھ پر اچانک کہیں سے بھی حملہ ہوسکتا تھا۔ مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا تھا اور نہ کسی نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ کوئی بھی کسی طرف سے نکل کر میرے سامنے آسکتا تھا۔ میں بھاگتا ہوا درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلا تو مجھے دور ایک جگہ آگ کا الاؤ روشن دکھائی دیا۔ میں اُس طرف بھاگا۔ وہاں پہنچا تو وہ وہی مکان تھا جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ آگ کا الاؤ مکان کے دروازے کے پاس روشن تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اندر کوئی تھا۔ اس جگہ وہ اکلوتا مکان تھا۔

میں نے کچھ دیر اسی جگہ کھڑے ہوکر جائزہ لیا۔ پھر اس مکان کی طرف چلنے لگا۔ مکان کے پاس پہنچ کر میں نے دروازہ کھولنا چاہا لیکن مکان کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازے کو ذرا زور سے دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ اندر اور باہر خاموشی تھی۔ مکان کے اندر اندھیرا تھا۔ میں واپس آیا اور ایک لکڑی اُٹھائی جس کے دوسرے سرے پر آگ روشن تھی۔ میں اس کی روشنی میں احتیاط سے مکان کے اندر چلا گیا۔

چھوٹے سے مکان کے دو ہی کمرے تھے۔ ایک خالی تھا اور دوسرے کمرے میں فرش پر کوئی کروٹ لیے لیٹا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی ٹھٹک کر گیا اور اسے دیکھنے لگا۔

اسی طرح سے ایک لڑکی کو کروٹ لیے میں خواب میں دیکھ چکا تھا۔ یقیناً وہ کوئی لڑکی ہی ہوگی۔ جس کے پیٹ میں خنجر پیوست ہوگا۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ میں اس کی طرف بڑھا، اس کے پاس جاکر رک گیا۔ میں نے کچھ دیر کے بعد اس کا رُخ اپنی طرف پھیرا۔ اور یہ دیکھتے ہی میں چونک گیا کہ اُس کے پیٹ میں ایک خنجر پیوست تھا۔

میں نے آگ کے الاؤ میں اس کا چہرہ دیکھا وہ کوئی بیس سال سے زائد عمر کی لڑکی تھی۔ میں اس لڑکی کو نہیں جانتا تھا۔ جانے وہ کون تھی اور کیوں یہاں مار کر اسے لٹایا ہوا تھا۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ میں جانے کے لیے گھوما اور یکدم تیز روشنیاں میرے چہرے پر پڑیں کہ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہاتھ رکھ لیے۔

کچھ دیر کے بعد روشنیاں کم ہوگئیں۔ میں دیکھنے کے قابل ہوا تو دروازے پر سکندر اپنے آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اُس کے آدمیوں نے ہاتھوں میں ہیوی ٹارچ پکڑ رکھی تھیں۔ اب ایک ہی ٹارچ روشن تھی۔ جس کا رُخ دوسری طرف تھا۔ اس سے کمرا روشن ہوگیا تھا اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔

"مار دیا تم نے لڑکی کو؟" سکندر بولا۔ "کون ہے یہ اور کیوں مار دیا تم نے؟"

"اپنا جرم میرے گلے ڈال رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ہمارا کام ہے۔ ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔" سکندر مسکرایا۔

"بُرا کرتے ہو۔" میں بولا۔

"بتانے کا شکریہ کہ ہم برا کرتے ہیں۔ کبھی اچھا بھی کریں گے۔" وہ ڈھیٹ پن سے مسکرا رہا تھا۔

"کون ہے یہ لڑکی اور اس بے گناہ کو کیوں مارا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"تجھے کیسے پتا ہے کہ یہ بے گناہ ہے؟" سکندر نے مجھ سے پوچھا۔

"تم لوگوں کے ہاتھوں بے گناہ ہی مارے جاسکتے ہیں۔ ظالم ہو تم لوگ۔" میں تیخ پا ہوکر بولا۔

وہ مسکرایا۔ "چلو میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ اس کو بھی مارنے کی ایک وجہ تھی۔ جس کی وجہ سے یہ موت کے منہ میں چلی گئی۔ لیکن اس کا الزام تو اب تم پر ہی آئے

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsigu

گا۔تم نے ہی اس لڑکی کا قتل کیا ہے۔"

"تم بہت ہی کمینے ہو۔" میں نے دانت پیسے۔"تم جیسے کو مسل دینا چاہیے۔"

"کمینہ تو میں ہوں۔اگر کمینہ نہ ہوتا تو میرے ذمے ایسے کام نہ ہوتے۔ایسے تمام کام میں ہی کرتا ہوں۔ہم تو صرف تمہارے باپ کو ٹھکانے لگانا چاہتے تھے لیکن یہ ہمیں اس وقت پتا چلا کہ تم بھی آئے ہوئے ہو جب تم اپنے باپ کے ساتھ فرار ہو رہے تھے۔تمہارے باپ کو بھی میں نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔"اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

اس کی بات سنتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔"تم نے میرے باپ کو مار دیا ہے۔کہاں ہیں وہ۔جواب دو۔"

"کیا کر سکتے ہو تم؟ کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔" سکندر کے لہجے میں بے پروائی تھی۔"یہ کام تو ایک دن ہونا ہی تھا۔جو کہ ہو گیا۔"

میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا لیکن اس سے قبل اس کے دو آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ان کی گرفت مجھ پر بہت مضبوط تھی اور میں اب ان کی گرفت میں سکندر کے سامنے کھڑا تھا۔

میں نے مزاحمت کی اور پوری قوت سے اپنے آپ کو ان کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کی،لیکن میں اپنے آپ کو ان سے چھڑانے میں ناکام رہا۔

"بولو کیا کر سکتے ہو؟" سکندر نے میری آنکھوں میں جھانکا۔"اپنے آپ کو ان سے چھڑا نہیں سکتے میرا مقابلہ کیا خاک کرو گے۔"

"مجھے چھوڑ کر دیکھو میں کیا کر سکتا ہوں تجھے اندازہ ہو جائے گا۔" میں چیخا۔مجھے اپنے باپ کا دکھ تھا اور میرا دل اس کی بات سن کر پھٹ رہا تھا۔میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس کے جسم کی ہر ہڈی توڑ کر اسے ایسی اذیت سے دوچار کر دوں کہ وہ عبرت کا نشان بن جائے اور اُس وقت پر پچھتائے جب وہ جرم کی دنیا میں داخل ہوا تھا۔

"تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔تم اپنے باپ کو نہیں بچا سکے۔" سکندر نے درشتی سے کہا۔"اب تم اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکو گے۔تم میرے ہاتھوں موت کی نیند سو جاؤ گے لیکن تجھے میں آسان موت نہیں دوں گا۔دیکھنا میں تیرا کیا حال کرتا ہوں۔"

"میں تمہاری گردن تن سے الگ کر دوں گا۔" میں دہاڑا۔"یاد رکھو اس بار تمہارا مقابلہ ایسی چٹان سے ہے کہ جس سے ٹکرا کر تم پاش پاش ہو جاؤ گے۔تمہارا نام و نشان مٹ جائے گا۔"

"تم کہتے ہی رہ جاؤ گے اور ہم نے جو کرنا ہو گا وہ کر جائیں گے۔پہلے فضل کو مارا اور اب تمہارے باپ کو بھی مار دیا۔سالوں سے ہمارے بارے میں کوئی نہیں جان سکا تھا اور یہ دونوں جان گئے تھے۔ان کا زندہ رہنا اب ٹھیک نہیں تھا۔تہذیب شاہ کا راز کیا ہے انہوں نے وہ جاننے کی گستاخی کر دی تھی۔" سکندر نے کہتے ہوئے میرے سر کے بال پکڑ لیے اور دو،تین جھٹکے دینے کے بعد اس نے کہا۔"اس لڑکی نے مجھے دھوکے باز کہہ دیا تھا۔میں نے اسے کیا دھوکہ دیا تھا۔بس اتنا ہی کیا تھا کہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا اور صاف جواب دے دیا تھا۔مجھ سے بولی کہ ساری دنیا کو بتائے گی۔میں نے کہا کہ دنیا میں رہے گی تو کسی کو بتائے گی۔" سکندر زہریلے لہجے میں ہنسا۔"اس وقت وہ اپنے پیٹ میں خنجر کا زخم لیے موت کی نیند سو رہی ہے۔"

"تم نے میرے باپ کو مار دیا۔تم لوگ ظالم ہو۔چھوڑو مجھے..... چھوڑو۔" میں اپنے آپ کو ان سے چھڑانے لگا۔مجھ پر ان کی گرفت ایسی تھی جیسے میں شکنجے میں کس دیا گیا ہوں۔میری مزاحمت ایک بار پھر ناکام ہو گئی تھی۔

"کتنا زور لگاؤ گے اپنی آزادی کے لیے۔ان کی گرفت لوہے کی سی ہے۔" وہ ہنسا۔

میں نے اس بار پوری قوت سے اپنے جسم کو جھٹکا دیا کہ وہ دونوں دائیں بائیں جا گرے۔میں کسی زخمی شیر کی طرح سکندر پر جھپٹا اور اس سے قبل کے اس کی گردن میرے ہاتھوں میں آتی وہاں پر موجود تیسرا آدمی میری طرف بڑھا اور اپنا بازو میری گردن کے گرد حائل کر کے اپنی گرفت سخت کر دی۔اسی اثنا میں وہ دونوں بھی اُٹھ گئے تھے۔وہ بھی تیزی سے مجھ پر آپڑے اس بار میں تین کی گرفت میں تھا۔

سکندر اطمینان سے اپنی جگہ پر کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔جب میں ایک بار پھر ان کی گرفت میں آ گیا تو اس نے کہا۔"دیکھ لیا تم پھر میرے آدمیوں کی گرفت میں ہو۔"

"خود کچھ کر نہیں سکتے اور یہ کتے رکھے ہوئے ہیں۔" میں بولا۔

"کچھ بھی کہہ لو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" سکندر نے کہا۔

"تم بھی کتے ہو۔" میں بولا۔

"سب باتیں چھوڑ کر یہ بات یاد رکھو کہ اب تیری باری ہے۔لیکن تجھے میں آسانی سے نہیں ماروں گا۔میں نے کہا تھا کہ مجھے شکار کرنے کا شوق ہے اور تم میرے شکار ہو۔یہ جنگل یہ زمین ہماری ہے۔یہاں کا چپہ چپہ ہمارا ہے۔اس جگہ تم بھاگو گے اور میں تمہارا شکار کروں گا۔" سکندر بولا۔

"تیری آنکھیں نکال کر میں نے اس جنگل کے کتوں کو نہ ڈال دیں تو میرا نام بھی گلریز نہیں ہے۔" میں فلک شگاف لہجے میں بولا۔

اُس نے میرے منہ پر زور سے مُکا مار دیا۔میرا نیچے کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔وہ بولا۔"چھوڑ دو اسے بھاگ سکتا ہے تو بھاگ جائے اور اگر کچھ کر سکتا ہے تو کر لے۔یہ آزاد ہے۔" یہ کہہ کر سکندر اس کمرے سے باہر نکل گیا۔کچھ دیر کے بعد اُنہوں نے مجھے ایک طرف دھکا دے دیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

میں جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھا اور باہر نکلا۔مکان کے باہر کوئی بھی نہیں تھا۔وہ سب اندھیرے کا فائدہ اُٹھا لیتے تھے اور یہیں کہیں غائب ہو جاتے تھے۔وہ جو کچھ بھی کر رہے تھے اپنے منصوبے کے تحت کر رہے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ وہ مجھے جتنا زچ کر سکتے ہیں وہ کریں۔

"کہاں ہو سکندر میرے سامنے آؤ۔تم نے میرے باپ کو مار دیا۔کتے سامنے آ۔" میں چیختا رہا۔اس ویرانے میں میری آواز جانے کہاں تک جا رہی تھی۔لیکن کوئی بھی میرے سامنے نہیں آیا۔میں اسی جگہ بیٹھ گیا۔

میں اپنی متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔میں بھاگ نہیں رہا تھا۔میں جانتا تھا کہ وہ میرے بھاگنے پر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔مجھ پر گولی بھی چلا سکتے ہیں

☆.....☆.....☆

میں اس جگہ کم از کم آدھا گھنٹہ بیٹھا رہا تھا۔کوئی بھی نہیں آیا۔میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا اور میں اس غم کو اپنے دل میں قید کرنے کے قابل ہو گیا تو اس جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔میں نے دور تک دیکھنے کی کوشش کی۔گھپ اندھیرا تھا۔آسمان پر ستارے اور آدھا چاند چمک رہا تھا۔روشنی کم تھی۔مکان کے باہر جو الاؤ روشن تھا وہ بھی راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا۔

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

میں سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ اس جگہ سے فرار ہونے کی کوشش کروں؟ لیکن کیسے؟ میرے لیے یہ جگہ چھوڑنا آسان نہیں تھا۔

اندھیرے میں بھاگ کر کوئی راستہ تلاش کرنا ایسے ہی تھا جیسے دیوار کے ساتھ سر ٹکرایا جائے اور مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ لوگ میرے آس پاس مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے اس جگہ سے باہر جانے نہیں دیں گے۔ وہ مجھے ہر طرح سے زچ کرنا چاہتے ہیں۔ سکندر نے جو باتیں مجھ سے کہی تھیں وہ اس نے بے وقوفی میں نہیں کہہ دی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے بھی مار دیں گے۔ کیونکہ میں بھی ان کے بارے میں جان گیا تھا۔ بس یہ تھا کہ وہ مجھے آسانی سے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ ایسا کیوں کر رہا تھا اس کی مجھے سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ جنونی تھا یا پاگل شخص تھا؟ اتنا میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ انسان نہیں درندہ تھا۔

مجھے اس جگہ سے باہر نکلنا تھا۔ ان کے چنگل سے خود کو آزاد کرنا تھا۔ یہ لوگ میرے باپ کو بھی مار چکے تھے۔ اگر میں بھی ان کے ہاتھوں ختم ہو گیا تو ان کا ظلم اسی طرح رہے گا۔ میں ان سب سے اپنے چاچا اور باپ کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ میں ان کے ہاتھوں ختم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کھیل کو اپنی موت کے ساتھ ہی لپیٹ دینا نہیں چاہتا تھا۔ انہوں نے میرے بدن میں زہر بھر دیا تھا اور اس زہر کو ان کی رگوں میں اتار کر انہیں موت دینا ہی میرا مقصد تھا۔

میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ سکندر کے آدمی آس پاس میری ایک ایک حرکت کو اپنی نگاہ میں کیے ہوئے ہونگے۔ میں سوچنے لگا کہ سکندر کے ساتھ اس وقت کتنے آدمی ہوں گے؟

میں یاد کرنے لگا اور مجھے چھ آدمیوں سے زیادہ اس کے ساتھ آدمی دکھائی نہیں دیئے۔ اس کے ساتھ چھ آدمی تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ اور بھی آدمی ہوں اور میرے سامنے محض چھ آدمی آئے ہوں یا پھر ہو سکتا ہے صرف چھ ہی آدمی ہوں۔ میں نے اپنی ہی سوچ کو رد کر دیا کیونکہ میں نے چھ آدمی دیکھے تھے۔

میں سوچتے سوچتے اپنی جگہ سے اُٹھا اور مکان کے اندر چلا گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ دن کے اُجالے میں میں اس مکان کو دیکھ چکا تھا۔ اس لیے مجھے اس مکان کا نقشہ یاد تھا۔ میں نے مکان کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ پھر میں ٹٹولتے ہوئے اس اندھیرے میں جاتے ہوئے اس طرف بڑھا جہاں میں نے ایک سیڑھی اوپر کی طرف جاتی ہوئی دیکھی تھی۔ کوشش کرنے سے میں اس سیڑھی تک پہنچ گیا۔ میں سیڑھی چڑھنے لگا اوپر دروازہ نہیں لگا تھا۔ آسمان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ چاند کی ہلکی روشنی بھی برس رہی تھی۔ وہ صاف چھت تھی۔ چاروں طرف چار فٹ اونچی دیواریں تھیں۔ میں جھکتا ہوا دیوار کے پاس پہنچا اور اس جگہ بیٹھ گیا۔ میرے کان باہر کی طرف تھے۔ میں کوئی آواز سننا چاہتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد مجھے باہر سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔

مجھے ایسا لگا جیسے کوئی دروازہ کھولنے کے لیے دھکیل رہا ہو۔ میں نے آہستہ سے اُٹھتے ہوئے اپنا سر بلند کیا اور باہر جھانکا۔

مکان کے دروازے کے پاس تین آدمی کھڑے تھے۔ یہ وہی تین تھے جو سکندر کے ساتھ تھے۔ وہ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ شاید انہیں یہ تشویش لاحق ہو گئی تھی کہ میں اندر کیا کر رہا ہوں۔ میں ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اس چھت سے دور

تک کا جائزہ لیا۔ دور تک کسی آبادی کے آثار نہیں تھے۔ ایک طرف اس مکان سے کوئی آدھا کلو میٹر کے فاصلے پر مجھے روشنی دکھائی دی۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ اس جگہ سکندر ہو۔ اس جگہ میری نگرانی پر یہ تین ہی آدمی مامور ہوں؟ لیکن یہ تعداد حتمی نہیں تھی۔

اچانک مجھے لگا جیسے کوئی سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہو۔ میں نے ایک بار پھر باہر جھانکا۔ دو آدمی دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ جبکہ تیسرا ان سے کچھ فاصلے پر موبائل فون پر باتیں کر رہا تھا۔ پھر وہ آدمی ان کے پاس آیا اور اپنی آواز دھیمی رکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ کہہ رہا ہے اسے سونے نہیں دینا باہر نکالو۔''

یہ بات اس نے دھیمے لہجے میں کہی تھی لیکن سکوت میں میری سماعت تک پہنچ گئی اور پھر چھت بھی کتنی اونچی تھی؟ محض دس فٹ اونچی چھت تھی۔

''اوپر سے اندر چلو۔'' پھر آواز آئی۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ تین ہی اس جگہ ہیں۔ اگر ان کے ساتھ کوئی چوتھا بھی ہوتا تو پھر وہ اس کے ساتھ کھڑا ہوتا اور یہ بات بھی طے تھی کہ سکندر اس مکان میں مزے کر رہا ہوگا اور یہ سکندر نے ہی حکم دیا ہوگا کہ میں سونے نہ پاؤں۔ بہر حال یہ میری قیاس آرائی تھی۔ سکندر اس جگہ موجود بھی تھا کہ نہیں اس کا علم نہیں تھا۔

''اوپر سے جانا ہے۔'' دوسرا بولا۔

''اور کیا سرنگ کھودنی ہے۔ وہ اندر جا کر سو گیا ہے۔'' تیسرا بولا۔

''کیا پتا جاگ رہا ہو۔'' پہلے نے کہا۔

''وہ ہماری باتیں سن رہا ہوگا۔'' دوسرا بولا۔ ''بیل میں گھس کر بیٹھ گیا ہے میں اسے نکالتا ہوں۔ تم دونوں اسی جگہ رکو۔''

ان کی باتیں سن کر میں ایک طرف ہو گیا۔ پھر مجھے کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ کوئی اوپر آ رہا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ ایک آدمی ایک طرف سے اوپر چڑھ آیا تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ میں اس کے عقب میں تھا۔ میں ایسا ہی چاہتا تھا۔

میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور ایک ہاتھ اس کی گردن کے گرد حائل کر کے اسے پکڑا اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ وہ مزاحمت کرنے لگا لیکن میں نے بھی گرفت اتنی مضبوط رکھی ہوئی تھی کہ اس کی مزاحمت ناکام ہو رہی تھی اور اس کے منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح سے وہ میرا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹا سکے۔ لیکن میری گرفت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ میری نگاہ بار بار اس طرف بھی اُٹھ رہی تھی کہ کوئی اور تو اس چھت پر نہیں آ رہا ہے۔ میں اس مزاحمت کو طوالت نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے یکدم اس کی گردن کو ایک جھٹکا دیا۔ آواز پیدا ہوئی اور اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹتے ہی وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کا جسم میرے ہاتھوں میں جھول گیا تھا۔ میں نے اسے فرش پر لیٹا دیا۔

میں بھاگ کر پھر اُس دیوار کے پاس چلا گیا۔ مجھے آواز سنائی دی۔

''اس نے ابھی تک دروازہ ہی نہیں کھولا۔ وہ بھی اندر سو تو نہیں گیا۔'' ایک نے کہا۔

''میں چلوں اوپر؟'' دوسرے نے پوچھا۔

''کچھ دیر اور دیکھ لیتے ہیں۔'' پہلا بولا۔

''مجھے گڑبڑ لگ رہی ہے۔'' پہلے نے مشکوک لہجے میں کہا۔

''دو منٹ چپ ہو جاؤ۔'' پہلا بولا۔

میں جلدی سے نیچے چلا گیا۔ اور دروازہ کھول کر

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ان کی دانست میں یہ ہی تھا کہ دروازہ ان کے ساتھی نے کھولا ہے۔ایک تیزی سے اندر آنے لگا تو میں نے پوری قوت سے اس کے سینے میں لات نکادی اور وہ کراہتا ہوا پیچھے دوسرے پر جا پڑا۔میں برق رفتاری سے ان کی طرف بڑھا اور پوری قوت سے اپنی ایک ٹھوکر اس کے سینے پر مار دی۔وہ بے حال سا ہوکر اسی جگہ دہرا ہوگیا۔وہ بری طرح سے تڑپ رہا تھا۔اس کی سانس رک رہی تھی۔جبکہ تیسرا ساتھی بھاگ کھڑا ہوا۔

میں اس کے پیچھے بھاگا۔اُس کا رُخ اُسی مکان کی طرف تھا جہاں میں نے روشنی دیکھی تھی۔میں اسے وہاں تک پہنچنے نہیں دینا چاہتا تھا۔بھاگتے ہوئے میں نے جست لگائی اور اسے لیتا ہوا زمین پر آپڑا۔وہ نیچے تھا اور میں اس کے اوپر۔

میں نے آؤ دیکھا اور نہ تاؤ اس پر مُکّوں کی بارش کردی۔میرے مکوں سے وہ بے حال ہوگیا تھا۔میں اس کے سینے پر سوار تھا۔میں نے اس کا گریبان پکڑا اور بولا۔

"سکندر کہاں ہے۔"

"پتا نہیں۔"اس نے جواب دیا۔وہ نڈھال ہوگیا تھا۔

"کتنے آدمی ہیں یہاں۔"میں نے اپنی آواز دھیمی رکھی تھی تاکہ وہ دور تک نہ جائے لیکن میرا لہجہ درشت تھا اور میں نے اس کے منہ پر دو مکے یکے بعد دیگرے مار دیئے تھے۔

ہم یہاں چھ آدمی ہیں۔"اس نے فوراً جواب دیا۔اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ ٹھیک ثابت ہوا تھا۔وہ چھ ہی تھے۔

"بتاؤ سکندر کہاں ہے؟"میں نے اس کو گریبان سے پکڑ کر اس کا سر اُوپر کیا۔

"یہیں ہوگا۔"اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

"یہیں کہاں ہے۔"میں نے سوال کیا۔

"یہاں چار مکان ہیں۔پتا نہیں وہ اس وقت کس مکان میں ہوگا۔"وہ بولا۔

"تم تینوں میرے پاس کیا کر رہے تھے۔"میں نے پوچھا۔

"سکندر نے تمہاری نگرانی کے لیے کہا تھا۔"اس نے جواب دیا۔

"سکندر کے ساتھ اور کون ہے؟"میں نے اس کے گلے پر اپنی اُنگلیاں رکھ دیں اور اس کا گلا دبانے لگا۔

"اس کے پاس تین بندے ہیں۔"اس کی آواز گھٹ رہی تھی۔

مجھے ان میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔مجھے یہ ہی جانتے تھے۔ان کا قصہ میں اسی جگہ ختم کردینا چاہتا تھا تاکہ میں اپنے چاچا اور باپ کا بدلہ لینے کے لیے آسانی سے تہذیب شاہ تک پہنچ سکوں اور اس کا اصل چہرہ دنیا کو دکھا سکوں۔چنانچہ میں نے اس کا گلا دبا کر اسے بھی اسی جگہ ختم کردیا۔

تین یہ تھے اور تین سکندر کے ساتھ تھے۔میں اس طرف بھاگا جس طرف مجھے روشنی دکھائی دی تھی اندھیرا تھا لیکن میں اندازے سے اُس طرف جا رہا تھا۔دائیں بائیں بھاگ کر آخرکار میں اس مکان تک پہنچ ہی گیا جو اب میرے سامنے تھا۔اس نے بتایا تھا کہ اس جگہ تین، چار مکان ہیں۔اب جانے وہ کس مکان میں ہوگا۔ہوسکتا ہے کہ وہ اس جگہ سے چلا بھی گیا ہو۔اور اگر وہ اس جگہ سے چلا گیا تو یہ میرے لیے ٹھیک نہیں تھا۔

اس جگہ خاموشی اور گہرا سکوت تھا۔مکان کے اندر روشنی بھی۔اس کا مطلب تھا کہ اندر جو لوگ بھی تھے وہ

جاگ رہے تھے۔میں نے کچھ دیر اس جگہ رک کر جائزہ لیا۔سکندر سے مجھے اپنے باپ کے بارے میں دریافت کرنا تھا اور اس کا ختم ہونا بھی ضروری تھا ورنہ میرا جینا محال ہوجاتا۔اس کے زندہ رہنے سے میں جہاں بھی ہوں گا وہ مجھے ڈھونڈ لیں گے اور میرا بچنا ناممکن ہوجائے گا۔کیونکہ وہ ہی مجھے جانتا تھا۔

میں دبے پاؤں آگے گیا۔سامنے دروازہ تھا اور اس کے ساتھ ایک کھڑکی تھی۔میں اس کھڑکی کے پاس چلا گیا اور ہولے سے کھڑکی کا پٹ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ کھڑکی اندر سے بند تھی۔میں دروازے کی طرف چلا گیا۔پہلے میں نے دروازے کے ساتھ کان لگا کر اندر سے کوئی آواز سننے کی کوشش کی۔اندر مکمل خاموشی تھی کوئی آواز کوئی سرسراہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔یوں لگتا تھا جیسے وہ مکان خالی ہو اور محض اس میں روشنی جل رہی ہو۔

دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔میں دیکھنے لگا کہ اندر کیسے جاؤں۔وہ آدمی اس طرف بھاگا تھا۔اب یہ بات بھی حتمی نہیں تھی کہ وہ اس مکان کی طرف ہی بھاگا تھا۔جنگل تھا،وہ کسی طرف بھی بھاگ سکتا تھا۔میں سوچنے لگا کہ کیا کروں۔

اس جگہ سکندر کی موجودگی میرے لیے اچھی بات تھی۔اگر وہ اس جگہ نہ ہوا تو پھر جیسے ہی اسے یہ پتا چلے گا کہ میں اس کے آدمیوں کا کام تمام کرکے بھاگ گیا ہوں تو وہ مجھے کتوں کی طرح تلاش کرے گا۔میرے لیے کہیں چھپنا ممکن نہیں رہے گا۔

میں اس مکان کی دوسری طرف چلا گیا۔وہاں سے میں مکان کے عقب میں چلا گیا۔جونہی میں اس طرف آیا میں ٹھٹک گیا۔کیونکہ اس جگہ دو آدمی انگور کی بیٹی سے دل بہلاتے ہوئے مدہوشی کی سیڑھی پر قدم رکھے جھوم رہے تھے۔اس سے مجھے یہ اندازہ ہوگیا کہ یہ بھی ان ہی لوگوں کی جگہ ہے اور یہاں سکندر مل سکتا ہے۔عجیب سی بوچھیلی ہوئی تھی۔

میں نے رک کر کچھ دیر کے لیے دیکھا اور پھر ان کی جانب بڑھا۔وہ مدہوش تھے۔پاس گلاس اُلٹے پڑے ہوئے تھے۔دو خالی بوتلیں زمین پر گری ہوئی تھیں۔پاس کچھ پھل بھی رکھے ہوئے تھے۔شیطان کی اس بیٹی نے ان کو ارد گرد سے بے نیاز کیا ہوا تھا۔انہیں یہ بھی پتہ نہیں چلا تھا کہ میں ان کے پاس کھڑا ہوں۔اس طرف بھی ایک دروازہ تھا جو کہ کھلا ہوا تھا۔

اچانک ایک آدمی نشے میں اپنے ساتھی سے بولا۔"میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں کسی سمندر میں چلا جاؤں اور ڈبکیاں لگاؤں۔"

"ڈوبنے کا ارادہ ہے۔سمندر میں ڈبکیاں۔"دوسرا کہہ کر ہنسا۔

"میں نہیں ڈوب سکتا۔بچہ نہیں ہوں۔"پہلے نے ہاتھ مارا۔

"اوئے.....تم نے سوچا کہ ہم کہاں پڑے ہوئے ہیں۔اندر ہیں کہ باہر ہیں۔"دوسرے نے چونک کر اپنی آنکھیں کھول کر دائیں بائیں دیکھنا شروع کردیا اور پھر اس کی گردن ڈھلک گئی۔جبکہ اس کا پہلا ساتھی پہلے ہی مدہوش ہوچکا تھا۔

میں کچھ دیر ان دونوں کو دیکھتا رہا۔اس حالت میں ان دونوں کو میرے لیے ختم کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔لیکن فی الحال میں نے ان کو ہاتھ لگانے کی بجائے اپنے اصل ہدف سکندر کی تلاش کے لیے اس دروازے سے مکان کے اندر چلا گیا۔

میں چلتے ہوئے کوئی آواز پیدا نہیں کررہا تھا۔بڑی احتیاط سے ہر قدم رکھ رہا تھا۔میرے دائیں جانب ایک کمرہ تھا۔اس کا دروازہ کھلا ہوا

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

تھا۔ میں نے اندر جھانکا تو وہاں ایک آدمی اوندھے منہ پڑا تھا۔ شاید وہ بھی مدہوش تھا۔ اس کمرے میں بھی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ جیسا ان کا حرام کا کام تھا ویسی ہی ان کی گندی اور حرام خوراک تھی۔ جو انہیں ارد گرد سے بے نیاز کیے ہوئے تھی۔

مجھے ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ کیونکہ یہ اُن کے کارندے تھے۔ ان کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔ سکندر کا ختم ہونا ضروری تھا۔ ان کو تو شاید میری شکل بھی یاد رہے کہ نہ رہے۔

ایک کمرا سامنے تھا۔ میں اس کی طرف چلا گیا۔ اس کا دروازہ بند تھا اور اندر روشنی تھی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا، اندر جھانکا، سکندر کرسی پر مدہوش بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک گلاس تھا۔ وہ پیتے پیتے ہوش کھو بیٹھا تھا۔ میں کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں جاتے ہی میں نے اندر سے دروازہ بند کیا۔ سکندر کے ہاتھ سے گلاس لیا تو وہ چونکا اور نشے میں بولا۔

”کیا ہے۔ کون ہے؟؟“

میں نے گلاس چھین کر دیوار پر دے مارا۔ چھناک کی آواز آئی۔ سکندر کی آنکھیں بند ہی رہیں۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔

میں نے زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارا کہ وہ کرسی سمیت نیچے جا گرا۔ میرا تھپڑ اتنی زور کا تھا کہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اور یکدم اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں تھی اور وہ میری جانب دیکھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

”کون ہے..... کون ہے؟“ سکندر ہڑبڑا گیا تھا۔

میں نے گریبان پکڑ کر اُسے سیدھا کیا اور بولا ”میرا باپ کہاں ہے۔“

”کون ہو تم؟“ سکندر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں تیرا باپ ہوں۔“ میں نے اس کا گریبان جھنجوڑا۔

”میرا باپ تو مر چکا ہے۔ تو کہاں سے زندہ ہو گیا ہے۔“ اُس نے کہا۔

”بتا میرا باپ کہاں ہے؟“ میں نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ اور رسید کر دیا۔ اس بار میں نے اسے دوسرے ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا جس سے اس کی کرسی نہیں گری۔ وہ پھر سیدھا ہو گیا تھا۔

”تم یہاں پہنچ گئے ہو۔ میرے آدمیوں نے تجھے اندر کیسے آنے دیا۔“ وہ غصے سے بولا۔

”دیکھ میں اندر آ گیا ہوں اور تیرے سامنے کھڑا ہوں۔ کہتا تھا کہ میری باری ہے اور اب دیکھ کہ کس کی باری ہے۔ بتا کہاں ہے میرا باپ۔“ میں نے کہا۔

”وہ زندہ ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”وہ اسی دنیا میں ہے۔“

”کہاں ہے۔ مجھے بتا کہ وہ کہاں ہیں۔“ میں نے آگ بگولہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں بتاؤں گا۔ ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ پوچھ پوچھ کر پاگل ہو جائے گا لیکن نہیں بتاؤں گا۔“ سکندر چیخا۔

”میں تیری گردن توڑ دوں گا۔“ میں نے اسے ایک بار پھر جھنجوڑا۔

”میری گردن توڑ دے گا تو پھر کیسے پتا چلے گا تجھے تیرا باپ کہاں ہے۔ یہ صرف میں جانتا ہوں۔ چھوڑ دے مجھے میں بتا دوں گا کہ تیرا باپ کہاں ہے۔“ سکندر نے مجھے لالچ دی۔

”مانگ مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک..... میرے پیر پکڑ اور زندگی مانگ۔“ میں غصے سے بولا۔

”مجھے مارے گا تو تیرا ہی نقصان ہو گا۔“ سکندر نے کہا۔

”تم اور کتنا نقصان کرو گے۔ چاچا فضل کو کس نے مارا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”کہا تو تھا کہ ہم نے ہی مارا تھا۔“ یہ کہتے ہی اس نے مجھے زور سے ایک طرف دھکا دے دیا۔ میرے لیے اس کا یہ حملہ غیر متوقع تھا کیونکہ مجھے وہ میرے تھپڑوں کی وجہ سے نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔ میرا نہیں خیال تھا کہ وہ کوئی ایسی حرکت کرے گا۔

میں سامنے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اسی اثنا میں اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اُٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے بھاگا۔

سکندر نے باہر نکلتے ہی مدہوش پڑے اپنے آدمیوں کو ایک ایک ٹانگ رسید کرتے ہوئے دہاڑتے ہوئے کہا۔ ”اٹھو اور پکڑو اسے۔ اس کی ہڈیاں توڑ دو۔ مار دو اسے۔“

لیکن وہ کچھ زیادہ ہی پی چکے تھے۔ انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ ان کا باس سکندر انہیں کیا حکم دے رہا ہے۔ وہ ہوں..... ہاں کر کے پھر ڈھلک گئے تھے۔ جب سکندر نے دیکھا کہ وہ نہیں اُٹھ رہے تو اس نے پاس پڑی کرسی اُٹھا کر مجھ پر دے ماری۔ میں عین وقت پر نیچے جھک گیا اور کرسی میرے سر کے اُوپر سے اُڑتی ہوئی دیوار پر جا لگی اور سکندر بھاگ کھڑا ہوا۔

سکندر آگے آگے بھاگ رہا تھا اور میں اس کے پیچھے تھا۔ اندھیرا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اس اندھیرے کا فائدہ اُٹھا کر کہیں گم نہ ہو جائے۔ ورنہ پھر اس کا میرے ہاتھ لگنا مشکل تھا۔

میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی اور بھاگتے بھاگتے اُسے پیچھے سے دھکا دے دیا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین پر جا گرا۔ میں نے اُسے پکڑا اور سیدھا کر کے اس کے ٹینٹوے پر اپنی اُنگلیاں جما دیں۔

”بتا میرا باپ کہاں ہے؟ کہاں رکھا ہے انہیں۔ بتاؤ۔“

”مار دیا ہے اسے۔“ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے دوسرے ہاتھ کے مکّے اس کے پیٹ میں مارنے شروع کر دیئے۔ ”کیوں مارا ہے میرے باپ کو..... کیوں مارا ہے۔“

”یہ کاظم کا حکم تھا۔“ سکندر بولا۔

”یہ کاظم کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ہی مجھے حکم دیا کرتا ہے۔ کسی کو مارنا ہو یا اغوا کرنا ہو اسی کا حکم ہوتا ہے۔“ سکندر نے بتایا۔

”کہاں ملے گا یہ؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تہذیب شاہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں زیادہ پتا نہیں ہے۔“ سکندر نے بتایا۔ وہ بمشکل بول رہا تھا اور اس کا جسم جیسے تڑپ رہا تھا۔

”کاظم کو میرا پتا ہے کہ تم میرے باپ کے ساتھ مجھے بھی پکڑ کر لے گئے تھے۔“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے بارے میں کسی کو نہیں پتا۔ کیونکہ کسی کو علم ہی نہیں تھا کہ تم اپنے باپ کے ساتھ ہو۔“ سکندر کی آواز گھٹ رہی تھی۔ اس کی سانس اُکھڑ رہی تھی۔ مجھے خود یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ جوش اور غصے میں اس کے ٹینٹوے پر جو میری اُنگلیوں کی گرفت تھی وہ اس قدر مضبوط ہوتی جا رہی تھی کہ اس کی سانس رک ہی گئی تھی۔

”اگر میرے باپ کو مار دیا ہے تو یہ بتاؤ کہ.....“

میرا سوال میرے منہ میں ہی رہ گیا۔ سکندر کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ وہ میرے ہاتھ میں ہی

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

جھول گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مر گیا تھا۔

میں نے اسے چھوڑ دیا وہ زمین پر گر گیا۔ میں اسی جگہ کھڑا رہا۔ میں نے ایک بار پھر یہ تصدیق کی کہ کہیں یہ مکر تو نہیں کر رہا ہے۔ وہ واقعی مر گیا تھا۔

اب یہ جاننا مشکل تھا یا اس نے میرے والد کو کہیں چھپایا ہوا تھا کہ واقعی مار دیا تھا۔ مجھے اس پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں پھر اسی مکان میں چلا گیا۔ میں نے ایک طرف سے ٹارچ اٹھائی اور اس کی مدد سے پہلے ایک رسی تلاش کی اور پھر وہاں پر موجود ان آدمیوں کو اس طرح سے باندھ دیا کہ وہ آزاد نہیں ہو سکتے تھے اسی جگہ پڑے پڑے موت کا ہر قدم اپنی طرف بڑھتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے اور پھر موت کی اُنگلی تھام کر اس دنیا سے اپنا ناپاک وجود لے جاتے۔

میں اس مکان سے باہر نکل گیا۔ میرے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ میں بہت دیر تک اس مکان کے اردگرد ابا جی کو تلاش کرتا رہا۔ لیکن مجھے ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میں نے یہ معاملہ خدا کے سپرد کیا اور اس جنگل سے نکل جانے کے بارے میں سوچا۔ اس سے پہلے کہ کوئی مجھے اس جگہ دیکھے اور میں کسی نئی مصیبت میں پھنس جاؤں مجھے وہ جگہ چھوڑنی تھی۔

مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ان کے چنگل میں دو دن سے ہوں۔ انہوں نے مجھے زیادہ تر بے ہوش رکھا تھا۔

میں نے ایک میز پر بہت سے پھل اور پانی کی بوتلیں دیکھیں تو بیٹھ کر پہلے پھل کھائے اور بہت سا پانی پیا اور اس جگہ سے جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

مکان کے ایک طرف مجھے کار کھڑی دکھائی دی تھی۔ جو یقیناً سکندر کی ہوگی۔ میں واپس اس جگہ آیا اور کار کی طرف دیکھا۔ میں اس کار کے پاس گیا۔ اندر جھانک کر دیکھا۔ کار کی چابی اندر لگی ہوئی تھی۔ میں بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر کے ایک طرف جاتی ہوئی کچی سڑک پر چل پڑا۔

میں کار بڑی تیزی سے چلا رہا تھا۔ جس طرف وہ کچی سڑک جا رہی تھی میرا رخ بھی اسی طرف تھا۔ دائیں بائیں درخت تھے۔ اور یہ راستہ ان درختوں کے بیچوں بیچ تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اس سڑک پر کوئی اور نہ اس طرف آ رہا ہو۔ آمنا سامنا ہو گیا تو مشکل ہو جائے گی۔ لیکن شکر تھا کہ کسی سے بھی سامنا نہیں ہوا اور میں ایک بڑی سڑک پر آ گیا۔

میں نے پہلے رک کر دائیں بائیں دیکھا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ یہ سڑک کوسی ہے اور کس طرف جاتی ہے۔ وہاں کوئی بورڈ وغیرہ نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے کار کا رُخ بائیں طرف موڑ دیا۔ مجھے یہ کار اپنے ساتھ نہیں رکھنی تھی۔ میرا ارادہ تھا جیسے ہی کہیں کوئی آبادی کے آثار دکھائی دیتے ہیں میں کار اس جگہ چھوڑ کر پیدل ہی روانہ ہو جاؤں گا۔ میں کار پوری رفتار سے چلا رہا تھا۔ اس ویران سڑک سے نکل جانا چاہتا تھا۔

میں بار بار بیک مرر سے بھی دیکھ رہا تھا کہ کوئی میرے پیچھے تو نہیں آ رہا ہے۔ کوئی سات آٹھ کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد مجھے سامنے پولیس وین دکھائی دی۔ ایک پولیس والا اسٹیرنگ سیٹ پر اُونگھ رہا تھا جبکہ دو سپاہی باہر کھڑے آپس میں شاید گپ شپ لگا رہے تھے۔ ممکن تھا کہ وین کے پیچھے بھی پولیس والے موجود ہوں۔

پولیس وین اس طرح سے کھڑی تھی کہ راستہ بند ہو کر رہ گیا تھا۔

میرے پاس اس کار کے کاغذات تو تھے

نہیں۔ اس جگہ سے نکل کر میں فرار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ نکلنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں ان کی جیپ کو ٹکر مار کر نکل جانے کی کوشش کرتا۔ میری کار دیکھتے ہی پولیس والے الرٹ ہو گئے تھے اور اُنہوں نے مجھے روکنے کے لیے اشارہ کیا۔

میں نے اپنی جیکٹ کے کالر کھڑے کر لیے تھے جس سے ایک حد تک میرا چہرہ چھپ سا گیا تھا۔ میں نے کار روک دی۔ دونوں سپاہی میری طرف بڑھے اور اسی دوران میری نگاہ اس سڑک سے دائیں طرف پڑی ایک پتلی سڑک دکھائی دی جسے میں کار چلاتے ہوئے اندھیرے کی وجہ سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ ورنہ میں اس طرف سے آسانی کے ساتھ نکل جانے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔

پہلے ان سپاہیوں نے کار کو غور سے دیکھا پھر ایک میرے پاس آ کر بولا۔ ”کار کے کاغذات ہیں؟“

”ہاں ہیں۔“ میں نے کہہ دیا۔

”دکھاؤ۔“ وہ بولا۔

”کیا بات ہے۔ چیکنگ کیوں ہو رہی ہے؟“ میں نے ایسے ہی ڈیش بورڈ کھولتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کار آپ کی ہے؟“ دوسرے نے اچانک سوال کیا۔

”ہاں میری ہے۔“ میں نے اعتماد سے جھوٹ بولا۔

”یہ کار تو چوری کی ہے۔ کاغذات دکھاؤ۔“ اس نے مجھے گھورا۔ ڈیش بورڈ کی دوسری طرف منہ کیے کھولنے کا میرا مقصد اپنا چہرہ چھپانا تھا۔

اب جو میں نے چوری کی کار کے بارے میں سنا تو میں چونکا۔ میں نے ایک نظر اس راستے کی طرف دیکھا جو جانے کس طرف جاتا تھا اور پھر اپنی ناک پر ہاتھ سے خارش کرتے ہوئے سپاہی کی پشت سے پیچھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔“

”کون ہے؟“ اس نے فوراً پیچھے کی طرف دیکھا اور میرے لیے یہ موقعہ بہت تھا۔ میں نے برق رفتاری سے کار گھمائی اور اس پتلی سڑک پر ڈال کر اسے بھگانا شروع کر دیا۔

سنگل سڑک پر کار کی ہیڈ لائیٹس کی وجہ سے دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ سڑک بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے ان سے جان چھڑانا تھی میں کس طرف جا رہا تھا مجھے اس کا علم نہیں تھا بس میں کار دوڑائے جا رہا تھا۔

سڑک ویران تھی۔ اس لیے مجھے تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں تھا۔ میں بیک مرر سے دیکھ رہا تھا کہ پولیس وین میرے تعاقب میں تھی۔

میں نے ایکسی لیٹر پر اپنا دباؤ بڑھا دیا۔ میرا ان کی وین سے کافی فاصلہ تھا۔ آگے ایک چھوٹا سا پل آ گیا۔ وہاں سے وہ سڑک سیدھی اور بائیں جانب جاتی تھی۔ میں نے پل کراس کیا اور بائیں طرف کار موڑ دی۔

کچھ دور جانے کے بعد مجھے کسی وادی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ میں نے کار کی رفتار میں اور اضافہ کیا اور جیسے ہی میں نے کار ایک طرف موڑی۔ اس سڑک پر کئی کارخانے اور فیکٹریاں تھیں۔ وہ کوئی انڈسٹریل ایریا تھا اور سڑک بھی کشادہ ہو گئی تھی۔ میں کار بھگاتا ہوا جا رہا تھا۔ اس دوران جو بھی مجھے موڑ دکھائی دیا میں نے کار اس جانب موڑ دی۔ سامنے ایک قطار میں ٹرک کھڑے تھے۔ وہاں کوئی آدمی مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے کار ان ٹرکوں کے ساتھ کھڑی کی باہر نکلا اور ایک طرف چل پڑا۔ وہاں

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

سے ایک گلی میں ہوگیا اور چلتے چلتے سامنے سڑک آ گئی۔

سڑک کے کنارے میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے، اس علاقے کا کیا نام ہے۔ میں کہاں آ گیا ہوں۔ سڑک کے اُس پار مجھے آبادی دکھائی دے رہی تھی۔ کیونکہ کئی گھروں کے باہر بلب اور ٹیوب لائیٹس روشن تھیں۔ میں نے خالی اور ویران سڑک عبور کی اور اس آبادی میں چلا گیا۔

میں تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ ایک گلی میں مجھے مسجد نظر آئی۔ وہاں گیا تو اس کا دروازہ بند تھا۔ مسجد سے ملحق مجھے ایک چاردیواری کیا ہوا پلاٹ دکھائی دیا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پلاٹ میں ایک کمرا تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا اور اندر چلا گیا۔ کمرے کے پاس پہنچ کر میں نے اندر دیکھا تو اندھیرا تھا۔ مجھے کچھ دکھائی ہی نہیں دیا۔

میں نے جونہی دروازے کو کھولنا چاہا دروازے کی آواز پیدا ہوئی اور کوئی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا وہ اتنی سی آواز پر بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"کون ہے..... کون ہے؟؟" اس نے پوچھا۔

"مسافر ہوں۔"

"مسافر ہو؟" اس کا لہجہ دھیما ہوگیا۔ "دراصل میری نظر کمزور ہے اور میں اندھیرے میں تو بالکل ہی نہیں دیکھ سکتا۔"

"میں دروازے پر کھڑا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ جگہ دیکھی تو اس طرف آ گیا۔ کیا مجھے رات گزارنے کے لیے جگہ مل سکتی ہے؟"

"اندر آ جاؤ۔ دیکھو تم مسافر ہی ہو ناں۔ کوئی چور تو نہیں ہو۔ میرے پاس لٹانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اس مسجد کا موذن ہوں۔ اس شہر کا نہیں ہوں۔ اس جگہ رہتا ہوں۔"

"میں مسافر ہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "کوئی چور یا لٹیرا نہیں ہوں۔ آپ اطمینان رکھیں۔"

"دیوار پر بورڈ لگا ہے۔ ایک بٹن ٹیوب لائٹ کا ہے۔ ذرا وہ جلا دو۔" اُس نے کہا۔

میں نے ٹیوب لائٹ روشن کر دی۔ چھوٹا سا کمرہ یک دم جگمگا اُٹھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک چارپائی بچھی ہوئی ہے۔ ایک طرف صندوق رکھا ہوا ہے ساتھ ہی چھوٹی سی میز پر کچھ کھانے پینے کے برتن رکھے ہوئے ہیں۔ وہ آدمی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بوڑھا شخص تھا۔ سفید داڑھی تھی۔ اس نے سرہانے کے پاس رکھی عینک اُٹھائی اور اپنی آنکھوں کو لگا کر میری جانب دیکھا۔ میرا جائزہ لینے کے بعد اس نے پوچھا۔

"اتنی رات گئے کہاں سے آئے ہو بیٹا؟ کہاں جانا ہے؟"

"لاہور سے آیا ہوں۔" میں نے بتایا۔ "پہلی بار یہاں آیا ہوں۔"

"یہاں کسی عزیز کے پاس آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں لیکن ان کا پتا بھول گیا ہوں۔" میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔ "بس کچھ یاد تھا اور میں اس طرف آ گیا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں ہے کہ میں نے کہاں اور کس طرف جانا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ فجر کی نماز مسجد میں پڑھنا۔ ساتھیوں سے میں ذکر کر دوں گا۔ انہیں تلاش کرنا مشکل نہیں رہے گا۔ ویسے کیا نام ہے اُن کا جن کے پاس جانا ہے۔" بزرگ نے شفقت سے کہا۔

میں سوچنے لگا کہ کیا نام لوں۔ میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ میرے منہ سے خود بخود ہی نادیہ کے بھائی کا نام آ گیا۔ "جی اس کا نام جمال ہے۔"

"جمال..... جن کے والد کا نام فضل الدین تھا۔ جن کا ابھی انتقال ہوا ہے۔" بزرگ نے نام سنتے ہی جلدی سے کہا اور میں یہ سنتے ہی چونک پڑا۔ میں نے متحیر نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور میرے دماغ میں فوراً یہ سوال اُبھرا کہ کیا میں اس علاقے میں موجود ہوں جہاں نادیہ اپنے بھائیوں کے پاس آئی ہے؟

"ہا..... ہاں وہی جمال۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "کیا آپ اُنہیں جانتے ہیں۔ یہاں قریب ہی رہتے ہیں وہ؟"

میری بات سنتے ہی اُنہوں نے پاس پڑی گھڑی اُٹھائی وقت دیکھا اور بولے۔ "رات کا ڈیڑھ بجا ہے۔ یہ چٹائی اور کھیس پڑا ہے۔ تم وہاں بچھا کر لیٹ جاؤ۔ صبح ہوتے ہی میں تمہیں ان سے ملوا دوں گا۔"

"کیا آپ جانتے ہیں انہیں؟" میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

"ہاں جانتا ہوں۔ فضل سے میری اچھی جان پہچان تھی۔ میں کئی بار اس سے ملنے کے لیے بھی اس کے قصبے میں گیا ہوں۔" بزرگ نے پوچھا۔

یہ تو معجزہ ہی ہوگیا تھا کہ تقدیر مجھے نادیہ کے پاس لے آئی تھی۔

"یہاں پاس ہی رہتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں قریب ہی رہتے ہیں۔ ابھی ملنے کا ارادہ ہے کیا۔" وہ مسکرائے

"ابھی ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔" میں مضطرب ہوگیا تھا۔

"رات کے اس وقت وہ آرام کر رہے ہوں گے۔ ان کی نیند خراب کرنے کا کیا فائدہ۔ تم یہاں سو جاؤ۔ خدا نے تمہاری مدد کر دی ہے۔ جن کا پتا بھول گئے تھے وہ مل گئے ہیں۔ تم اطمینان سے سو جاؤ۔" بزرگ نے کہا۔

میں مضطرب ہوگیا تھا لیکن اپنی اس بے چینی کا اظہار کرنے کی بجائے چٹائی اور کھیس اُٹھا کر چٹائی زمین پر بچھائی اور لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی مجھے ابا جی کی یاد کا غم بے حال کرنے لگا اور میں ایک بار پھر ان کی یادوں میں کھو گیا۔

☆.....☆.....☆

رات جانے کب میری آنکھ لگ گئی تھی۔ کب میں نیند کی وادی میں پہنچا اور کس وقت میری آنکھوں سے جاری آنسو خشک ہوئے مجھے یاد نہیں تھا۔

فجر کی اذان سے قبل مجھے اُنہوں نے جگا دیا تھا۔ میں تھکا ہوا تھا۔ مجھے بھوک بھی ستا رہی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ مسجد جائیں میں آتا ہوں۔

فجر کی نماز ادا کر کے میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ میں اپنے والدین کے لیے دعائیں کرنے لگا۔ دن کا اُجالا پھیل گیا تھا۔ میرے پاس ایک نوجوان آیا اور بولا۔

"حافظ جی نے بتایا کہ آپ نے جمال صاحب کے گھر جانا ہے۔ آیئے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

"ہاں۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ اُٹھ کر چل پڑا۔ اس جگہ سے دو گلیاں چھوڑ کر ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ نوجوان نے بتایا کہ یہ جمال کا گھر ہے۔ وہ کہہ کر چلا گیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو کچھ دیر کے بعد نادیہ کی بھابی نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرا کر بولیں۔

"ارے گلریز تم..... آ جاؤ اندر آ جاؤ۔"

میں اندر چلا گیا۔ نادیہ کی ماں سے ملا۔ جمال ابھی گھر میں ہی تھا وہ مجھے گلے ملا۔ مجھے نادیہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے متلاشی نگاہوں سے کئی بار دائیں بائیں دیکھا لیکن مجھے کہیں بھی وہ چور نگاہیں نظر نہیں آئیں جو مجھے کسی دروازے کی اوٹ

www.pkdigest.com

سے دیکھ رہی ہوں جس کی مسکراہٹ خوش بو بکھیر رہی ہو۔

میں اس کے بارے میں کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نہایا، ناشتے کے دوران مجھ سے جمال نے ابا جی کے بارے میں سوال کیا تو میں چپ ہو گیا۔ جمال نے مجھ سے پھر پوچھا اور میں بولا۔

''چاچا فضل کی طرح ابا جی کو بھی قتل کردیا گیا ہے۔''

میری بات سنتے ہی وہ سب دم بخود رہ گئے۔ خوف سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سب بولنا بھول گئے ہوں۔

''یہ کیسے ہوا اور کب ہوا؟'' جمال نے پوچھا۔ ''تم نے بتایا ہی نہیں۔''

''چار دن پہلے۔'' میں اسی جواب پر اکتفا کرنا چاہتا تھا۔

''یہ کیسے ہوا تھا؟'' جمال نے متحیر لہجے سے پوچھا۔

''میں کچھ نہیں کرسکا۔ بس وہ انہیں اغوا کرکے کہیں لے گئے اور پھر......'' میں کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ یہ کیسے ہو گیا۔'' جمال کو گہرا صدمہ پہنچا تھا۔

''کون لوگ ہیں جو ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ جمال کو بھی فون پر دھمکیاں آتی رہی ہیں۔ اسے ڈرایا جاتا رہا ہے۔'' نادیہ کی امی نے متفکر ہو کر کہا۔

''کیسی دھمکیاں؟'' میں نے پوچھا۔ ''کون دھمکیاں دے رہا تھا۔''

''بس اچانک فون آنے شروع ہو گئے۔ پتا نہیں کون تھا۔ نادیہ کو ختم کرنے کا کہہ رہا تھا۔'' جمال بولا۔

''نادیہ کو؟'' میں چونکا۔ ''نادیہ کو ختم کرنے کا کیوں کہہ رہا تھا۔''

''بس عجیب باتیں کررہا تھا۔ ہم تو ڈر گئے تھے۔'' جمال نے کہا۔

''کہاں ہے نادیہ؟'' مجھے پوچھنے کا موقع مل گیا اور میں نے دائیں بائیں دیکھا۔

''ہم ڈر گئے تھے۔ پتا نہیں کیا ہو جائے۔ اسی دوران نادیہ کا ماموں آگیا اور اس نے اپنے بیٹے کے لیے نادیہ کا ہاتھ مانگ لیا۔ اس کا بیٹا دبئی میں رہتا ہے وہاں کام کرتا ہے۔ ہم نے ہاں کردی۔ سادگی سے نکاح ہوا اور آنا فانا نادیہ کا بھی اپنے شوہر کے ساتھ باہر جانے کا انتظام ہو گیا اور وہ دبئی چلی گئی۔ اب کوئی فون نہیں آتا۔'' جمال نے بتایا۔

میرے دل کی دھڑکن جیسے رک گئی ہو۔ میری آنکھیں جمال کے چہرے پر ہی منجمد ہو گئی تھیں۔ میری سانس شاید میرے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ زندگی جیسے پیچھے رہ گئی تھی اور میں کہیں آگے نکل گیا تھا۔

مجھے نہیں پتا کہ جمال نے اور کیا بتایا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ ان دھمکیوں کے بارے میں بتا رہا تھا، اپنے اندیشے بیان کررہا تھا، قیاس آرائی کررہا تھا لیکن میں کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔

میں چپ پتھر کا بنا ہوا تھا۔ نادیہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ وہ تو اپنے دل کی بات کسی سے کہہ بھی نہیں سکی ہوگی۔ کیسے کہتی۔ چپ چاپ اس نے اپنے بڑوں کا فیصلہ قبول کرلیا ہوگا۔ شاید اس نے میرے بارے میں سوچا ہو۔ مجھے یاد کیا ہو۔ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ کچھ بولنے کے لیے بے چین ہو۔ میں یہ ہی سوچتا رہا اور میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔

معروف صحافی، ادیب اور مفسر
مشتاق احمد قریشی کی ایک اور تالیف
دو بڑے
اردو ادب کی دو بڑی اہم شخصیات ابن صفی اور
ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی زندگی اور ان کی خدمات
اردو ادب کے دو روشن مینار جن کی
روشنی سے اردو ادب منور رہے گا

بڑے لوگوں کو یاد رکھنا اور ان کی عظمت کا عملاً اعتراف کرنا بھی بڑائی ہے

''دو بڑے'' کے حوالے سے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور ابن صفی کی بڑائی کا اعتراف کرنے والا بھی اس زود فراش زمانے میں ''بڑا آدمی'' ہی قرار پائے گا اور اسی لیے میں برادرم مشتاق قریشی کو بھی ''تیسرا بڑا آدمی'' تسلیم کرتا ہوں۔
(سرشار صدیقی۔ ادیب، شاعر، نقاد)

مولف: مشتاق احمد قریشی
ملنے کا پتہ
نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز، احمد چیمبر تلو ریاض اسٹریٹ، آئی آئی چندریگر روڈ کراچی
مکتبہ القریش، اردو بازار لاہور

Pdf by Roadsign

"کیا ہوا کہاں کھو گئے ہو؟" اچانک جمال نے میرا بازو ہلایا۔

میں چونکا۔ "نہیں میں سن رہا تھا۔ تمہاری ساری بات سن رہا تھا۔" میں اُداس ہو گیا تھا۔ میرا لہجہ مغموم تھا۔ جمال نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا۔

"ہم کیا کرتے۔ جانے وہ کون تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ نادیہ کو اغوا کر لے گا۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ جیسے ہی ہم نے اس کا نکاح کیا، پھر فون آنے بند ہو گئے اور اَب کوئی فون نہیں آتا۔" جمال نے کہا۔

کون ہو سکتا ہے وہ جو یہ جانتا تھا کہ نادیہ کا نکاح ہو گیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہی تھا کہ نادیہ کا کہیں نکاح ہو جائے۔ کیا وہ جو کوئی بھی تھا وہ میرے اور نادیہ کے تعلق کے بارے میں جانتا تھا؟ وہ ان کو دھمکیوں سے مجبور کر رہا تھا کہ نادیہ کا تعلق مجھ سے ٹوٹ جائے؟ لیکن میرا تعلق نادیہ سے تھا..... یہ صرف نوید جانتا تھا۔ اس کے سوا تو کسی کو پتا ہی نہیں تھا۔ پھر نادیہ کو کس نے استعمال کیا؟ محض اس لیے کہ وہ مجھ سے دور ہو جائے۔ عجیب اُلجھن تھی اور عجیب معمہ تھا۔

"کہاں کھو جاتے ہو تم؟" ایک بار پھر جمال نے میرا بازو پکڑ کر ہلایا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔ بات کیا ہے تم مجھے کچھ ڈھیلے ڈھیلے لگ رہے ہو۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کون لوگ ہیں وہ جو ہمارے خاندان کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے چاچا فضل اور پھر ابا جی کو مجھ سے چھین لیا۔" میں بولا۔

"جانے کون لوگ ہیں لیکن اَب ذرا سکون ہے۔ مگر تمہاری خبر سن کر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔" جمال نے مغموم ہوتے ہوئے کہا۔

"ہم اس بات پر خوش ہیں کہ نادیہ کا گھر بس گیا ہے اور وہ دبئی بھی چلی گئی ہے۔ اس کی قسمت دیکھو گھنٹوں میں اس کی زندگی بدل گئی۔ لڑکا بھی بہت ہی اچھا اور شریف ہے۔" نادیہ کی ماں اس بات پر پر مسرت دکھائی دے رہی تھیں۔ اُن کے چہرے کی خوشی اور اطمینان دیکھ کر میں نے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔

"میں چلتا ہوں۔" میں جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "زندگی رہی تو پھر ملاقات ہو گی۔ شاید قسمت مجھے اس حقیقت سے پردہ اُٹھانے کے لیے یہاں تک کھینچ کر لائی تھی۔" میں نے آخری جملہ زیرِ لب کہا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" جمال نے پوچھا۔ "ابھی تو آئے ہو۔"

"واپس جا رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "بس اتنا ہی وقت تھا۔"

"کیا مطلب ہے کہ اتنا ہی وقت تھا؟ ابھی جا رہے ہو۔" جمال بولا۔ "دو چار دن تم ہمارے ساتھ رہو۔"

"بس آپ لوگوں سے ملنے کو دل کیا اور یہاں آ گیا۔ کالج جانا ہے۔ چھٹی بس ایک دن کی ہی ملی تھی۔ پھر ملاقات ہو گی۔" میں نے اُداس لہجے میں کہا۔ "پڑھائی کا پہلے ہی حرج ہو رہا ہے۔"

"ملتے رہنا..... ہمارے والد ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ ہم یہ ناتا نہیں توڑیں گے۔" جمال نے مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "تم میرے بھائی جیسے ہی ہو۔"

"ہم تو نہیں توڑنا چاہتے لیکن لوگ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔" میں بولا۔ "وہ ہم سے

سب کچھ چھیننے کے لیے کسی گدھ کی طرح ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔"

"اُن لوگوں کا انجام بھی اچھا نہیں ہو گا۔ خدا سب دیکھ رہا ہے۔" جمال بولا۔

"ہاں خدا تو دیکھ ہی رہا ہے۔" میں بولا۔

میں نے نادیہ کی ماں کو سلام کیا اور جانے کے لیے دروازے تک گیا تو مجھے یاد آیا کہ میری جیبیں خالی ہیں۔ پاس کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی کہ جس کو فروخت کر کے سفر کا خرچ نکال سکوں۔ لیکن جمال سے مانگتے ہوئے شرم بھی آ رہی تھی۔ میں نے کبھی جمال سے کوئی پیسہ نہیں مانگا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" جمال نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

"میں کچھ نہیں سوچ رہا۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا لیکن پھر سوچا کہ سفر کیسے ہو گا۔ کیا مانگ لوں۔ مجبوری تو ہے۔

"کچھ کہنا چاہتے ہو؟" جمال میری پریشانی بھانپ رہا تھا۔ "لیکن کہنے سے ڈرتے ہو۔ کوئی بات ہے جو تمہاری زبان پر نہیں آ رہی ہے۔"

"وہ دراصل..... بس میں میری جیب کسی نے کاٹ لی تھی۔" میں اٹکتے ہوئے بولا۔ "کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے کہ مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔"

جمال نے سنتے ہی فوراً اپنا پرس نکال کر میرے آگے کر دیا۔ "یہ بڑے کم بخت ہوتے ہیں۔ لو جتنی ضرورت ہے لے لو اور اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ہم بھائی ہیں۔ تم کچھ بھی مانگ سکتے ہو۔ ایسا میرے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں جاتے ہی منی آرڈر کر دوں گا....." میں بولا۔ مجھے ندامت سی ہو رہی تھی۔

"گریز..... خبردار جو تم نے ایسی بات کی۔ جتنی ضرورت ہے لے لو۔" نادیہ کی امی نے فوراً کہا۔ "اور واپس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"بس پانچ سو روپے دے دو۔" میں نے کہا اور جمال نے ایک ہزار کا نوٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے وہ نوٹ پکڑ لیا۔

"تمہارا شکریہ جمال۔" میں نے ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پھر تم نے غیروں والی بات کی۔" جمال بولا۔

"شکریہ تو ادا کرنا فرض بنتا ہے ناں۔ اس میں غیروں والی کوئی بات نہیں ہے۔" میں مسکرایا۔

ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کے گلے ملے اور میں اس گھر کی دہلیز پار کر کے باہر چلا گیا۔

میرا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ باپ بھی چلا گیا اور پیار بھی نہ رہا۔ میں تہی دست چلتا جا رہا تھا۔ غم کا سمندر مجھے گھیرے ہوئے تھا اور میں لاچار کشتی کی مانند ہچکولے کھا رہا تھا۔ میری زندگی میں ایسا تغیر آ گیا تھا کہ جس کے بارے میں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ کیسے کیسے بھنور میری زندگی میں کھڑے ہو گئے تھے۔ گرداب کی مالا جیسے میرے گلے میں کسی نے ڈال دی تھی۔ کمال عزیز سے لے کر خالد چیمہ تک اور اَب تہذیب شاہ میری آنکھوں کا کانٹا تھا۔ سب کچھ میری مٹھی سے ریت کے ذروں کی طرح نکل گیا تھا۔

نادیہ کا غم میرے دل پر کسی پہاڑ کی طرح تھا۔ میں نے بمشکل اپنے آنسو ضبط کیے ہوئے تھے۔

میری پڑھائی کا خرچہ برداشت کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ مجھے اپنا مستقبل بھی اسی جگہ ختم ہوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میرا کوئی سہارا نہیں تھا۔ بس ایک خدا کا سہارا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ سارے انتقام

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

اور کھائی ہوئی قسم بھول جاؤں؟ رات کو کہیں نوکری کرلوں اور دن کے اجالے میں اپنی پڑھائی جاری رکھ کر اپنے باپ کا خواب پورا کروں؟ سب کچھ چھوڑ دوں۔ اپنے باپ، چاچا فضل اور نادیہ کا غم سینے سے لگا کر زندگی کی سانسوں کی لڑی چھتار ہوں؟ جو ہوا اسے اپنا مقدر جان کر باقی سب کچھ بھول جاؤں؟

میں رکشے سے اتر کر لاری اڈے کی طرف چلا گیا تھا اور جیسے کوئی طاقت مجھے اپنے ساتھ لیے جا رہی تھی، میں چلتا ہوا، بس میں سوار ہو گیا تھا۔ بس کب چلی اس کا بھی مجھے پتا نہیں چلا تھا۔

میں سوچوں کی دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ میں کوئی بھی فیصلہ کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ میرے سینے پر غم کانٹے بن کر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پیوست ہو رہے تھے۔ اور مجھے ہر بار ایک نئی تکلیف اور اذیت کا مزا چکھنا پڑ رہا تھا۔

بس لاہور شہر میں داخل ہو گئی تھی۔

اچانک میں نے سوچا کہ میں کسی سے بھی انتقام نہیں لوں گا۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ جب میرے ہاتھ ہی کچھ نہیں رہا تو میں انتقام لے کر کیا کروں گا۔ کمال عزیز، خالد چیمہ اور تہذیب شاہ کے پیچھے بھاگنے کی بجائے میں اپنی پڑھائی پر توجہ دوں گا اور کچھ بن کر اپنے والدین کا خواب پورا کروں گا اس کے لیے مجھے چاہے رات کو کام کرنا پڑے اور دن کو اپنی کلاسیں لینی پڑیں۔ میں کسی لڑائی میں نہیں پڑوں گا۔ میں سب کچھ اسی جگہ ختم کر دوں گا۔ زندگی نئے انداز سے شروع کروں گا۔

میں نے یہ سوچ لیا تھا۔ بس سے اتر کر ویگن میں بیٹھا اور سیدھا ہوسٹل چلا گیا۔

کمرے کو تالا لگا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ نوید کالج میں ہوگا۔ اس وقت وہاں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کالج کا ٹائم تھا سب لوگ پڑھائی میں مصروف ہوں گے۔ جو لڑکے ہوسٹل میں ہوں گے وہ اپنے اپنے کمروں بند ہوں گے۔ اس لیے کسی سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں ہوسٹل سے باہر چلا گیا۔

ابھی میں نے کالج کا گیٹ عبور کیا ہی تھا کہ اچانک فرحت ایک طرف سے نکل کر میرے سامنے آگئی۔ وہ مجھے حیران کن نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اُسے دیکھ کر رک گیا تھا۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے؟'' فرحت نے پوچھا ''میں سمجھی آپ یہ شہر چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔''

''میں ایک کام سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں واقعی جلدی میں گیا تھا۔ اسی لیے کسی سے ملاقات نہیں ہو سکی۔''

''آپ کب آئے واپس؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔ مجھے اس کے چہرے سے لگتا تھا جیسے وہ میرے لیے پریشان رہی ہے۔

''میں ابھی آیا ہوں۔ تھوڑی دیر ہوئی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں آپ کے لیے بہت پریشان تھی کہ آپ کہاں چلے گئے ہیں۔ آج آپ مجھے چار دن کے بعد مل رہے ہیں۔'' فرحت نے کہتے ہوئے اپنی نگاہیں جھکا لی تھیں۔ اس کے چہرے پر مجھے اپنے لیے پیار محسوس ہو رہا تھا۔

''میں ابھی آیا ہوں مجھے ذرا ایک کام ہے۔ اس کے بعد ملاقات ہوتی ہے۔'' میں نے کہہ کر اس جگہ سے جانا چاہا۔

''اب آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی کام

www.pkdigest.com

ہے؟''

''کوئی کام ہوگا تو میں آپ سے پوچھوں گی؟ میں ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔'' وہ متانت سے بولی۔

''میں کلاس روم کی طرف جا رہا ہوں۔'' میں نے ناچاہتے ہوئے بھی جواب دے دیا۔

''اپنے دوست کے پاس جا رہے ہیں آپ۔؟'' وہ بولی۔

''تم جانتی ہو میرے دوست کو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں آپ کے دوست کو جانتی ہوں۔''

''تم کیا نہیں جانتی ہو۔ یہ بتا سکتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''سب جانتی ہوں۔'' اس کے چہرے پر وہی متانت تھی۔

''ٹھیک ہے پھر بات ہو گی۔'' میں کہہ کر کلاس روم کی طرف جانے لگا۔

''میں نے پوچھا آپ اپنے دوست کے پاس جا رہے ہیں؟'' اس نے عقب سے ایک بار پھر سوال کیا۔

''ہاں اُسی کے پاس جا رہا ہوں۔'' میں نے رک کر اُکتائے لہجے میں جواب دیا۔ ایک تو مجھے نوید سے ملنے کی جلدی تھی اُوپر سے اس کے سوال ہی ختم نہیں ہو رہے تھے۔

''وہاں جانے کا فائدہ نہیں ہے۔ وہ کلاس روم میں نہیں ہے۔'' فرحت نے کہا اور میں اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ کلاس روم میں نہیں ہے؟'' میں بولا۔

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں جانتی ہوں کہ وہ کلاس روم میں نہیں ہے۔''

''اگر وہ کلاس روم میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں ہے۔ وہ بھی اچانک کالج سے غائب ہو گیا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ ایک سفید کار میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا تھا۔ اُس نے پرنسپل صاحب سے کوئی میٹنگ کی اور اس کے بعد ہوسٹل سے اُس لڑکے نے سامان اُٹھا کر گاڑی میں رکھا اور گاڑی چلی گئی۔'' فرحت نے بتایا۔

میں خیرہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات سن رہا تھا۔ ''وہ چلا گیا؟؟''

''ہاں...... جب تک اس کے ساتھ آئے ہوئے لڑکے نے سامان گاڑی میں نہیں رکھ لیا وہ گاڑی میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ پرنسپل صاحب سے بھی وہ نہیں ملا تھا اور چلا گیا۔'' فرحت بولی۔

''اس کے ساتھ جو لڑکا تھا وہ کیسا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کی شکل وصورت کیسی تھی۔'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''مجھے تو اسی جیسی لگتی تھی۔ جیسے وہ اس کا بھائی ہو۔'' فرحت نے کہا۔ ''آپ کے دوست کو اس دن میں نے بہت چپ دیکھا تھا۔''

میں سوچنے لگا کہ نوید نے ہوسٹل چھوڑ دیا ہے؟ یا وہ اپنے شہر چلا گیا ہے ملنے ملانے کے لیے؟ اگر وہ ملنے کے لیے گیا ہے تو وہ سامان کیوں لے کر گیا ہے؟ ایسے بہت سے سوالات تھے جو میرے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ میں کلاس روم کی طرف جانے کی بجائے ہوسٹل کی طرف چلنے لگا کہ وہاں سے پتا کروں کہ نوید نے کمرا چھوڑ دیا ہے؟

فرحت بھی میرے پیچھے چلنے لگی۔ ہوسٹل کی

Pdf by Roohdesign

انتظامیہ سے پتا چلا کہ نوید نے کمرا چھوڑ دیا ہے اور سارا سامان وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے۔

میرے پاس موبائل فون نہیں تھا کہ میں ابھی نوید کو کال کر کے اس کے اچانک جانے کی وجہ پوچھ سکوں۔ اچانک مجھے فرحت کے ہاتھ میں موبائل فون دکھائی دیا میں نے پوچھا۔

''کیا میں ایک کال کر سکتا ہوں؟''

''وائے ناٹ۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا موبائل فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے نوید کا نمبر ملا کر اپنے کان سے لگا لیا۔ کچھ دیر کے بعد لڑکی کی آواز سنائی دی کہ مطلوبہ نمبر بند ہے۔ میں نے دو، چار بار کوشش کی، ہر بار وہی جواب ملتا رہا اور میں نے موبائل فون فرحت کی طرف بڑھا دیا۔ میری پریشانی بڑھ گئی تھی اور میں نوید کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''شکریہ۔'' میں نے فرحت کو اس کا موبائل فون واپس کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا موبائل فون کہاں ہے۔ میں بھی آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ہو ہی نہیں رہا تھا۔'' فرحت نے پوچھا۔

''میرا موبائل فون گر گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس لیے کسی سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ شاید اس وجہ سے نوید مجھے بتا نہیں پایا ہوگا۔''

''آپ یہ موبائل رکھ لیں۔ آپ کو ضرورت ہوگی۔'' فرحت نے مجھے پیشکش کی۔

''نہیں شکریہ میں اور لے لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''پلیز رکھ لیں۔ میرے پاس ایک اور سیٹ بھی ہے۔ جب آپ نیا پرچیز کر لیں تو یہ واپس کر دیجیے گا۔'' فرحت اپنائیت سے کہہ رہی تھی۔ اس نے وہ موبائل فون میری طرف بڑھایا ہوا تھا۔ موبائل فون کی مجھے بھی ضرورت تھی۔ میں نے ایک نظر موبائل فون کی طرف دیکھا۔

''لیکن میرے پاس سم کارڈ نہیں ہے۔ میرا شناختی کارڈ میرے سامان کے ساتھ تھا سامان نوید لے گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ یہی سم کارڈ استعمال کر سکتے ہیں۔'' فرحت بولی۔

''میں نوید کے شہر جا رہا ہوں۔ وہیں سے نیا موبائل خرید لوں گا آپ پریشان نہ ہوں۔'' میں نے کہہ کر اس سے موبائل فون لینے سے انکار کر دیا۔ وہ اسی جگہ کھڑی رہی اور میں کسی رکشے کو متلاشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگا۔

فرحت بھاگ کر میرے پیچھے آگئی۔ ''آپ مجھ سے رابطہ کریں گے ناں؟''

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر معصومیت اور سچائی ایک ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا۔

''ہاں میں رابطہ رکھوں گا۔''

وہ میری بات سن کر مسکرائی اور میں اس جگہ سے چلا گیا۔

☆......☆......☆

سفر بمشکل ختم ہوا اور میں نوید کے شہر میں کھڑا تھا۔ میں پہلے کبھی اس کے گھر نہیں گیا تھا۔ لیکن مجھے اس نے اپنا ایڈریس بتایا تھا اور یہ بات میرے دماغ میں محفوظ تھی کہ اس کے علاقے میں ایک مشہور چوک ہے اور اس چوک سے اس کے باپ کا نام لے کر اگر ان کے بارے میں پوچھا جائے تو پاس ہی ان کا گھر ہے کوئی بھی بتا دے گا۔

میں نے اس چوک میں پہنچ کر نوید کے والد کا نام

www.pkdigest.com

لیا تو واقعی ایک لمحے میں مجھے اُس آدمی نے سمجھا دیا کہ نوید کا گھر کہاں ہے۔

میں چلتا ہوا ایک گلی میں پہنچ گیا۔ وہاں ایک بڑا سا گھر تھا۔ میں نے بیل دی تو تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص باہر نکلا۔

''السلام علیکم۔'' میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''وعلیکم السلام۔'' اُس شخص نے خوش خلقی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''میرا نام گلریز ہے اور میں نوید کا دوست ہوں۔ یہ گھر نوید کا ہی ہے ناں۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں نوید یہاں ہی رہتا ہے۔'' اس شخص نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ''آپ نوید کے دوست ہیں؟''

''جی ہاں۔ کیا میں ان سے مل سکتا ہوں۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں کیوں نہیں۔ ایک منٹ۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ شخص پھر گیٹ پر آیا اور مجھے اندر لے گیا۔ مجھے ایک ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد وہ بولا۔

''نوید میرا بھانجا ہے۔ نوید ڈاکٹر کے پاس گیا ہے۔ بس ابھی آتا ہی ہوگا۔ نوید کی امی نے کہا کہ جب تک نوید آتا ہے میں آپ کو اندر بٹھا دوں۔''

''بہت شکریہ۔ نوید ڈاکٹر کے پاس گیا ہے؟ خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اسی اثنا میں دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔ غالباً کسی خاتون نے اس شخص کو اندر بلا لیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر کے بعد پھر آیا اور پوچھا۔

''آپ نوید کے ساتھ پڑھتے ہیں ناں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''نوید کی امی پوچھ رہی تھیں۔ آپ کیا کھائیں گے۔'' اُس شخص نے سوال کیا۔

''نوید آ جائے تو پھر اس بارے میں بھی سوچ لوں گا۔'' میں مسکرایا۔

''تب تک کچھ تو چلے گا۔'' وہ مسکرایا۔

''ایک گلاس پانی کا پلا دیجیے۔ اور میں منہ ہاتھ دھونا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں پانی لے کر آتا ہوں۔ وہ رہا باتھ۔ آپ منہ ہاتھ دھوئیں یا نہائیں آپ کی مرضی۔'' یہ کہہ کر وہ جیسے ہی جانے لگا یکدم رک گیا اور میری جانب گھوم کر بولا۔ ''دراصل میں جا ہی رہا تھا۔ آپ کے بہانے مجھے کچھ دیر اور رکنے کا موقع مل گیا۔ بس نوید آتا ہی ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ شخص ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور واپس آیا تو ایک جگ پانی کا اور گلاس پڑا ہوا تھا۔ شاید وہ شخص یہ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں نے پانی گلاس میں ڈالا اور پینے کے بعد صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھے تھکاوٹ ہو رہی تھی۔ کئی سوالوں کا انبار بھی تھا۔ نوید کا انتظار بڑھتا جا رہا تھا اور نوید تھا کہ آ ہی نہیں رہا تھا۔ میں کروٹ پہ کروٹ بدل رہا تھا۔

اسی طرح ایک گھنٹہ اس کا انتظار کرتے ہوئے گزر گیا۔ معاً ڈرائنگ روم کے دروازے سے ایک نوجوان اندر آیا اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد بولا۔

''گلریز ہیں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''میرا نام شاہد ہے اور میں نوید کا کزن ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' میں بولا۔

Pdf by Roadsign

"نوید میرے ساتھ ہی گیا تھا۔ نوید ڈاکٹر سے ہی اپنی بہن کے پاس چکوال چلا گیا ہے۔ آپ کے بارے میں اطلاع آئی تو میں نے فون کر کے اُسے آپ کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا کہ وہ ابھی راستے میں ہی ہے۔ واپسی بھی ممکن نہیں ہے کل واپسی ہوگی۔" شاہد نے بتایا۔

میں حیرت سے سوچنے لگا۔ "کیا ملاقات نہیں ہوسکتی۔"

"وہ کل آنے کا کہہ رہا ہے۔" نوجوان بولا۔ "ایک گھنٹہ پہلے میں نے اسے بس میں سوار کرایا تھا۔ دونوں شہروں کے بیچ میں ہے وہ۔"

اب میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں یہاں رک کر اس کا انتظار کرلوں۔ میں بھی چکوال چلا جاؤں۔ اس شہر میں جان پہچان والا بھی کوئی نہیں رہتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کہوں۔

"اب کیا ہوسکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس اس کا اچانک ہی جانے کا پروگرام بن گیا اور وہ چلا گیا۔" شاہد نے کہا۔

"پھر میں چلتا ہوں۔" میرا خیال تھا کہ وہ میرے یہ کہنے سے مجھے روکنے کی کوشش کرے گا اور یہ کہے گا کہ میں یہاں رک کر اس کا انتظار کرلوں۔ اتنی دور سے آیا ہوں۔ کل اس سے ملاقات ہوجائے گی۔ لیکن یہ محض میری خام خیالی تھی۔

"کھانا وغیرہ کھا لیں۔" اس نے مجھے پیشکش کی۔ مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی لیکن جب نوید ہی نہیں ملا تو میری بھوک اُڑ گئی تھی اور مجھے حیرت اس بات پر بھی تھی کہ نوید نے اتنی سرد مہری کا ثبوت کیوں دیا؟ وہ میرا جگری دوست تھا۔ مجھے اپنے گھر میں رکنے کا کہہ سکتا تھا۔ اپنے گھر والوں کو یہ کہہ سکتا تھا کہ میں کل تک اس کا اس گھر میں رہ کر انتظار کروں لیکن نوجوان کے لہجے سے مجھے یہ لگ رہا تھا جیسے وہ اب میرے جانے کا انتظار کررہا ہے۔

سب کچھ میرے ہاتھ سے نکلتا جارہا تھا۔ میں اکیلا ہوتا جارہا تھا۔ دوست کی یہ دوستی بھی مجھے سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"نہیں کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چلتا ہوں۔" میں دروازے کی طرف بڑھا۔

اس ڈرائنگ روم کے دو دروازے تھے ایک گھر کی طرف کھلتا تھا اور دوسرا دروازہ گیراج کی طرف تھا۔ جو غیر مہمان کو اندر لانے اور باہر جانے کے لیے تھا۔ میں اسی دروازے سے اندر آیا تھا اور اُس دروازے سے باہر جانے کے لیے قدم اُٹھا رہا تھا کہ اچانک میرے قدم اسی جگہ جم گئے۔

میرے عقب سے نوید کی آواز آئی۔ "رک جاؤ گلریز۔"

آواز سنتے ہی میں چونکا اور تیزی سے گھوما۔ اندر کی طرف جانے والے دروازے پر نوید موجود تھا۔ لیکن میری خیرہ آنکھیں ساکت ہوگئی تھیں۔ کیونکہ نوید وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر پلستر چڑھا ہوا تھا۔ اس کے منہ پر بھی زخم کے نشان تھے۔ میں حیرت سے اسے دیکھے جارہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اُتری ہوئی تھی اور وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور تعجب سے پوچھا۔ "یہ کیا ہوگیا؟؟"

"میں نے جھوٹ بولنے کے لیے شاہد کو اندر بھیج تو دیا لیکن مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوا کہ میں تمہیں اپنے دوست کو اس طرح سے جانے دوں اور تمہارے سامنے آگیا۔" نوید نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے پہلے اپنا سچ کہا۔

"کیوں ایسا کررہے تھے؟" میری حیرت دوچند ہوگئی تھی۔

"میں نے یہ اس لیے کیا تھا تاکہ تم مجھے اس حالت میں نہ دیکھو۔" نوید نے کہہ کر میری طرف ہاتھ پھیلائے اور میں اس کے گلے لگ گیا۔ میرا کندھا اس کے آنسوؤں سے تر ہوگیا تھا۔ "میں نہیں چاہتا تھا کہ تم مجھے اس حالت میں دیکھو۔"

"یہ ہوا کیا ہے۔ مجھے بتاؤ؟" میں نے اس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میرا کزن شاہد ہے۔ میرے دوست کی طرح ہے۔ شاہد تم کچھ کھانے کے لیے لاؤ۔" شاہد کمرے سے باہر چلا گیا۔

"یہ کیا ہوا ہے؟؟" میں مضطرب تھا۔ "یہ سب کیا ہے؟"

"کچھ کھا لو پھر باتیں کرتے ہیں۔" نوید نے کہا۔

"پہلے میں جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے میرے سوال کا جواب دو پلیز۔"

"ابا جی کا کیا حال ہے۔" نوید نے پوچھا۔ وہ میرے سوال کا جواب آسانی سے نہیں دینا چاہتا تھا۔

میری آنکھیں بھر آئیں۔ "وہ میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔"

"کیا؟؟" نوید کے منہ سے حیرت انگیز "کیا" نکلا اور وہ میری طرف دیکھتے کا دیکھتا ہی رہ گیا۔

"ہاں۔" میں بولا۔ "وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ ہمیشہ کے لیے۔"

"کیسے؟" وہ بولا۔ "کیسے ہوا یہ سب۔ کیسے وہ چھوڑ گئے؟"

"جیسے چاچا فضل نے میرا ساتھ چھوڑا۔" میں بولا۔ "اسی طرح وہ بھی مجھے چھوڑ گئے۔"

"اوہ..... خدا۔" نوید تڑپا۔ "کیا انہیں بھی....."

"ہاں انہیں بھی ظالموں نے قتل کردیا۔" میں نے اس کا جملہ مکمل کردیا۔

نوید سے بات نہیں ہورہی تھی وہ میری طرف یوں دیکھے جارہا تھا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہے۔ کوئی ایسی بات بول دی ہے جو ناقابل یقین ہے۔ جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"تمہارا شک ٹھیک نکلا۔ کیسے ہوا یہ سب اور تم کہاں تھے۔" نوید نے پوچھا۔

اس سوال کے جواب میں میں نے اُسے ساری بات بتائی وہ حالات اس کے گوش گزار کردیے جن کا میں نے سامنا کیا تھا۔ اور پھر میں نے یہ بھی بتایا۔

"نادیہ کا بھی نکاح ہوگیا ہے اور وہ بھی مجھے چھوڑ گئی ہے۔"

"نادیہ کا نکاح کردیا اُنہوں نے؟" نوید کے چہرے پر حیرت تھی۔

"ہاں۔ کچھ بھی ہاتھ میں نہیں رہا۔" میں دکھی ہوتے ہوئے بولا۔ "میں اکیلا ہوگیا ہوں۔"

"ایسا ہو ہی گیا۔" نوید پریشان ہوکر بولا۔ "وہ اس چال میں بھی کامیاب ہوگئے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا کہہ رہے ہو تم۔"

"میری وہیل چیئر دھکیل کر مجھے باہر تک لے چلو گے۔ ہم اپنے کمرے میں چلتے ہیں۔" نوید نے کہا۔

"تم کچھ کہہ رہے تھے۔" مجھے اس کی بات سن کر تشویش ہورہی تھی۔

"ہاں میں بتاتا ہوں لیکن اپنے کمرے میں جاکر۔" نوید نے کہا۔

میں نے اُٹھ کر اس کی وہیل چیئر کو پیچھے سے پکڑا

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

اور دھکیل کر باہر لے گیا۔ پھر اس نے جس طرف کہا میں اسی طرف چلتا رہا اور ایک کمرے کے سامنے رک کر اس نے کہا کہ میں دروازہ کھولوں۔

وہ نوید کا کمرا تھا۔ کمرا بڑا اور قرینے سے سجا ہوا تھا۔ ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ وہ وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ ”سب کچھ بدل گیا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ کیا سے کیا ہو گیا ہے۔“

”ہاں مجھے بھی لگتا ہے جیسے وقت نے ایسے پَر لگا لیے ہیں جس سے اس کی پرواز اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ اور سب کچھ ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔“ میں بولا۔

اسی اثنا میں شاہد ایک ٹرے لے آیا۔ میں کچھ کھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں وہ بات پوچھنے کے لیے مضطرب تھا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن نوید کے مجبور کرنے پر میں اس کے ساتھ ہی کھانا کھانے لگا۔ شاہد اجازت لے کر چلا گیا تھا۔

کھانے کے بعد ملازم چائے لے آیا۔ اس دوران ہمارے درمیان عام باتیں ہوتی رہیں۔

جب ہم چائے بھی پی چکے تو میں نے نوید سے سوال کیا جو مجھے مسلسل بے چین کر رہا تھا۔

”تم نے کہا تھا کہ کھانا کھانے کے بعد میرے ہر سوال کا جواب دو گے۔ اب بتاؤ یہ کیا ہوا ہے اور تم نے نادیہ کے نکاح پر بھی کچھ کہا تھا کہ یہ بھی ان کی چال لگتی ہے۔“

”تمہارے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔ میں تم سے کیا چھپاؤں گا؟ میرے اس حادثے کی حقیقت کا صرف شاہد کو پتا ہے۔ میرے گھر والوں کے علم میں یہ ہی ہے کہ میرا ایکسی ڈینٹ ہو گیا تھا لیکن یہ کوئی حادثہ نہیں تھا۔“ نوید کہنے لگا۔

”یہ حادثہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟“ میرا دل دھڑکا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ ”تمہارے جانے کے بعد میں ایسے ہی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ میں اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ کھوکے سے ایک سگریٹ لیا اور اسے سلگاتا ہوا چہل قدمی کرتا جا رہا تھا کہ اچانک میرے پیچھے کسی نے میری کمر پر پستول کی نالی لگا دی اور بولا۔

”حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔ چپ چاپ چلتے رہو۔“

”کون ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”سنا نہیں چپ چاپ چلتے رہو۔“ اس نے درشت لہجے میں کہا۔

”کہاں لے جا رہے ہو مجھے۔“ میں نے پھر سوال کیا۔

”اگر بولے تو گولی مار دوں گا۔“ اس نے میری کمر میں اپنے پستول کی نال کھبوئی اور میں چپ ہو گیا۔

میں چلتا رہا۔ اس نے مجھے گردن موڑ کر پیچھے دیکھنے سے بھی سختی سے منع کر دیا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک پجارو کھڑی تھی۔ اس نے مجھے اس میں بیٹھنے کے لیے کہا اور جونہی میں اس میں بیٹھا میرے منہ پر کسی نے رومال رکھ دیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک کمرے میں بند تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔ میں زمین پر لیٹا ہوا تھا اور کمرے میں کھڑکی سے روشنی آ رہی تھی۔ میں نے کچھ دیر لیٹے لیٹے جائزہ لیا اور پھر اُٹھ کر کمرے کا اکلوتا دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ باہر سے مقفل تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کسی نے بھی دروازہ نہیں کھولا۔ پتہ نہیں کون لوگ تھے جو مجھے اغوا کر کے اس جگہ لے آئے تھے۔ میں کہاں تھا مجھے اس کا کوئی علم

نہیں تھا۔

میں نے ایک بار پھر دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور اس پر زور آزمائی بھی کی۔ کھڑکی پر لوہے کی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔ وہاں سے میں نے باہر جھانکا تو سامنے بالکونی کی دیوار تھی۔ اور اس سے پار مجھے مکانات دکھائی دے رہے تھے۔ جس جگہ میں قید کیا گیا تھا وہ کوئی اونچی جگہ تھی۔ کسی کو آواز دینا یا مدد کے لیے پکارنا ممکن نہیں تھا کیونکہ بالکونی کی دیوار کے پاس دور مکانات تو دکھائی دے رہے تھے لیکن یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ آگے سڑک، ہے کیا ہے؟

کچھ دیر کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور تین آدمی اندر آئے۔ ایک کمال عزیز تھا۔ دوسرا اس کا بیٹا نادر اور تیسرا خالد چیمہ تھا۔ تینوں نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور مکار مسکراہٹوں کو کانٹوں کی طرح میری آنکھوں میں چبھو دیا۔

ان کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ مجھے ان لوگوں نے اغوا کیا ہے۔

کمال عزیز میری طرف بڑھا اور اس نے میری ٹھوڑی پکڑ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”تیرا دوست کہاں ہے۔“

”یہ پوچھنا تھا تو مجھ سے وہیں پوچھ لیتے، یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اچھا نہیں ہے کہ ہم تجھے اپنا مہمان بنا کر پوچھ رہے ہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”یہ مہمان نوازی مجھے اچھی نہیں لگی۔“ میں نے کہا۔

”تم دونوں ہمیں کون سے اچھے لگتے ہو کہ ہم مہمان نوازی اچھی کریں۔“ وہ بولا۔

”ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کہ تم ہمارے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔“ میں نے کہا۔

”جو ہماری بات نہیں مانتا وہ ہمارے کام کا نہیں رہتا تو ہم اسے کسی اور کام کا بھی نہیں رہنے دیتے۔“ کمال عزیز بولا۔ ”بتاؤ تمہارا دوست کہاں ہے۔“

”مجھے اس کا نہیں پتا۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

”سچ کہہ رہے ہو۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں بولا۔

”دوست کو بچانا چاہتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”اُسے کیا ڈر کہ میں اسے بچاؤں۔“ میں اس کی بات سن کر مسکرایا۔

”تجھے سب پتا ہے۔ کہاں چوہے کی طرح وہ چھپا ہوا ہے تم جانتے ہو۔ کسی اچھے بچے کی طرح بتا دو۔ وہ کہاں ہے ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔“ کمال عزیز نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ میں نے ایک بار پھر انکار کرتے ہوئے نفی میں گردن ہلا دی۔

”دیکھ ہم اپنی زبان کے پکے ہیں۔ اُس پر پیچھے سے حملہ نہیں کریں گے۔ سامنے آ کر لڑیں گے اور اپنے آدمی کا بدلہ لیں گے۔ ہم کل سے اسے تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن وہ نہیں مل رہا۔ تجھے اس لیے تکلیف دی ہے تا کہ تم ہمیں اس کے بارے میں بتا کر ہماری تلاش ختم کر سکو۔“ کمال عزیز نے کہا۔ ”اور تم ہو کہ ہمارے ساتھ تعاون ہی نہیں کر رہے ہو۔“ یہ کہہ کر کمال عزیز نے چپ کھڑے خالد چیمہ کی طرف دیکھا۔

”پتا ہے لیکن نہیں بتاؤں گا۔“ اس بار میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ دیا۔

کمال عزیز میری بات سن کر ایک بار پھر خالد چیمہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ”تم اس کے بہت

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

ہی قریبی دوست ہو۔ یہ بتاؤ اس کا کسی لڑکی سے کوئی تعلق ہے؟"

"میں یہ بات تجھے کیوں بتاؤں۔" میں نے بلا تامل کہا۔

"یہ بتانا تو پڑے گا تجھے۔" اس نے اطمینان سے اپنا سر ہلایا۔

"کچھ نہیں بتاؤں گا۔" میں چیخا۔ "چھوڑو مجھے اور جانے دو۔"

"یکی بات ہے کہ تو ہمیں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا؟" کمال عزیز نے متانت سے پوچھا۔

"نہیں۔" میں فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

میری بات سن کر وہ سیدھا خالد چیمہ کے پاس چلا گیا۔ اُس سے بولا۔ "مجھے یہ کچھ نہیں بتائے گا۔ تم پوچھو اس سے۔"

"میں تو پھر پوچھ ہی لوں گا۔" خالد چیمہ نے معنی خیز انداز میں اپنا سر ہلایا۔

خالد چیمہ میرے پاس آیا اور اس نے جیب سے ایک باریک پھل کا تیز دھار چاقو نکالا اور اُسے میری آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔ پھر یکدم اس نے برق رفتاری سے وہ چاقو میری پنڈلی کے گوشت میں اس طرح سے پیوست کر دیا کہ مجھے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ وہ کیا کرنے والا ہے اور اس نے کیسے آناً فاناً کر دیا۔ مجھے اس کی پھرتی کا پتا ہی نہیں چلا۔

تکلیف سے میری چیخ نکل گئی۔ اس نے میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور دانت پیس کر بولا۔ "بتا اس کا تعلق کسی لڑکی کے ساتھ ہے۔"

مجھے شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ اس تکلیف میں بھی میں نے انکار کر دیا۔ اس نے وہ چاقو نکالا اور میری پنڈلی میں دوسری جگہ پیوست کر دیا۔

میری ایک بار پھر چیخ نکل گئی۔ اسی برق رفتاری سے اس نے وہ چاقو نکال کر میری اسی پنڈلی میں تیسری جگہ داخل کر دیا۔ تکلیف سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ خون بہہ رہا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور لگ رہا تھا جیسے میری ٹانگ میں آگ سی لگ گئی ہے یا گوشت میں انگارے بھر دیئے ہوں۔

اس نے میرے سر کے بال پکڑ کر کھینچے اور غرایا "بتاؤ..... جو تم سے پوچھا جا رہا ہے بتاؤ۔"

تکلیف سے میری جان نکل رہی تھی۔ میری برداشت جواب دے رہی تھی اور میں نے نادیہ کا نام لے دیا۔ پھر ان کے پوچھنے پر اس علاقے کا نام، اس کے خاندان کے بارے میں میں جتنا جانتا تھا وہ ان کے گوش گزار دیا۔

میری بات سن کر وہ تینوں مسکرائے۔ خالد چیمہ پیچھے ہٹ گیا اور کمال عزیز میرے پاس آ کر بولا۔ "ہم یہ سب جانتے تھے۔ اس کے بارے میں ساری معلومات لے لی تھیں۔ ہم نے اپنا کام بھی شروع کر دیا ہے بس تم سے یہ تصدیق کر رہے تھے کہیں ہم کوئی دھوکا تو نہیں کھا رہے ہیں۔"

"اسے بتاؤ ہم کیا کر رہے ہیں۔" خالد چیمہ نے کہا۔

کمال عزیز بولا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ تمہارے دوست سے سب کچھ چھین لیں۔ اس کی محبوبہ بھی اس سے دور ہو جائے۔ ہم اس کی محبوبہ کے گھر والوں کو ذہنی ٹارچر کر رہے ہیں۔ وہ مجبور ہو جائیں گے کہ اس کی محبوبہ اس کی زندگی سے نکل جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہم دوسری خوراک یہ دیں گے کہ اس کی محبوبہ کو ختم کر دیں گے۔ پہلے ہلکی خوراک اور اس کے بعد ذرا سخت اور حتمی خوراک ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ تینوں ہنسے۔

"اس کا کیا کرنا ہے۔" نادر نے پوچھا۔

"تم اس سے فٹ بال کی طرح کھیلو اور خوب انجوائے کرو۔" کمال عزیز نے کہا۔

نادر نے میری جانب قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور پھر اس نے ایک مُکا میرے منہ پر دے مارا۔ میں تیزی سے اُٹھا اور نادر پر چھلانگ لگا دی۔ وہ میرے نیچے تھا اور میں اس کے اوپر تھا۔ میں نے ابھی اس پر دو ہی مکے برسائے تھے کہ خالد چیمہ نے مجھے پکڑ لیا اور اس کے بعد ان تینوں نے مجھے خوب مارا۔ میری دونوں ٹانگوں پر ہاکیاں ماریں کہ میری ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔

میری ٹانگوں میں جان ہی نہیں رہی۔ میرے پورے بدن میں تکلیف تھی۔ خون سے میری ٹانگیں سرخ ہو گئی تھیں۔ میں بے جان سا ان تینوں کے سامنے زمین پر پڑا ہوا تھا۔

"کیا کرنا ہے اس کا؟" خالد چیمہ نے پوچھا۔

"کہیں پھینک دیتے ہیں۔" کمال عزیز نے نفرت سے کہا۔

"مار ہی دیتا ہوں۔" خالد چیمہ نے مجھے گھور کر کہا۔

"اس کے ساتھ اتنا ہی کافی ہے۔ چار مہینے تک بستر سے لگا رہے گا۔ دوست سے دوستی بھول جائے گا۔ اپنے آدمیوں سے کہو کہ اسے کہیں پھینک دیں۔ مرنا ہوگا تو خود ہی پڑا پڑا مر جائے گا۔" کمال عزیز نے بے پروائی سے کہا۔ جیسے وہ کسی انسانی جان کے بارے میں بات کرنے کی بجائے کسی کیڑے مکوڑے کے لیے ایسا کہہ رہا ہو۔

اس کے بعد اُس کے آدمیوں نے مجھے ویرانے میں پھینک دیا۔

رات کا وقت تھا۔ جانے کون سی جگہ تھی۔ میں زمین پر بے یار و مددگار پڑا ہوا تھا۔ تکلیف سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میری ٹانگوں سے خون رس رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی میری سانس کی لڑی ٹوٹ جائے گی۔ کوئی جانور، سانپ یا بچھو اس طرف آ جاتا اور وہ مجھے نقصان پہنچا دیتا تو میں موت کے منہ میں چلا جاتا۔

تکلیف اور خون بہنے سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میں مدد کے لیے چلانے لگا لیکن میری آواز اس جگہ کون سنتا۔ چلاتے چلاتے میرے گلے میں خراش پڑ گئی تھی۔ میں نے اپنے بازوؤں کے بل پر اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے اس جگہ سے نکلنے کی کوشش کی تاکہ کسی ایسی جگہ تک جا سکوں جہاں پر مجھ پر کسی کی نظر پڑ جائے یا میں کسی کو اپنی مدد کے لیے پکار سکوں لیکن مجھ سے ایسا ہو نہیں سکا۔ میں رفتہ رفتہ نڈھال ہو رہا تھا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ میری موت میری طرف رینگتی ہوئی بڑھ رہی ہے۔ کمزوری سے میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ سانس جیسے سینے میں رکنے لگی تھی۔ ہاتھوں میں بھی جان نہیں رہی تھی۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس طرف ایک بوڑھا شخص آ گیا۔ کچھ دور اس کا گھر تھا اور وہ سردی سے بچنے کے لیے لکڑیاں جمع کر رہا تھا۔ میں نے سرسراہٹ سنی تو میں مدد کے لیے پکارا۔ وہ بھاگتا ہوا میری طرف آ گیا۔ اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"میری مدد کیجئے۔ مجھے یہاں سے لے جائیں۔ مجھے کچھ لوگ زخمی کر کے یہاں پھینک گئے ہیں۔" میں نے اُس سے کہا۔

"کون ہو تم؟" کچھ دیر تک مجھے چپ چاپ دیکھنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"میں اسی شہر میں رہتا ہوں۔ میں شدید زخمی ہوں پلیز مجھے یہاں سے کسی ڈاکٹر کے پاس لے

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

جائیں۔" میری آواز میں ضعف آ گیا تھا۔

"مجھے یہ پلس کیس لگتا ہے۔" وہ گھبرا رہا تھا اور میری مدد کرنے کے لیے رضا مند دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ شاید مجھے اسی طرح چھوڑ کر چلے جانا چاہتا تھا۔

میں نے یہاں اپنے دماغ سے کام لیتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "میں پولیس والا ہی ہوں۔ مجھے مجرم ہی پھینک کر گئے ہیں۔ مجھے اُنہوں نے ہی زخمی کیا ہے۔ مجھے یہاں سے لے جاؤ۔"

"آپ پلس والے ہو؟" اس نے غیر یقینی نگاہوں سے دیکھا۔

"ہاں میں پولیس والا ہوں۔" میں نے کہا۔

"لیکن....." وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"لیکن کیا؟" میں بولا۔

اس شخص نے میری طرف مشکوک اور خوفزدہ سی نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔ "لیکن..... میں کیسے لے جا سکتا ہوں۔ میں آپ کو یہاں سے اُٹھا کر نہیں لے جا سکتا۔"

"تم کسی کو لے آؤ۔" میں تکلیف سے چُور بولا۔ "کوئی تو ہوگا۔ تمہارا کوئی ساتھی۔"

"میرا گھر پاس ہی ہے۔ میں یہاں لکڑیاں اکٹھی کرنے کے لیے آیا تھا۔ میں کسی کو لے کر آتا ہوں۔ میں لاتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"جلدی لے آؤ۔ لے کر آؤ گے ناں۔" میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا کیونکہ ایک وہی تھا جو مجھے اس جگہ سے نکال سکتا تھا۔ ورنہ موت مجھے اپنے پنجوں میں لینے کے لیے بے تاب تھی۔۔

"ہاں..... ہاں لے کر آؤں گا۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور اس جگہ سے چلا گیا۔

میں پھر تنہا اس جگہ اذیت میں مبتلا اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ میرا دل ڈگمگا رہا تھا کہ وہ آئے گا کہ نہیں آئے گا۔ شاید وہ جان چھڑا کر بھاگ گیا ہے۔ لوگ ایسے حادثات میں دوسرے کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن پولیس کی تفتیش اور ناجائز پوچھ گچھ سے ایسی نیکی کرنے سے گھبرا جاتے ہیں اور چاہتے ہوئے بھی وہ مدد نہیں کر پاتے۔ اس لیے مجھے ڈر تھا کہ وہ نہیں آئے گا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ اس طرف آ گیا تھا۔ اور اتفاق بار بار نہیں ہوتے ہیں۔

میری خوش نصیبی تھی کہ وہ ایک نوجوان کو ساتھ لے کر آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک چارپائی بھی لے کر آئے تھے۔ اُن کو دیکھ کر میری سانس میں سانس آئی۔ دونوں نے مجھے احتیاط سے اُٹھایا، اس کے باوجود ان کے اُٹھانے سے مجھے شدید تکلیف ہوئی۔ اُنہوں نے مجھے چارپائی پر ڈال کر، چارپائی اُٹھائی اور مجھے اس جگہ سے لے گئے۔

کچھ فاصلے پر بہت سے کچے گھر بنے ہوئے تھے۔ شاید وہ کوئی چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہ چارپائی اُنہوں نے ایک گدھا گاڑی پر رکھی اور مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے جو اس جگہ سے کم از کم تین کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ گدھا گاڑی کے چلنے سے چارپائی کو ہچکولے لگ رہے تھے جس سے مجھے شدید اور ناقابلِ برداشت تکلیف ہو رہی تھی لیکن مجھے یہ تکلیف برداشت کرنی تھی اور میں بمشکل وہ تکلیف برداشت کر رہا تھا۔

بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر دل کے اچھے انسان ملتے ہیں۔ ورنہ وہ اپنی فیس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے حادثاتی کیس کو وہ اول تو لیتے ہی نہیں ہیں اور اگر لے بھی لیں تو ایسا ناک منہ چڑھاتے ہیں کہ جس سے مریض کے ساتھ آئے ہوئے زیادہ فیس کا لالچ دینے پر مجبور ہو جائیں۔ وہ ڈاکٹر اچھا آدمی

تھا۔ واقعی وہ انسانیت کی خدمت کے لیے ہی ڈاکٹر بنا تھا۔ اس کے دل میں یقیناً خوفِ خدا زندہ تھا۔ اس نے مجھے ابتدائی مرہم پٹی فراہم کرنے کے بعد فون کر کے ایمبولینس بلائی اور مجھے ایک ہسپتال میں بھیج دیا۔

وہ ہسپتال اس ڈاکٹر کے بیٹے کا تھا۔ وہاں سے میں نے شاہد کو فون کیا۔ شاہد اُسی وقت اس طرف نکل آیا۔ میں نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ کسی کو کچھ نہ بتائے اور اکیلا ہی آ جائے۔

جب شاہد اس ہسپتال میں پہنچا تو میرا آپریشن ہوا۔ میری دونوں ٹانگوں پر پلستر چڑھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں کہا کہ ہم چاہیں تو ہسپتال میں رہ سکتے ہیں چاہیں تو گھر چلے جائیں۔

وہ رات ہم نے ہسپتال میں گزاری۔ دوسرے دن ہسپتال سے فارغ ہو کر ہم سیدھے ہوسٹل گئے اور اپنا سارا سامان سمیٹا اور گھر کا رُخ کر لیا۔ میں شاہد کو تو سب کچھ بتا چکا تھا۔ لیکن ہم نے گھر میں یہی بتایا کہ میرا روڈ ایکسی ڈینٹ ہو گیا ہے۔ کسی کو نہیں پتا کہ اصل میں ہوا کیا ہے۔ ابھی تک سارے گھر والے اسے حادثہ ہی سمجھ رہے ہیں۔

جب مجھے یہ پتا چلا کہ میرا دوست گلریز یہاں آ گیا ہے تو میں نے بہانہ کر دیا۔ میں تم سے نہیں ملنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اس معاملے میں اُلجھو۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر تمہیں دکھ ہوگا۔ تم پُرجوش ہو۔ اپنے دوست کو اس حالت میں دیکھ کر اپنے پر کنٹرول نہیں رکھ سکو گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی سے مت لڑو اور اپنی پڑھائی مکمل کرو۔ اس لیے میں نے تمہاری آمد کا سن کر جھوٹ کا سہارا لینا چاہا اور پھر خود ہی تمہارے سامنے آ گیا۔

نوید کہہ کر چپ ہو گیا۔ میں اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے اس کی دونوں پلستر میں چھپی ہوئی ٹانگوں کو دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر جو زخم تھے ان پر اپنی نگاہیں مرکوز کیں۔ میرا دل کرب سے پھٹ رہا تھا۔ میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون جیسے آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔

میں کچھ دیر کے بعد بولنے کے قابل ہوا اور اس سے کہا۔

"ایک بات کہوں۔"

نوید بولا۔ "ہاں بولو۔"

"جب میں واپس آ رہا تھا۔ سب کچھ ہار کر تو میں نے سوچا تھا کہ میں کسی سے انتقام نہیں لوں گا۔ میں سب کچھ اپنے سینے میں دفن کر کے پڑھوں گا اور اپنے والدین کا خواب پورا کروں گا۔ اس جگہ پڑھنا مشکل ہوگا تو کسی دوسری جگہ چلا جاؤں گا۔ ایسی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لوں جو انتقام کے زہر سے لبریز ہوگی۔ لیکن تجھے دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔" میں بولا۔ "میں جس زہر سے بھاگ جانا چاہتا تھا اب اسی زہر کو اپنے حلق سے نیچے اتار کر ان لوگوں کی زندگی اجیرن کر دوں گا۔"

"تم نے کیا ارادہ کر لیا ہے؟" نوید نے پوچھا۔ "کیا سوچ لیا ہے تم نے؟"

"میں ان سب کو ان کے انجام تک پہنچاؤں گا۔" میں نے دانت پیسے۔ "میں نے بس یہ سوچ لیا ہے۔" میں فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"نہیں تم کچھ نہیں کرو گے۔ تم نے جو سوچا تھا وہ ٹھیک تھا۔" نوید نے جلدی سے کہا۔ "میں نے یہ تم کو اس لیے نہیں بتایا کہ تم لڑنے اور مارنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"اتنا کچھ ہو جانے پر میں اب کچھ نہیں بھول سکتا۔ مجھے اُنہوں نے زہر کی وہ بوند بنا دیا ہے جو اُن

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

کے حلق میں ٹپک کر رہے گی اور یہ اپنے اپنے انجام کو پہنچیں گے۔" مجھے غصہ آنے لگا۔ "اب میری واپسی ممکن نہیں ہے۔ وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔ کمال عزیز کو تو میں اس شہر کے چوراہے پر بھیک مانگنے کے لیے بٹھادوں گا۔"

"تم اس راہ پر چل پڑے تو تمہارا مستقبل خراب ہوجائے گا۔" نوید متفکر لہجے میں بولا۔ "تم ایسا سوچو بھی مت۔ بھول جاؤ سب کچھ۔"

"تمہارا مستقبل جو خراب ہوا ہے وہ؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہارا قصور یہ ہے کہ تم میرے دوست ہو۔ میرا کیا قصور تھا؟ میں تو غریب کی مدد کے لیے اُٹھا تھا۔ بُرائی سے دور رہنے کے لیے ہم نے اُن کو انکار کیا تھا۔ اس کی یہ سزا؟ میرا چاچا مار دیا۔ میرا باپ مجھ سے چھین لیا میرا پیار مجھ سے الگ کردیا۔ اتنی بڑی سزا دے دی اُنہوں نے کہ میرے عزیز دوست کی ٹانگیں توڑ دیں۔"

"جو ہوا اسے بھول جاؤ۔" نوید نے التجا کی۔ "تم پڑھو میں تمہارا سارا خرچہ اُٹھاؤں گا۔ میں تین، چار ماہ کے بعد چلنے لگوں گا۔"

"اب نہیں۔ اب کوئی نہیں بچے گا۔ نہ تہذیب شاہ اور نہ وہ تینوں۔ خالد چیمہ کی گردن پر تو میں اپنے دو پیر رکھ کر اسے چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دوں گا۔" غصے سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ "تمہارا دوست بدل گیا ہے۔ اب میں بتاؤں گا کہ کیسے کوئی تریاق سے زہر بنتا ہے۔"

"تمہارا انجام جانتے ہو کیا ہوگا۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ "میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو۔ تم اس راہ پر مت چلو۔"

"میں بساط ہی ایسی بچھاؤں گا کہ کھیل بھی میرا ہوگا، کھلاڑی بھی میں ہی ہوں گا، اور چال بھی میری ہی ہوگی۔" میں نے نوید کی طرف جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

نوید میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "لیکن....."

"لیکن یہ کہ کل کسی اور کو یہ استعمال کرنے کی کوشش کریں میں ان کو اپاہج بنا کر اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گا۔ اور اگر میں پڑھائی کرنے کا سوچ بھی لوں تو کیا یہ مجھے پڑھائی کرنے دیں گے؟ یہ مجھے کتے کی طرح سونگھتے ہوئے مجھے سزا دینے کے لیے بے چین ہیں۔ میں کچھ نہیں کروں گا لیکن یہ تو میرے خلاف کریں گے ناں؟؟"

میری بات سن کر نوید چپ ہوگیا۔ پھر اس نے کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ لوگ تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔ تم ایک کام کرو۔"

"کیا کام کروں؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تم ایسا کرو وہ شہر چھوڑ دو۔" نوید نے مجھے مشورہ دیا۔

"پھر کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "ایک کونے میں کسی بزدل کی طرح چھپ کر بیٹھ جاؤں۔"

"تم یہاں آجاؤ۔ ہم مل کر کوئی کام کرتے ہیں۔ سرمائے کی فکر مت کرو۔" نوید نے مجھے تجویز پیش کی۔ "پڑھائی بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم ایک ساتھ کوئی کام کرتے ہیں۔"

"وہ تلاش کرتے ہوئے یہاں تک بھی آجائیں گے اور پھر میرے ساتھ ساتھ تمہیں یا تمہاری فیملی کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ جب سانپ باہر آجائے اور ڈسنے کے لیے وہ شکار کی تلاش میں ہو تو پھر وہ ڈسے گا ہی۔ اس لیے ضروری ہے کہ

سانپ کی مُنڈی کچل دی جائے۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ یہاں آگئے تو تمہاری فیملی بھی ڈسٹرب ہوگی۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں تم سے دور چلا جاؤں۔"

نوید کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ ایک بار پھر چپ ہوگیا۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر بار بار غصہ آرہا تھا اور اس پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔ جب کمرے میں خاموشی طوالت اختیار کرنے لگی تو میں نے خاموشی توڑی۔

"تم کب تک ٹھیک ہوجاؤ گے۔" یہ سوال میں نے ایسے ہی موضوع بدلنے کے لیے پوچھا تھا۔

"ڈاکٹر نے مجھے تین، چار ماہ کا کہا ہے۔ پھر میں چلنے کے قابل ہوجاؤں گا۔" اُس نے جواب دیا۔ "بالکل ٹھیک چلنے لگوں گا۔"

"اور اس کا کچھ پتا چلا۔ جو مجھے زویا بن کر مدد کے لیے پکارتی تھی۔" میں نے پوچھا۔ "اس کے بارے میں کوئی خبر؟"

"مجھے یہاں سے پتا چلا ہے کہ زویا کے شوہر نے اسے طلاق دے دی تھی۔ کیونکہ اس کا رابطہ تم سے ہوتا تھا اور تمہارا موبائل فون انہوں نے لے لیا تھا۔ اس لیے جانے کیا ہوا ہوگا۔ اور اس کا کیا چکر ہوگا۔" نوید نے بتایا۔ "طلاق کے بعد اس نے اپنی زندگی خود جینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے جانے وہ کن لوگوں کے ساتھ مل کر کیا کر رہی ہوگی۔"

"اس کے گھر والوں کا اس سے رابطہ ہے۔" میں نے پوچھا۔

"گھر والے اپنی زندگی میں مگن ہیں۔ یہ ساری فیملی ہی آزاد خیال لوگوں پر مشتمل ہے۔" نوید نے جواب دیا۔

"نوید مجھے تم موبائل فون دے سکتے ہو۔ اور اگر ہو سکے تو میرا وہی سم کارڈ مجھے یہاں سے دلا دو۔" میں نے کہا۔

"ایک چھوڑ سو موبائل فون لے مجھ سے۔ پیسوں کی ضرورت ہے تو وہ بھی بتاؤ۔" نوید نے جلدی سے کہا۔ "دیکھو دوست سے زیادہ مجھے اپنا بھائی سمجھنا۔"

"بس ایک موبائل اور کچھ پیسے دے دو۔ قدرت نے چاہا تو میں تمہارے پیسے لوٹا دوں گا۔" میں نے آنکھیں جھکائے ہوئے کہا۔ میں پہلی بار اپنے دوست سے مانگ رہا تھا۔ اس لیے مجھے ندامت بھی ہو رہی تھی۔

"میں شاہد کو فون کرتا ہوں وہ آجائے اور تمہیں وہ سم کارڈ لا دے۔" نوید نے کہا۔ "لیکن تم وہی سم کارڈ کیوں لینا چاہتے ہو۔"

"یہ نمبر زویا کے پاس ہے۔ شاید وہ پھر رابطہ کرے اور مجھے پتا چل جائے کہ وہ کیا کہتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ میرے کام بھی آجائے۔" میں نے بتایا۔ "اپنا کھیل کھیلنے کے لیے مجھے تاش کے پتوں اور شطرنج کے مہروں کی ضرورت تو پڑے گی۔"

"یہ نمبر..... نادیہ کے پاس بھی تو ہوگا۔" اس نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں اس کے پاس بھی وہ نمبر ہے۔"

"شاید وہ تم سے رابطہ کرے۔" نوید نے اپنا خیال پیش کیا۔

"وہ اب کسی اور کی ہوچکی ہے۔ وہ اب کسی اور کی عزت ہے۔" میں نے کہا۔ "اب میں اس کے بارے میں ایسا نہیں سوچوں گا کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔ یا مجھے کہیں ملے۔"

"میرا مطلب تھا کہ شاید وہ تم سے رابطہ کر کے کچھ بتانا چاہتی ہو۔" نوید نے کہا۔ "شاید اس کے دل میں کوئی بات ہو۔"

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

"میں نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "اب اس کی اور میری زندگی الگ ہو چکی ہے۔ جو قسمت میں تھا وہ مجھے مل گیا اور جو اس کی قسمت میں تھا وہ اسے مل گیا ہے۔"

نوید نے یکدم میرا ہاتھ پکڑ لیا "مجھے معاف کرنا دوست۔"

"کس بات کی معافی چاہتے ہو۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں تکلیف برداشت کر پاتا تو میں قطعاً نہ بتاتا کہ تمہارا تعلق نادیہ سے ہے۔" نوید نے ندامت سے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

"وہ سارا جال بچھا کر تم سے تصدیق کر رہے تھے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ شرمندہ تو میں ہوں۔ میری وجہ سے تم یہاں تک پہنچ گئے۔" میں ندامت سے بولا۔ "لیکن ایک بات یاد رکھو۔ بُروں کے بُرے دوست ہوتے ہیں۔ وہ میرے بارے میں میرے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں جان گئے تھے۔ اُنہوں نے یہ پہلے ہی جان لیا تھا کہ نادیہ سے میرا کوئی تعلق ہے۔ کیونکہ دھمکی آمیز کالیں چند روز سے نادیہ کے بھائی کو موصول ہو رہی تھیں۔"

"لیکن تم تو کہتے ہو کہ نادیہ کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔" نوید نے کہا۔

"ہاں..... لیکن میرے سوتیلے چاچا کو شک تھا کہ میرا تعلق نادیہ سے ہے۔ کیونکہ اس نے ایک بار ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھا بھی تھا۔ اس نے ایک بار مجھے طنزیہ بھی کہا تھا کہ باپ کی دوستی کو رشتے داری میں بدلنا چاہتے ہو۔" میں نے بتایا۔ "وہ اتنا لالچی ہے کہ اس سے اگر ان کا رابطہ ہو گیا ہوگا، جو کہ مجھے یقین ہے کہ لازمی ہوا ہوگا۔ اس نے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ کمال عزیز مجھے پوری طرح سے برباد کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ حساب لینے نکلوں گا تو پھر سوتیلے چاچا کا بھی کھاتہ کھول کر رہوں گا۔"

نوید نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر شاہد کو بلانے کے لیے فون کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

نوید کی حالت دیکھ کر مجھے جو دکھ اور کرب ہوا تھا اس کا اندازہ صرف میں ہی کر سکتا تھا۔ وہ ذہین طالب علم تھا۔ وہ پڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن اُن ظالموں نے نوید کو اپنے انتقام کا نشانہ بنا دیا۔ جس سے اس کی دونوں ٹانگوں کو شدید نقصان پہنچا تھا۔

میرے دل اور آنکھوں میں ان سب کے لیے زہر بھر گیا تھا۔ مجھے نہ تو انجام کی کوئی فکر تھی اور نہ اس نتیجے کی کہ کیا ہوگا۔ بس اب یہ ہی بات دل و دماغ میں تھی کہ ان سب کو ختم کرنا ہے۔ ایسی بساط بچھانی ہے کہ ایک ایک کر کے سب اپنے انجام کو پہنچتے رہیں۔

شاہد میرا اسم کارڈ لے آیا تھا۔ نوید نے مجھے ایک اچھا موبائل فون دے دیا تھا۔ میں نے سم کارڈ ڈال کر موبائل فون آن کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ واپسی کا سفر شروع کروں۔

میرا ارادہ بھانپ کر نوید نے مجھے کہا کہ میں ابھی اس کے پاس رہوں۔ دو چار دن اس جگہ رہوں گا تو کوئی بھی فیصلہ جذبات میں آ کر نہیں کروں گا۔ مجھے سوچنے کا موقعہ مل جائے گا۔ اس کی بات سن کر میں نے کہا۔

"فیصلہ تو میں کر چکا ہوں۔ اب یہ بدل نہیں سکتا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

"تم یہاں تین چار دن رہو۔ آرام سے سوچنا اور پھر چلے جانا۔" نوید نے کہا۔ "تمہارے آنے سے میرا دل بھی لگ گیا ہے۔ ورنہ میں بہت اُداس اور پریشان ہو گیا تھا۔"

"میں ایک رات کے لیے رک جاتا ہوں اور وہ بھی تمہارے کہنے پر۔" میں اس کی بات مان گیا۔ "کل میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے ایک رات ہی سہی۔ تم کل چلے جانا۔" نوید نے شاید اس خیال سے کہا کہ ذہن بدلنے کے لیے یہ وقت بھی بہت ہے۔ اس وقت میں میں سکون سے سوچ سکتا ہوں۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم دیر تک باتیں کرتے اور پھر اس کا ملازم مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں میرا سارا سامان پڑا ہوا تھا جو نوید ہوسٹل سے اپنے ساتھ اُٹھا لایا تھا۔

میں بستر پر لیٹ گیا۔ پہلے تو ابا جی کی یاد آتی رہی اور اس کے بعد نادیہ نے مضطرب کرنا شروع کر دیا۔ میں جتنا اسے بھول جانا چاہتا تھا وہ اتنی ہی شدت سے مجھے یاد آ رہی تھی۔ میں نادیہ کو بھول جانا چاہتا تھا کیونکہ وہ اب کسی اور کی عزت تھی۔

میں نے بستر پر کئی بار کروٹیں بدلیں اور ذہن کو کہیں اور لگانے کی کوشش کی لیکن ابا جی کی یاد جسم میں پیوست کانٹوں کی طرح اذیت دیتی رہی اور میں آنسوؤں کی لڑی میں بہتا رہا۔

اچانک میرا موبائل فون بول اُٹھا۔ میں نے چونک کر موبائل کی اسکرین دیکھی۔ انجانا نمبر تھا۔ میں نے موبائل فون آن کر کے اپنے کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے زویا کی آواز آئی جو میں فوراً پہچان گیا تھا۔

"ہیلو....."

"جی کون؟" میں نے تصدیق کے لیے پوچھا۔ حالانکہ اس کی آواز میں کوئی شک نہیں تھا۔

"زویا بول رہی ہوں۔ آپ نے اتنے دن اپنا موبائل فون آف رکھا تھا۔ کیا بات تھی۔ اب اچانک ملایا تو آپ کا موبائل آن ملا۔" زویا نے کہا۔ "کہاں گم ہو گئے تھے آپ۔"

"ہاں دراصل میرا موبائل گم ہو گیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا ابھی ملاقات ہو سکتی ہے۔" زویا بولی۔

"اتفاق سے اس وقت بھی میں شہر سے باہر ہوں۔ ابھی نہیں مل سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ ہر بار مجھے یہی کہتے ہیں۔ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔" اس کا لہجہ تیز ہو گیا۔ "کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے ہیں۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"آپ جانتے نہیں ہیں کہ میں کس مصیبت میں پھنسا ہوں۔ اس وقت بھی میں وہ گھر چھوڑ کر کسی اور جگہ منتقل ہو چکی ہوں۔ اپنی جان بچانے کے لیے چھپی ہوئی ہوں۔" زویا نے کہا۔ "میں مدد کے لیے کسی اور کو بھی پکار سکتی تھی لیکن جانے کیوں آپ کو دیکھتے ہی میرا دل چاہا کہ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔"

"کیا بتا سکتی ہیں کہ آپ کی جان کیوں خطرے میں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کون لوگ ہیں جو آپ کی جان لینا چاہتے ہیں۔"

"فون پر یہ بات نہیں ہو سکتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"فون پر ہر بات ہو سکتی ہے۔ اس میں کیا حرج ہے۔ اب بھی تو آپ مجھ سے فون پر ہی بات کر رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ مجھ سے کل مل سکتے ہیں۔" اس نے مجھ سے پوچھا۔ "مجھے ہر صورت ملیں۔ میں بہت مشکل

www.pkdigest.com

Pdfby Roadsign

میں ہوں۔"

"ہاں کل ملاقات ہوسکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن کہاں ملاقات ہوگی۔"

"آپ شہر میں آتے ہی مجھے اسی نمبر پر کال کرنا میں بتادوں گی کہ ہم کہاں مل سکتے ہیں۔" زویا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔" میں بولا۔" واپسی پر فون کروں گا۔"

"کل ملاقات ہوگی ناں؟" ایک بار پھر زویا نے مجھ سے دریافت کیا۔

"بالکل ہوگی، لازمی ہوگی۔" میں نے کہا اور رابطہ منقطع ہوگیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کیا چاہتی ہے اور اس کی کیا چال ہے؟ مجھے ہی اس نے کیوں اپنا ہمدرد ایک ہی ملاقات میں سمجھ لیا۔ مجھ پر اتنا اعتماد کیوں کہ مجھ سے اپنی بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔

ان ہی سوچوں میں مجھے نیند آگئی اور میں اردگرد سے بے نیاز ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن میں نے ناشتہ کرنے کے بعد اپنا سامان ایک بیگ میں رکھا اور نوید سے جانے کی اجازت چاہی تو اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مت جاؤ۔"

"مجھے رکنے پر مجبور نہ کرو۔ خدا نے چاہا تو ملاقات ہوگی۔" میں نے کہا۔

"جانے دو سب۔" نوید بولا۔" اب بھی وقت ہے اور تم یہیں جاؤ۔"

"اب یہ ممکن نہیں ہے۔ زہر سے امرت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔" میں نے کہہ کر نوید کو اپنے سینے سے لگایا اور اپنا بیگ پکڑ لیا۔

نوید نے مجھے روک کر اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔" یہ رکھ لو۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم رکھو اور کوئی سوال مت کرو۔" اس نے وہ لفافہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

"مجھے پتا تو چلے کہ اس میں ہے کیا؟" میں نے ایک بار پھر سوال کیا۔

"اگر اپنا موبائل نمبر تبدیل کرو تو نیا نمبر مجھے دے دیا کرنا۔ میں تمہارے رابطے میں رہنا چاہتا ہوں۔" نوید نے کہا۔" جب بھی پیسوں کی ضرورت پڑے تو مجھے بلا تکلف فون کردیا کرنا۔"

"میرا یہی نمبر رہے گا۔ اور میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔" میں نے اس کا ہاتھ دبایا۔

"کس جگہ جانے کا ارادہ ہے؟" نوید نے پوچھا۔

"اسی شہر میں جاؤں گا۔ اسی جگہ رہوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"نہیں اور چلے جاؤ۔" نوید نے کہا۔" وہ شہر چھوڑ دو۔"

"تم ایسا بار بار مت کہو۔ مجھے اسی شہر میں جانا ہے۔ اسی جگہ رہنا ہے۔ اس کے بعد مجھے تقدیر کہاں لے جاتی ہے اس کا مجھے پتا نہیں ہے۔" میں بولا۔

"میں تمہارے لیے دعا گو ہوں۔" نوید نے کہا۔" تم آباد رہو۔ شاد رہو۔"

"آباد ہونے سے پہلے ہی تقدیر نے سوکھے پتوں کی طرح بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ شاد ہونا پتا نہیں اب قسمت میں ہے کہ نہیں۔" میں افسردگی سے بولا اور نوید سے اجازت لے کر اس کے گھر سے چلا آیا۔

میرا دل بوجھل ہورہا تھا۔ لاہور شہر بہت بڑا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھے اس شہر میں کہاں سر چھپانے کی جگہ ملے گی۔ کہاں میرا سائبان

ہوگا۔ ایک خیال تھا میرے دل میں کہ اگر اسے میری ضرورت ہے یا مجھے وہ اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے تو میں اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کروں گا۔

اس شہر میں دوسری لڑکی فرحت تھی۔ جس سے میں مدد لے سکتا تھا۔ اور کوئی بھی ایسا سہارا نہیں تھا جسے میں اپنے لیے استعمال کرسکتا۔

میں چلتا ہوا بازار سے گزر رہا تھا۔ بیگ میرے کندھے پر تھا۔ نوید نے جو لفافہ دیا تھا وہ میں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔

اچانک میرے چلتے ہوئے قدم آہستہ ہوگئے۔ میں آتی جاتی ٹریفک کو دیکھنے لگا۔ مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ میرے قدم ایک جگہ رک گئے۔ اس جگہ سے میں اُس سڑک کو دیکھ سکتا تھا جو میرے سامنے تھی۔ اس سڑک پر دائیں بائیں ٹریفک دوڑ رہی تھی۔ میری نگاہیں اس دوڑتی ہوئی ٹریفک کو دیکھ رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے اس جگہ کچھ ہونے والا ہے۔ کوئی بات ہونے والی ہے۔ جیسے ابھی کچھ ہوجائے گا۔

یہ میرا دل کہہ رہا تھا۔ یہ میرا واہمہ تھا یا اندر کی اُداسی تھی، کیا تھا مجھے اس بات کا علم نہیں تھا لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہاں کچھ ہوگا۔ ابھی یہاں ایک اُودھم سا مچ جائے گا۔

اچانک میری نگاہ ایک ٹرک پر ٹک گئی۔ وہ ٹرک بائیں طرف سے آرہا تھا۔ اس پر اتنا سامان لدا ہوا تھا کہ وہ باہر تک دکھائی دے رہا تھا جو مضبوط رسوں سے باندھا ہوا تھا۔

پھر میں نے دائیں طرف دیکھا اور میری نگاہ ایک کتے پر چلی گئی۔ کتا سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ ابھی یہ کتا سڑک کراس کرنے کی کوشش کرے گا اور تیز رفتار ٹرک اسے بچاتے ہوئے اُلٹ جائے گا۔ اس سے اس سڑک پر ایک حادثہ ہوجائے گا۔

یہ الفاظ میری زبان پر خود بخود آگئے تھے اور میں جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

ٹرک تیز رفتاری سے آرہا تھا۔ اسی اثنا میں کتا سڑک عبور کرنے لگا تو وہ ٹرک کے سامنے آگیا۔ ٹرک ڈرائیور نے کتے کو بچانے کے لیے تیزی سے اسٹیئرنگ گھمایا اور اس کے ساتھ ہی ٹرک ایک طرف اُلٹ گیا۔ ایک دھماکہ ہوا، ٹرک کا سامان سڑک پر بکھر گیا۔ کئی کاریں اس ٹرک کے ساتھ ٹکرانے سے بمشکل بچیں۔ ایک آدھ اپنے آپ کو بچا نہ سکیں اور وہ اس حادثے کا شکار ہوگئیں۔ اس جگہ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔

میں اسی جگہ کھڑا تھا۔ سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے ہوا تھا۔ میری نگاہیں اس حادثے پر مرکوز تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس حادثے سے قبل مجھے خیال آیا تھا کہ یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ اور پھر میری زبان پر وہ الفاظ آئے کہ ایسا یہاں ہوگا۔ اور ویسا ہوگیا۔

اچانک مجھے اباجی کی بات یاد آگئی کہ بزرگ امیر حسین نے مجھے دعا دی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ میں غیر معمولی خوبیوں کا حامل ہوں گا جس کے اسرار مجھ پر وقت کے ساتھ ساتھ کھلتے رہیں گے۔

میرے خوابوں کے بعد کیا یہ بھی ان ہی بزرگ کی دعا کا تسلسل نہیں ہے؟ میں سوچ رہا تھا اور میرے سامنے سڑک پر بھاگ دوڑ ہورہی تھی۔

(باقی آئندہ)

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

لاٹھی

بھائی عمران احمد'
السّلام علیکم!
آپنے جس طرح نئے افق میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی اور جس طرح انہیں آگے بڑھایا یعنی مصنفین کی صف میں شامل کیا یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے۔ ورنہ ہم جیسے قاری تو صرف خطوط لکھتے ہی رہ جاتے۔ بہرحال حوصلہ افزائی کا ایک بار پھر شکریہ۔ اس ماہ "لاٹھی" کے ساتھ حاضر ہوں۔ امید ہے دوستوں کو ضرور پسند آئے گی۔

والسّلام
ریاض بٹ
حسن اقبال

میرا نام خالد ہے۔ اس سے قبل انہی صفحات پر آپ میری پانچ کہانیاں پڑھ چکے ہیں۔ چھٹی کہانی حاضر ہے۔ یہ تفتیشی کہانی میری پچھلی کہانی کا دوسرا حصہ ہے۔

ہم بڑی جلدی میں ضروری تیاری کے بعد روانہ ہوئے تھے۔

وسیع و عریض باغ تھا۔ آم' لوکاٹ' آلوچے وغیرہ کے بہت سے درخت تھے۔ باغ کے وسط میں دو کمروں کا ایک نیم پختہ سا مکان بنا ہوا تھا۔ لاش آم کے ایک گھنے درخت کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔ سینے میں عین دل کے مقام پر ایک خنجر دستے تک پیوست تھا۔ یہ کسی مشاق ہاتھ کا کارنامہ لگتا تھا لاش کے آس پاس خون کا ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ خون ابھی جما نہیں تھا اور لاش کی حالت سے یہ بات ظاہر تھی کہ یہ واردات دو گھنٹے پہلے ہوئی ہے۔ وہ باغ تھا' ظاہر ہے زمین کچی تھی۔ وہاں پر کھروں کے نشان واضح تھے۔ میں نے شوکی اور سپاہی اللہ دتہ کو ضروری کارروائی کے لیے کہا اور خود چوہدری نوید کی طرف متوجہ ہوگیا۔ جو اس دوران بڑی خاموشی سے ہماری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

اس نے باغ میں ہی کرسیاں ڈلوادی تھیں۔ میں کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے دوبارہ سیدھا ہوگیا اور گویا ہوا۔

''چوہدری صاحب آپ کا نوکر کہہ رہا تھا کہ جابر خان کو شرافت علی نے قتل کیا ہے شرافت علی ہے کدھر؟ مجھے تو نظر نہیں آرہا۔''

''اوہ..... بادشاہو بیٹھو تو سہی اس سے بھی ملاقات کروا دیتے ہیں پہلے موسم کے لحاظ سے.....''

''چوہدری صاحب! ہم یہاں دعوتیں اڑانے نہیں آئے۔ ایک قتل ہوگیا ہے اس کی خاطر آئے ہیں۔'' میں نے خشک لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میرے لہجے کی خشکی محسوس کر کے ایک لمحے کے لیے چوہدری نوید کے چہرے پر ناگواری کی سلوٹیں نظر آئیں۔ پھر وہ فوراً سنبھل گیا اور پاس کھڑے ایک نوکر ٹائپ بندے سے بولا۔

''پرویز سے کہو کہ شرافت کو لے آئے۔''

چند لمحوں کے بعد ایک ہٹا کٹا بندہ شرافت علی کو لے کر آگیا۔ شرافت علی کا چہرہ بالکل کفن کی چادر کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے

چل رہا تھا۔ اس کے کپڑوں پر خون لگا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اب گرا کہ تب گرا۔ لیکن نہ جانے کیوں شرافت علی کی حالت دیکھ کر میرا دل اسے قاتل ماننے پر تیار نہیں ہو رہا تھا' خیر جو کچھ بھی تھا اسے سامنے تو لانا تھا۔

اس دوران شوکی اور سپاہی اللہ دتہ اپنا کام مکمل کر کے ہماری طرف آگئے۔

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج کر ہم شرافت علی کو لے کر تھانے آگئے' لیکن ابتدائی تفتیش کرنا نہیں بھولے تھے۔

شرافت علی کو ہم نے فی الحال ایک کانسٹیبل کے کمرے میں بٹھا دیا۔ آگے بڑھنے سے پہلے ابتدائی تفتیش سے جو کہانی سامنے آئی ہے۔ وہ آپ کے گوش گزار کرنا مناسب ہوگا۔

چوہدری نوید نے بتایا کہ باغ کی دیکھ بھال کے لیے پرویز اور قدیر مامور ہیں۔ باقی عملہ اس کے علاوہ ہے۔

پرویز اور قدیر باغ میں بنے ہوئے دو کمروں میں سے ایک میں رہتے ہیں۔ آج کسی کام کے سلسلے میں چوہدری نوید بھی آیا ہوا تھا۔ وہ سب یعنی چوہدری نوید' پرویز اور قدیر باغ کے دوسرے کونے میں ایک لوکاٹ کے درخت کے نیچے کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ انہیں شور سنائی دیا۔

وہ سب دوڑے آئے۔ بقول پرویز کے انہوں نے دیکھا کہ جابر خان نیچے گرا ہوا ہے اور آخری سانسیں لے رہا ہے۔ خنجر دستے تک اس کے سینے میں پیوست ہے۔ شرافت علی خون آلود کپڑوں کے ساتھ اس کے پاس کھڑا ہے اور اسے مرتے دیکھ رہا ہے۔ چوہدری نوید نے پرویز اور قدیر سے کہا کہ شرافت علی کو لے جا کر کمرے میں بند کردو۔ وہیں کمرا تھا جس میں پرویز اور قدیر رہتے ہیں۔ پھر اس نے گامے کو تھانے کی طرف دوڑا دیا۔ یہ تھی کل کہانی۔

میں اور شوکی سر جوڑ کر اس قتل کے متعلق سوچ رہے تھے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ہوگا جس طرح چوہدری نوید اینڈ کمپنی نے کہا تھا۔ کیا واقعی اسی طرح ہوا تھا؟

اچانک سپاہی انور نے کمرے میں آکر اطلاع دی کہ شرافت علی کی بیوی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔

ابھی شرافت علی پر قتل ثابت نہیں ہوا تھا۔ ابھی وہ ملزم تھا' مجرم نہیں۔ میں نے اور شوکی نے آپس میں مشورہ کر کے اسے کمرے میں بلا لیا۔ وہ تیر کی طرح سیدھی ہماری طرف آئی میرے قدموں میں بیٹھنے لگی میں نے قدموں کو پیچھے کیا اور شوکی نے اسے بازو سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا۔

''بی بی! ہوش کے ناخن لو۔ کیوں ہمیں گناہ گار کر رہی ہو' ادھر کرسی پر بیٹھ جاؤ اور سکون سے اپنے آنے کا مدعا بیان کرو۔'' وہ کرسی پر نہیں بیٹھی۔ کھڑے کھڑے بولی۔

''میں نے سنا ہے کہ آپ نے شرافت علی کو گرفتار کر لیا ہے؟ تھانے دار صاحب شرافت علی تو بڑا حساس اور درد رکھنے والا بندہ ہے۔ اس کے پاؤں کے نیچے اگر کوئی چیونٹی بھی آکر مر جائے تو وہ مغموم ہو جاتا ہے۔ مرغی ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے جابر خان جیسے بندے کو کیسے قتل کیا ہوگا؟ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' شرافت علی کی بیوی کے لہجے میں اپنے شوہر کے لیے محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

تھانے دار اگر جذباتی باتوں پر توجہ دینے لگیں۔ تو ان کے لیے تھانے داری کرنا مشکل ہو جائے۔

ہم نے بڑی مشکل سے اس وفا کی پتلی عورت کو جھوٹی سچی تسلیاں دے کر رخصت کیا اور شرافت علی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

اس کی حالت پہلے سے بھی بری تھی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ سر ڈول رہا تھا۔ کندھے جھک گئے تھے۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی کی بازی ہار گیا ہو۔

ہم نے اسے کرسی پر بٹھا کر پانی پلایا۔ اس کا حوصلہ بڑھایا۔ تب کہیں جا کر وہ ذرا بات کرنے کے قابل ہوا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ ہم تفتیش کے دوران جتنے سوال و جواب کرتے ہیں اگر پورے کے پورے لکھنے لگ جاؤں تو کہانی بہت لمبی ہو جائے۔ لہٰذا طوالت سے بچنے کے لیے مختصراً بہت ضروری سوال و جواب میں تحریر کرتا ہوں۔

''ہاں بھئی شرافت علی! یہ سب کیسے ہوا؟''

''جناب میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں آپ کے پاس آیا تھا کہ برائے مہربانی جابر خان کو سمجھائیں وہ مجھے تنگ نہ کرے۔ میں نے کوئی ڈرامہ نہیں کیا۔''

''کیا تم نے اس بات کا ذکر کسی اور سے بھی کیا تھا کہ جابر خان نے تمہارے پاس امانتاً سونا اور پیسا رکھوایا ہے۔'' شوکی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل نہیں جناب! میں قسم کھا کر آپ کو یقین دلاتا ہوں۔''

''تمہاری بیوی نے کسی سے ذکر کیا ہوگا۔'' میں نے پوچھا۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔'' شرافت علی نے اعتماد سے کہا۔

''اس اعتماد کی وجہ شرافت علی؟'' شوکی نے ذرا تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''جناب میں نے اسے منع کیا تھا۔ وہ تو میری بات کی بڑی سچ رکھتی ہے۔ وہ تو وفا کی پتلی ہے۔ ایسی عورت' ایسی بیوی قسمت والوں کو ملتی ہے۔''

وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا' اس اسٹیج پر ہم نے اسے یہ بتانا نامناسب نہیں سمجھا کہ اس کی بیوی چند لمحے پہلے تھانے میں آئی تھی۔

''یہ سب تو اپنی جگہ ٹھیک ہی ہوگا۔ شرافت علی تم چوہدری کے باغ میں کیسے پہنچ گئے؟''

''چوہدری صاحب نے ایک بندہ بھیجا تھا پیغام یہ تھا کہ انہوں نے جابر خان کو بھی بلایا ہوا ہے۔ تمہیں بھی چوہدری صاحب نے بلایا ہے۔''

''کس لیے؟''

''یہ تو اس نے نہیں بتایا تھا جناب۔'' شرافت علی نے مسکین سی آواز میں کہا۔

''اور تم بغیر سوچے سمجھے وہاں چلے گئے۔'' شوکی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

مجھے شرافت علی کی سادہ لوحی اور حد درجہ بے وقوفی پر غصہ آ گیا۔

لیکن پھر کچھ سوچ کر ہنس پڑا۔

یہ بے موقع ہنسی تھی۔ شوکی اور شرافت علی نے چونک کر میری طرف دیکھا شوکی تو خاموش تھا لیکن شرافت علی نے معصومیت اور حیرانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانے دار صاحب ابھی میں نے وہ بات تو بتائی ہی نہیں۔ جس کو سن کر آپ ہنس پڑیں گے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے اور شوکی نے بہ یک وقت اس کی طرف دیکھا۔

''بات ہی کچھ ایسی ہے.....'' شرافت علی بات کرتے کرتے رک گیا۔

''جلدی بتاؤ بھئی پہیلیاں مت بجھواؤ۔'' اس بار میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''دراصل جی مجھے بچپن سے کوئل کی آواز بہت اچھی لگتی ہے۔ میں جب باغ میں داخل ہوا تو کسی درخت پر کوئل بول رہی تھی میں نے اوپر دیکھا۔ آخر ایک درخت پر مجھے کوئل بولتی ہوئی نظر آ گئی۔ میں اس کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ اچانک کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ جب میں نے نیچے دیکھا تو ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ نیچے جابر خان پڑا تھا۔ ابھی میں حیران و پریشان کھڑا تھا کہ مجھے ایک تیز آواز آئی۔

''چوہدری صاحب ذرا جلدی آیئے دیکھیے شرافت علی نے جابر خان کو قتل کر دیا ہے۔ پھر کہیں سے چوہدری صاحب قدیر اور دوسرے لوگ آگئے آواز دینے والا پرویز تھا۔ مجھے پکڑ لیا گیا میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ جابر خان ایک لاش میں تبدیل ہو چکا ہے۔

''اوئے شرافت علی یہ تُو نے کیا کیا؟'' چوہدری صاحب نے مجھے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

''چوہدری صاحب میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو آپ کے بلانے پر آیا ہوں۔''

''تمہارے کپڑوں پر خون کیسے لگ گیا؟'' پرویز نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''میں گر گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''چلو قدیرے اس کو لے جا کر کمرے میں بند کر دو اور سائیکل پر ایک بندہ تھانے بھیج دو۔'' چوہدری صاحب نے حکم دیا۔'' شرافت علی خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

''جب تم باغ میں داخل ہوئے تو تمہیں باغ میں کوئی بندہ نظر نہیں آیا؟''

''نہیں سرکار.....!'' شرافت علی کی ایک ایک بات سے سچائی کی خوشبو آ رہی تھی۔

پھر یہ سب کیا تھا؟ بات ڈاکے سے شروع ہوئی تھی۔ ابھی تک گونگے ڈاکوؤں کے متعلق کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی' اچانک یہ قتل ہو گیا اور قتل بھی اس آدمی کا ہوا جس کا پیسا اور سونا ڈاکو لے گئے تھے۔

''سر ایک بات بُری طرح میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے۔'' شوکی نے حسبِ عادت کندھے ہلاتے ہوئے کہا۔

''کون سی بات بھئی یہاں تو فی الحال کوئی بھی بات پلے نہیں پڑ رہی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اگر یہ قتل شرافت علی نے نہیں کیا تو اسے پھانسنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

''اس کے متعلق تو یہ بندہ ہی کچھ بتا سکتا ہے۔'' میں نے شرافت علی کی طرف اشارہ کیا۔

''میں..... میں کیا بتا سکتا ہوں؟'' اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔

''دیکھو شرافت علی کوئی کام بلاوجہ نہیں ہوتا۔ اس کی کوئی ٹھوس وجہ ہوتی ہے۔'' شوکی نے اس کی حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

www.pkdigest.com

"جناب! میری سمجھ میں تو کوئی وجہ نہیں آ رہی۔"

پھر ہم نے شرافت علی کو حوالات میں بند کر دیا۔ ہم جو کچھ کرنا چاہتے تھے یہ اس کے لیے لازمی تھا۔ ہم یہی ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ہم شرافت علی کو قاتل سمجھ رہے ہیں۔

اگلے دن صبح صبح میں نے فون کر کے بڑے صاحب کو رپورٹ دے دی قتل کے متعلق تو ہم پہلے ہی اطلاع دے چکے تھے۔

ہم نے ایک کام یہ کیا کہ ایک مخبر عورت کو چوہدری نوید اینڈ کمپنی کے متعلق راز کی باتیں معلوم کرنے کے لیے مامور کر دیا۔ نہ شرافت علی نے کسی کو بتایا تھا۔ نہ اس کی بیوی نے۔

پھر ڈاکوؤں کو کیسے پتا چلا کہ شرافت علی کے گھر اتنا مال پڑا ہے۔ کیوں کہ شرافت علی تو بڑی مشکل سے اپنا گزارہ کر رہا تھا۔ بات اچنبھے کی تھی۔

گونگے ڈاکو کون تھے کہاں سے آئے تھے' اور کہاں چلے گئے؟ ان سوالوں کے جواب ہمیں درکار تھے۔ ہمارے پاس فی الحال کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ڈاکو جاتے جاتے وہ پرچی بھی لے گئے تھے جو انہوں نے لکھ کر شرافت علی کو دی تھی۔

شوکی تفتیش کے سلسلے میں جا چکا تھا۔ میں فائلیں الٹ پلٹ رہا تھا۔ کہ اچانک سپاہی اللہ دتہ اندر داخل ہوا اور سلوٹ کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"کہو بھئی کیا خبریں ہیں؟" میں نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"سر باغ میں جو گھر ملے ہیں۔ وہ گڈ مڈ ہیں۔ چھ سات بندوں کے گھر ہیں۔ جو ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک گھر ایسا ہے جو علیحدہ ہے لیکن وہ گھر اشرافت علی کا ہے۔ جو یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ وہ واردات ہونے کے بعد آیا تھا۔"

"اچھا بہت خوب بھئی ہم نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔"

"سر پھر شرافت علی کو آپ نے حوالات میں کیوں بند کیا ہے؟" سپاہی اللہ دتہ نے کہا۔

میں نے اسے وجہ بتائی اور وہ سر ہلا کر چلا گیا۔

اگر دو باتوں کے جواب مل جائیں تو ہماری منزل ذرا آسان ہو جاتی۔

پہلا ڈاکوؤں کو کس نے بتایا تھا؟ دوئم آخر چوہدری نوید وغیرہ کو شرافت علی کے ساتھ کون سی دشمنی ہے؟

دن بارہ بجے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ اس کے مطابق قتل دن دو اور تین بجے کے درمیان ہوا تھا۔ قاتل اپنے کام میں مشاق تھا۔ اس نے عین دل میں خنجر پیوست کیا تھا۔ مقتول بس تین چار منٹ میں ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔ اس کے علاوہ رپورٹ میں یہ بات بھی درج تھی کہ مقتول نے قتل ہونے سے کچھ دیر پہلے ہی شراب پی تھی۔ یا اسے پلائی گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ نے تو سب کچھ واضح کر دیا۔ مبینہ مجرم چالاک اور اثر و رسوخ والے تھے۔ اس لیے ان کے ساتھ چالاکی اور دھوکے سے نپٹنا تھا۔

ہم بے بس نہیں تھے' لیکن جب اس قسم کی حالت ہو تو بہت ذہانت اور سوچ بچار سے بساط بچھانی پڑتی ہے۔ مجرموں کے خلاف ٹھوس ثبوت درکار ہوتے ہیں تاکہ عدالت میں جا کر کیس پٹ

نہ جائے اور ان کو گرفتار کرنے کے بعد شرمندگی نہ ہو۔ وہ گرمیوں کے دن تھے۔ سورج غروب ہونے سے آدھا گھنٹہ پہلے شوکی آ گیا۔ اس کے چہرے پر گرمی نے اثر کیا تھا لیکن وہ میرے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تو میں نے پوچھا۔

"لگتا ہے کوئی سرا ہاتھ آ گیا ہے؟"

"سر ایک سرا ہاتھ آیا ہے۔" شوکی نے کہا۔

پھر اس نے مجھے اس سرے کے متعلق بتایا۔ تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ واقعی مخبر عورت نے کمال کر دیا تھا۔ لیکن مجھے شرافت علی پر بہت غصہ آیا۔

جب ہم نے اسے بلا کر اس کے متعلق پوچھا تو وہ معصومیت سے بولا۔ "کیا یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے؟"

اس کیس میں مجھے شرافت علی پر غصہ اور ترس بہ یک وقت آیا تھا۔ عجیب شخص تھا۔

شرافت علی کو واپس اپنی جگہ پر بھیج کر میں نے اور شوکی نے ایک پلان بنایا۔ جو کچھ ہم کرنے جا رہے تھے۔ اس میں گڑبڑ کا امکان بھی تھا۔ اس لیے ہم نے بڑے صاحب کو بھی اعتماد میں لے لیا تھا۔ یعنی ان سے اجازت حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے ہمیں کہا تھا کہ پکا ہاتھ ڈالنا ہے۔ باقی کام اگلے دن پر ڈال کر ہم رات ڈیوٹی والے ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے تھانے کا انتظام کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اگلی صبح جب ہم تھانے پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ کام ہو گیا ہے کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ ہر بات ہماری حسب خواہش ہو گئی تھی۔ یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔

صبح نو بجے کے قریب چوہدری نوید دو باڈی گارڈز کے ساتھ تھانے میں داخل ہوا۔

باڈی گارڈز باہر ہی رہ گئے اور چوہدری غصے میں بھرا ہوا میرے دفتر میں داخل ہوا۔ میں اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے دعا سلام کے بعد وہ بولا۔

"تھانے دار صاحب! یہ کیسی اندھیر نگری ہے؟"

"کیوں چوہدری صاحب ایسا کیا ہو گیا۔ آپ تشریف تو رکھیں۔" میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"رات سے میرے دو خاص بندے غائب ہیں۔" چوہدری نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ اپنی چوہدراہٹ میں تھا۔ جب کرسی پر بیٹھا تو اس کی گردن تنی ہوئی تھی۔

"کن بندوں کی بات کر رہے ہیں؟"

"پرویز اور قدیر کی جناب! اتنی جرأت کس کی ہوئی ہے۔ یہ تو براہ راست چوہدری نوید سے پھڈا ڈالنے والی بات ہے۔" لگتا تھا چوہدری صاحب بڑی مشکل سے غصہ ضبط کر رہے ہیں۔

"چوہدری صاحب! ہو سکتا ہے کہ آپ کے بندے خود ہی کسی کام سے نکل گئے ہوں۔" شوکی جو اس وقت میرے کمرے میں ہی بیٹھا ہوا تھا بولا۔

"ناممکن سورج مغرب سے نکل سکتا ہے لیکن میرے بندے...... ناممکن قطعی ناممکن۔"

چوہدری نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"اوہ چوہدری صاحب اس بے چاری میز پر تو رحم ہی کریں۔" میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

"اوہ سوری! اس وقت میں اپنے آپ میں

Pdf by Readsign
www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

نہیں ہوں۔"

"آپ ان کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانا چاہتے ہیں تو باہر جائیں دائیں طرف تیسرے کمرے میں محرر بیٹھا ہوا ہے......"

"وہ تو میں خود دیکھ لوں گا صرف آپ کو اطلاع دینی تھی۔" وہ اٹھا اور پُرغرور چال چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے اس نے ہاتھ ملانا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

جب چوہدری اپنے دونوں باڈی گارڈوں کو لے کر تھانے کی چار دیواری سے نکل گیا تو میں نے شوکی سے کہا۔

"تم نے دیکھا۔ کتنا غرور ہے اس میں دوسروں کو انسان سمجھتا ہی نہیں۔"

"سر دفع کریں، جلد ہی اس کو آٹے دال کا بھاؤ پتا چل جائے گا۔" شوکی نے کہا۔

"میں ذرا کام شروع کروا دوں۔"

"بالکل!" ابھی تک حالات ہمارے موافق تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد تھانے کی فضا چیخوں سے گونجنے لگی۔

تقریباً ایک گھنٹے تک یہ آوازیں آتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ سکون ہو گیا۔

پھر شوکی، حوالدار ہیبت خان اور کانسٹیبل رفیق ساتھ ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے تینوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔

"سر مال تیار ہے۔ آپ معائنہ کر سکتے ہیں۔" ہیبت خان اور کانسٹیبل رفیق نے یک زبان ہو کر کہا۔

میں نے دل کھول کر انہیں شاباشی دی اور کہا کہ "باری باری دونوں کو بھیج دو۔"

شوکی نے مجھے بتایا کہ ہیبت خان اور کانسٹیبل رفیق کو "کام" شروع کرنے کا کہہ کر وہ ذرا بازار کی طرف نکل گیا تھا۔

سب سے پہلے ہیبت خان قدیر کو لے کر آیا۔

جی ہاں قارئین آپ کافی ذہین ہیں۔ سمجھ گئے ہوں گے کہ رات کی تاریکی میں ہم نے چوہدری نوید کے دونوں ڈشکروں کو تھانے کے آخری کونے میں بنے ہوئے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ کبھی کبھی ہمیں بھی ایسے غیر قانونی کام کرنے پڑتے ہیں۔ آدھی رات کے وقت دونوں شراب کے نشے میں دھت تھے۔ اس لیے کسی خاص زحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

"ہاں بھئی قدیر پہلوان! اب تم کیا کہتے ہو؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"مائی باپ پہلے آپ اسے باہر نکالیں۔ اس نے ہیبت خان کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوئے جرم کرتے ہوئے تمہیں کسی بات کا خیال نہیں ہوتا۔ یہ ادھر ہی رہے گا۔ ہیبت خان اگر یہ ذرا بھی جھوٹ بولے تو تم......" میں نے معنی خیز نظروں سے ہیبت خان کو دیکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"آپ فکر ہی نہ کریں سر۔" اس نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد دونوں یعنی قدیر اور پرویز نے ہمیں ذرا بھی پریشان نہیں کیا۔ یہ ایک ہوس پرست اور مغرور انسان کی فطرت کی کہانی تھی۔

دراصل گاؤں کے باہر شرافت علی کے باپ دادا کی تھوڑی سی زمین ہے جو چوہدری نوید کی زمینوں سے ملی ہوئی ہے۔ کچھ عرصے سے

چوہدری نوید کی نظریں اس زمین پر لگی ہوئی تھیں۔ شرافت علی کے باپ سے چوہدری نے اس زمین کو خریدنے کی بات کی تھی، لیکن وہ کسی قیمت پر زمین بیچنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ ہمارے باپ دادا کی نشانی ہے (یہ زمین بنجر تھی) شرافت علی کے باپ نے مرتے مرتے یہ بات شرافت علی کے کان میں ڈال دی تھی۔

یہ باتیں مخبر عورت نے ہمیں بتائی تھیں۔ شرافت علی نے پوچھنے پر بڑی معصومیت سے کہا تھا۔ کیا دشمنی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے؟ چوہدری کو یہ پتا چل چکا تھا کہ گاؤں کے باہر والی زمینیں کچھ عرصے کے بعد سونے کے بھاؤ بکنے والی تھیں۔ وہاں حکومت کچھ فیکٹریاں لگانے کا سوچ رہی تھی اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ شرافت علی یہ زمین کسی قیمت پر نہیں بیچے گا۔ چنانچہ اس نے ایک بھیانک منصوبہ بنایا۔ جابر خان شراب وغیرہ کا رسیا تھا اور اس کی دوستی قدیر اور پرویز سے تھی۔ وہ اکثر باغ میں جاتا رہتا تھا۔ چوہدری نے شرافت علی کی سادہ لوحی اور معصومیت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ جابر خان نے چوہدری کے کہنے پر روپے اور سونے کا زیور شرافت علی کے گھر رکھ دیا اور پھر وہ اور قدیر گونگے ڈاکو بن کر اس کے گھر میں گھس گئے، وہ گونگے اس لیے بن گئے تھے کہ کہیں اپنی آواز سے پہچانے نہ جائیں۔ انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔ خدا کو شرافت علی کو بچانا مقصود تھا اس لیے جب میں نے جابر خان کو تھانے بلایا تو وہ اپنے گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر سیدھا باغ میں آ گیا۔ اس کی بیوی نے کہہ دیا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ ویسے ہی کہہ دیا

کہ فلاں جگہ گیا ہے۔ اس نے پہلی بار جرم کیا تھا وہ گھبرا گیا تھا۔ اتفاق سے اس وقت چوہدری بھی باغ میں موجود تھا۔ اس نے جابر خان کی گھبراہٹ دیکھی۔ تو اس نے سوچا کہیں یہ بندہ بھانڈا ہی نہ پھوڑ دے اس نے قدیر اور پرویز سے کہا کہ اسے ہمیشہ کے لیے گونگا بنا دو۔ جب جابر خان کو شراب پلائی جا رہی تھی۔ اس وقت چوہدری کے کہنے پر ایک بندہ شرافت علی کو بلانے جا رہا تھا۔ دراصل جابر خان کا قتل وہ شرافت علی کے کھاتے میں ڈالنا چاہتے تھے۔

پھر سب کچھ چوہدری کے حسب منشا ہو گیا، لیکن اب انجام ہماری حسب منشا ہونے والا تھا۔ ایک بات کا ہمیں افسوس ہو رہا تھا کہ چوہدری کسی قانونی گرفت میں نہیں آیا تھا۔ اس کے خلاف ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا سارے ثبوت جابر خان، قدیر اور پرویز کے خلاف تھے۔ چوہدری صاف مکر گیا تھا۔ عدالت ثبوت مانگتی ہے۔ کوئی کہے کہ یہ جرم میں نے فلاں آدمی کے کہنے پر کیا ہے تو عدالت گواہ اور ثبوت مانگتی ہے۔ شرافت علی کو ہم نے عزت سے رکھا تھا اور عزت سے گھر بھیج دیا تھا۔

ایک مجرم اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ باقی دو کو ہم نے مع ان کے جرم کے سپرد عدالت کر دیا۔

جب مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا تو ہمیں اطلاع ملی کہ چوہدری نوید پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور اس کا دایاں دھڑ بے کار ہو گیا ہے۔ اسے کہتے ہیں کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

ھوشیار

جناب عمران احمد!
السلام علیکم!
آج کے دور میں موبائل فون کے ذریعے پیغام رسانی بہت آسان ہوگئی ہے۔ آپ چند لمحوں میں حدیث دل اپنے مطلوب تک بغیر کسی تاخیر اور بغیر کسی ڈر و خوف کے پہنچا سکتے ہیں' لیکن جب یہ سہولت نہیں تھی تو عاشق نامدار کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ اس کا ایک رنگ آپ اس کہانی میں ملاحظہ فرمائیے۔
والسلام
محمد بلال
لاہور

اس روز ان چار نقاب پوش مسلح لڑکوں نے جودو موٹر سائیکلوں پر سوار تھے' نادیہ اور اس کی دو ہم جماعت لڑکیوں عنبرین اور عالیہ کو اس سنسان اور ویران راستے میں گھیر لیا جو بس اسٹاپ کی طرف جاتا تھا۔ اس وقت کوئی چہل پہل اور آمد و رفت نہیں تھی۔ نقاب پوش لڑکوں نے اس سنہرے موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ ان کے ہاتھوں میں خوف ناک قسم کے ریوالوروں کو دیکھ کر ان تینوں کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ تھر تھر کانپنے لگیں۔ ان کے دل اُچھل کر حلق میں آ گئے تھے۔ ان میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ مدد کے لیے چیختی چلاتیں۔

چاروں لڑکوں نے ان تینوں لڑکیوں کو پوری طرح اپنے نرغے میں لے لیا۔ ان میں کسی نے عنبرین اور عالیہ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکے نے جوان کا لیڈر لگتا تھا' نادیہ کی طرف بڑھا اور اس کا سر سے نیچے تک جائزہ لیا اور اس سے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔ ''ہم نے سنا ہے کہ تم نذیر سے محبت کرتی ہو؟''

اس اچانک اور غیر متوقع گھیراؤ سے وہ حد درجہ خائف اور سراسیمہ ہوگئی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے جلد ہی اپنے حواس پر قابو پالیا اور اس لڑکے کی زبان سے نکلے ہوئے جملے نے تن بدن میں ایک آگ لگا دی تھی۔ وہ تنک کر بولی۔ ''نہ میں کسی نذیر کو جانتی ہوں اور نہ ہی کسی سے محبت کرتی ہوں۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' اس لڑکے کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ ''کیا نذیر تمہارا ہم جماعت نہیں ہے؟''

''ہوگا مگر میں اسے نہیں جانتی ہوں۔'' نادیہ نے بے پروائی سے اپنے شانے جھٹکے تھے۔

''تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتی ہو۔'' وہ تڑختے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔ ''مجھے ایک ایک بات کی رپورٹ ملتی رہتی ہے۔ تم اس سے دو ایک مرتبہ نوٹس لے چکی ہو۔ نوٹس لینا اور واپس کرنا محض ایک بہانہ تھا۔ نوٹس کے بہانے تم دونوں ناموں کا تبادلہ کرتے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''بکواس بند کرو۔'' نادیہ زمین پر پیر پٹخ کر برہمی سے بولی۔ ''میں پڑھنے کے لیے آتی ہوں' عشق لڑانے نہیں۔''

''تم اپنی صفائی میں کچھ بھی کہو میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' اس کا انداز استہزائی تھا۔

''مجھے صفائی پیش کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' نادیہ نے نفرت سے کہا تھا۔

''میری بات دھیان سے سنو۔'' وہ دھمکی آمیز

لہجے میں بولا تھا۔ ''تم سے جو محبت کرتا ہے اور تمہاری محبت کے جو قابل ہے وہ میرا دوست ہے۔ اس کا تم پر حق ہے۔ تم اس کی' صرف اس کی ہو۔ اگر تم نے اس کے سوا کسی اور سے محبت کی تو ہم اس کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیں گے سمجھیں۔''

''اگر تم نے اپنی زبان کو لگام نہ دی تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔'' نادیہ نے بے خوفی سے کہا۔ وہ سخت طیش کے عالم میں آ گئی تھی۔ ''تم نذیر کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہتے ہو کرو۔ میری بلا سے۔''

''یہ تمہیں پہلی اور شریفانہ وارننگ ہے۔'' وہ درشت لہجے میں بولا تھا۔

''تم بھی میری وارننگ سن لو۔'' نادیہ کانپنے لگی۔ ''اگر تم نے آئندہ ایسی بے ہودہ باتیں اور حرکتیں کیں تو میں تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں گی ذلیل آدمی.....''

ان بدمعاشوں نے کالج سے کچھ لڑکوں کو باہر نکلتے دیکھا تو وہ موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر تیزی کے ساتھ فرار ہو گئے۔ ان لوگوں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ تینوں اتنی بدحواس اور خوف زدہ ہوگئی تھیں کہ ان میں سے کسی کو ان کی گاڑیوں کے نمبر نوٹ کرنے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ اس واقعہ کا عنبرین اور عالیہ نے اتنا شدید اثر لیا کہ وہ دو دن تک کالج نہیں آئی تھیں۔ البتہ نادیہ آتی رہی۔ اس نے اس واقعہ کی ہوا بھی لگنے نہیں دی تھی اور اتنی احتیاط ضرور برتی تھی کہ بس اسٹاپ سے کالج' کالج سے بس اسٹاپ آتے جاتے وہ لڑکوں کے ساتھ ہو لیتی تھی۔ اس واقعہ کا علم جب ہوا تھا جب عنبرین اور عالیہ کالج آئیں۔ پھر یہ واقعہ جنگل کی آگ کی طرح کالج میں پھیل گیا۔ حالاں کہ نادیہ نے ان دونوں کو بڑی سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ وہ کالج میں کسی سے اس واقعہ کا تذکرہ نہ کریں۔ مگر وہ عورت ذات تھیں' یہ بات ان کے پیٹ میں نہ رہ سکی۔

نادیہ نے چار پانچ ماہ پہلے اس کالج میں داخلہ لیا تھا۔ جب سے وہ اس کالج میں آئی' کالج کے بہت سارے لڑکوں کی کمزوری بن گئی تھی۔ وہ غیر معمولی حسین تو نہیں لیکن غیر معمولی طور پر اتنی پُرکشش تھی کہ دیکھنے والوں کو پاگل کر دے۔ اس کی کشش میں نہ صرف چہرے کے نقوش کے تیکھے پن اور جاذبیت کا بڑا دخل تھا بلکہ اس کے نکلتے ہوئے قد کا بھی۔ اس کی صندلی رنگت کے آگے سُرخ و سپید لڑکیوں کا حسن ماند پڑ گیا۔ وہ ایک قیامت بن گئی تھی۔

وہ صرف بے حد پُرکشش ہی نہیں بلکہ ایک اچھی اور ذہین طالبہ' بہترین مقررہ' اچھی ہم جماعت' نفاست پسند اور نیک سیرت لڑکی تھی۔ اس کے باوجود وہ عام لڑکیوں سے یکسر مختلف تھی۔ وہ لیکچرز بڑے غور سے سنتی اور اس کا سر ایک خاص انداز میں کاپی پر جھکا ہوتا تھا۔ میں نے یا کسی نے اسے کینٹین میں یا لان پر بیٹھ کر گپ شپ میں اپنا وقت برباد کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ گھر سے کالج' کالج سے گھر تک محدود رہتی۔ اس کی سہیلیاں بھی کم تھیں۔ مزاج کی سیدھی سادی اور اچھی طبیعت کی مالک تھی اس میں تکبر اور غرور نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کوئی لڑکا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ اس سے بڑے اخلاق سے پیش آتی۔ اس نے کبھی کسی لڑکے کو مایوس نہیں کیا تھا۔

بہت سارے لڑکے نادیہ کے دیوانے تھے۔ ان دیوانوں میں میرا دوست اور ہم جماعت نذیر بھی تھا۔ نادیہ اس کی بہت بڑی کمزوری بن گئی تھی اور وہ اسے پانے کے لیے بے حد سنجیدہ بھی تھا۔ مگر میرا خیال تھا کہ وہ نادیہ کو اپنا نہیں بنا سکے گا۔ میں نے

www.pkdigest.com

Pdf.by Roadsign

اسے کئی بار سمجھایا تھا کہ وہ دیوانگی کے خیالات پالنے کے بجائے اپنی تعلیم پر توجہ دے۔ اس لیے کہ یہ فائنل ایئر ہے اور پھر کالج میں جو بہت سارے لڑکے اس کے دیوانے ہیں وہ نہ صرف امیر کبیر ہیں بلکہ صاحب حیثیت بھی ہیں۔ کاروں میں آتے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ایک نادیہ ہی نہیں ہر لڑکی بہتر زندگی اور تابناک مستقبل کے لیے ان میں سے کسی لڑکے کا انتخاب کرے گی۔ میری باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ کلاس میں لیکچر سے زیادہ نادیہ پر توجہ دیتا تھا اور اس کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔

نادیہ نے کبھی نذیر یا کسی اور لڑکے کو کوئی ایسی لفٹ نہیں دی یا ان سے کھل مل کر باتیں نہیں کرتی تھی کہ جو اس پر شک کیا جاسکے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے یا کرنے لگی ہے اس نے دو ایک بار نذیر سے نوٹس لیے۔ اس سے زیادہ اور بات نہ ہوسکی تھی۔ ان نوٹس کی وجہ سے نذیر نے نادیہ سے دوستی بڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی حوصلہ افزائی نہیں ہوسکی تھی۔ اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اور ساری امیدیں خاک میں مل گئیں مگر وہ مایوس نہیں ہوا۔ اس واقعہ نے نذیر کو کالج میں توجہ کا مرکز بنا دیا تھا اور پھر نادیہ جو بھولے سے بھی اس کی طرف نہیں دیکھتی تھی اب اسے کن اکھیوں سے دیکھنے لگی تھی یا نذیر اس کی نظروں کے سامنے آنے لگا تھا۔ نذیر نے اس واقعہ کے بعد سے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جو نادیہ کے لیے کسی اسکینڈل کا باعث بن سکے۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکا ہوتا تو شاید وہ اس واقعہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔

میں انفلوائنزا کے باعث چار دن تک کالج نہیں جاسکا۔ چوتھے دن مجھے میرے ایک ہم جماعت نے میرے گھر پر آکر بتایا کہ دو دن پہلے نذیر پر کسی نے کالج سے باہر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ بال بال بچ گیا لیکن زخمی ہوگیا اور اسپتال میں زیر علاج ہے۔ اس نے آپ کو بلایا ہے۔

میں اس روز تو اسے دیکھنے اسپتال نہیں جاسکا تھا البتہ دوسرے دن پہنچا تھا۔ پرائیوٹ اسپتال میں اس کا کزن ڈاکٹر تھا۔ وہ وہیں داخل تھا۔ اس کے سر اور بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ نذیر نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ اسے دو نقاب پوش لڑکوں نے کالج سے باہر گھیر لیا تھا۔ اسے اس جرم کی سزا دی گئی ہے کہ وہ نادیہ سے محبت کرتا ہے۔ اس کی محبت کی وجہ سے وہ لڑکا جو نادیہ کی چاہت میں پاگل ہے نادیہ کی محبت سے محروم ہوگیا ہے۔ اس لڑکے کی ایما پر نقاب پوش لڑکے اسے نادیہ کی محبت سے باز رکھنے کے لیے اسے دھمکیاں دینے لگے تھے۔ اس نے ان بدمعاش لڑکوں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ نادیہ کی محبت سے دستبردار نہیں ہوگا۔ اس بات پر وہ اسے زخمی کرکے فرار ہوگئے۔

معلوم نہیں وہ کون لڑکا تھا جو ان دونوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا۔ پہلے اس نے نادیہ کو دھمکی دی۔ حالاں کہ نادیہ غریب نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ وہ نذیر سے محبت کرتی ہے یا اس سے محبت ہوسکتی ہے۔ اسے تو اپنی تعلیم سے محبت تھی۔ یہ تو ایک ایسی بات تھی جس کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ ادھر نذیر نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو اس پر انگلی اٹھائی جاسکے۔ اس نے نہ تو کبھی یہ دعوا کیا کہ نادیہ اس سے محبت کرتی ہے اور نہ ہی میرے سوا کسی کو بتایا تھا کہ وہ نادیہ سے محبت کرتا ہے پھر بھی محبت کا یہ ٹریفک یک طرفہ ہی چل رہا تھا۔ اس صورت میں کسی کا جانی دشمن بن جانا حیرت انگیز تھا۔

نذیر نے مجھے سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر کہا۔ ''یار ریاض! کل شام نادیہ مجھے دیکھنے آئی تھی۔''

''کیا......؟'' میں اپنی جگہ سے اُچھل پڑا۔ ''کیا کالج کی لڑکیوں کے ساتھ آئی تھی؟''

''نہیں، وہ اکیلی تھی۔'' نذیر بولا۔ ''اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ پر قاتلانہ حملہ کس لیے ہوا؟ میں نے اس سے کہا کہ اس جرم میں کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔''

''ایں! یہ بات تم نے اس سے صاف صاف کہہ دی تھی؟'' میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''اس نے یہ بات سن کر کیا کہا؟''

''وہ بولی...... میں تو آپ سے محبت نہیں کرتی ہوں اور نہ ہی آپ نے کبھی ایسی حرکت کی جس سے کسی کو شک ہو کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ پھر اس نادیدہ دشمن کو یہ شک کیوں ہوا؟''

''مجھے کیا معلوم کہ اسے کیسے اور کیونکر ہم دونوں پر شک ہوگیا ہے۔'' نذیر بتانے لگا۔ ''ان بدمعاشوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا تم نادیہ سے محبت کرتے ہو۔ میں نے اقرار کیا کہ...... ہاں۔''

''یہ اقرار آپ نے کیوں کیا؟'' وہ ناگواری سے بولی تھی۔

''اس لیے کہ مجھے آپ سے واقعی محبت ہوگئی ہے۔''

''لیکن مجھے تو نہیں ہے۔'' وہ تنک کر بولی تھی۔

''لیکن میں نے آپ سے کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھے آپ سے محبت ہے لہٰذا اب آپ بھی مجھ سے محبت کریں۔''

''اس نے تمہاری بات سن کر کیا کہا؟'' میں نے درمیان میں پوچھا۔

''اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میں نے ایک لیکچر دے ڈالا تھا۔'' نذیر کہنے لگا۔ ''میں نے اس سے کہا تھا محبت کرنے کا حق ہر شخص رکھتا ہے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ ہر اچھی اور خوب صورت چیز سے محبت آپ ہی آپ ہوجاتی ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ آپ بھی مجھ سے محبت کریں۔ آپ مجھ سے محبت کریں یا نہ کریں لیکن میں آپ سے محبت کرتا رہوں گا۔ وہ بدمعاش دس بار بھی مجھ پر قاتلانہ حملہ کیوں نہ کرے۔ میں اس کے سامنے آپ سے محبت کا دم بھرتا رہوں گا۔''

''اس طرح تو آپ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔'' وہ کانپ کر بولی تھی۔

''اب مجھے موت کی نہیں آپ کی محبت کی پروا ہے۔ میں نے بڑے عزم و حوصلے سے کہا اور پہلی بار اس کی آنکھوں میں محبت پاش نظروں سے جھانکا تھا۔'' نذیر بولا۔ ''میری بات سن کر اس نے ایک لمحے کے لیے ایک ٹک مجھے دیکھا تھا۔ اس کی منجمد آنکھوں میں حیرت کے تاثرات تھے۔ پھر وہ میری نگاہوں کی تاب نہ لاسکی اور اپنی نظریں نیچی کرلی تھیں۔ اس نے پھر ایک لفظ بھی نہیں کہا اور خاموش چلی گئی۔'' نذیر نے توقف کرکے مجھ سے پوچھا۔ ''اس کا کیا مطلب لوں؟ کیا یہ سمجھوں کہ اسے مجھ سے محبت ہوگئی ہے؟''

''اگر اسے تم سے محبت ہوگئی ہوتی تو وہ اپنی محبت کا ثبوت دے جاتی۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا اس کا میری طرف ایک ٹک دیکھنا، نظریں نیچی کرنا اور خاموشی سے واپس چلے جانا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اسے بھی مجھ سے محبت ہوگئی ہے؟''

''نہیں......''

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

"وہ کس لیے.....؟" نذیر جز بز ہو گیا۔

"اس لیے کہ وہ کالج کی غیر معمولی مقبول طالبہ ہے۔ اور غیر معمولی طور پر حسین' جب کہ تم اس کے مقابلے میں معمولی ہو۔ غیر معمولی لڑکیاں' غیر معمولی لڑکوں کو پسند کرتی ہیں۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"اگر میں معمولی قسم کا طالب علم ہوں تو وہ مجھے دیکھنے کس لیے آئی تھی؟" نذیر کو غصہ آ گیا۔

"وہ تمہیں دیکھنے اس لیے آئی تھی کہ تم اس کے ہم جماعت ہو۔ محبوب نہیں۔"

"تم دیکھ لینا!" نذیر بڑے عزم و حوصلے سے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "ایک روز وہ نہ صرف میری محبت میں گرفتار ہو جائے گی بلکہ تمہاری بھابی بھی بن جائے گی۔"

نذیر اور نادیہ کی محبت کے چرچے کالج میں ہونے لگے اور لوگ اس تجسس میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ کون لڑکا ہے جو نذیر کی جان لینے کے درپے ہے۔ کچھ لڑکے تو سراغ رسانی کے فرائض انجام دینے لگے تھے۔ نذیر کو اپنے رقیب اور ان نقاب پوشوں کی اتنی پروا نہیں تھی جتنی اسے نادیہ سے محبت کی تھی۔ اب نادیہ کالج آتی تو وہ سب سے پیچھے بیٹھتی اور گھر بھی جلد ہی چلی جاتی تھی۔ ادھر نذیر نے ایسی کوئی حرکت کبھی نہیں کی جو اس کے لیے کسی پریشانی یا بدنامی کا سبب بنے۔ وہ دستور محبت کا بڑا احترام کرتا تھا۔ نادیہ کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کرتا تھا۔

ایک روز جب پریڈ خالی تھا میں اور چند دوست کینٹین میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتفاق سے نذیر موجود نہیں تھا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ وہ اپنے گھر جا رہا ہے اسے کوئی ضروری کام ہے۔ دفعتہً فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ یہ آوازیں کالج کے باہر سے آئی تھیں۔ سارے کالج میں ایک ہڑبونگ اور افراتفری مچ گئی۔ ہم لوگ کینٹین سے باہر آئے تو چند نقاب پوشوں کو موٹر سائیکلوں پر فرار ہوتے ہوئے دیکھا۔ درختوں کے جھنڈ کے پاس نذیر کھڑا ہوا تھا۔ ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ پھر اس کے رقیب نے نذیر کو گولیوں کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے نذیر کے قریب جا کر اسے دیکھا تو اسے صحیح سلامت پایا۔ وہ معجزانہ طور پر بچ گیا تھا۔

باوجود کوشش کے یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ آخر وہ لڑکا کون ہے جو نذیر کی جان لینے کے درپے ہے۔ کالج کے ہر امیر کبیر اور شر پسند قسم کے لڑکوں پر شک و شبہ ہونے لگا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ کچھ لڑکوں نے نادیہ کے ہاں اپنا رشتا بھی بھیجا تھا جسے نادیہ کے گھر والوں نے صاف طور پر انکار کر دیا تھا۔ ان ہی میں سے کوئی لڑکا تھا۔ جو اپنی ناکامی کا بدلہ نذیر سے لے رہا تھا۔ اس نادیہ رقیب کا پتا نہیں چل سکا۔

اس روز سے کالج میں بڑا خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ نادیہ تین دن تک کالج سے غیر حاضر رہی تھی۔ چوتھے دن آئی تو وہ کچھ خوف زدہ سی تھی۔ نذیر اس کے برعکس بہت خوش تھا جیسے اسے کوئی تمغہ مل گیا ہو۔ نادیہ کی محبت مل گئی ہو۔ حالاں کہ نادیہ نے اس واقعے کے بعد بھی اس سے کوئی بات یا ملاقات نہیں کی تھی۔

پندرہ بیس روز خیر و عافیت سے گزر گئے۔ پھر سالانہ امتحان شروع ہو گئے۔ تمام پرچے ختم ہونے کے کوئی ایک ہفتہ کے بعد نذیر میرے گھر آیا تو بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کے دو ڈبے تھے۔ میں سمجھا کہ ایک ڈبا میرے لیے ہے اور دوسرا کسی اور کے لیے ہوگا۔ جب اس نے دونوں

ڈبے میری طرف بڑھائے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے اپنی حیرت بھری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر کے پوچھا۔ "یہ کس خوشی میں دو ڈبے لائے ہو؟"

"پہلا ڈبا اس خوشی میں کہ مجھے ملازمت مل گئی ہے۔" اس نے سرشار لہجے میں جواب دیا۔ "دوسری خوش خبری یہ ہے کہ میرا رشتا نادیہ سے طے ہو گیا۔"

"سچ!" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"سو فیصد سچ!" وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔

"مگر میری جان نادیہ سے شادی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔"

"وہ کس لیے؟"

"اس لیے کہ تمہارے رقیب کو پتا چلے گا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ "کالج میں کتنے ہی لڑکے نادیہ کی محبت میں گرفتار تھے۔ اس رقیب نے انہیں کچھ نہیں کہا۔ وہ تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا۔ تمہارا جرم یہ تھا کہ تم سے نادیہ نے دو ایک بار فلرٹ کیے تھے۔ کیا وہ رشتا طے ہو جانے کی خبر سن کر خاموش بیٹھ جائے گا؟"

"اس خوف و خدشے کا اظہار نادیہ نے بھی کیا تھا۔" نذیر بولا۔

"جس روز میں نے اپنا رشتا اس کے ہاں بھیجا تھا اس کے دوسرے روز نادیہ نے مجھے عالیہ کے ذریعے پیغام بھیج کر شالیمار باغ میں بلایا۔ ہم نے تنہائی میں بات کی تھی اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے اندازہ نہ تھا کہ آپ کو میری محبت اتنی مہنگی پڑے گی۔ اس نادیدہ شخص نے محض شک و شبے کی بنا پر آپ کی جان لینے کی کئی بار کوشش کی۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کی جان چلی جائے۔" نذیر نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔ میں نے نادیہ سے پوچھا "آپ صرف اتنا بتائیے کہ آپ مجھے پسند کرتی ہیں کہ نہیں؟ میرا رشتا منظور ہے کہ نہیں۔ میری بات سن کر نادیہ چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی۔ پھر وہ نظریں نیچی کر کے بولی۔ وہ لڑکی بڑی خوش نصیب ہوگی جسے آپ کی رفاقت ملے گی۔ میں آپ کے جذبے کی بڑی قدر کرتی ہوں۔ میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ ہر اس شخص کو جان کا خطرہ اس شخص کی طرف سے لاحق ہوگا جو آپ سے شادی کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ منگنی اور شادی کے بعد دشمن صبر کر کے بیٹھ جائے۔ میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ کل میرا اس سے رشتا طے ہوگا۔ آئندہ مہینے شادی ہوگی۔"

"تمہیں یہ خوشی مبارک ہو لیکن میرا دل....." وہ درمیان میں بولا۔

"تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ راز صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔ تم کسی اور کو نہیں بتانا۔ وہ رقیب بھی میں ہی تھا اور نقاب پوش لڑکے بھی میرے محلے کے تھے۔ میں نے انہیں کچھ رقم دے کر یہ سارا کھیل رچایا تھا۔"

"ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"اگر یہ کھیل نہیں کھیلتا تو نادیہ نہ میری طرف متوجہ ہوتی اور نہ مجھے پسند کرتی' نہ محبت کرتی۔ اس کھیل کی وجہ سے تو وہ مجھ سے محبت کرنے لگی اور شادی کرنے پر راضی ہو گئی۔"

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

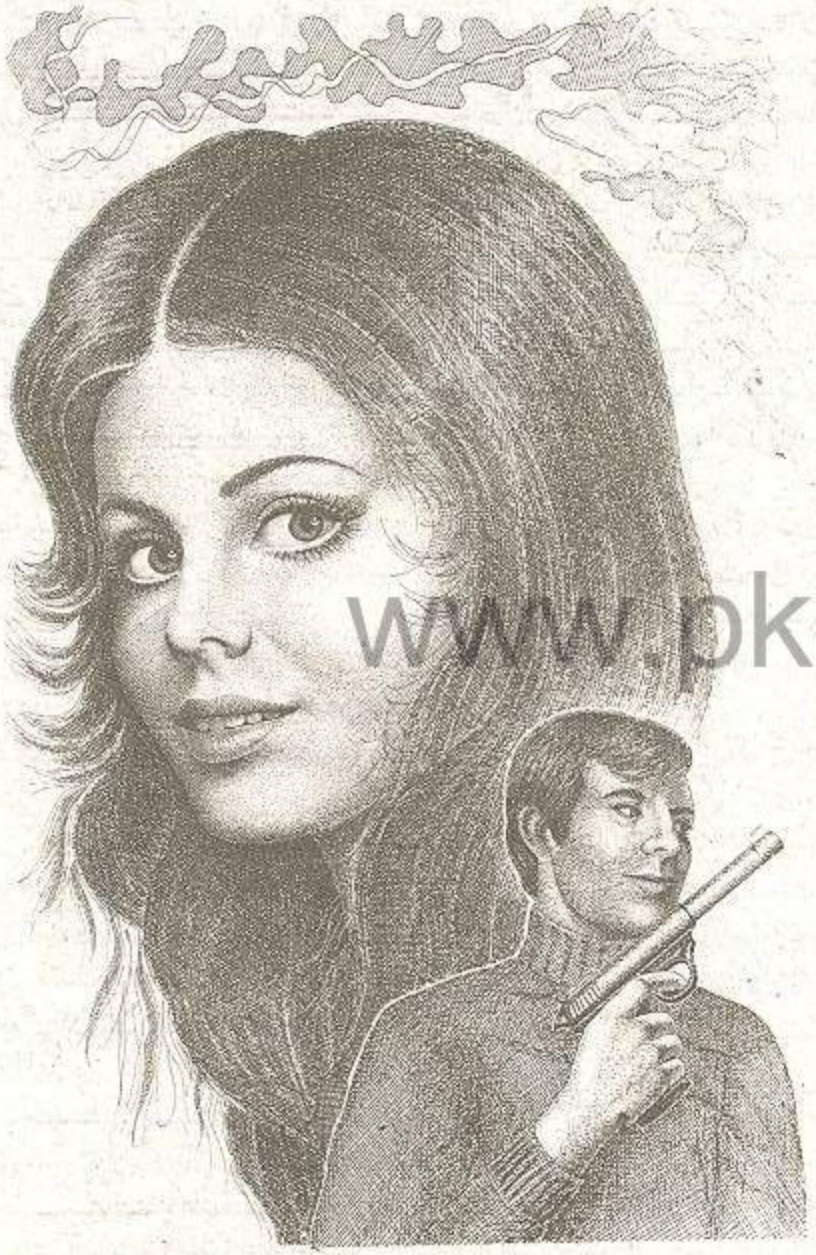

قسط نمبر 56

زنجیریں

شہناز بانو

زمین کے دعویداروں کے مابین ہونے والی خونی کشمکش کی داستان ہے

کہنے تو یہی ہیں کہ زمین کا مالک اللہ ہے لیکن حضرت انسان اس دنیا میں مہمان ہونے کے باوجود اس کے حق ملکیت سے دست بردار نہیں ہوتا زمین کی بنیاد پر ہونے والے جھگڑے اور خونی فسادات ہمارے معاشرے کا جزولاینفک ہیں' برصغیر پاک و ہند کے دیہاتوں میں تو یہ روز مرہ کا معمول ہے ایسی داستانوں کی ان علاقوں میں کوئی کمی نہیں کہ نسلوں کی نسلیں اس زمین پر قربان ہوجاتی ہیں لیکن ستم ظریفی دیکھئے کہ زمین پھر بھی کسی کی نہیں ہوتی۔

یہ کہانی ہے ایک ایسے نوجوان کی..... جس کے سر سے ماں کا سایہ کیا اٹھا کہ سارا جگ ہی اس کا دشمن بن گیا۔

رشتے ریت کے ان ٹیلوں میں تبدیل ہوگئے جو تیز ہواؤں کے باعث راتوں رات اپنی جگہ بدل لیتے ہیں۔

زن' زراور زمین کی تکون کے پس منظر میں لکھی جانے والی ایک سبق آموز تحریر

مجھے یہ دیکھ کر خاصی حیرت ہورہی تھی کہ لوگوں کو مجھے دیکھ کر یعنی میرے روپ میں بلرام کو دیکھ کر کس قدر خوشی ہورہی ہے کہ میں حویلی واپس جارہا ہوں۔ جو بھی مجھے دیکھتا وہ خوشی سے حویلی کی جانب دوڑ لگا دیتا' یعنی حویلی کے مین پھاٹک پر میرے استقبال کی بھرپور تیاریاں تھیں۔ اب تک تو یہ خبر رانی یعنی شکنتلا تک بھی پہنچ گئی ہوگی کہ اس کا پیارا اس کا منگیتر آرہا ہے۔ شاید وہ دل ہی دل میں میرا یعنی مہاراج کا بھی شکریہ ادا کررہی ہوگی کہ میں نے کتنا سچ کہا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ رات بھر سوئی بھی نہ ہو' اس گومگو کا شکار رہی ہو کہ بلرام آرہا ہے یا نہیں۔

خیر اسی قسم کی باتیں سوچتا ہوا حویلی پہنچ گیا اور جیسا کہ میں سوچ رہا تھا حویلی کے گیٹ پر بے تحاشا لوگ کھڑے تھے اور ''کنور بلرام کی جے'' کے نعرے لگا رہے تھے' حویلی کے سارے ملازمین میرے استقبال کے لیے گیٹ پر کھڑے تھے اور ان کے درمیان میں شکنتلا رانی اپنی ساڑھی کے پلّو کو سر پر جمائے کھڑی تھی' اس نے ساڑھی کا پلّو اپنی پیشانی پر کافی آگے تک سرکا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں پوجا کی تھالی تھی اور وہ میری آرتھی اُتارنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

شمشیر نے بگھی بالکل حویلی کے بڑے سے لکڑی کے پھاٹک کے سامنے لے جا کر روک دی اور میں بڑی شان تفاخر سے اپنی نوکدار اور تلوار نما مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بگھی سے اُتر آیا۔

شکنتلا رانی میرے اُترتے ہی تیزی سے آگے بڑھی ہاتھوں میں تھامی ہوئی تھالی اس کے ہاتھوں میں لرز رہی تھی۔ اس نے پہلے تھالی سے کوئی چیز اُٹھا کر میرے ماتھے پر تلک لگایا' پھر تھالی کو میرے سامنے گول گول گھمانے لگی۔ وہ گیندے کے پھول کی پتیاں بھی تھالی سے اُٹھا اُٹھا کر میرے اوپر پھینک رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہوکر اس نے تھالی پاس کھڑی ملازمہ کے ہاتھ میں تھمادی پھر مجھ سے بولی۔

''میں کتنی بھاگیہ شالی (خوش نصیب) ہوں کہ

www.pkdigest.com

Pdf by Readingpk

آپ میری زندگی ہی میں لوٹ آئے ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ کا انتظار کرتے کرتے یہ پتھرائی ہوئی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی' اگر آپ اپنے آنے کی اطلاع کر دیتے تو بہت اچھا ہوتا آپ یوں اچانک آئے کہ ہم کچھ بھی تو نہ کر سکے۔"

"ہاں بس اچانک ہی ہمارے آنے کا پروگرام بن گیا۔ تم بتاؤ کیسی ہو اور چاچا جی تو اچھے ہیں۔" میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ میرے ساتھ چلنے لگی اس کی آنکھوں میں خوشی اور مسرت کے لاکھوں قمقمے جلتے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس معصوم سی لڑکی کو اس طرح دھوکا دیتے ہوئے مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا' مگر کیا کرتا مجبوری بھی ایسا کرنا بہت ضروری تھا اور بابا صاحب کا حکم بھی اور ویسے بھی یہ سارا پروگرام بھی یہی تھا کہ اس حیوان بلرام کو انسان کا بچہ بنا کر اس حویلی میں واپس لانا ہے اور شکنتلا سے شادی بھی کروانی ہے۔

"چاچا جی کہاں ہیں؟ وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہے' وہ اچھے تو ہیں ناں؟" میں نے یہ بات جانتے ہوئے بھی کہ وہ بیچارہ بیٹی کے غم میں بستر سے جا لگا ہے انجان بن کر پوچھا۔

"کہاں اچھے ہیں' جب سے آپ یہاں سے اچانک کہیں چلے گئے تھے۔ ہمارے ساتھ ساتھ وہ بھی آپ کی پرتکشاہ (انتظار) میں بستر سے جا لگے ہیں۔ وہ اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ بستر سے خود سے اُٹھ بھی نہیں سکتے۔" اس کے لہجے میں ڈھیروں اُداسی اُتر آئی تھی۔

"ارے.....!" میں نے شدید افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ "کہاں ہیں وہ؟ ہم سب سے پہلے انہیں جا کر ملیں گے اور اُن سے معافی مانگیں گے کہ ہماری وجہ سے انہیں اتنا کشٹ (تکلیف) اُٹھانا پڑا۔"

"اور رانی۔" یہ کہہ کر میں رگھا اور رانی کی جانب منہ کر کے اسے مخاطب کیا۔ "آپ سے تو ہم اطمینان سے بات کریں گے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے لب اَدھ کھلی کلی کی طرح تھوڑے سے کھل گئے اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں ایک دم اپنے ماضی میں چلا گیا۔ ایک من موہنا' معصوم سا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا اور اس چہرے کے لیے میری آنکھوں میں جو پیار اُترا اسے محسوس کر کے رانی سرتاپا نہال ہو گئی اور شرماتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بھگوان کا شکر ہے کہ آپ آ گئے آپ جا کر پتا جی سے ملیے' ہم بھگوان کے چرنوں میں ماتھا ٹیک کر ابھی آتے ہیں۔"

رانی وہاں سے دوسری جانب مڑ گئی میں نے پاس کھڑی سرسوتی سے پوچھا کہ چاچا جی اپنے ککش (کمرے) میں ہی ہیں ناں تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور میں تیز تیز قدموں سے رانی کے پتا کے کمرے کی جانب چل دیا۔

اس کو بھی میرے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ ایک خادمہ اس کے پاس موجود تھی' میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا اس کے زرد اور مردہ چہرے پر مسرت ناچنے لگی' اس نے اُٹھنے کی کوشش کی' مگر باوجود کوشش کے اُٹھ نہ سکا۔ تو میں لپک کر اس کے قریب پہنچا اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بلرام میرے بچے.....!"

میں اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سما گیا۔ وہ بوڑھا مجھے سینے سے لگا کر بلک بلک کر رونے لگا' ہچکیوں کے باعث اس کا کمزور اور بوڑھا جسم بُری طرح کانپ رہا تھا۔

"مجھے شما کیجیے چاچا جی.....! میں اب آ گیا ہوں ناں اب کبھی لوٹ کر نہیں جاؤں گا' یقین کیجیے میں ایک ضروری کام سے شہر گیا تھا' مگر وہاں ایک مصیبت میں پھنس گیا تھا' مجھے پولیس نے کسی کے شبے میں پکڑ لیا تھا۔ پانچ برس کی جیل ہو گئی تھی' اب رہائی ملی ہے تو سیدھا لوٹ آیا ہوں۔" میں نے اس بوڑھے کو ایک جھوٹی کہانی سنا کر اپنی صفائی پیش کی اور اس کے سینے سے الگ ہو کر اس کے بیڈ کے کنارے پر ہی بیٹھ گیا۔

"اگر ایسی بات تھی تو تم نے ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی۔" بوڑھے وکرم نے حیرانی اور پریشانی سے کہا۔

"میں نے بہت کوشش کی مگر..... بس چھوڑیں چاچا جی اس بات کو' میں اس کو دُہرا کر اور یاد کر کے کانپ جاتا ہوں میں نے بہت اذیت بھرے دن گزارے ہیں' مگر اب تو میں آ گیا ہوں۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا اور اب آپ بھی جلدی سے ٹھیک ہو جائیں میرے پرانے والے چاچا جی بن جائیں۔"

"اب کیا ٹھیک ہونا ہے بیٹا بلرام اب تو ایک آخری خواہش رہ گئی ہے کہ تمہارا اور رانی بٹیا کا سمبندھ ہو جائے تو میں سکون سے اپنی آنکھیں بند کر سکوں۔ بٹیا کی اتنی فکر تھی کہ موت سے بھی چھپتا پھر رہا تھا۔ جب اپنی بچی کو اُداس اور غمگین دیکھتا تھا تو دل دُکھ سے بھر جاتا تھا۔" بوڑھے وکرم نے تیز تیز سانسوں کے درمیان رُک رُک کر کہا۔

"آپ زیادہ بات مت کریں۔ ورنہ طبیعت زیادہ خراب ہو جائے گی' دیکھیں تو آپ کی سانس ذرا سا بولنے سے کتنی پھول رہی ہے۔" میں نے اس کے سینے کو آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے کہا۔

"بس بیٹا اپنا گھر بساؤ اور اپنی زمینوں کو سنبھالو' منشی سے پچھلے پانچ سال کا حساب لے لینا۔ پتا نہیں وہ کیا کر رہا ہے اور کیا نہیں میں تو کسی قابل نہیں رہا۔" وہ پھر بولا۔

"میں سب دیکھ لوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ بس اب آرام کریں۔ میں چلتا ہوں بہت لمبے سفر سے آ رہا ہوں تھک گیا ہوں آرام کروں گا۔" میں یہ کہتے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ رانی کمرے میں داخل ہوئی۔

اس نے شرما کر مجھے دیکھا پھر اپنے باپ کے پُر مسرت چہرے کی جانب دیکھا اس نے بیٹی کو سینے سے لگانے کے لیے اپنے بازو پھیلائے تو وہ بھاگ کر باپ کے سینے سے لگ گئی۔

"میری بچی!" وہ پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا' میں بھی رک کر یہ جذباتی منظر دیکھنے لگا پھر وکرم رانی سے بولا۔

"جاؤ بیٹا بلرام کو اس کے کمرے میں لے جاؤ۔ وہ لمبے سفر سے آ رہا ہے۔ اشنان کرے گا' پھر آرام کرے گا اتنے تم بھوجن کی تیاری کرواؤ اور منشی سے کہو کہ آج رات کا بھوجن سب کے گھروں میں حویلی سے جائے گا۔ دیگیں چڑھوا دو' آج کسی کے گھر چولھا نہ جلے' آج برسوں بعد اس حویلی کا سپوت آیا ہے۔ اس حویلی کی روٹھی خوشیاں لوٹ آئی ہیں۔"

"جی پتا جی!" رانی نے خوشی سے بل کھا کر کہا تو میں مسکرانے لگا۔

رانی مجھے اپنے ساتھ لے کر اس کمرے میں آئی جس میں بلرام کا قد آور پورٹریٹ لگا تھا۔

"میں نے اشنان گھر میں گرم پانی رکھوا دیا ہے۔ آپ اشنان (غسل) کر لیں۔ میں بھوجن پروستی ہوں۔" رانی نے کہا۔

"تم نے آج تک میرے ککش کو اسی طرح رکھا

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

ہوا ہے۔ جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔'' میں نے واپس جاتی ہوئی رانی کی کلائی تھام کر پیار بھرے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے لجا کر آنکھیں جھکا لیں۔ پھر اس کے چہرے پر شرم کی جگہ حزن نے لے لی اس کے لب کپکپانے لگے وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بہ مشکل تھوک نگل کر بولی۔

''جن کا انتظار ہر لمحے آنکھیں کرتی ہیں' ان چیزوں کو اسی طرح سینت کر رکھا جاتا ہے۔ آنکھ سے دور ہونے والے دل سے دور تھوڑے ہوتے ہیں۔ آپ کو شاید ہمارا ساتھ منظور ہی نہیں تھا۔ جب ہی تو سگائی ہوتے ہی آپ ایسے گئے کہ گھر کا رستا ہی بھول گئے۔''

''میں نہیں آیا تھا تو تم کسی اور سے شادی کرلیتیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا تو اس نے تڑپ کر میری جانب شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں مجھ سے بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ بہت سے شکوے تھے ان میں اور میری جانب تکتے اس کی آنکھوں میں ڈھیروں پانی تیرنے لگا۔ پھر اس نے ایک کرب کے عالم میں اپنی پلکوں کی جھالر کو دھیرے سے گرالیا تو آنکھوں میں تڑپتا نمکین پانی بے قرار ہو کر باہر نکل آیا۔

''رانی!'' میں نے بے ساختہ اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا اور میرا یہ عمل میرے پلان کا حصہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک اضطراری عمل تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ رانی بلرام سے کتنی زیادہ محبت کرتی ہے مجھے ایک بار پھر شدت سے ماہین کا خیال آگیا۔ میں نے اپنے دونوں بازو اس کے گرد حمائل کر دیے اور اپنے لب اس کے مہکتے بالوں میں رکھ دیے۔ وہ میرے سینے میں جیسے جذب ہوتی جارہی تھی۔

''مجھے معاف کردو میں نے تمہیں دوری اور جدائی کے عذاب میں مبتلا کیا ہے۔ بہت دکھ دیا ہے۔ اگر تم مجھ سے اتنا پیار کرتی ہو تو میں بھی تو تمہیں اتنا ہی پیار کرتا ہوں۔ کتنی ہی راتیں میں نے تمہارے بن جیسے کانٹوں پر سو کر گزاری ہیں۔ کتنی ہی حسیں تمہارے ملیح چہرے کے دیدار کے لیے اپنی آنکھیں کھولیں ہیں۔ پل پل تڑپا ہوں۔ مر مر کے جیا ہوں اور جی جی کے مرا ہوں۔ آج اب ہم دوبارہ سے جو یوں ملے ہیں تو کبھی جدا نہ ہوں گے۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ پیار ہے' محبت ہے' تم مجھے اپنے فراق کی کہانی سنانا اور میں تمہیں جدائی کے کرب کی داستانیں سناؤں گا۔ میں تمہیں بہت پیار کرتا ہوں۔ بہت پیار..... تمہارے بنا تو میں ایسا تھا جیسے روح کے بنا جسم' بالکل ٹھنڈا یخ' مگر آج جیسے اس ٹھنڈے یخ وجود کو حرارت مل گئی ہے۔ زندگی کی حرارت' پیار کی حرارت خوشیوں اور مسرتوں کی حرارت.....''

میں اپنی آنکھیں بند کیے اس کے مہکتے بالوں پر اپنے لب رکھے بولے جارہا تھا مجھے خود اس بات کا احساس نہیں تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کیوں کہہ رہا ہوں۔ بس کہے جارہا تھا۔ اظہار محبت اور محبت کی شدتوں کا اظہار کیے جارہا تھا۔ میں تو بس اتنا جانتا تھا کہ ماہین میری بانہوں میں ہے میرا کھویا ہوا پیار مجھے مل گیا ہے۔

پھر میں نے اس کا ملیح چہرہ اس کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر اوپر اٹھایا اور دھیرے سے اس کی فراخ پیشانی کو چوم لیا پھر اس کی بھیگی پلکوں پر اٹکے ہوئے آنسوؤں کو اپنے لبوں سے چن لیا۔ پھر اس کے کشمیری سیب جیسے گالوں کو آہستہ سے چوما اور جب اس کے لبوں پر میرے دہکتے ہوئے لب آئے تو وہ تڑپ کر میری بانہوں سے نکل گئی۔

''نہیں بلرام جی' ابھی نہیں پہلے دودھ ہوجانے

دیں پھر یہ سب کچھ آپ ہی کا ہے۔'' اس نے دھونکنی کی طرح چلتی اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے شرما کر کہا تو میں اک دم ہوش میں آگیا اور مجھے خیال آیا کہ میرے سامنے ماہین نہیں رانی ہے' رانی جو بلرام کی منگیتر ہے اور اس سے پیار کرتی ہے' میں اس کا بلرام بن کر آیا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بھی میرے لیے ماہین بن جائے۔

اس خیال کے آتے ہی میرا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا اس نے میرے چہرے کو دیکھا تو گھبرا کر بولی۔

''آپ ناراض ہوگئے ہیں بلرام جی..... بھگوان قسم ہمارا وہ مطلب نہیں تھا ہم تو بس ایسے ہی بس آپ جلدی سے دودھوا کی تیاری کرلیں اور ہم سے بھی تو نہیں رہا جاتا۔''

''نہیں رانی میں ناراض نہیں ہوں۔ بس یہ سوچ رہا تھا کہ شاید میں کچھ زیادہ ہی کہہ گیا تھا شاید مجھے وہ سب تم سے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔'' میں نے متانت سے کہا۔

''کیوں نہیں کہنا چاہیے تھا۔ جو کچھ آپ نے اپنی زبان سے کہا سمجھ لیں وہی ہمارے من کی آشا اور آواز تھی۔ ایک بات پوچھیں اگر آپ برا نہ مانیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''پوچھو' کیا پوچھنا چاہتی ہو۔'' میں ایک گہری سانس لیتے ہوئے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا واقعی آپ بھی ہمیں اتنا چاہتے ہیں اور اگر اتنا پیار کرتے ہیں تو ہمیں یوں تڑپنے کے لیے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔'' اس نے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سچ ہے کہ میں بھی تم سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں اور میں تمہیں چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ بلکہ ایک ضروری کام سے دہلی گیا تھا۔ مگر وہاں کسی اور کے دھوکے میں ہمیں پولیس نے پکڑ لیا۔ ہمیں جیل ہوگئی تھی ہم پانچ سال سے جیل میں تھے۔''

''ہائے رام!'' جیل کا نام سن کر اس نے جھٹ اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کا منہ اور آنکھیں کھل گئیں۔

''ہاں اب رہائی ملی ہے تو سیدھے اپنی حویلی آئے ہیں۔'' میں کہا۔

''جب ہی آپ کی صحت گری گری رہی ہے۔ رام..... رام! آپ نے کتنا کشٹ اٹھایا ان راکششوں کو معلوم نہیں تھا کہ اصلی مجرم کون ہے؟'' اس نے غصے سے کہا۔

''چھوڑو جانے دو اس بات کو' بس یہ بتاؤ کہ تم نے ہمیں شما تو کردیا ناں۔'' میں نے کہا۔

''اس میں شما مانگنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم چلتے ہیں ذرا رسوئی گھر میں جا کر دیکھیں کہ بھوجن کی تیاری کہاں تک پہنچی۔ اتنے آپ اشنان کر کے تازہ دم ہوجائیں۔'' اس نے کھڑے ہو کر کہا اور چھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئی اس کے باہر جاتے ہی میں بے دم سا ہو کر بستر پر گر پڑا۔ رانی کے سامنے میں نے اپنے روتے ہوئے دل کو بڑی مشکلوں سے سنبھالا ہوا تھا۔ بابا صاحب نے منع کیا تھا کہ ماہین کے بارے میں سوچنا بھی مت' مگر یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ماہین کی شکل کی ایک لڑکی جو دن رات میری آنکھوں کے سامنے رہے گی مجھ سے اظہار الفت بھی کرے گی اور میں ماہین کے بارے میں سوچوں بھی نہیں۔

میں کیا کروں اس دل کو کہ جو اسی کے نام پر دھڑکتا ہے۔ میرے دل میں کل بھی ماہین کا خیال تھا آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا دل میں کیا ہے اس سے یا تو انسان خود واقف ہوتا ہے یا اس کا رب' اس

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

لیے میں دل مین ماہین کے بارے میں سوچتا ہوں بابا صاحب کو کیسے پتا چلے گا۔ وہ کوئی دلوں میں چھپے بھید سے تھوڑی واقف ہیں۔ میں تھوڑی دیر اور تصور میں ماہین سے باتیں کرتا رہا پھر اُٹھ کر نہانے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔ میں یہاں ایک بار پہلے بھی آچکا تھا۔ مگر وہ دوسرا کمرہ تھا اس کمرے کو تو مجھے شمشیر دکھانے کے لیے لایا تھا۔

شمشیر کا خیال آتے ہی مجھے خیال آیا کہ جب سے میں یہاں آیا ہوں شمشیر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ میں تو بگھی سے اُتر کر حویلی میں آگیا تھا۔

نہا کر آیا تو میں نے شمشیر کو آہستہ سے آواز دی۔ جواب میں مجھے اس کی سرگوشی سنائی دی۔

"لیں باس! ختم ہوگیا تمہارا رومانس دیکھ لو باس میں کتنے صبر وتحمل سے تمہاری شاندار اداکاری کو دیکھ رہا تھا۔ ویسے باس تم بڑے خوش نصیب ہو ہر جگہ تمہیں کوئی نہ کوئی حسینہ دل بہلانے کو مل ہی جاتی ہے۔ نہ صرف مل جاتی ہے بلکہ تم پر جی جان سے فدا بھی ہو جاتی ہے۔" اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"بکواس مت کر! تجھے اندازہ ہے اس بات کا کہ بابا صاحب نے مجھے بلرام بنا کر کتنے بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے اوپر سے یہ حکم کہ اس کے بارے میں سوچو بھی مت۔" میں نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

"تم نے دیکھا تو ہوگا باس کہ سونا بھٹی میں تپ کر ہی کندن بنتا ہے۔ بس یوں ہی سمجھ لو بابا صاحب تمہیں عشق کے امتحان کی بھٹی میں تپا کر کھوٹ علیحدہ کر کے کھرا بنا رہے ہیں۔" شمشیر نے سیانوں والے لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے میں شمشیر کی بات کا کوئی جواب دیتا کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو شمشیر بولا۔

"باس آرہی ہے تمہاری معشوقہ رانی' اب تم اسے سنبھالو میں چلا۔"

"ابے جا کہاں رہا ہے یہیں رہ میرے پاس۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"یہیں ہوں کہیں نہیں جا رہا بس غائب ہو رہا ہوں۔" شمشیر نے کہا اور غائب ہوگیا۔

اتنے میں رانی اندر آگئی میں آئینے کے سامنے کھڑا بالوں میں کنگھا کر رہا تھا۔ میرے بال کافی بڑے تھے اور ان کو سنوارنے کے لیے مجھے دیر تک کنگھا کرنا پڑا۔

"آیئے بلرام جی بھوجن تیار ہے۔" رانی نے مجھ سے کہا تو میں کنگھا رکھ کر رانی کے ساتھ باہر نکل آیا۔

کھانے میں رانی نے بہت زیادہ اہتمام کیا ہوا تھا۔ وہ بہت زیادہ خوش تھی ایک ایک چیز مجھے اُٹھا اُٹھا کر دے رہی تھی، میں نے نوٹ کیا کہ کھانے میں پنیر سے بنی ہوئی بہت سی ڈشز تھیں جو اس نے بہ طور خاص بلرام کے لیے بنوائی تھیں اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بلرام کو پنیر بہت زیادہ پسند ہے۔ جب کہ اس کے برعکس مجھے پنیر کا ذائقہ زیادہ پسند نہیں تھا۔ مگر میں دل پر ضبط کر کے ناپسندیدگی کے باوجود ساری ڈشز ٹرائی کر رہا تھا۔ اب مجھے بابا صاحب کی حکمت عملی سمجھ میں آئی کہ انہوں نے مجھے رانی کی حویلی میں بلرام بن کر رہنے کے لیے کیوں کہا ظاہری بات ہے یہاں رہ کر مجھے بلرام کی پسند ناپسند اور عادات وخصلت کے بارے میں اچھی طرح سے پتا چل جائے گا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر میں کوئی غلطی کروں گا یا بلرام کے مزاج کے خلاف یا اس کے الٹ کوئی بات کروں تو رانی ضرور مجھ سے استفسار کرے گی تب میں سیدھا سا یہ بہانہ کردوں گا کہ کیوں کہ میں نے پانچ برس جیل میں گزارے ہیں اور مجھ پر ذہنی اور جسمانی بہت ٹارچر ہوا ہے اس لیے

بہت سی چیزیں بار بار بھول جاتا ہوں۔ یا پھر یہ کہ میری عادت ومزاج بدل گیا ہے۔ اب بلرام دہلی میں کن بری خصلتوں کا شکار تھا اس کے بارے میں مجھے بابا صاحب نے اپنی ہتھیلی کو اسکرین بنا کر دکھا ہی دیا تھا۔ وہ ساری بُری عادتیں میں یہاں شو نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تو مجھے اپنے آپ کو رانی کا عاشق اور چاہنے والا ظاہر کرنا ہے۔ یہاں مجھے کب تک قیام کرنا ہے۔ اس کے بارے میں بھی مجھے بابا صاحب ہی کے حکم کا انتظار تھا۔

رانی نے مجھے جی بھر کر کھلایا یہاں تک کہ میرے پیٹ میں مزید کھانے کی گنجائش نہیں رہی۔ تب میں دسترخوان سے اُٹھ گیا اور کہا کہ مجھے نیند آرہی ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔ تو رانی نے کہا کہ آپ اپنے کمکش میں جا کر سو جائیں باقی باتیں رات کو ہوں گی۔ تو میں اُٹھ کر بلرام کے کمرے میں آگیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ پیٹ بھر جانے کے بعد واقعی مجھے زبردست نیند آرہی تھی اور ویسے بھی میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ جنگل میں بابا صاحب کے ساتھ پوری رات ہی گزر گئی تھی پھر وہاں فجر کی اذان اور نماز کا وقت ہوگیا تو میں نے اور شمشیر نے نماز ادا کی اور پھر میں یہاں آگیا۔

بستر بہت آرام دہ اور نرم وگداز تھا۔ اس پر ریشم کی چادر اور نرم گدا تھا۔ میں جیسے ہی اس پر لیٹا میری آنکھوں میں گہری نیند اُتر آئی اور آنکھیں خود بخود بند ہونے لگی۔ تب مجھے شمشیر کی آواز سنائی دی۔

"میں معذرت چاہتا ہوں باس' بس ایک منٹ میری بات سن لو پھر اطمینان سے سو جانا۔" شمشیر کی آواز سن کر میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ مجسم میرے سامنے کھڑا تھا۔

"بعد میں بات کر لینا یار اس وقت مجھے زبردست نیند آرہی ہے۔" میں نے نیند کے خمار سے بوجھل لہجے میں کہا تو وہ بولا۔

"مجھے پتا ہے کہ تمہیں نیند آرہی ہے بابا صاحب کا حکم ہے اس لیے فوری تمہیں بتانا ہے۔"

بابا صاحب کا نام سنا تو میری نیند یک لخت غائب ہوگئی اور میں پوری طرح الرٹ ہوگیا اور کہا۔

"ہاں ہاں بولو کیا حکم ہے بابا صاحب کا؟"

"بابا صاحب نے کہا ہے کہ شاہ زیب کو وہاں عیش وعشرت کے لیے نہیں بھیجا ہے۔ یہاں اسے اور بھی دوسرے بگڑے ہوئے کام کرنے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہاں کے منشی نے رانی کی زمینوں کے معاملات میں بہت الٹ پھیر اور گڑ بڑ کر رکھی ہے۔ تمہیں منشی سے گزشتہ پانچ برسوں کا حساب مانگنا ہے اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرنا ہے دوسری اور اہم بات یہ کہ یہاں رہ کر تمہیں بلرام کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت زیادہ مدد ملے گی۔ اس لیے اپنی آنکھیں اور کان کھول کر رکھنا اس کے علاوہ تمہیں یہاں ایک فوٹو البم ملے گی جس میں بلرام کے بہت سے دوستوں کی تصاویر ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو بلرام کے ساتھ دہلی میں ہیں۔ تم جب سو کر اُٹھ جاؤ گے تب میں تمہیں ایک ایک کے بارے میں بتاؤں گا۔ ان سب کے نام اور ان کے کاموں کے بارے میں۔" شمشیر نے مجھے تفصیل سے بتایا۔

"ٹھیک ہے شمشیر میں ہر بات کا خیال رکھوں گا۔ اب سو جاؤں۔" میں یہ سمجھا کہ پتا نہیں کیا بات ہے مگر بابا صاحب کے احکامات تو یہیں کے بارے میں تھے۔

"ٹھیک ہے باس تم سو جاؤ۔ میں ذرا سر سوتی کے دیدار کے مزے اٹھالوں۔" اس نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ بہت دنوں بعد شمشیر اپنی پرانی جون

www.pkdigest.com

Pdf by Readings

میں مجھے دکھائی دیا۔

"یار تو بھی خوب ہے ہر جگہ اپنا کانٹاٹ کر لیتا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا کروں باس' تم تو سو رہے ہو اور میں بور ہو رہا ہوں اور ویسے بھی تمہارا دل بہلانے کے لیے رانی موجود ہے تو پھر میں نے سوچا کہ خادم کو خادمہ سے ہی دل بہلانا چاہیے۔"

"تو پکا آوارہ اور بدمعاش ہو گیا ہے اور تو نے یہ کیوں کہا کہ میں دل بہلا رہا ہوں۔ میں کوئی دل ول نہیں بہلا رہا وہ تو بابا صاحب کا حکم ہے اس لیے یہ سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے۔" میں نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

"خوب سمجھتا ہوں میں تمہیں باس' بابا صاحب کا تو بہانہ ہے ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ ہے۔ اچھا یہ بتاؤ اگر تم دل نہیں بہلا رہے تو تھوڑی دیر پہلے کیا ہو رہا تھا۔ جب رانی تمہارے سینے سے لگی تھی۔ اگر وہ خود تمہاری شدتوں سے گھبرا کر پیچھے نہ ہٹ جاتی تو تم تو لگ گئے تھے کام سے.....!" اس نے اپنی گول گول آنکھیں شرارت سے نچاتے ہوئے کہا۔

"دفع ہو جا یہاں سے۔" میں نے جھینپ کر اپنا ہاتھ اسے مارنے کے لیے گھمایا مگر میرا ہاتھ اس کے جسم سے پار ہو گیا تو وہ ہنسنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کیا تم مجھے جانتے نہیں ہو کہ میں کیا کیا کر سکتا ہوں۔

"اب جا دفع ہو جا اور جا کر اپنی سرسوتی کو بیٹھا تکتا رہ۔" میں نے تکیے پر سر رکھ کر کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

"آہ..... ہا! میں اس حسینہ کو تکنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ ہاتھ لگا نہیں سکتا۔" اس نے احمقانہ افسردگی اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور غائب ہو گیا۔

اور مجھے ہنسی آ گئی پہلے یہ روبن سے عشق لڑا رہا تھا۔ اب یہاں سرسوتی کے پیچھے لگا ہے۔ سرسوتی رانی کی خاص ملازمہ تھی اور ہر دم اس کے ساتھ رہتی تھی خوش شکل اور جوان تھی چھریرے جسم کی سانولی رنگت والی سرسوتی واقعی پرکشش تھی اس کے انگ انگ سے جوانی کی مستی چھلکتی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں تھیں اور کافی گھنے اور لمبے بال تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر میری جگہ اس وقت سچ مچ بلرام آ جاتا تو سرسوتی غریب ضرور اس کی درندگی کا نشانہ بن جاتی کیوں کہ وہ خاصا عیاش آدمی تھا۔

میرے ذہن کے پردے پر روبن کا تصور بھی لہرایا میں دیکھ رہا تھا کہ وہ میری یوں اچانک گمشدگی سے کتنی زیادہ پریشان تھی اس کا گلاب جیسا چہرہ کملایا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تھے اور ہونٹ خشک پپڑی زدہ تھے۔ وہ خیالوں میں گم ایک جگہ اپنی نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ یہ سب دیکھتے دیکھتے میں نیند کی گہری وادیوں میں اُتر گیا۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں دیر تک آنکھیں کھولے بستر پر لیٹا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میں حویلی میں ہوں اور دوپہر کا کھانا کھا کر سو گیا تھا۔ پتا نہیں کیا ٹائم ہوا تھا۔ اتنا جانتا تھا کہ رات ہو چکی ہے۔ مگر کتنی رات یہ پتا نہیں چل رہا تھا۔ تب میں نے شمشیر کو پکارا۔ میری پہلی آواز پر اس نے جواب دیا۔

"یس باس! اُٹھ گئے تم۔"

"ہاں یار جب ہی تو تجھے آواز دی ہے کیا ٹائم ہوا ہے۔" میں نے لیٹے لیٹے ہی اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں۔ تم خاصی دیر سو لیے۔" اس نے کہا۔

"اچھا ڈرالائٹ تو آن کر اتنا اندھیرا ہے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔" میرے کہنے کی دیر تھی کہ کمرے میں روشنی پھیل گئی میرا دل چاہا کہ میں غسل کروں۔ سو کر اُٹھنے کے بعد غسل کرنے کی میری پرانی عادت تھی اس طرح میں پوری طرح فریش ہو جاتا تھا۔

میں غسل کر کے آیا تو شمشیر نے ڈریسر پر سجے ڈھیر سارے پرفیوم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"باس یہ والا پرفیوم لگاؤ بلرام اسی کو استعمال کرتا ہے۔"

میں نے پرفیوم کی شیشی اُٹھائی اور اس کا نام پڑھا اور ڈھیر سارا پرفیوم اپنے اوپر اسپرے کر لیا۔

"اب جلدی سے باہر جاؤ۔ رانی بہت بے تابی سے تمہارے جاگنے کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ کم از کم دس چکر اس بند دروازے کے سامنے لگا چکی ہے۔" شمشیر نے کہا تو میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

سامنے سے رانی تیز قدموں سے چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ میرے اوپر نگاہ پڑی تو لمحہ بھر کو ٹھہر گئی۔ شوخ اور پُرمسرت نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور ایک ادا سے بل کھا کر میری جانب بڑھی اور بولی۔

"شکر ہے بھگوان کا آپ اُٹھ گئے ہم تو اتنی دیر میں نہ جانے آپ کے کمرے کے کتنے چکر لگا چکے ہیں۔ اپنے کمرے میں آ کر لگتا ہے آپ کو بہت پر سکون نیند آئی ہے۔"

"ہوں!" میں نے آہستہ سے گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "واقعی' ایسا لگا تھا جیسے کب سے نہیں سویا ہوں۔ اپنے بستر پر لیٹ کر بہت سکون کا احساس ہوا۔"

"ہاں میں یہ بات اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ آپ کو کبھی بھی اپنے بستر کے علاوہ کہیں اور نیند نہیں آتی۔ بھگوان انہیں سمجھے جن لوگوں نے آپ پر اتنے ظلم ڈھائے۔" رانی نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا اور میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ بلرام تو خود ایک ظالم آدمی ہے' اس پر کوئی کیا ظلم کرے گا اس وقت رانی کی زبانی مجھے ایک بات اور علم میں آئی کہ بلرام اپنی عادتوں کا غلام ہے۔

رانی نے مجھ سے رات کے کھانے کے بارے میں پوچھا تو میں نے فی الحال منع کر دیا کہ دوپہر میں تم نے زیادہ کھلا دیا تھا اور پھر میں فوراً ہی سو گیا تھا اس لیے مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔

"کیا آپ ابھی اپنے دوستوں سے ملنے جائیں گے جس جس کو آپ کے آنے کا پتا چل رہا ہے وہ حویلی آ رہا ہے۔ مگر آپ سو رہے تھے اور میں نے آپ کو بے آرام نہیں کیا۔ آپ چاہیں تو جا کر ان سے مل لیں۔ کھانا دیر سے کھا لیجیے گا۔" رانی نے کہا۔ مجھے آج ہی شمشیر نے بلرام کے دوستوں کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ایک البم مجھے دکھائے گا جس میں بلرام کے سارے دوستوں کی تصاویر ہوں گی میں نے ابھی تک انہیں دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس لیے رانی سے کہا۔

"نہیں آج نہیں' آج تو میں تمہارے ساتھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کل ان لوگوں سے ملوں گا۔ آج اور ابھی اگر کوئی بھی آئے تو تم انہیں کوئی بھی بہانہ کر کے ٹال دینا۔" میں نے کہا تو رانی کی آنکھیں ایک بار پھر مسرت سے چمک اُٹھی۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں کہ آپ صرف میری خاطر اپنے دوستوں سے نہیں ملنا چاہتے۔" اس نے کہا۔

"تمہیں میری محبت پر کوئی شک ہے کیا.....؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

"ہاں یقین نہیں آتا۔" اس نے نگاہیں جھکا کر دھیرے لہجے میں کہا۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ کہ تمہیں کس طرح سے میری محبت کا یقین آئے گا۔" میں نے کہا تو اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر خود ہی شرما کر سر جھکا کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

"میری محبت کا ثبوت چاہیے' دوپہر کو جو کچھ کہا وہ کافی نہیں تھا۔" میں نے اسے بازوؤں سے تھام کر کہا تو وہ بری طرح لجا گئی۔ میرا ذہن ایک بار پھر ماہین کی جانب چلا گیا۔ رانی کی جگہ ماہین نے لے لی اور میں اس کی اس شرمانے کی ادا پر بری طرح مرمٹا تھا اور میں نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں اس کے حسین چہرے کو تھام لیا اور اس کے چہرے پر جھک گیا۔ اس نے حیا سے آلودہ نگاہیں اٹھا کر ایک نظر مجھے دیکھا پھر اپنی آنکھیں جھکا لیں اور میں نے اپنے لبوں سے اس کے حسن کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا اور پھر وہ بے خود ہو کر میرے سینے سے آن لگی۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہی تھی۔

"بلرام جی ہمیں بس آپ چاہیں ہم نے آپ کی بہت پرتیکشا (انتظار) کی ہے۔ ہمیں تو یوں لگا تھا جیسے ہماری سانسیں تھم جائیں گی اور آپ نہیں آئیں گے اور یہ ہمارے پیار کی شکتی ہی تھی کہ آپ ہمارے پاس لوٹ آئے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو رانی تمہارے پیار کی شکتی ہی ہمیں تمہارے پاس واپس لے آئی ہے اب میں تم سے کبھی بھی دور نہیں جاؤں گا۔ کبھی بھی نہیں۔" میں نے اسے بانہوں میں تھامے تھامے کہا۔

"واقعی!" اس نے میرے سینے سے سر اٹھا کر پُر مسرت لہجے میں کہا۔

"جس کو تمہارے جیسا حسین اور اتنا چاہنے والا جیون ساتھی مل جائے وہ بھلا تم سے دور جانے کا تصور بھی کر سکتا ہے۔" میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"تو بس پھر جلدی سے ہمارے اور اپنے ودھوا کی تیاری شروع کر دیں۔ آپ سے یہ دوری اب ہم سے بھی برداشت نہیں ہو رہی۔" اس نے میری بانہوں کے حصار سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا دل چاہتا ہے تمہارا۔" میں نے دوبارہ اس کی کلائی تھام کر کہا۔ "یہی کہ اسی طرح ہمارے سینے سے لگی رہو اور ہم تمہارے حسن کو اس طرح سراہتے رہیں۔" میرا لہجہ خود بخود شوخ ہو گیا۔

"بلرام جی آپ بہت بے شرم ہیں۔" اس نے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے کہا۔

"ابھی کہاں بے شرم ہوئے ہیں ابھی تو سب کچھ شرم کے دائرے میں ہی ہے ذرا ہمارا اور اپنا ودھوا ہو جانے دو پھر دیکھنا....." اس نے میرا جملہ بھی پورا نہیں سنا اور تیزی سے وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

اس کے وہاں سے جاتے ہی میں پوری طرح اپنے حواسوں میں آ گیا۔ میں نے غصے اور جھلاہٹ میں زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا کہ رانی کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر میں کیوں اپنے ماضی میں چلا جاتا ہوں۔ کیوں اسے اپنی ماہین سمجھنے لگتا ہوں۔ وہ رانی ہے بلرام کی منگیتر وہ مجھ سے بلرام سمجھ کر محبت کی باتیں کرتی ہے کہیں میں اس کی سادگی سے ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھا رہا۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا پھر میرے دل نے جواب دیا کہ رانی سے اظہار محبت کرنا ضروری ہے کیوں کہ اس کی بلرام سے شادی ہونے والی ہے۔ یہ اک سچی اور معصوم لڑکی ہے اور اس نے پورے خلوص سے اسے چاہا ہے اگر میں اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دوں گا اس کا

معصوم دل ٹوٹ جائے گا۔

رانی کے جانے کے بعد میں پائیں باغ کی جانب نکل گیا اور وہاں ٹہلتے ہوئے یہ ساری باتیں سوچنے لگا' یہاں حویلی کے اندر سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی ہے۔ اچانک میرے کانوں میں دو آدمیوں کی باتیں کرنے کی مدھم آوازیں آنے لگیں تو میں ان آوازوں کی سمت مڑ گیا۔ تب ہی میں نے وہاں دو آدمیوں کو کھڑے ہوئے دیکھا جو آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ شاید یہ حویلی کے ملازمین میں سے تھے۔ میں خاموشی سے ان کی باتیں سننے لگا' وہ کہہ رہے تھے۔

"اب تو چھوٹے سرکار واپس آ گئے ہیں۔ اب منشی جی کو پتا چلے گا وہی سب کے مائی باپ بنے بیٹھے تھے۔ رانی صاحبہ نے تو ان سے کبھی حساب لیا ہی نہیں' منشی جی نے زمینوں کی جو آمدنی کی اور انہیں دی انہوں نے لے لی۔ میں جانتا ہوں انہوں نے زمینوں کے معاملے میں بھی کافی ہیر پھیر کی ہے اور تمہیں پتا ہے رامو کاکا کی دھنتی کے اوپر تو دانت گاڑے وہ بڈھا بیٹھا تھا۔ دھنتی نے مجھے خود بتایا تھا کہ رامو کاکا نے منشی جی سے کچھ رقم ادھار لی تھی اور جب وہ وقت پر رقم واپس نہ کر سکے تو اس بڈھے نے کہا کہ میرا ودھوا دھنتی سے کر دو' پر دھنتی نے بھی رامو کاکا کو دھمکی دے دی کہ وہ کنویں میں کود کر اپنی جان دے دے گی مگر اپنے دادا جی کی عمر کے اس بڈھے سے ودھوا نہیں کرے گی دھنتی تو صرف مجھ سے پیار کرتی ہے' مگر وہ راکشش ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ بات چھوٹے سرکار کو بتا دوں پر بابو رام مجھے ان سے بڑا ڈر لگتا ہے' اتنے دنوں کے بعد لوٹے ہیں۔ پتا نہیں اب ان کا مزاج کیسا ہو گیا ہے۔ ذرا کچھ دن ٹھہر کر بات کروں گا۔"

"ڈرنے کی کیا بات ہے رگھویر مجھے تو چھوٹے سرکار بڑے بھلے آدمی دکھے ہیں پر تو ٹھیک بول رہا ہے ذرا اک دو روز ٹھہر جا پھر بھلے بات کر لینا اور اس بڈھے منشی کی بھی ساری پول پٹی کھول دینا۔" دوسرا آدمی جس کو رگھو نے بابو رام کہہ کر مخاطب کیا تھا بولا۔

اور پھر وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے وہاں سے آگے چلے گئے اور میں سوچنے لگا کہ واقعی یہ منشی تو بڑا گڑبڑ آدمی لگتا ہے اس کو دیکھنا ہی پڑے گا' مگر کل کیوں کہ آج رات میں ان تمام لوگوں کی معلومات شمشیر سے لینے والا تھا۔ مجھے باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی اس لیے میں حویلی کے اندر چلا گیا۔ جہاں رات کا کھانا تیار تھا۔ میں نے کھانا کھایا کچھ دیر رانی سے بات چیت کی اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں کمرے میں آیا ہی تھا کہ رانی میرے پیچھے آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں کچھ کپڑے تھے میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

"بلرام جی ہم آپ کے سوتے وقت پہننے والے وستر (کپڑے) لے کر آئے ہیں۔"

"ارے تم نے کیوں تکلیف کی سرسوتی کے ہاتھ بھیج دیے ہوتے۔" میں نے کپڑے اس کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں آپ کو ہمارا آنا اچھا نہیں لگا۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم آپ کے سارے کام اپنے ہاتھوں سے کریں۔" اس نے کہا۔

"تمہارا آنا برا نہیں بلکہ بہت اچھا لگا ہے مگر رات کی تنہائی اور تمہارے اس حسین ساتھ کو دیکھ کر اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے کہیں ہم سے تمہارے حسن کی شان میں مزید گستاخی نہ ہو جائے۔ اس لیے لمحہ بھر دیر لگائے بغیر فوراً یہاں سے چلی جاؤ' ورنہ ہم ابھی.....!" میں نے شوخ لہجے میں کہا تو وہ ہنستی ہوئی

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

کمرے سے باہر نکل گئی۔ مگر فوراً ہی پلٹ کر آئی اور دروازے سے ہی بولی۔

"بھگوان کی سوگند اب آپ کی ایسی باتوں کی وجہ سے ہم رات بھر سو نہیں سکیں گے۔"

"نیند تو ہمیں بھی نہیں آئے گی۔ پھر تم ایسا کرنا کہ یہیں آجانا دونوں مل کر رت جگا منائیں گے۔" میں نے کہا تو وہ ہنسی کی پھلجڑیاں بکھیرتی ہوئی لوٹ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ پلٹ کر آئے میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ مجھے شمشیر سے بات کرنے کی بے چینی ہو رہی تھی۔ میں وہ تصویروں والا البم جلد از جلد دیکھنا چاہتا تھا۔ دروازہ بند کر کے میں جیسے ہی پلٹا میری نگاہ شمشیر پر پڑی۔ وہ رہتا تو ہر لمحے میرے ساتھ تھا مگر میرے سامنے ظاہر تنہائی میں ہی ہوتا تھا۔ مجھے دیکھ کر شرارت بھرے لہجے میں بولا۔

"شکر ہے باس تم نے دروازہ بند کردیا۔ ورنہ مجھے کمرے سے باہر جانا پڑتا کیوں کہ مجھے بڑی شرم آرہی تھی۔"

"پھر شروع ہوگئی تیری بکواس!" میں نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

"کیا کروں باس تم تو تھوڑی سی دل لگی بھی نہیں کرنے دیتے۔" اس نے منہ پھلا کر کہا۔

"اچھا اب زیادہ ناراض ہونے کی اداکاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں نہیں تجھے منانے والا۔" میں نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا اور اپنے دونوں بازو موڑ کر سر کے نیچے رکھ لیے۔

"ہاں ہاں تم کیوں مجھے منانے لگے میں تمہارا لگتا ہی کیا ہوں صرف ایک خادم ہی ناں!" اس نے خالص عورتوں والے انداز میں لڑتے ہوئے کہا تھا۔ مجھے ہنسی آگئی اور میں نے کہا۔

"بکواس نہیں کر تو میرا خادم نہیں بلکہ دوست ہے ایک ایسا مخلص دوست جس کے خلوص کا جواب دینا میرے بس میں نہیں۔" پھر میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "یار شمشیر تو جس طرح میرا ساتھ دے رہا ہے اور پہلے بھی دیا ہے میں تیرے احسانوں کا بدلہ اتارنا بھی چاہوں تو نہیں اُتار سکتا۔ تُو نے صرف میری خاطر بابا صاحب کی حکم عدلی کی ان کو ناراض کیا اور سزا بھی پائی۔ ہمارے انسانوں میں ایسے دوست کہاں۔"

"ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ تو نہ کرو۔ بس باس میں آیا تو تمہارے پاس بابا صاحب کے حکم سے تھا مگر اب تو تم سے ایسی محبت ہوگئی ہے کہ میں تم سے دور نہیں جا سکتا مگر تم نے ایسا کیوں کہا کہ انسانوں میں ایسے دوست نہیں ہوتے۔ تم واقعی خوش نصیب ہو کہ تمہیں پُر خلوص دوست ملے ہیں عادل بھائی، روبن اور جہانگیرہ تمہارے ایسے دوست ہیں جو تمہارے لیے اپنی جان بھی دے سکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر تو تمہاری "وہ" آج بھی صرف تمہارا پیار اپنے دل میں بسائے بیٹھی ہے تمہیں پتا ہے۔" اس نے بہت پُر جوش انداز میں کہا۔ پھر فوراً ہی بولا۔ "خیر چھوڑو۔"

"مجھے کیا نہیں پتا؟ شاید تو اس کے بارے میں کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔ بتانا رک کیوں گیا۔" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں باس! دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔" اس نے فوراً ہی بات کو گول کردیا اور اپنا ہاتھ آگے کیا تو اس میں ایک فوٹو البم تھی۔ وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک کر بیٹھ گیا اور البم بیڈ پر رکھ کر کھول دی تو میں بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے وہ بات جاننے کی ضد نہیں کی کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اسے

www.pkdigest.com

اس کے بارے میں کچھ بھی بتانے کی اجازت نہیں ہے اور میں اس سے ضد کر کے کسی نئی پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

شمشیر کی لائی ہوئی اس البم میں بہت ساری تصاویر تھیں۔ اس گاؤں میں موجود بلرام کے رشتہ داروں اور دوستوں کی تصاویر تھیں۔ شمشیر مجھے سب کے نام اور ان کے بلرام سے رشتے بتاتا جا رہا تھا۔ اس نے مجھے بلرام کے ماں باپ کی تصاویر بھی دکھائیں کہ اگر حویلی میں مجھے ان کی تصاویر دکھائی دے جائیں تو میں ان کے بارے میں کسی سے نہ پوچھ بیٹھوں کہ یہ کون ہیں۔ آخر میں دہلی میں بلرام کے ساتھیوں کی تصاویر تھیں۔ ان میں ایک جوان اور حسین تتلی کی تصویر بھی تھی۔ اس کے بارے میں شمشیر نے بتایا کہ یہ بلرام کی داشتہ ہے اور زیادہ تر اس کے گلے کا ہار بنی رہتی ہے پھر ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔

"باس تمہارے تو یہاں بھی خوب مزے ہوں گے۔ اب تم اس حسینہ کے ساتھ موج مستی کرو گے۔"

"تو ایسا کر کہ بلرام کی شکل اختیار کر کے اس کی جگہ چلا جا۔ موج مستی بھی کرلینا۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ہم ایسا ہی تو نہیں کر سکتے باس! اگر ایسا ہی کرنا ہوتا تو بابا صاحب تم سے یہ کام کیوں کرواتے ہم لوگ ہی کر لیتے مگر انسانوں کے کام انسانوں ہی کو کرنا زیب دیتا ہے۔ ہم تو اپنے دینِ اسلام کے نام پر اس کارِ خیر میں تمہاری مدد کر رہے ہیں۔" شمشیر نے سنجیدگی سے کہا تو میں خاموش ہوگیا۔

ساری تصاویر دکھانے کے بعد شمشیر نے البم بند کردی اور بولا۔ "تم نے سب کی شکلیں اور نام ذہن نشین کرلیے ہیں ناں۔"

"کر تو لیے ہیں لیکن اگر کسی کی شکل اور نام ذہن سے نکل بھی گیا تو تو کس لیے ہے تو بتائے گا مجھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔" شمشیر نے کہا میں نے دیکھا کہ البم اس کے ہاتھوں میں نہیں تھی۔

"ارے البم کہاں گئی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟ یہ رہی۔" اس نے کہا تو مجھے البم دوبارہ اس کے ہاتھوں میں نظر آنے لگی۔

"یار تو بھی زبردست شے ہے چیزوں کو پل بھر میں غائب کر دیتا ہے پل میں لے آتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کاش میں سرسوتی کو بھی غائب کر کے اپنے ساتھ لے جاتا۔" اس نے پھر پکے عاشقوں والے انداز میں کہا تو میں ہنس پڑا۔ اور اسے کہا کہ وہ اب جائے اور مجھے سونے دے تو شمشیر غائب ہوگیا اور میں سونے لیٹ گیا۔

"باس ایک اہم بات تو تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔" میں نے شمشیر کی آواز سن کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"اب کیا ہے یار!" میں نے کہا۔

"باس اس مندر کے پاس بنے چبوترے پر جہاں تم بیٹھا کرتے تھے بہت سے لوگ آرہے ہیں تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ لوگوں کے منہ در منہ تمہاری کرامات کی شہرت کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ لوگ وہاں گھنٹوں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں بلکہ کچھ لوگ تو تمہیں تلاش بھی کر رہے ہیں۔ بہت دکھی لوگ ہیں سب کے اپنے اپنے مسائل ہیں وہ حل کروانے کے لیے تمہارے پاس آنا چاہ رہے ہیں اور تم یہاں بلرام بنے بیٹھے ہو۔"

"آنے دو یار میں کیا کروں..... لوگ بھی کتنے آسان راستے ڈھونڈتے ہیں اپنے مسائل کے حل

Pdf by Roadsign

کے لیے اللہ سے رجوع نہیں کرتے ہم جیسے گناہ گاروں کے پاس آتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ کیا ہندو' کیا مسلمان سب کا یہ حال ہے۔" شمشیر نے کہا اور غائب ہو گیا۔

میں نے ایک بار پھر سونے کے ارادے سے اپنی آنکھیں موند لیں۔ ساری رات پھر کسی نے مجھے ڈسٹرب نہیں کیا اور میں پُرسکون نیند سوتا رہا۔

دوسری صبح ناشتے سے فارغ ہو کر میں حویلی کی بگھی میں سوار ہو کر گاؤں کی سیر کے لیے نکل گیا۔ راستے میں بلرام کے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ میں بلرام کی حویلی میں بھی گیا۔ یہ حویلی رانی کی حویلی سے قدرے چھوٹی تھی۔ یہاں صرف ملازمین ہی رہتے تھے۔ اسی حویلی میں منشی بابو رام چند بھی رہتا تھا۔ مجھے حویلی میں آتا دیکھا تو بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں منشی کو کیا کہہ کر مخاطب کروں بلرام پتا نہیں اس کو کیا کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ میں نے منشی کے چہرے کی جانب دیکھا اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں میں نے سرگوشی میں شمشیر سے پوچھا تو اس نے کہا۔

"بلرام اس کو منشی کہہ کر بلاتا تھا اور رعونت بھرے لہجے میں بات کرتا تھا۔"

"کیا حال ہے منشی تیرا؟" میں نے بارعب لہجے میں پوچھا۔

"جی رہا ہوں۔ سرکار کی سلطنت میں!" اس نے ہاتھوں کو جوڑے جوڑے سارے دانت نکال کر خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔

"ہوں.....!" میں نے صرف ہنکاری بھرنے پر ہی اکتفا کیا۔ پھر کہا۔

"آج شام کو بڑی حویلی میں پچھلے پانچ برسوں کا سارا کھاتہ لے کر آجانا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی اور واپس مڑ گیا۔ تب مجھے اپنے کان میں شمشیر کی سرگوشی سنائی دی۔

"ذرا پیچھے مڑ کر ایک نگاہ منشی کو تو دیکھو تم نے تو اس کی دھوتی ہی گیلی کر دی۔ کھڑا تھر تھر کانپ رہا ہے۔"

"واقعی!" میں نے ہنستے ہوئے کہا مگر مڑ کر نہیں دیکھا اور بڑی حویلی واپس آ گیا۔

شام کو میں منشی کا انتظار ہی کرتا رہا مگر وہ نہیں آیا تب میں نے اسے بلانے کے لیے ایک آدمی کو بھیجا تو اس نے آ کر بتایا کہ منشی تو بستر پر پڑا ہائے ہائے کر رہا ہے۔ اسے تیز بخار ہے۔ میں سمجھ گیا کہ منشی کو اپنی شامت صاف دکھائی دے رہی ہے۔ اس لیے وہ بخار کا بہانہ کر کے پڑا ہے۔ آخر کب تک! آج نہ سہی کل سہی میں ٹہلتا ہوا اپنے کمرے سے بائیں باغ کی جانب جا رہا تھا۔ تب میں نے حویلی کی ساری ملازماؤں کو ایک جگہ اکٹھا کھڑے باتیں کرتے دیکھا سب کے چہروں پر تشویش کے آثار تھے۔ اور وہ دبی دبی آواز میں ایک دوسرے سے بات کر رہی تھیں۔ میں اسی جگہ ٹھہر گیا اور سرسوتی کو آواز دی۔

"سرسوتی ذرا ادھر تو آؤ۔"

"جی چھوٹے سرکار حکم!" وہ ایک ہی آواز میں تیزی سے میرے نزدیک آ گئی اور دونوں ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی والی بات لگتی ہے تم سب یہاں ایک جگہ کھڑی ہو۔ اور سب ہی کے چہروں پر پریشانی ہے۔" میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"وہ جی..... وہ چھوٹے سرکار..... بات یہ ہے کہ....." وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

اس لیے اٹک اٹک کر رک گئی۔

"ہاں ہاں بولو۔ تم رک کیوں گئیں۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

"وہ..... وہ سرکار گاؤں سے ایک لڑکی غائب ہو گئی ہے۔ کل رات کو مندر گئی تھی۔ پر ابھی تک نہیں لوٹی ہے۔ سب لوگ پریشان ہیں۔ سارے گاؤں میں تلاش کر لیا' مگر اس کا کہیں پتا نہیں چل رہا۔ بھگوان جانے اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ وہ ہماری سکھی تھی سرکار' ہم اسی لیے پریشان ہیں۔"

"اوہو! یہ تو پریشانی کی بات ہے۔ نہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی کے ساتھ یہ گاؤں چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ اس کا کسی سے پریم بندھن تو نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں سرکار ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی بھگوان جانے کہاں گئی۔" سرسوتی نے جلدی سے کہا اور پریشانی سے سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

میرا خیال وہی تھا جس کا اظہار میں نے سرسوتی سے کیا تھا۔ وہ گمشدہ لڑکی وجنتی کسی سے پیار کرتی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ جس سے وہ پیار کرتی ہو وہ کسی نچلی ذات کا ہو اور اس کو یہ معلوم ہو کہ اس کی شادی اس سے نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ ہندوؤں میں ذات کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ کوئی بھی نچلی ذات کا آدمی اونچی ذات والوں کے قریب بیٹھ بھی نہیں سکتا اور اسی وجہ سے ان دونوں نے یہ فیصلہ کیا ہو کہ ظالم دنیا والوں سے دور جا کر ایک دوسرے کے ہو جائیں میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ رانی میرے نزدیک آ گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"کیا سوچ رہے ہیں بلرام جی؟ کہیں سرسوتی پر دل تو نہیں آ گیا۔ اسے پاس بلا کر کیا کہہ رہے تھے۔ لگتا ہے دل لگی کرنے کی آپ کی پرانی عادت ابھی چھوٹی نہیں ہے' مگر اب آپ کو اپنی پرانی عادت چھوڑنی ہوگی اب تو آپ صرف ہمارے ہیں اور آپ کو ہمیشہ ہمارا ہی بن کر رہنا ہوگا۔" اس نے ایک ادائے دلبری سے کہا۔

"تمہاری جان کی سوگند رانی' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم تو اب تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتے' رہی بات سرسوتی کی تو اس سے ہم اور بات کر رہے تھے۔" میں نے اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکے سے اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔ میرے جھٹکا دینے سے رانی میری جانب کھنچی چلی آئی' مگر پھر تیزی سے اِدھر اُدھر گردن گھما کر بولی۔

"کیا کرتے ہیں بلرام کوئی دیکھ لے گا۔"

"دیکھتا ہے تو دیکھنے دو' ہم کوئی غیر تو نہیں۔" میں نے شوخ لہجے میں کہا تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور میں اس کی جلترنگ بجاتی ہوئی ہنسی میں کھو سا گیا۔ رانی کی ہنسی ایک بار پھر مجھے میرے ماضی میں لے گئی مگر رانی کی آواز مجھے فوراً میرے ماضی سے حال میں لے آئی۔

"اچھا تو سرسوتی سے میرے سرکار کیا بات کر رہے تھے؟"

"ہم یہاں سے گزر رہے تھے تب ہم نے ساری ملازماؤں کو ایک جگہ جمع سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا اور سب ہی کے چہروں پر ہمیں فکر و پریشانی دکھائی دی۔ بس وہی پوچھ رہے تھے۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے رانی کو اصل بات بتا دی۔

"ہاں ہم جانتے ہیں انہیں کیا پریشانی ہے۔ گاؤں کی ایک لڑکی وجنتی کل شام سے غائب ہے پتا چلا ہے کہ وہ مندر گئی تھی مگر لوٹ کر نہیں آئی۔" رانی نے بے پروا انداز میں کہا تو میں نے جواب میں خاموشی اختیار کی۔

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

مجھے منشی پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے میرے پاس آنے سے انکار کیسے کیا۔ اس کا میرے پاس نہ آنا ہی اس کے بے ایمان ہونے کا ثبوت ہے۔ میں کل تک صبر نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تھوڑا ٹائم لے رہا ہے تاکہ کھاتوں میں مزید گڑبڑ گھٹالا کر سکے۔ میں اسے ایسا کرنے نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے زور سے چیخ کر ایک ملازم بانو کو آواز دی۔

میری آواز اتنی تیز تھی کہ ساری حویلی میں اس کی گونج سنائی دے گئی۔ بانو میری آواز پر بوکھلا کر دوڑا چلا آیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''حکم چھوٹے سرکار!''

''تم ابھی اور اسی وقت چھوٹی حویلی جاؤ اور منشی کو اپنے ساتھ لے کر آؤ اور اسے کہنا کہ اگر وہ مر بھی رہا ہو تو گزشتہ پانچ برسوں کے سارے کھاتے اپنے ساتھ لیتا آئے اور ہاں اگر وہ آنے میں ذرا بھی آئیں بائیں کرے تو اس کو گھسیٹتے ہوئے یہاں لے کر آؤ۔'' میں نے شدید غصے کے عالم میں اپنی سرخ آنکھیں نکال کر کہا تو بانو بری طرح کانپنے لگا۔

''اب...... ابھی...... ابھی لایا سرکار!'' اس نے میرے غصے کو دیکھتے ہوئے بہ مشکل پکارتے ہوئے کہا۔

میری آواز سن کر رانی بھی دوڑ کر میرے غصے سے سرخ چہرے کو حیرانی اور پریشانی سے دیکھنے لگی۔ مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔ شاید جو کچھ میں نے بانو سے کہا اس نے سن لیا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد بانو منشی کو لے کر آ گیا۔ منشی لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے دونوں ہاتھوں کو جوڑے ہوئے آ رہا تھا۔ کچھ رجسٹر اس نے بغل میں دبا رکھے تھے اور کچھ بانو کے ہاتھوں میں تھے۔ میں نے خشمگیں نگاہوں سے منشی رام چند کی جانب دیکھا تو وہ فوراً میرے پیروں میں گر گیا اور گڑگڑانے لگا۔

☆☆......❁......☆☆

روشانے کو پریشان دیکھ کر مجھے گونا گوں مسرت حاصل ہوئی تھی اور کیوں نہ ہوتی خلق خدا کو پریشانیوں میں مبتلا کرنے والی اور مجبور اور بے کس لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھانے والی غریبوں کی لاشوں پر اپنی دوکان کو چمکانے والی روشانے سے مجھے دلی نفرت تھی وہ تو میرے اللہ کا کرم تھا کہ شہباز جیسا شریف لڑکا مجھے مل گیا۔ ورنہ اس نے تو ایک بار پھر میری مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر مجھے گندگی کی دلدل میں دھکیل ہی دیا تھا۔ آخر کبھی تو یہ بھی اپنے آپ کو حالات کے آگے بے بس محسوس کرے اتنے وسیع اختیارات اور ذرائع رکھنے کے باوجود وہ حیران و پریشان ہے اور اس کی پریشانی کی وجہ میں ہوں۔ میں نے اس کو اس پریشانی میں مبتلا کیا ہے یہی سوچ کر مجھے بے پناہ خوشی اور مسرت حاصل ہو رہی تھی میرا شدت کے ساتھ دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنی یہ خوشی کسی کے ساتھ تو شیئر کروں۔ مگر سوائے شہباز کے کوئی ایسا نہیں تھا جس کے آگے میں اپنے جذبات کا اظہار کر سکوں گا۔ مگر شہباز کو یہ سوچ کر میں نے فون نہیں کیا کہ ایک تو اتنی اہم بات میں اس کمرے میں کر نہیں سکتی۔ حالانکہ پہلے میں شہباز سے ہر بات کر لیتی تھی مگر جب سے میں نے روشانے کی باتیں سنی تھیں میں نے احتیاط کر لی تھی کہ جب میں اس کی باتیں سن سکتی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ کوئی میری باتیں بھی سن سکتا ہے اور دوسری بات یہ کہ وہ اس وقت سو رہا ہوگا میں تو رات بھر اس کے بیڈ پر آرام سے سوتی رہی اور وہ رات بھر کھڑا میری شکل تکتا رہا۔ عجیب پاگل آدمی ہے۔ پھر مجھے اس کی ساری باتیں یاد آنے لگیں تو میرا دل عجیب سا ہو گیا۔ وہ بہت اچھا انسان تھا۔ پُر

www.pkdigest.com

خلوص اور بے حد چاہنے والا اگر میرا دل شاہ زیب کا نہ ہو گیا ہوتا تو شاید میں اس کا ہاتھ تھام لیتی' مگر میں کیا کرتی میں بھی اپنے پیار سے مجبور تھی حالانکہ نہ شاہ زیب میرے پاس تھا اور نہ اس کی کوئی خیر خبر تھی' مگر میں اپنی آخری سانس تک اس کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ یہ میرا ایمان تھا کہ اگر میری چاہت میرا پیار سچا ہے تو کبھی نہ کبھی شاہ زیب اپنی ماہین کے پاس ضرور لوٹ کر آئے گا۔ اب تو شاہ زیب کا پیار ایک درد بن کر میرے دل میں رہتا ہے' کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے پیار کا یہ درد ہی شاہ زیب سے میری چاہت کا صلہ ہے۔ شہباز مجھ سے کہتا ہے کہ میں بہت خوب صورت ہوں' مگر میرا شاہ زیب مجھ سے کہتا تھا تم بہت معصوم ہو' میری وہ خوب صورتی اور حسن تو آج بھی برقرار ہے' مگر میری وہ معصومیت جس کا شاہ زیب دیوانہ تھا۔ ظالم دنیا نے چھین لی ہے اب اگر شاہ زیب مجھے ملا تو میں اسے اس کی معصوم ماہین کہاں سے لوٹاؤں گی میں نے بھی دنیا والوں کی طرح چال بازیاں سیکھ لی ہیں۔ شاہ زیب کی میٹھی میٹھی یادوں میں کھوئے کھوئے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

دروازے پر دستک سے میری آنکھ کھل گئی۔ دروازے پر زبیدہ کھڑی تھی۔ وہ مجھ سے کھانے کا پوچھنے کے لیے آئی تھی۔ میں نے کہا تم چلو میں آ رہی ہوں۔

میں فریش ہو کر نیچے گئی تو روشانے موجود نہیں تھی' پتا نہیں کہاں گئی تھی۔ میں نے بہت ہلکا کھانا کھایا کھانا کیا بلکہ صرف سلاد ہی پر اکتفا کیا میں دوبارہ شہباز کے پاس جانا چاہتی تھی' مگر میں اس وقت تک نہیں جا سکتی تھی جب تک شہباز کی کال نہیں آ جاتی۔ میں گھر میں بوریت محسوس کر رہی تھی اس لیے ٹی وی دیکھنے لگی میں اپنے کمرے میں نہیں گئی بلکہ نیچے لاؤنج ہی میں موجود رہی۔ شاید میں غیر ارادی طور پر روشانے کا انتظار کر رہی تھی۔

تقریباً دو گھنٹوں کے بعد روشانے آ گئی' مگر جب وہ اندر آ رہی تھی تو اس طرح کہ اس کے کان سے موبائل فون لگا ہوا تھا اور وہ کسی پر بُری طرح ناراض ہو رہی تھی۔ اندر آ کر اس نے فون کو زور سے صوفے پر پٹخ دیا اور گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی اور اپنی آنکھیں موند لیں۔

میں نے ٹی وی آف کر دیا اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا اور اسے پکارا۔

''روشانے...... روشانے ڈیئر' کیا پرابلم ہے کیوں اتنی ڈیپریس ہو جان؟''

سالے سب حرامی ہیں۔ اُلو کے پٹھے۔ سب کو حرام کھانے کی عادت ہو گئی ہے۔ انہیں صرف بٹھا کر کھلاؤ تو کھا کھا کے سانڈ ہو جائیں گے اور ذرا ایک کام کو کہہ دو تو سب کی ماں مر جاتی ہے۔ اب بتاؤ جب یہ سب میرے کسی کام کے نہیں رہے تو میں ان کا کیا کروں۔ دل چاہ رہا ہے سب کو ایک لائن میں کھڑا کر کے گولیوں سے اُڑا دوں۔''

میرے مخاطب کرنے پر اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھٹ پڑی میں خاموشی اور تحمل سے اس کی بات سنتی رہی وہ جب خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔

''بات کیا ہے؟ کون سا کام ان لوگوں نے نہیں کیا۔ تم مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔''

وہی لڑکیوں کی گمشدگی والی بات' کل سے اب تک نہ تو شامی کا کچھ پتا چلا ہے اور نہ ہی شبانہ کا کوئی سراغ ملا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اتنی سی بات کے لیے

Pdf by Roudsign

آپ اتنی پریشان کیوں ہیں۔ شامی کا تو سمجھ میں آیا ہے کہ آپ کی کزن ہے مگر شبانہ..... شبانہ تو آپ کی بوتیک میں کام کرنے والی ایک معمولی ورکر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی کہیں چلی گئی ہو۔'' میں نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا کہا تم نے!'' وہ ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور چونک کر بولی۔ ''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں' وہ خود ہی کہیں غائب ہو سکتی ہے اور اپنے اغوا کا محض ڈراما رچایا ہو یہ تو بہت ہی تشویش کی بات ہے۔'' اس کی پیشانی کی لکیریں فکر و تردد سے مزید گہری ہو گئیں۔

''یہی تو میں پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ اگر وہ خود کہیں چلی گئی ہے تو اس کو اپنے اغوا ہونے کا ڈراما رچانے کی کیا ضرورت ہے لگتا ہے کوئی بہت ہی خاص بات ہے۔ مجھے نہیں بتائیں گی۔'' میں نے کہا۔

''ارے یار وہ کوئی میرے بوتیک کی عام ورکر نہیں تھی' میرے بہت کام کی بندی تھی اس کے ذریعے میں نے بہت سے اہم کام نکلوانے ہیں۔ کچھ دنوں سے وہ بہت بے زاری دکھا رہی تھی۔ کچھ دنوں پہلے اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی تھی وہ مجھ سے جان چھڑانا چاہ رہی تھی اگر وہ خود گئی ہے یا اسے کسی نے اغوا کیا ہے دونوں صورتوں میں میرے سر پر خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اسے کوئی بھی میرے خلاف بطور ثبوت استعمال کر سکتا ہے اور مجھے پورا یقین ہے وہ میرے مخالفوں میں چلی گئی ہے۔ کاش مجھے تھوڑا سا وقت مل جاتا تو آج وہ زندہ ہی نہ ہوتی۔ میں نے اس کے لیے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ شاید اسے اس بات کی بھنک مل گئی تھی جب ہی وہ اچانک غائب ہو گئی۔ یہ اچھا نہیں ہوا۔'' وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلنے لگی وہ بے قراری اور بے چینی کے عالم میں اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں کھول اور بند کر رہی تھی۔

''روشانے بیٹھ جائیں۔ اس طرح پریشان ہوتی رہیں تو آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی آپ کا بی پی شوٹ کر جائے گا ریلیکس ہو جائیں۔ شبانہ اور شامی کا جلد پتا چل جائے گا۔'' میں نے اس طرح کہا جیسے میں اس کے لیے بہت زیادہ فکرمند ہوں۔

''میرا بی پی پہلے ہی بہت ہائی ہو رہا ہے۔ بس اب دماغ کی رگ پھٹنی باقی رہ گئی ہے۔'' اس نے جھنجلا کر کہا۔ مجھے لگتا ہے ان دونوں کا اغوا کسی ایک آدمی نے کیا ہے مجھے بس اس شخص کا پتا چل جائے اس کی تو میں.....!'' اس نے نحش گالی دی اور پھر غصے اور جھنجلاہٹ میں اس کے منہ سے مغلظات اُبلنے لگے۔ میں نے اس کو پانی پلایا اور صوفے پر بٹھا کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

وہ بہت نڈھال سی ہو رہی تھی۔ میرے کندھے سے لگے لگے بولی۔ ''ماہین تم دعا کرو کہ وہ دونوں مل جائیں ورنہ میری عزت خاک میں مل جائے گی۔ میرا سارا سیاسی کیریئر تباہ ہو جائے گا۔''

''آپ فکر نہ کریں میں ضرور دعا کروں گی۔'' میں نے کہا پھر اسے لے کر اس کے بیڈ روم میں آ گئی اور اسے بیڈ پر لیٹا دیا۔ اس کو ڈیپریشن کم کرنے کی دوا دی اور کہا کہ وہ کچھ دیر آرام کر لے اگر کوئی فون آئے گا اور ضروری ہوا تو آپ کو جگا دوں گی میں آپ کے پاس ہی بیٹھی ہوں۔

میرے اس طرح خیال کرنے سے وہ ممنون نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے میرا شکریہ ادا کرنے لگی پھر اس نے کروٹ بدل لی میں کمرے میں موجود کرسی پر بیٹھ گئی اور میرے لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے۔

اس کے موبائل فون کی بیل دو دفعہ بجی دونوں مرتبہ میں نے فوراً فون ریسیو کیا اور پوچھا کہ کوئی خاص

خبر ہو تو میڈم کو جگا دوں۔ مگر فون کرنے والے نے روشانے کو جگانے سے منع کر دیا اور کہا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔

جب تک روشانے سوئی رہی میں اس کی بہت وفادار سیکریٹری کی طرح اس کے روم میں بیٹھی رہی۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ بے دار ہو گئی۔ روم میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کھڑکیوں کے پردوں بہت ہلکی ہلکی سے روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ میری آنکھیں اتنی دیر میں اس ہلکی روشنی کی عادی ہو چکی تھی۔ روشانے آنکھیں کھولے چپ لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ میں جانتی تھی وہ بہت زیادہ ذہنی خلفشار کا شکار ہے۔ آنکھ کھلتے ہی سارے اندیشے اس کے سامنے منہ پھاڑ کر آ گئے' میں نے اسے اس کی پریشان کن سوچوں میں ڈسٹرب نہیں کیا اور خاموشی سے اس کا جائزہ لیتی رہی۔ اچانک اس نے میری جانب کروٹ لی اور اسے یہ احساس ہوا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے تو خوف و دہشت سے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''آپ اُٹھ گئیں روشانے.....!'' اس کے خوف زدہ ہونے پر میں تیزی سے اُٹھ کر اس کے قریب گئی۔ ''میں ہوں ماہین میں نے کہا تھا ناں کہ آپ سو جائیں میں آپ کے پاس ہی بیٹھی ہوں۔'' میں نے اس کے ہاتھ کو تھام کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اوہ.....!'' اس نے ایک سکون بخش طویل سانس اپنے اندر کھینچی اور دوبارہ تکیے پر اپنا سر رکھ کر اپنی آنکھیں موند لیں اور بولی۔

''میں ڈر گئی تھی۔'' پھر آنکھیں کھول کر تھوڑا سا بیٹھنے کے انداز میں اُٹھی اور ہیڈ کے سرہانے سے اپنی پشت ٹکائی اور ممنون نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا تم اُس وقت سے یہاں بیٹھی ہو؟''

''ہاں! کیوں کہ میں جانتی تھی کہ آپ بہت ڈسٹرب ہیں اور آپ کو کسی بھی وقت میری ضرورت پڑ سکتی ہے' مگر یہ بتائیں کہ آپ اتنی خوف زدہ کیوں ہیں آپ کا کوئی کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ کوئی معمولی عورت تھوڑی ہیں آپ روشانے ہیں میڈم روشانے!'' میں نے لگاوٹ بھرے انداز میں کہا۔

''ویسے تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو' مگر تم نے سنا نہیں کہ چیونٹی بھی ایک ہاتھی کی موت کا سبب بن سکتی ہے۔ میں بھی اسی بات کو لے کر پریشان ہوں کہ کہیں یہ حقیر لڑکیاں میری تباہی اور بربادی کا سبب نہ بن جائیں۔'' اس نے فکرمند لہجے میں کہا۔

''یہ سب آپ کا وہم ہے مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا آپ بے فکر رہیں۔'' میں نے کہا تو وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اسے جو یوں اپنی جانب تکتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

''ایسے کیا میری جانب دیکھ رہی ہیں کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے۔''

''میں دیکھ رہی ہوں کہ تم کتنے اچھے دل کی مالک ہو' میں نے تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف مجبور کیا اور تمہیں اس کام کے لیے بلیک میل کیا جو تم کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ بجائے اس کے کہ تم بھی میرا بُرا چاہتیں' تم مجھے تسلی دے رہی ہو' میری دل جوئی کر رہی ہو تم بہت اچھی ہو ماہین تھینکس.....!'' اس نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر ہلکے سے دباتے ہوئے کہا۔

''میں نے جو کچھ کیا آپ کی خاطر کیا۔ آپ نے بھی تو مجھے اپنے پاس پناہ دی ہے۔ مجھے اتنے آرام سے رکھا ہے اور میں احسان فراموش نہیں ہوں ہمیشہ آپ کی وفادار رہوں گی۔'' میں نے بڑی صفائی سے

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

جھوٹ بولا۔

حالانکہ جھوٹ اور بے ایمانی میری سرشت میں نہیں ہے مگر روشانے جیسی کرپٹ سیاست دان کے ساتھ رہ کر میں نے بھی سارے سیاسی داؤ پیچ اور ہتھکنڈے سیکھ لیے تھے کہ کب کس طرح اپنے مطلب کے لیے دوسرے کو الو بنا کر اپنا کام نکلوانا ہے۔ میں بھی روشانے کو الو بنا کر اپنی وفاداریوں کا یقین دلا رہی تھی۔

''ارے ہاں جب میں سو رہی تھی تو کیا میرے فون آئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں کالز آئی تھیں۔ میں نے کہا کہ کوئی ضروری بات ہو تو میڈم کو جگا دوں تو انہوں نے کہا کہ نہیں جگانے کی ضرورت نہیں ہے کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''ذرا میرا موبائل تو دینا میں دیکھوں کس کی کالز تھیں۔'' روشانے اِدھر اُدھر موبائل تلاش کرتے ہوئے کہا تو میں نے سائڈ ٹیبل سے اٹھا کر اس کا موبائل اسے دے دیا۔ اس نے موبائل فون پر آنے والی کالز کے نمبر دیکھے پھر طیش میں آ کر ایک فحش گالی دیتے ہوئے بولی۔

''یہی کہنے کے لیے فون کیا ہوگا کہ میڈم ان دونوں کا کہیں پتا نہیں چل رہا ہے۔''

''ریلیکس روشانے......! آپ پھر غصہ کر رہی ہیں۔ تسلی رکھیں ان دونوں کا پتا چل جائے گا۔'' میں نے کہا تو وہ ریلیکس ہو گئی۔

''آپ غسل کر لیں میں آپ کے لیے اچھی سی چائے بنوا کر لائی ہوں۔ اگر کچھ کھانا ہو تو ساتھ لے آؤں۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں کچھ لے آؤ۔ میں نے کب سے کچھ نہیں کھایا ہے اور ہاں میرا ڈریس نکال دو کل جو تم لائی تھیں ان میں سے نکال دینا میں ذرا وزیر اعلیٰ سے ملنے جاؤں گی ان کے ساتھ بہت سی ضروری باتیں ڈسکس کرنا ہیں۔'' پھر اپنے موبائل پر نمبر ملا کر وزیر اعلیٰ کے پی اے سے بات کرنے لگی۔

میں نے اس کا ایک لائٹ گرے کلر کا ڈریس نکالا۔ اور کمرے سے باہر آ گئی میں دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہی تھی کہ میں کامیاب رہی ہوں۔ اب میں اس مسئلے پر اس سے بات کر سکتی تھی۔ لڑکیوں کو تلاش کرنے کی وہ کیا کیا کوششیں کر رہی ہے۔ سب میرے علم میں رہیں گی اور وہ سب میں شہباز کو بتاتی رہوں گی۔ میں نے گھر کے بھیدی کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔

میں نے روشانے کے لیے چائے اور سینڈوچز بنوائے اور خود ہاتھوں سے ٹرے اٹھا کر اس کے کمرے میں آئی۔ وہ غسل کر کے آ چکی تھی۔ وہ ڈریس روشانے پر بہت سج رہا تھا اور وہ بہت دل کش نظر آ رہی تھی مگر چہرے پر فریشنس کی جگہ پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔

میں بار بار اپنے موبائل کی جانب دیکھ رہی تھی۔ مجھے شہباز کی کال کا انتظار تھا۔ روشانے چائے پی رہی تھی تب میرے سیل کی بیل بجنے لگی روشانے نے چونک کر میری جانب دیکھا اور میں نے سیل فون کی جانب پھر شہباز کا نمبر دیکھ کر بُرا سا منہ بنایا اور کہا۔

''لو پھر اس کا فون آ گیا میں پریشان ہو رہی تھی کہ روشانے کے سامنے شہباز سے کس طرح بات کروں گی تب میرے بُرے سے بنے ہوئے منہ کی جانب دیکھ کر روشانے بولی۔

''اس سے اچھی طرح سے بات کرو اب تم اس کو ناراض مت کر دینا میں تو ویسے ہی مصیبت میں پڑ گئی ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فون میں آنسر کا بٹن پش کر کے کان سے لگایا۔

دوسری جانب سے شہباز کافی پُرجوش تھا کہنے لگا ابھی فوراً آ جاؤ تو میں نے جھٹ کہا۔

''میڈم روشانے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ان کے ہی پاس بیٹھی ہوں ایک دو گھنٹے کے بعد آ جاؤں گی وہ محتاط ہو گیا اور بولا۔

''ذرا اس کو فون دو۔ تو میں نے روشانے کی جانب فون بڑھاتے ہوئے کہا کہ وہ آپ کی خیریت پوچھنا چاہتا ہے۔ روشانے نے مجھ سے فون لے کر کان سے لگا لیا اور دھیمی آواز میں ہیلو کہا۔ شاید وہ اس سے اس کی خیریت پوچھ رہا تھا۔ چند رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد روشانے نے مجھے فون دے دیا۔ کیوں کہ شہباز نے فون ڈسکنکٹ کر دیا تھا۔

''میں تو جا رہی ہوں تم بھی چلی جاؤ ایسا لگتا ہے کہ اس کا تمہارے بغیر دل ہی نہیں لگتا۔'' اس نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''جانا تو پڑے گا آپ دیکھ لیں روشانے میں نے یہاں بھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیا ہے۔ لیکن میری آپ سے ایک ریکویسٹ ہے کہ اب شہباز کے علاوہ مجھے کسی اور کے پاس جانے کے لیے مت کہیے گا۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''نہیں نہیں تم فکر نہ کرو میں تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی۔ یہ مرد بھی سارے اتنے الو کے پٹھے ہوتے ہیں کہ جب تک انہیں جوان لڑکی کی رشوت نہ پیش کرو مانتے نہیں ہے۔ مجھے بھی یہ سب کرتے اچھا تو نہیں لگتا مگر کیا کروں کرنا پڑتا ہے۔'' اس نے انسانیت کے جامے میں جواب دیا۔

''تھینک یو اینڈ لو یو!'' یہ کہتے ہوئے میں نے آگے بڑھ کر اس کے رخسار پر ایک بوسہ دیا اور اس کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی پھر شہباز کو کال ملائی اور پوچھا۔

''کوئی خاص بات ہوئی؟''

''ہاں! تم آ رہی ہوں ناں!'' اس نے محتاط لہجے میں مختصر جواب دیا۔

''روشانے جانے والی ہے اس کے جانے کے بعد میں آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا اور پاؤں پھیلا کر بیڈ پر لیٹ گئی اتنی دیر روشانے کے کمرے میں ایک ہی پوزیشن میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے میری کمر اکڑ گئی تھی۔

آدھے گھنٹے آرام کے بعد میں کمرے سے نکلی اور ٹہلتی ہوئی نیچے آ گئی روشانے جا چکی تھی۔ میں تیزی سے اپنے کمرے میں آئی اور آ کر اہتمام سے تیار ہوئی اور نیچے آ گئی میرا ڈرائیور کمال نیچے موجود تھا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس سے شہباز کے فلیٹ پر چلنے کے لیے کہا اس نے کوئی تعرض

شک کا ناگ

شک کا ناگ
دھیرے دھیرے
من کے اندر پھیل رہا ہے
روئیں روئیں کو ڈس رہا ہے
اس کا اُن دیکھا زہر
روح کو زخمی کر رہا ہے
میں سلگتے تن من اور
زخمی روح کے ساتھ
آنکھوں میں شوخی لیے
چہرے پر مسکراہٹ بکھیرے
جی رہی ہوں
سقراط تو نہیں پھر بھی
ہنس کر
زہر پیالہ پی رہی ہوں
(ریحانہ سعیدہ......گڑھی شاہو۔ لاہور)

www.pkdigest.com

Pdfby Roadsign

نہیں کیا اور کار میں بیٹھ کر کار اسٹارٹ کردی۔ ورنہ پہلے وہ روشانے سے ضرور پوچھتا تھا' مگر اس وقت اس نے نہیں پوچھا شاید روشانے جاتے ہوئے اسے بتا کر گئی ہوگی کہ میں جانے والی ہوں۔

شہباز میرا ہی منتظر تھا اسے میرے چہرے پر چمکتی ہوئی مسرت کی کرنیں نظر آئیں تو بولا۔

"ماشاء اللہ بہت فریش اور خوش دکھائی دے رہی ہو' کیا میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہوجاؤں کہ یہ خوشی اور مسرت میرے پاس آنے کی ہے یا پھر روشانے کو پریشانی میں مبتلا کرنے کی ہے۔"

"دونوں ہی وجوہ ہیں پھر میں نے اسے ساری باتیں بتادیں اور یہ بھی کہ میں نے کس طرح روشانے کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا ہے۔"

"گڈ! یہ تو تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ اس سے ہمارا کام بہت آسان ہوجائے گا۔ ویسے میں نے ایک بات اور سوچی ہے اور وہ اہم کام تمہیں کرنا ہوگا۔" شہباز نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"وہ کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"تمہیں روشانے کے روم میں اس کے بیڈ کے سرہانے کی پچھلی جانب ایک مختصر سی چپ لگانی ہوگی۔"

"وہ کس لیے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ روشانے اپنے کمرے میں چاہے کسی انسان سے بات کرے یا موبائل یا فون پر بات کرے۔ تم کہیں پر بھی ہوگی تم اس کی بات سن سکو گی۔" شہباز نے بتایا۔

"مگر کس طرح؟ یعنی میں اس چپ کے ذریعے اس کے کمرے میں ہونے والی ساری گفتگو سن سکوں گی۔" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پُرشوق لہجے میں پوچھا۔

"ہاں یہ بہت اہم سوال ہے۔" اس نے اس طرح مسکرا کر مجھے دیکھا جیسے کوئی کسی بچے کے احمقانہ سوال پر مسکراتا ہے۔

"کیا ہے بھئی اپنے کیوں مسکرا رہے ہو' اب مجھے ساری بات تو معلوم نہیں ہے۔ میں تو سوال کروں گی۔" میں نے جھینپ کر کہا۔

"تم اتنی کیوٹ کیوں ہو؟ جب تم اس طرح بات کرتی ہو تو بہت ہی کیوٹ لگتی ہو۔" اس نے محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"اچھا زیادہ فضول باتیں مت کرو' کام کی بات کرو۔" مجھے اس کے منہ سے اپنی اس انداز سے کی گئی تعریف سن کر تھوڑی سی شرم آگئی۔

"تم اس کے ذریعے وہ ساری باتیں سن سکو گی۔" اس نے میری جانب ایک موبائل فون سیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ پھر اس کے استعمال کا طریقہ بتانے لگا۔ کہ جب بھی اس کے کمرے میں کوئی بھی آواز پیدا ہوگی تو اس کی یہ والی لائٹ آن ہوجائے گی پھر تمہیں چند نمبر ملانے ہوں گے نمبر ملا کر تم فون کان سے لگاؤ گی تو اس کمرے کی ساری آوازیں تمہیں سنائی دیں گی' اگر تم لوگوں کے درمیان بھی ہوگی تو کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ تم فون پر کس سے گفتگو کر رہی ہو' یا کوئی اور اہم کام دیکھنے والے یہی سمجھے گے کہ تم فون پر بات کر رہی ہو' بس اس کے لیے تمہیں خود ہی یہ احتیاط کرنی ہوگی کہ جب روشانے اپنے بیڈ روم میں ہو تو تم بھی اپنے روم میں چلی جانا اور اگر تمہیں اس کی موجودگی میں اس کے روم میں جانا ہو تو اس فون سیٹ کو اپنے کمرے میں چھپا کر رکھ کر جانا۔ اچھا ہے کسی کی نگاہ اس پر نہ ہی پڑے۔ اس طرح سے ہمیں روشانے کی ہر بات کا علم ہوتا رہے گا اور ہمارا گھیرا اس

کے گرد تنگ ہوتا رہے گا۔" شہباز نے مجھے تفصیل سے اس فون کا استعمال سمجھایا۔

میں نے اچھی طرح سے شہباز کی ہر بات سمجھ لی۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ وہ شامی اور شبانہ سے ملنے کے لیے گیا یا نہیں ان دونوں کے کیا حال ہیں۔

"میں کیسے ملنے جاسکتا ہوں کیوں کہ میں ان کے سامنے آنا نہیں چاہتا یہ کام تو میرے بندے کرتے ہیں۔ میں نے فون پر بات کی تھی تو اس نے بتایا کہ پہلے تو ان دونوں نے بہت شور مچایا کہ انہیں کس لیے قید کر کے رکھا ہے۔ تب میرے بندے نے انہیں اچھی طرح ساری بات سمجھادی کہ ہم نے تمہیں قید نہیں کیا ہے بلکہ روشانے کے غنڈوں سے تمہاری جان بچائی ہے اور تمہیں چھپا کر بھی اس لیے رکھا ہے کہ روشانے کے آدمی تمہیں بھوکے کتوں کی طرح ہر جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے شامی اور شبانہ کو یہ بھی بتا دیا کہ وہ ان کے بارے میں ہر بات سے واقف ہیں اور یہ بھی کہ روشانے انہیں کیوں مارنا چاہتی ہے انہوں نے پوچھا کیا تم لوگ اپوزیشن جماعت والوں کے آدمی ہو اور ہمیں روشانے کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہو تو میرے بندوں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ فی الحال وہ یہاں اطمینان سے رہیں جب مناسب وقت آئے گا تو سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ تب شبانہ نے کہا کہ وہ اپنے گھر والوں سے فون پر بات کر کے انہیں بتانا چاہتی ہے کہ وہ خیریت سے ہے تو انہیں یہ بات بھی سمجھا دی گئی ہے کہ ایسا کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے روشانے نے اس کے گھر کے فون پر آبزرویشن لگوادی ہو' یا ان کے گھر پر آنے والی ہر کال ٹریس ہو رہی ہو' تم چند دن صبر کرلو پھر تمہارے گھر والوں کو بھی تمہاری خیریت کی اطلاع بھجوادی جائے گی۔"

"ویسے شہباز تم نے انہیں رکھا کہاں پر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سوری جانو..... میں تمہیں نہیں بتا سکتا یہ بہت ہی سیکرٹ ہے اور تم روشانے کے گھر میں اس کے ساتھ رہتی ہو' اس سے گفتگو کرتی ہو' ہوسکتا ہے کہ بے خیالی میں تمہارے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس کو سن کر روشانے جیسی شاطر عورت چونک جائے اور ہمارا سارا بنا بنایا کھیل ختم ہوجائے۔" شہباز نے میرے رخسار کو چھوتے ہوئے کہا۔

"تم نہیں بتانا چاہتے نہ بتاؤ' ویسے میں اتنی احمق ہرگز نہیں ہوں جتنا تم مجھے سمجھ رہے ہو۔" میں نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔

"اچھا بابا سوری۔ لو کان پکڑ لیے ایمان سے میں تمہیں احمق ہرگز نہیں سمجھتا۔ بس اتنا جان لو کہ کوئی بھی اہم بات جتنے کم کانوں تک پہنچے اتنا ہی اچھا ہوتا

غزل

تمہارا حُسن اگر بے نقاب ہوجائے
ہر ایک ذرہ تجلّی مآب ہوجائے
حیات اپنی مکمل حیات ہوجائے
نظر کا وار اگر کامیاب ہوجائے
ہماری تشنہ لبی کا خیال کر ساقی
وہ اِک نظر جو حریفِ شراب ہوجائے
ہمارے پہلو سے گزرے وہ اوڑھ کر خوش بُو
خدا نہ کردہ کہیں انقلاب ہوجائے
یہ میرا شوق سہی' حاصلِ حیات سہی
سوال میرا' تمہارا جواب ہوجائے
اِس آرزو پہ نظر بے قرار ہے عاطر
وہ ایک بار سہی' بے حجاب ہوجائے
(رانا حنیف عاطر..... جھڈو)

www.pkdigest.com

ہے اُس کے محفوظ ہونے کے چانس بڑھ جاتے ہیں۔'' شہباز نے شرارتی انداز میں اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

پھر ہم دونوں نے کچن میں جا کر کافی بنائی اور ساتھ بیٹھ کر پی ساتھ ہی ادھر اُدھر کی باتیں بھی کرتے رہے۔ تب مجھے اچانک یاد آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔

''شہباز تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم نے شاہ زیب کی تلاش شروع کر دی ہے۔ تو تمہاری کوشش کہاں تک کامیاب رہی۔''

''شاہ زیب کی تلاش جاری ہے ابھی کوئی مثبت خبر نہیں آئی ہے۔ جیسے ہی کوئی کنفرم نیوز میرے پاس آئی میں تمہیں فوراً بتاؤں گا۔'' شہباز نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تم لوگ کہاں تلاش کر رہے ہو اسے تمہیں کیا اندازہ ہے کہ وہ کہاں ہوگا۔'' میں نے پوچھا۔

''اس بات کا تو کوئی اندازہ نہیں ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''یہی بات تو میں پوچھ رہی ہوں جب تمہیں اس کے بارے میں کوئی علم ہی نہیں ہے تو تم کس طرح اور کہاں تلاش کر رہے ہو؟'' میں نے بحث کے انداز میں کہا۔

میری بات سن کر وہ خاموشی سے یا زچ ہو جانے والے انداز میں دیکھنے لگا۔ میں خاموشی سے اس کے بولنے کی منتظر رہی چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔

''کسی گمشدہ انسان کو تلاش کرنے کے کچھ طریقہ کار ہوتے ہیں۔ اگر ہمیں جگہ کا تعین ہو تو مشکل ہی کوئی نہیں۔ سب سے پہلے تو تم نے مجھے اس کے گاؤں کا نام بتایا تھا تو ہم نے وہاں سے اس کا ایڈریس معلوم کیا۔ پھر اس کے بھائیوں کے شناختی کارڈ سے اس کے والدین کا نام حاصل کیا۔ پھر ان ساری مندرجات کی بناء پر نادرا کے آفس سے اس کے بارے میں معلوم کیا' تو معلوم ہوا کہ اس کا موجودہ ایڈریس ایک دوسرے گاؤں کا ہے۔ جہاں میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس گاؤں کا چوہدری تمہاری والدہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا اور وہیں ان کا انتقال ہوا تھا۔ مگر وہاں بھی معلوم کرنے پر پتا چلا کہ کئی سال پہلے شاہ زیب نامی لڑکا کچھ عرصہ اس چوہدری مکرم شاہ کی حویلی میں رہا تھا مگر پھر وہ وہاں سے چلا گیا ہے اور اب وہ کہاں ہے میرے بندے اس بات کا پتا لگانے کی کوشش کر رہے ہیں بہت زیادہ کھل کھلا کر اس کے بارے میں معلومات لیں تو حویلی کے ملازمین نے مکرم شاہ کو یہ بات بتا دی کہ کچھ لوگ شاہ زیب کے بارے میں جاننا چاہ رہے ہیں کہ وہ اب کہاں گیا ہے۔

مکرم شاہ نے میرے بندوں کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور شاہ زیب سے ان کا کیا رشتہ ہے میرے بندے نے بتایا کہ وہ شاہ زیب کے گاؤں سے آئے ہیں۔ شاہ زیب اپنا گھر اور گاؤں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس لیے اس کے بھائیوں نے اس کی تلاش کا کام انہیں سونپا ہے۔ اس کا بڑا بھائی بہت بیمار ہے اور مرنے سے پہلے شاہ زیب سے ملنا چاہتا ہے۔

مکرم شاہ شک میں پڑ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ جانتا ہے کہ شاہ زیب کہاں ہے مگر نہ جانے کیوں وہ اس کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے گریز کر رہا ہے۔ اس نے فی الوقت تو میرے بندوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ شاہ زیب اس کے پاس سے کہاں چلا گیا۔ وہ خود اسے تلاش کرے گا اور معلوم ہو جانے پر خود اسے اس کے بھائی کی

بیماری کی اطلاع دے کر اس کے گاؤں بھیج دے گا۔ میرے بندے بھی خفیہ طور پر شاہ زیب کی تلاش میں مصروف ہیں۔ انہوں نے حویلی کے کچھ خاص ملازمین کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش تو کی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ شاہ زیب ایک دو مرتبہ تمہاری والدہ سے ملنے کے لیے گاؤں آیا تھا اور تمہاری والدہ کے انتقال کے بعد بھی وہاں آیا تھا' مگر اب کافی عرصہ ہوا وہ وہاں نہیں آیا۔ تم دعا کرو کہ میرے بندوں کی کوششیں بارآور ثابت ہوں اور شاہ زیب کا پتا چل جائے۔"

جتنی دیر شہباز بولتا رہا اس کے ہر جملے سے پہلے میرے دل سے دعا نکلتی کہ شاہ زیب مل جائے' لیکن اس کی اتنی بات نے بھی میرے دل میں امیدوں کے لاکھوں دیے جلا دیے تھے اور میں خوش تھی کہ آج نہیں تو کل مجھے شاہ زیب کا پتا چل جائے گا۔ کم از کم اس بات سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ میرا شاہ زیب اسی دنیا میں ہے' وہ دنیا سے کہیں نہیں گیا اور جب وہ دنیا میں موجود ہے تو اس کا پتا بھی چل جائے گا۔ شاید میری زندگی کی وہ سب سے بڑی خوش خبری ہو گی جب مجھے شاہ زیب کے مل جانے کی اطلاع ملے گی اور میری زندگی کا سب سے حسین اور خوش گوار دن وہ ہو گا جب میں اور شاہ زیب ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں گے لگتا ہے میں تو اتنی بڑی خوشی کا وہ لمحہ سہار ہی نہ سکوں گی جب میرا گوہر مقصود میرے دل کی دھڑکن' میری روح' میرا شاہ زیب میرے سامنے ہو گا مارے خوشی کے کہیں یہ سانسیں ہی نہ تھم جائیں اور..... اور شاہ زیب کیسا فیل کرے گا۔ کیا وہ بھی میرے لیے اتنا ہی بے قرار ہو گا کیا وہ بھی میری دید کے لیے تڑپ رہا ہو گا کہیں میرے اندر سے اندیشوں کے ناگوں نے اپنے پھن اٹھائے۔

ہاں ہاں کیوں نہیں..... اچانک اندر سے دوسری آواز ابھری ہمارا پیار سچا تھا اور سچا ہے ہم نے پورے خلوص اور اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ ایک دوسرے کو چاہا ہے کیا وہ مجھے قبول کرے گا؟ یہ سوال بار بار کسی سانپ کے ڈنک کی طرح مجھے ڈستا رہتا تھا اور یہیں پر آ کر میری آنکھیں بہہ نکلتی تھیں اور میں سوچتی تھی ٹھیک ہی تو ہے میں وہ ماہین کہاں رہی جسے وہ چاہتا تھا جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا جسے ہمیشہ کے لیے اپنانے کا وعدہ کیا تھا اور یہ ماہین جس سے وہ اب ملے گا اپنی لٹی ہوئی عصمت کا دن رات ماتم کرنے والی ماہین ہے' جس کے بدن کو نہ جانے کتنے درندوں نے بھنبھوڑا ہے' پہلے والی ماہین کی اداؤں میں معصومیت تھی بانکپن تھا اور اس ماہین کی ناز و ادا مردوں کو رجھانے والی ہیں۔ آج وہ اس ظالم دنیا کے سارے داؤ پیچ سیکھ گئی ہے۔ دنیا نے اس کی معصومیت کو اس سے چھین کر اپنے قدموں تلے روندڈالا ہے۔

"کہاں کھو گئیں کیا شاہ زیب سے باتیں کر رہی ہو؟" شہباز کی آواز مجھے خیالات کی دنیا سے کھینچ لائی اور میں چونک پڑی۔ میں کوئی خوش گوار بات نہیں سوچ رہی تھی بلکہ اندیشوں میں گھری ہوئی تھی میرا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ میں نے چونک کر تیزی سے سر اُٹھا کر شہباز کی جانب دیکھا تو میری آنکھوں سے دو آنسو لڑھک کر میرے گالوں پر آ گئے۔

"ارے ماہین!" وہ میرا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اُٹھ کر میرے نزدیک آ گیا۔ پھر مجھے بازوؤں سے تھام کر کھڑا کیا اور اپنی لرزتی ہوئی انگلی کی پور سے میرے گالوں پر اٹکے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

"تم پریشان کیوں ہوتی ہو' میں نے کہا تو ہے' ان شاء اللہ شاہ زیب کا جلد پتا چل جائے گا جہاں تم نے

Pdfby Readsign

انتظار کیا ہے تھوڑا صبر اور کر لو' بس کچھ دن اور پھر تمہارا شاہ زیب تمہارے پاس ہو گا اور وہ تم سے اپنا دیرینہ وعدہ پورا کرے گا' تمہیں اپنی دلہن بنا کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔" اس نے ایک زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو' وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا ناں..... وہ میرے بارے میں جاننے کے بعد مجھے چھوڑ کر تو نہیں چلا جائے گا۔" میں نے شہباز کے ہاتھوں کو تھام کر غیر یقینی لہجے میں کہا۔

"بالکل سچ!" اس نے بہت نرم لہجے میں کہا۔ "وہ تم سے محبت کرتا ہے اور اس کی یہ محبت ہی اسے مجبور کرے گی کہ وہ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا لے کیوں کہ ماضی میں جو کچھ بھی تمہارے ساتھ زیادتیاں ہوئی ہیں ان میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ تمہیں وہی ماہین سمجھے گا جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ جیسے میں تمہیں آج بھی بالکل پاکیزہ سمجھتا ہوں۔"

شہباز نے کچھ اس طرح مجھے یقین دلایا کہ میرے دل کو تسلی ہو گئی اور میں مطمئن ہو کر مسکرانے لگی۔ ہم دیر تک بیٹھے اپنی پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔

جب میں شہباز کے پاس سے جانے لگی تو اس نے مجھے روشانے کے روم میں لگانے والی ننھی منی سی چپ دی اور ساتھ ہی موبائل فون سیٹ دیا اور اس سارا طریقہ کار ایک بار پھر مجھے سمجھایا۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا تو وہ بولا۔

"ہاں یاد آیا۔ ایک دو روز میں اس کا عاشق انڈر ورلڈ ڈان آنے والا ہے۔ وہ دونوں کیا باتیں کرتے ہیں تمہیں وہ ساری باتیں بہت دھیان سے سننی ہیں اور یاد بھی رکھنی ہیں۔ اس کے علاوہ اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہیں بہت زیادہ احتیاط کرنی ہے اور اس گھر

"دعا"

یا اللہ ایسی زندگی دے' ایک ہاتھ میں قرآن ہو۔ دوسرے میں تیرے نبی ﷺ کا فرمان ہو۔ دل میں صحابہ و اہل بیت کی قدر روشان ہو۔ وقت موت یہ سامان ہو' کلمہ کی جان ہو' ہماری جان' تیرا قرآن ہو۔ تیرے محبوب ﷺ کے روضہ کی طرف دھیان ہو۔ جب وقتِ موت ہو نقشہ عجیب ہو' سامنے روضۂ حبیب ہو' زبان پر کلمہ نصیب ہو (آمین ثم آمین)۔

"حاصل زندگی"

مجھے جنت حاصل کرنے سے زیادہ دو رکعت نماز محبوب ہے کیوں کہ جنت حاصل کرنے میں میری رضا ہے جب کہ نماز پڑھنا میرے ربّ کی رضا ہے (حضرت علیؓ)

سو رکعت نماز

ایک خان صاحب بغیر ٹکٹ کے ٹرین میں سفر کر رہے تھے ٹکٹ چیکر جیسے ہی ڈبے میں اندر آئے انہوں نے نماز کی نیت کر لی۔ چیکر پاس بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا۔ خان صاحب زور سے بولے "سو رکعت نمازِ نفل لا ہور تک اللہ اکبر"۔

(بنِ مقبول جاوید احمد صدیقی..... راولپنڈی)

سے کوئی بھی کام کی بات نہیں کرنی ہے۔ فون پر ہم صرف عام سی باتیں کریں گے۔" میں ساری بات سمجھ گئی اور روشانے کے گھر واپس آ گئی۔

روشانے ابھی تک واپس نہیں آئی تھی مگر میں یہ بات نہیں جانتی تھی کہ وہ کب تک واپس آئے گی کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس کے کمرے میں اپنا کام کر رہی ہوں اور وہ واپس آ جائے اور ویسے بھی عموماً اس کی غیر موجودگی میں اس کا کمرہ لاک ہی رہتا تھا۔ پھر بھی میں نے اس کو فون کیا اور اس سے اس کی خیریت پوچھی۔ میں نے اس طرح لگاوٹ کا مظاہرہ کرتے

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

ہوئے اس کی خیریت پوچھی جیسے میں اس کے لیے بہت فکر مند ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ وہ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد واپس آئے گی اور اس کی طبیعت کافی بہتر ہے۔

مجھے اس بات کا اطمینان تو ہو گیا کہ روشانے کم از کم ایک گھنٹے تک تو نہیں آئے گی میں اپنا کام اطمینان سے کر سکتی ہوں یہ سوچ کر میں تیزی سے اس کے کمرے کی جانب بڑھی دروازہ بند تھا مگر جب میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر گھمایا تو وہ گھوم کر رہ گیا اور دروازہ نہیں کھلا۔ یعنی دروازہ لاک تھا میں خاموشی سے اپنے روم میں واپس آگئی اور سوچنے لگی کہ یہ کام جب ہی ہو سکتا ہے جب روشانے موجود ہو اور اس کا کمرہ کھلا ہو مگر روشانے کی موجودگی میں میں یہ کام کیسے کر سکتی ہوں۔ آخر یہ کام ہو گا کس طرح؟

میں دیر تک بیٹھی سوچتی رہی بالآخر ایک بہت ہی شاندار ترکیب میرے ذہن میں آگئی۔

☆☆……۞……☆☆

سیدھا کھڑا ہو جا رام چندا!'' میں پوری قوت سے دہاڑا مگر رام چند اسی طرح میرے پیروں پر گرا رہا۔ وہ بس ایک ہی بات کہے جا رہا تھا۔ ''مجھے شما کر دیجیے سرکار۔''

''کس بات کے لیے شما کر دوں اُلو کے پٹھے۔ سیدھا کھڑے ہو کر بات کر ابھی تو میں نے کچھ دیکھا بھی نہیں کیا بھی نہیں اور تو بے مارے کی توبہ کر رہا ہے۔'' میں نے زور سے لات مار کر اسے دور گرا دیا۔ تو وہ لرزتا اور کانپتا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اس سے کھاتے دکھانے کے لیے کہا۔ تو اس نے ایک ایک کر کے سارے رجسٹر میرے آگے کھولنے شروع کر دیے۔

تقریباً دو ڈھائی گھنٹوں تک میں زمینوں کا سارا حساب کتاب دیکھتا رہا۔ درمیان میں میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ مگر جب میں سارے کھاتوں کا حساب کتاب دیکھ کر فارغ ہوا تو مجھے پتا چلا کہ منشی نے کافی گڑبڑ کی ہوئی ہے۔ سالانہ آمدنی کی مد میں آدھی رقم بھی حویلی نہیں پہنچائی گئی۔ کچھ زمینیں منشی نے فروخت کر دی تھیں۔ بہت سے لوگوں کو قرضہ دیا ہوا تھا۔ اور ان کی وصولیابی کا سود منشی کی جیب میں جا رہا تھا۔

یہ بات تو میں جان چکا تھا کہ وہ ان ہی قرضوں کی وجہ سے کتنے ہی غریب کسانوں کو بلیک میل کر رہا ہے۔ اسی دن مجھے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ منشی نے اس سے پہلے بھی دو جوان لڑکیوں کے بدلے قرضے معاف کیے تھے۔ اور ان لڑکیوں نے منشی کی خباثت سے تنگ آکر کنوئیں میں کود کر جان دے دی تھی۔ آج کل ایک اور لڑکی کی گمشدگی کی خبریں گردش کر رہی تھیں۔ مجھے اچانک ہی خیال آیا کہ کہیں یہ کام منشی کا تو نہیں کہ اس نے ہی اس لڑکی کو غائب کر دیا ہو کیوں کہ یہ کافی دنوں سے اس لڑکی کے باپ کو مجبور کر رہا تھا کہ اگر وہ اپنی جوان لڑکی کی شادی اس سے کر دے تو وہ قرضہ معاف کر دے گا میں نے یہی بات منشی سے پوچھی تو وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔

''رام…… رام…… رام سرکار! اب منشی اتنا کمینہ بھی نہیں جو ایسی حرکت کرے گا۔''

''تم کتنے کمینے ہو منشی اس بات کا اندازہ تو مجھے اچھی طرح سے ہو گیا ہے۔ میں یہ بات بھی تم سے اگلوا لوں گا۔ پہلے تم سے زمینوں کا معاملہ صاف کر لوں۔'' میں نے دانتوں کو پیستے ہوئے اسے گھورا۔

''اب بتاؤ کہ یہ ساری رقم تم واپس کر رہے ہو یا نہیں اور وہ زمینیں تم نے کس کے ہاتھ فروخت کی

ہیں۔ مجھے وہ ساری زمینیں واپس چاہئیں اور ساری رقم بھی اگر تُو نے ایسا نہیں کیا تو یاد رکھ کہ تجھے بھوکے کتوں کے آگے ڈلوا دوں گا' مگر تجھے مرنے نہیں دوں گا ان زخموں کے ساتھ زندہ رہنے دوں گا تا کہ تو اذیت سہہ سہہ کر اور تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے سمجھا۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

''دیا کریں سرکار مجھ غریب پر میں وہ رقم کہاں سے لا کر دوں مجھ سے تو وہ رقم ساری خرچ ہو گئی۔'' اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''خرچ ہو گئی! کہاں خرچ کر دی تُو نے وہ رقم جہاں تک مجھے علم ہے نہ تو تیری کوئی بیوی ہے اور نہ بچہ پھر تو نے کہاں اُڑائی وہ رقم تو کہاں عیاشیاں کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''سرکار اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں……!'' بانو جو دور کھڑا تھا میرے قریب آکر ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''ہاں کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو اس منشی کے متعلق اور اس کی حرکتوں کے بارے میں جو کچھ بھی پتا ہے سب مجھے بتا دو اور ہاں اب اس سے کسی کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ یہ اب اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔'' میں نے منشی کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''سرکار اس منشی نے کسانوں پر بڑا ظلم کیا ہے یہ تو سب کا مائی باپ بنا بیٹھا تھا۔ یہ بہت ہی بدنگاہ ہے ہر جوان اور کنواری لڑکی کو دیکھ کر اس کی رال ٹپک پڑتی ہے اور ہاں یہ گاؤں سے باہر ساتھ والے گاؤں میں کرشمی نامی ایک عورت کے پاس جاتا ہے۔ یہ اپنی ساری رقم اس کے اوپر خرچ کرتا ہے۔ وہ بکاؤ عورت ہے اور منشی کو اُلو بنا کر اس سے سارا مال کھینچتی ہے۔'' بانو نے قہر آلود نگاہوں سے منشی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

حاصلِ مطالعہ

☆ ناگہاں فقرے بازیاں سینے کی تندی میں اکسیر ہوتی ہیں۔

☆ مناسب نامناسب کا شعور ہوش مندی کی دلیل ہے۔ اس سے مراد ہے کہ آدمی بالکل پتھر نہیں بن گیا ہے۔

☆ ذمے داری یا ایک روایتی لفظ فرض کی ادائی سے حق کا جواز نہیں بنتا۔ کوئی ہر چند ایک باپ کی حیثیت سے اپنی ذمے داری پوری کرنے کی کوشش کرے لیکن فرض کی ادائی اور ذمے داری کی تکمیل کسی مبادلے معاوضے یا حق سے مشروط نہیں کرنی چاہیے۔

☆ جسم بھی کیسا درختوں کی مانند ہوتا ہے۔ کڑی دھوپ ہو یا تند ہوا' پتے' ڈالیاں خمیدہ ہو جاتی ہیں۔

☆ اوپر رکھی چیز کا حصول دست رس ہی سے ممکن ہے اور قامت کی بلندی کے لیے بھی کوئی چیز چاہیے ہوتی ہے۔

(عبداللہ شاہد…… حیدر آباد)

''کیوں بے منشی بانو سچ کہہ رہا ہے۔'' میں نے منشی سے بانو کے بیان کی تصدیق کی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''اس کا مطلب ہے بانو نے جو کچھ بھی کہا وہ سچ ہے۔'' میں نے منشی سے کہا تب بھی وہ خاموش ہی رہا۔

''منشی تو اپنے کمرے کی چابیاں نکال۔'' میں نے کہا تو منشی نے لرزتے ہاتھوں سے اپنے کرتے کی جیب سے ایک چابی نکال کر میری جانب بڑھائی تو میں نے بانو کو اشارہ کیا کہ وہ منشی سے چابی لے لے بانو نے جھپٹنے کے انداز میں منشی سے چابی چھین لی۔ اور میری جانب استفساری نگاہ سے دیکھنے لگا۔

''بانو تم ایک کام کرو دو چار آدمیوں کو اپنے ساتھ لو

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

اور اس کے کمرے کی اچھی طرح تلاشی لو اس کے کمرے میں رکھے ٹرنک اور الماری کی بھی اچھی طرح تلاشی لو اور جو کچھ بھی ملے سب کچھ لے آؤ۔" میں نے کہا۔

"سرکار اس سے ٹرنک اور الماری کی بھی چابی لیں یہ بڑا سیانا ہے اس نے انہیں کھلا تھوڑی رکھا ہوگا۔" باسو نے منشی پر نفرت انگیز نگاہ ڈال کر کہا تب میں نے منشی کی جانب صرف دیکھا اور منشی نے مزید چابیاں باسو کے حوالے کر دیں۔

"اور ہاں تم ان سارے کسانوں کو اکٹھا کرو جو ہماری زمینوں پر کام کرتے ہیں۔ میں ان سب سے ملنا چاہتا ہوں اور یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ منشی نے سب کے ساتھ کیا کیا معاملات طے کیے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی بتاؤ کہ اس گاؤں میں کوئی پڑھا لکھا اور شریف آدمی ہے تو اسے بھی میرے پاس لے آؤ۔"

پڑھے لکھے آدمی کو میں نے اس لیے بلایا تھا کہ اب منشی کی ذمہ داری میں کسی اور کو سونپنا چاہتا تھا۔ منشی تو ظاہر ہے اب یہ کام کر نہیں سکتا تھا۔

"تم آج شام ہی سب کو بلا لو۔" میں نے باسو کو ہدایت کی تو وہ چلا گیا۔

"سرکار میرے لیے کیا حکم ہے۔" منشی نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

"تو شام تک یہیں اسی جگہ اس طرح کھڑا رہ' خبردار جو یہاں سے ایک انچ بھی ہلا یا تو نے بیٹھنے کی کوشش کی۔" میں نے کہا اور وہاں سے جانے لگا۔

"سرکار مجھ بوڑھے پر دیا کریں۔ میرے اندر کھڑے رہنے کی سکت نہیں ہے۔ میں مر جاؤں گا۔" اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا اور رونے لگا۔

"دیا کروں تجھ بوڑھے پر' تجھے یاد آ گیا کہ تو بوڑھا ہے' تجھے کبھی دیا آئی ان نوجوان لڑکیوں پر جب تجھے اپنے بوڑھے ہونے کا خیال نہیں آیا۔ کون ہے وہ تیری ہوتی سوتی لکشمی جس کے پاس جا کر تو اپنی گزری جوان یادیں تازہ کرتا ہے۔ جب تو تُو بڑا جوان بنتا ہوگا جب تُو بوڑھا نہیں ہوتا۔ تو انسان نہیں راکشش ہے۔ کھڑا رہ چپ کر کے اور اپنے سارے پاپوں کو یاد کر اور بھگوان سے دیا کی بھیک مانگ آج تیرے پاپوں کا گھڑا پھوٹ گیا ہے انت ہو گیا ہے تیرا' اور ایسا انت کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔" میں نے کہا اور اندر آ گیا۔

رانی میرے پاس آئی اور بولی۔ "بلرام جی میں تو سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ یہ منشی اس قدر کمینہ نکلے گا۔ برسوں سے ہماری زمینوں کی دیکھ بھال یہ کر رہا ہے۔ مگر اس کے دل میں پاپ ہے میں نہیں جانتی تھی۔ اچھا ہوا کہ آپ نے اس سے حساب کتاب مانگا۔"

"چاچا جی بیمار ہو گئے۔ میں نہیں تھا رانی تو تمہیں ساری دیکھ بھال کرنی چاہیے تھی۔ منشی نے بھی سوچا ہوگا کہ اب تو کوئی اسے پوچھنے والا ہے ہی نہیں۔ وہ کھل کر من مانی کر سکتا ہے اور اس نے کی اور آج دیکھ لو نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"میں کیا جانوں زمینوں کا حساب کتاب' یہ کام تو جس کے کرنے کا ہے اسی کو ساجھے' آپ نے تبھی تو ہمیں بالکل ہی بے آسرا چھوڑ دیا تھا۔ آپ کے جانے کے بعد پتا جی بیمار پڑ گئے اور پھر ان کی بیماری بڑھتی ہی چلی گئی حد یہ کہ وہ چلنے پھرنے سے ہی معذور ہو گئے اور بستر کے ہی ہو کر رہ گئے ورنہ اس سے پہلے تو پتا جی ہی ساری خیر خبر رکھتے تھے۔" رانی نے دکھی لہجے میں کہا۔

"خیر چھوڑو' اب میں آ گیا ہوں تو سب دیکھ لوں گا۔ چاچا جی کی بیماری بھی ٹھیک ہو جائے گی میں ذرا چاچا جی سے مل لوں اور انہیں منشی کی کارستانیوں کے بارے میں بتا دوں۔" میں نے کہا اور وکرم کے کمرے کی جانب چل دیا۔ حالانکہ رانی اور وکرم سے نہ تو میرا کوئی ناتا تھا اور نہ ہی کوئی تعلق' مگر میں دو وجوہ سے یہ سارا بگاڑ سدھار رہا تھا۔ ایک تو بابا صاحب کا حکم تھا دوسرا میرے اندر جو انسانیت تھی اس کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ میں پریشان حال اللہ کی مخلوق کی مدد کروں۔ اب چاہے وہ کسی بھی مذہب یا فرقے سے تعلق رکھتا ہو' انسان تو ہے اور انسانیت کا رشتا سب رشتوں سے عظیم ہوتا ہے۔

میں وکرم کے پاس گیا اور اسے ساری باتیں بتائیں تو اس بے بس اور بے کس بستر پر پڑے بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اسے اپنی بے بسی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔

"اب آپ بالکل ٹھیک ہو جایئے چاچا جی' اب میں آ گیا ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا اور ہاں میرا اور رانی کا دودھ جب تک نہیں ہوگا جب تک آپ بالکل ٹھیک ہو کر چل پھر نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔

"مگر بلرام بیٹے' میں تو بھگوان جانے ٹھیک ہوتا بھی ہوں یا نہیں۔ تم اس کی پرتیکشا مت کرو' اب تو مجھے لگتا ہے کہ بھگوان کے گھر جلدی جانا ہوگا۔ بلکہ مجھے تو تمہارے آنے سے جو سکون ملا ہے وہ میں بیان نہیں کر سکتا اب میں سکون سے مر تو سکوں گا۔ ایک تو میری رانی کا گھر آباد ہو جائے گا۔ دوسرے کوئی میری چتا کو آگ لگانے والا تو ہوگا تم نہیں تھے تو میں یہی سوچ سوچ کر کڑھتا رہتا تھا کہ میری چتا کو آگ کون لگائے گا بھگوان نے مجھے بیٹا نہیں دیا' مگر اجے کاکا مجھے ہمیشہ یہ کہہ کر تسلی دیتے تھے کہ بلرام ہم دونوں کا بیٹا ہے اور یہی ہماری چتاؤں کو آگ لگائے گا۔" وکرم بہت آہستہ اور رک رک کر بات کر رہا تھا۔ مگر پھر بھی اس کا سانس بری طرح پھول گیا۔

"آپ زیادہ باتیں نہ کریں چاچا جی' دیکھیں تو آپ کا سانس کتنا چڑھ گیا ہے آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ ابھی بھگوان کو آپ کو بلانے کی جلدی نہیں ہے ابھی تو آپ کو ہمارے بچوں کو بھی اپنی گود میں کھلانا ہے۔" میں نے اس کو بہلانے کے لیے کہا تو وہ مسکرانے لگا اور مجھے ڈھیروں دعائیں دینے لگا اور میں دل ہی دل میں شرمندہ سا ہو گیا کہ میں رانی سے شادی تو کرنے والا نہیں۔ اب پتا نہیں جب اصل بلرام یہاں آئے گا تو وہ کیا رویہ اختیار کرے گا۔ لگتا ہے اس کو سدھارنے کا کام بھی مجھے شمشیر کے سپرد کرنا پڑے گا۔

شام کو میں کسانوں سے ملنے کے لیے بالکل تیار بیٹھا تھا کہ حویلی میں اطلاع آئی کہ گاؤں سے ایک اور جوان لڑکی غائب ہو گئی ہے اور یہ بھی مندر ہی گئی تھی اور واپس نہیں آئی۔ میں سوچنے لگا کہ منشی تو حویلی میں موجود ہے پھر کیا چکر ہے.....!"

"یہ وہی والا مندر ہے ناں.....!" میں رانی سے یہ کہتے کہتے رک گیا کہ جس کے سامنے والے چبوترے پر میں بیٹھا کرتا تھا۔

"گاؤں میں ایک ہی تو مندر ہے اور یہ ہمارے علاقے کا سب سے پرانا اور قدیم مندر ہے آپ کو یاد نہیں ارے ہاں آپ کو کہاں یاد ہوگا آپ نے تو کبھی اس مندر کے اندر قدم بھی نہیں رکھا۔" رانی نے شاکی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور میں نے جھٹ کہا۔

"ہاں واقعی میں اس مندر کے اندر کبھی نہیں گیا۔" یہ حقیقت بھی تھی۔ میں مندر کے اندر نہیں گیا تھا۔

www.pkdigest.com

دیکھنے میں اس کی عمارت کافی پرانی دکھائی دیتی تھی۔
ایک مرتبہ جب بائو کے کہنے پر میں اس مندر میں جا رہا تھا تب مجھے اتنی زور کا جھٹکا لگا کہ میں پوری جان سے کانپ گیا اور میں نے بائو کو ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔

''رانی میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ لڑکیاں کہاں غائب ہو رہی ہیں وہ بھی مندر جاتے ہوئے' گاؤں کے راستے مندر جاتے ہوئے اتنے سنسان بھی نہیں ہیں مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے لڑکیاں غائب کی جا رہی ہیں۔'' میں نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بلرام جی! میرے خیال میں آپ کو اس معاملے کی پڑتال ضرور کرنی چاہیے۔'' رانی نے بھی تشویش کا اظہار کیا اور اس سے پہلے کہ میں رانی سے اس موضوع پر مزید بات کرتا بائو نے آکر اطلاع دی کہ کسان آگئے ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے منشی کے کمرے کی تلاشی لی کوئی کام کی چیز ملی یا نہیں۔ تب بائو نے اپنے ہاتھوں میں اٹھائی ہوئی گٹھڑی میرے سامنے رکھ دی۔

''کیا ہے اس میں ذرا اس کو کھول تو سہی۔'' میں نے کہا۔ رانی بھی اس معاملے میں دلچسپی لیتے ہوئے میرے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔

بائو نے گٹھڑی کو کھولا تو جو کچھ اس کے اندر سے برآمد ہوا اس کو دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''یہ..... یہ سب منشی جی کے ہاں سے ملا ہے؟'' رانی نے شدید حیرت سے کہا۔

''جی ہاں رانی جی' یہ سارا زیور اور روپیہ اسی راکشش منشی کے کمرے کے ٹرنک اور الماری سے ملا ہے۔ یہ دیکھیں یہ سونے کے زیورات' یہ روپیہ اور یہ زمینوں کی فائل وہ ساری زمینیں منشی نے کسی اور کو نہیں بیچی ہیں کچھ اس نے اپنے نام کروالی ہیں اور یہ ایک زمین اس نے اس عورت لکشمی کے نام کی ہے اور یہ پتا نہیں کتنا روپیہ اور زیور تو وہ اس کو دے چکا ہوگا۔'' بائو نے کہا۔

''ٹھیک ہے بائو تم یہ سب سامان اُٹھا کر رانی کے ساتھ اندر جاؤ' رانی اسے حفاظت سے رکھ دے گی اور تم منشی کو ساتھ لے آؤ۔'' میں نے بائو سے کہا اور حویلی کے باہر مردان خانے کی جانب آگیا جہاں گاؤں سے آئے ہوئے بلرام کی زمینوں پر کام کرنے والے کسان بیٹھے تھے۔

جیسے ہی میں وہاں پہنچا تو وہ سب مجھے دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔ سب کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور وہ سر جھکا کر مجھے پرنام کر رہے تھے۔ جواباً مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا۔ میں نے بھی اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر انہیں پرنام کیا اور وہاں بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا اور ان کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تو سب بیٹھ گئے چند لمحے انہوں نے آپس میں سرگوشیاں کیں پھر میری جانب متوجہ ہوگئے۔

میں نے ان سے بات شروع کی ہی تھی بائو منشی کو لے کر آگیا۔ منشی کی حالت کافی پتلی ہو رہی تھی اور چہرے پر سخت مردنی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے ایک ہی نگاہ میں اندازہ لگا لیا کہ منشی کو میرے سامنے ایک مجرم کی حیثیت سے کھڑا دیکھ کر سارے کسانوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے اور پھر سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس لیے میں نے سب کو خاموش ہوجانے کے لیے کہا اور کہا کہ ایک ایک کر کے بات کریں۔ منشی بھی تم سب کے سامنے ہے اور میں بھی یہاں موجود ہوں۔ اب جس کو منشی سے جو بھی شکایت ہے یا اس نے جس کو جو تکلیف پہنچائی ہے وہ بلا کھٹکے بیان کرے۔

پھر تو کسی کی بھی زبان خاموش نہیں رہی۔ تقریباً سارے ہی لوگوں نے منشی کے سیاہ کرتوتوں کے بارے میں بتایا۔ ان ہی کسانوں میں وہ دونوں اشخاص بھی شامل تھے کہ جن کو قرضے معاف کرنے کے عیوض منشی نے بلیک میل کیا تھا اور ان کی جوان لڑکیوں کو اپنے گھر کام کاج اور ایک کو حویلی کی صفائی کے بہانے لے گیا تھا۔ بعد میں اس نے ان کو اپنی ناپاک ہوس کا شکار بنایا اور پھر وہ لڑکیاں زندہ نہ رہ سکیں۔

میں نے سب کے سامنے منشی کو زمینوں سے بے دخل کر دیا اور اس کا سارا روپیہ اور زیور لے کر اسے چھوٹی حویلی سے باہر نکال دیا اور کہا کہ اب اپنی زندگی کے بقیہ دن لکشمی کے تلوے چاٹتے ہوئے گزار دے۔

ایک دو دن کے بعد بائو حویلی میں ایک نوجوان لڑکے کو اپنے ہمراہ لے کر آیا اور بتایا کہ یہ پریم چند ہے اس نے بارہ جماعتیں پڑھی ہیں۔ حساب کتاب میں پکا ہے اور ٹیک اور ایمان دار بھی ہے۔ پریم چند ان ہی کسانوں میں سے کسی کا لڑکا تھا۔ جو بلرام کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔

میں نے اس سے چند ضروری باتیں پوچھیں اور پھر اسے منشی کی جگہ ملازم رکھ لیا۔ اسے ہر بات اچھی طرح سے سمجھا دی۔ وہ ایک سمجھ دار لڑکا تھا۔ سب کچھ بہت جلدی سمجھ گیا۔ میں نے پچھلے برسوں کے کھاتے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ ان میں منشی نے جتنی گڑبڑ کی ہے تم وہ سب درست کرو پھر میرے پاس آنا۔

تین چار روز انہی چکروں میں پڑے پڑے گزر گئے شکر تھا کہ سارے معاملات بہ خیر و خوبی نمٹ گئے۔ میں اتنا زیادہ مصروف رہا کہ رانی سے بھی بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ اب اطمینان ہوا اور میں فارغ ہوا تو سوچا رانی کے احوال پوچھے جائیں۔

میں رانی کے کمرے کی جانب جا رہا تھا تو میں نے رانی کو پریشانی کی حالت میں ایک جگہ بیٹھے ہوئے دیکھا اور اس وقت بھی اس کے گرد حویلی کی ساری ملازمائیں پریشان صورت بنائے کھڑی تھیں۔ ان سب کو اس حالت میں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور میں رک گیا اور وہیں سے کھڑے کھڑے آواز لگائی۔

''رانی! کیا بات ہے؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟''

میری آواز پر چونک کر رانی اور ساری ملازماؤں نے میری جانب دیکھا۔ تب رانی تیزی سے اُٹھ کر میری جانب آئی اور بولی۔

''کچھ ٹھیک نہیں ہے بلرام جی بھگوان جانے کہ اس گاؤں میں یہ کیا انیائے ہو رہا ہے۔ ایک ہفتے میں یہ تیسری لڑکی ہے جو غائب ہوئی ہے۔''

''ارے!'' میں نے تاسف سے کہا۔ ''اب کون سی لڑکی اور کہاں سے غائب ہوئی ہے؟''

''سرسوتی!'' رانی نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سرسوتی! ہماری حویلی کی ملازمہ۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں بلرام جی وہ بھی کل شام کو مندر گئی تھی مگر ساری رات گزر گئی وہ بھی حویلی لوٹ کر نہیں آئی ہے۔'' سرسوتی کے غائب ہونے کا سنا تو مجھے شمشیر کا خیال آیا کہ کہیں اب تو اس کی معشوقہ غائب ہوگئی۔ اس کا پتا وہی لگائے گا۔

(باقی آئندہ)

Pdfby Roadsign
www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

ادھورے خواب

محترم عمران احمد صاحب!
السلام علیکم!

ہمارے معاشرے میں عموماً مردوں کی اکثریت زندگی گزارتی ہے۔ اوپر سے کچھ، اندر سے کچھ ان کی مثال گرگٹ کی طرح ہوتی ہے۔ جو وقت اور حالات کے مطابق اپنا رنگ تبدیل کرتا رہتا ہے۔ یہ تحریر بھی ایک ایسے مرد اور مظلوم عورت کی ہے جس کے خواب ادھورے رہ گئے تھے۔ امید ہے یہ کہانی قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔

خیر اندیش
طاہرہ جبیں تارا
لاہور

موسم صبح سے ہی ابر آلود تھا۔ بادلوں کے ٹکڑے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے' یوں جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں' ہلکی ہلکی پروا چل رہی تھی۔ اتنی شدید گرمی کے بعد موسم کا یہ رنگ اللہ تعالیٰ اس ناشکری قوم کو اپنی رحمتوں سے نواز رہا تھا۔ اسی اثناء میں ہلکی ہلکی پھوار ابر نیساں کی مانند برسنے لگی۔ یہ موسم اسے ہمیشہ سے ہی پسند تھا' اسے امی نے کہا بھی تھا کہ آج اسکول نہ جاؤ مگر وہ نہ مانی' امی آپ جانتی تو ہیں کہ یہ ابر آلود موسم مجھے کتنا پسند ہے اور ایسے موسم میں گھر بیٹھنا کچھ اچھا نہیں لگتا اور آج تو میں نے اور صوبیہ نے شاپنگ کرنے انارکلی جانا ہے۔ سو سویٹ امی آج تو بالکل بھی چھٹی نہیں کرنی ورنہ صوبیہ لی بی مجھے جان سے مار دے گی' یہ کہہ کر وہ اسکول چلی گئی۔ بچے بھی آج اسکول کم ہی آئے تھے۔ اس لیے دونوں نے دو تین پیریڈ بچوں کو پڑھایا اور پھر میڈم سے اجازت لے کر انارکلی چلی گئیں۔

'یار تم نے صرف دو سوٹ لیے ہیں اور چلا چلا کر تھکا مارا ہے۔ جناب میں زیادہ ونڈو شاپنگ کرتی ہوں۔'' صوبیہ نے کہا۔

''ویسے یار ونڈو شاپنگ کا بھی اپنا ہی مزا ہے' اب دیکھو نا کتنے ہی ڈیزائن میرے کمپیوٹر ذہن میں نقش ہو گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے ڈیئر ان ڈیزائنز سے میں بھی مستفید ہوں گی۔''

''اوکے اوکے تمہیں بھی سوٹ سی دوں گی یاد رکھو گی' کس حاتم طائی سے پالا پڑا تھا۔'' صوبیہ نے حاتم طائی بنتے ہوئے رملہ سے کہا۔

''چلو اب ریگل سے چاٹ کھاتے ہیں' بہت تھکاوٹ ہو گئی ہے اور پھر امی بھی گھر میں اکیلی ہیں بس اب چاٹ کھا کر گھر چلیں گے' ٹھیک ہے رملہ۔''

دونوں ریگل آ گئیں اور چاٹ کھانے لگیں۔

''رملہ یہاں کی چاٹ کا جواب نہیں ہے۔ حالانکہ میں نے بانو بازار سے بھی چاٹ کھائی ہے مگر تم سچ کہہ رہی ہو کہ یہاں کی چاٹ مجھے ہمیشہ کھینچ کر لے آتی ہے۔ رملہ نے کہا اور پھر اچانک اس کی نظر اس پر پڑی اسے یوں لگا جیسے وقت تھم گیا ہو' ہاں وہ ستم گر ویسا ہی تھا۔ جیسے دو سال پہلے اس نے چھوڑا تھا' کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا' صرف وقت بدل گیا تھا۔ جو رشتہ اس سے بندھا ہوا تھا۔ وقت کی گردش نے اسے دھندلا دیا تھا مگر دل کا رشتہ ابھی

بھی قائم تھا' اس کا جی چاہا کہ اسے پکارے رمیز میرے بنا تمہارے دن کیسے گزرے' جھوٹی محبت کا ہی سہی ایک تعلق تو تم نے مجھ سے قائم کیا ہی تھا مگر وہ سوچ کر رہ گئی۔ اس کی آن نے گوارا نہیں کیا کہ وہ اس شخص کو بلائے جس نے اسے سرتاپا بدل دیا تھا جس کی جھوٹی محبت میں کھو کر اسے دن رات تو کیا اپنی بھی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ وہ اسے دھندلائی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور کسی کا قول اسے یاد آ گیا کہ ''بچھڑنے سے محبت میں شدت پیدا ہوتی ہے اگرچہ جذبوں پر وقت کی گرد ش تہیں ڈال دیتی ہے مگر یہ جذبے کبھی نہیں مرتے کبھی بھی نہیں ہزار چاہنے کے باوجود بھی تمام کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔'' اس کا اندازہ اسے اس سے ہوا کہ وہ شخص اپنی تمام تر بے وفائی کے باوجود کسی دیوتا کی طرح اس کے من مندر کے سنگھاسن پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

''رملہ رملہ کیا ہوا ہے۔''

''ہوں..... ہاں..... کچھ بھی نہیں۔''

''دیکھو تو اپنی رنگت اور تمہاری آنکھوں میں چمکتے موتی۔ رملہ کچھ تو بولو کیا ہوا ہے؟''

''یار کچھ بھی نہیں ہوا' بس وہ مرچیں زیادہ ڈال دی ہیں نا تو اس لیے آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں' چلو گھر چلتے ہیں۔'' اور وہ گھر لوٹ آئی۔

''امی پلیز مجھے چائے کا ایک کپ بنا دیں۔'' رملہ نے کہا۔

''بیٹی کھانا کھا لو۔'' رملہ کی امی نے کہا۔

''نہیں امی بھوک نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی کمین گاہ میں آ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ یوں جیسے در بند کرنے سے وہ اذیت ناک لمحے بھلا سکے گی۔

''اف خدایا! میں جتنا اسے بھلانا چاہتی ہوں وہ کیوں میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ یہ زندگی کا کیسا دوراہا ہے کہ جن یادوں سے جن لوگوں سے ہم پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں وہ پل پل اذیت دینے کے لیے کسی نہ کسی بہانے ہماری راہوں میں آ جاتے ہیں۔ گزری باتوں اور یادوں کے اوراق تہہ در تہہ اس کے سامنے کھلتے چلے گئے۔ جن یادوں سے وہ فرار چاہتی تھی' جنہیں دل کے نہاں خانوں میں دفن کیا ہوا تھا وہ آج بھی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ اسے اذیت دینے آ موجود ہوئی تھیں۔''

''بیٹی رمیز ایک اچھا لڑکا ہے۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنی سکت اور دم خم نہیں رہا کہ تیری حفاظت کر سکوں' اس لیے میں نے سوچا کہ رمیز سے تمہاری شادی کر دوں۔''

''مگر امی ابھی میں پڑھنا چاہتی ہوں اور پھر میں آپ کی بیٹی نہیں بیٹا ہوں' میں کسی صورت آپ کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی۔''

''رملہ بیٹی ہر لڑکی کی شادی ہوتی ہے۔ اگر وقت پر ان کی شادی نہ کی جائے تو وہ ساری عمر اپنے والدین کی دہلیز پر گزار دیتی ہیں۔ تمہارا بھائی ہے نہ باپ کا سہارا ہی باقی رہا ہے اور میری تو وہ حالت ہے کہ آج ہوں کل نہیں۔ میری خوشی اور سکون اسی میں ہے کہ میں تیرے ہاتھ پیلے کر دوں تاکہ سکون سے مر سکوں اور یہ لڑکیوں کی ریت ہے کہ وہ نہ چاہتے ہوئے چپ چاپ سر جھکا دیتی ہیں چاہے روح میں سناٹے ہی کیوں نہ بسیرا کر لیں۔'' اپنی خواہشوں اور خوشیوں کو پس پشت ڈال کے دوسروں کی خاطر جینا ہی انسانیت ہے۔'' اس نے اپنی امی کے سامنے سر جھکا دیا اور ایم اے کرنے کا خواب بھلا کر وہ ایک ماہ کے اندر

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

اندر رملہ ظہیر سے رملہ رمیز بن گئی۔ فقط تین بولوں نے اس کی شخصیت بدل کر رکھ دی رمیز خوابوں کے شہزادے کی مانند خوب صورت اور ہینڈسم تھا خاص طور پر اس کے چہرے پر اس کی خوب صورت آنکھیں' اس کی فرینڈز اکثر رمیز کو دیکھ کر فراز کا شعر سناتیں۔

ان کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے
فراز
سونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

اور اسے اپنی امی کے انتخاب پر بے حد فخر تھا۔ اسے اپنے آپ پر رشک آتا' رمیز اسے چاہتا بھی بے انتہا تھا اور وہ بھی اس کی چاہت میں مست اور سرشار سب کو بھلائے بیٹھی تھی۔ اس کی کزنز اور فرینڈز گلہ شکوہ کرتی تھیں کہ ''اب تم ہمارے گھر آتی ہی نہیں ہو' ایسی سسرال کو پیاری ہوئی ہو۔ تم تو سرتاپا ہی بدل گئی ہو سوائے رمیز کے تمہیں کچھ سوجھتا ہی نہیں۔'' تو وہ ہنس پڑتی اور کہتی ڈیئر ''اب میرا سب کچھ رمیز ہی ہے۔ میرا مجازی خدا' پھر مجھے اور کوئی کیسے نظر آسکتا ہے۔'' دن یونہی ہنسی خوشی گزر رہے تھے ایک دن رمیز نے کہا۔

''رملہ پلیز! تم کٹنگ کروالو' یہ اتنے لمبے بال تم کیسے سلجھاتی ہو' سچ مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے۔''

''رمیز میں نے ان بالوں کی بڑی حفاظت کی ہے انہیں کٹواتے ہوئے میرا دل دُکھتا ہے۔''

''تم میری خاطر اتنا بھی نہیں کرسکتیں۔'' رمیز نے منہ پھلاتے ہوئے کہا اور وہ بے بس ہوگئی۔

''اوکے باس میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں اور آپ کی پسند سے بال کٹواتی ہوں۔'' اور یوں اس نے رمیز کی پسند کا ہیئر اسٹائل اپنالیا۔ حالانکہ بال کٹواتے ہوئے جو کچھ اس کے دل پر گزری وہی جانتی تھی' مگر یہ جذبے انسان کو بے بس کردیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ رمیز نے اسے اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ کہاں وہ شوخ رنگوں اور میک اپ سے بھاگنے والی اب ہمہ وقت میک اپ میں نظر آتی اور شوخ لباس زیب تن کرتی اس کی اپنی پسند اور مرضی باقی ہی نہ رہی۔ کٹھ پتلی بن گئی' جو صرف رمیز کے اشاروں پر چلتی' کھانا پینا' اوڑھنا' بچھونا سب کچھ وہ رمیز کی مرضی اور پسند سے کرتی سب اس کا مذاق اُڑاتیں۔ مگر اس کا ایک ہی جواب ہوتا کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے اور میں نے اپنی پسند' مرضی اور انا ہی تو کھوئی ہے نا مگر اس کے بدلے مجھے رمیز کی لامحدود اور انمول چاہت ملی ہے اور یہ بیوی کے لیے خوش نصیبی کی بات ہے کہ اسے پل پل کی خبر رکھنے والا ساتھی نصیب ہو اور ایسے لمحے انسان ہار بھی جائے تو بازی مات نہیں سب اسے پاگل اور شوہر پرست کہہ کر چھیڑتے مگر وہ رمیز کی محبت میں سرشار جس کا عکس اس کے چہرے سے ہویدا ہوتا۔

وہ سب کی طنزیہ باتیں اور ریمارکس سنتی مگر اس کے لبوں پر صرف رمیز کا ہی نام ہوتا جو بندھن اس سے بندھا تھا وہ بہت خوب صورت اور اٹوٹ تھا اور اس تعلق کو قائم رکھنے کے لیے تو وہ جان بھی قربان کرسکتی تھی۔ وہ مسرور اور شاداں تھی کہ اس کا جیون ساتھی اپنی پسند سے بڑی چاہت کے ساتھ اس کے لیے کپڑے' جیولری' میک اپ اور کیسز اور سی ڈیز لے کر آتا ہے' مگر یہ لمحے' یہ وقت' یہ خوشیاں اور چاہتیں وہ صرف چھ ماہ کے لیے اپنے مقدر میں لکھا کر لائی تھی۔ کاتب تقدیر نے بڑے

مختصر لمحوں کے لیے اسے خوشیوں سے مستفید ہونے کا موقع دیا تھا اور اب تقدیر ایز ی دی دور کھڑی مسکرا رہی تھی اور اس کی محبت کا محل چکنا چُور ہو چکا تھا۔

ہاں اس شام واقعی وقت کی گردش تھم گئی۔ جب اچانک اس نے رمیز کی باتیں سنیں۔ وہ لمحہ اے کاش کہ وہ لمحہ اس کی زندگی میں نہ آیا ہوتا۔ جس نے اس کی انا کو اتنا مجروح کیا کہ وہ اپنے آپ سے بھی نظریں نہ ملا سکی۔ آہ عورت جو وفا کے نام پر مٹ جاتی ہے' اپنا آپ تج دیتی ہے مگر مرد کی فریب کاری اور دھوکا دہی کو نہیں سمجھ سکتی۔ جو ہمیشہ اس بھولی اور معصوم کو محبت کے نام پر ہی لوٹتا ہے۔ محبت و چاہت کا فریب دے کر ہی ڈستا ہے۔ چاہے یہ مرد کسی بھی روپ میں ہو۔ سنا تھا باپ اور بھائی تحفظ کی علامت ہیں مگر اس زمانے میں تو اس روپ نے بھی فریب کاری کی چادر اوڑھ لی ہے۔ باپ اور بھائی کا تقدس بھی ختم ہوکر رہ گیا ہے یہ بھی دولت و جائیداد کی خاطر اس معصوم عورت کو زندہ درگور ہی کررہے ہیں۔ وہ بھی تو اپنے شوہر سے دھوکا کھا بیٹھی۔ شوہر جس کی چاہت نکاح کے دو بول کے ساتھ ہی اس کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ آہ وہ شام جب رمیز اپنے کمرے میں کسی سے باتیں کررہا تھا۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا آیا کہ اس نے دوسرے فون سے ان کی باتیں سننی شروع کردیں اور پل بھر میں اس کے خواب چکنا چُور ہوگئے۔ رمیز کی جھوٹی محبت کا پول کھل گیا۔ یہ بے خبری بھی کتنی اچھی ہوتی ہے کہ انسان ہر دکھ اور غم سے نا آشنا رہتا ہے مگر آگہی تو عذاب بن کر اُترتی ہے جو جسم و جان کو راکھ بنا دیتی ہے۔ اس نے سنا وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

''آج میں نے تمہیں دو تین سال بعد دیکھا تو مجھے گزرے لمحے یاد آگئے ہے' تم کب سعودیہ سے آئیں؟''

تو کسی نے کہا۔ ''کل آئی ہوں یار..... میں نے سنا ہے تم نے شادی کرلی۔ گزرے پل کیوں یاد آگئے؟ بہلا رہے ہو نا مجھے۔''

''نہیں شافعہ جی' میں تو کسی لمحے بھی تمہیں نہیں بھلا سکا' بس امی ابو کے مجبور کرنے پر شادی تو کرلی مگر میری روح آج بھی تمہاری متلاشی ہے۔ میں نے تو ہر پل تمہاری کمی محسوس کی۔ تم نہ ہوتے ہوئے بھی ہر پل میرے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم رہی ہو۔ تمہاری یاد ہی تو میری زندگی تھی۔''

''اوہ..... ہو..... بیوی کے ہوتے ہوئے بھی جناب نے مجھے یاد رکھا میری کمی محسوس کی نا ممکن.....''

''شافعہ غلط نہ سمجھو' اس سے تو میرا تعلق صرف کاغذی ہے۔ تم سے تو روح کا تعلق ہے۔ کاغذی تعلق تو کسی وقت بھی توڑا جاسکتا ہے مگر روح کا تعلق کبھی نہیں ٹوٹتا' سوائے اس کے کہ روح اس خاکی جسم کا ساتھ چھوڑ دے۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو رمیز؟ کیا میں واقعی اتنی خوش نصیب ہوں کہ تمہاری چاہت آج بھی میرے لیے ہے؟''

''ہاں شافعہ اور سنو یہ بھی سچ ہے کہ میں نے رملہ کو جو میری بیوی ہے' تمہارے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی' تاکہ تم جسمانی طور پر تو میرے سامنے رہو۔ میں نے تمہاری پسند کو اوّلیت دی' جانتی ہو میں نے تمہارا ہیئر اسٹائل' تمہاری پسند کے کلرز' پرفیوم' جیولری یہاں تک کہ تمہاری

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

پسند کے سونگز موویز سب کچھ اس پر آزمایا اسے تمہارا روپ دینے کی کوشش کی مگر وہ پھر بھی تمہارے جیسی نہیں بن سکی۔ میں نے اس میں ہمیشہ تمہارا چہرہ تلاشنے کی کوشش کی اور سرتاپا اسے تمہارا روپ دیا مگر شکل تمہاری نہیں دے سکا' تمہارا انداز نہیں دے سکا۔ انسان ہوں ناخدائی کا دعویٰ تو نہیں کرسکتا! مگر اس سب کے باوجود وہ رملہ ہی رہی ہے' میری محبت' میری چاہت' میری روح شافعہ نہیں بن سکی۔''

''ویری امیزنگ ارے رمی تم تو مجھے حیران کیے دے رہے ہو۔ تمہاری بیوی کی اپنی کوئی پسند' انا اور خودداری نہیں ہے جو وہ تمہارے سامنے گھٹ پتلی بن گئی میں تو کبھی یوں مکمل طور پر کسی کی پسند میں نہیں ڈھل سکتی کہ اپنی پسند رہنے ہی نہ دوں۔''

''ڈیئر وہ ایک معصوم اور مشرقی لڑکی ہے۔ جو اپنا سب کچھ مجازی خدا کو ہی سمجھتی ہے' چاہے مجازی خدا کے دل میں اس کے لیے کوئی جذبہ ہی نہ ہو۔ بس یار میں نے اسے جھوٹ موٹ اپنی محبت کا یقین دلایا اور تمہاری پسند پدہ چیزوں کے انبار لگادیے اور اس نے اپنی پسند ختم کرکے میری پسند سمجھتے ہوئے سب کچھ اپنالیا۔ یہاں تک کہ میری سوچ بھی جو کہ تمہاری سوچ تھی' اب تم آ گئی ہو نا' تو.....''

''اوکے ڈیئر مگر میں محبت شیئر نہیں کرسکتی' تم میرڈ ہو۔ کاش تم نے اتنی جلدی نہ کی ہوتی تو پھر کچھ سوچا جاسکتا تھا۔ کاش تم نے میرا انتظار کیا ہوتا۔''

''جناب ابھی بھی تمہاری محبت میں کوئی شریک نہیں۔ جہاں تک رملہ کی بات ہے تو نہ مجھے اس سے دلچسپی ہے نہ محبت۔ میں اسے آزاد کردوں گا۔''

''اوکے رمی' کل اپنی پرانی جگہ پر ملتے ہیں' ٹھیک پانچ بجے' پھر کچھ سوچیں گے۔''

یہ سب سنتے ہوئے اس کی انا کو زبردست چوٹ لگی تھی۔ ''میں آج تک جھوٹی محبت کے سہارے جیتی رہی' ناپسندیدہ ہستی بن کر اس گھر کے آنگن میں اُتری۔ کسی کی اُترن میرا نصیب تھی۔ میری حیثیت تو شوکیس میں سجے کھلونے سے بھی کمتر ہے۔ کھلونا ٹوٹ جائے تو پھر اسے شوکیس سے نکال کر پھینک دیا جاتا ہے مگر اس کی حیثیت' اس کا روپ اپنا ہی رہتا ہے۔ میری اپنی حیثیت تو ختم کردی گئی ہے میرا روپ تو توڑ پھوڑ دیا گیا ہے کسی اور کے لیے' میں' میں اب کیا ہوں؟ رملہ یا شافعہ یا کوئی بھی نہیں۔ اس کی سوچیں بے ربط ہوگئی تھیں اب اس گھر کو سجانے کے لیے کوئی دوسری آئے گی۔ مگر وہ دوسری تو نہیں' دوسری تو میں ہوں وہ تو پہلی ہے جو آج بھی رمیز کے من آنگن کی دیوی ہے۔ آہ یہ گھر جس کی سجاوٹ کے لیے میں نے اپنا تن من دھن سب کچھ وار دیا اب یہ میرا نہیں رہا اس کی رگیں پھٹنے لگیں۔''

رمیز گنگناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ ''رملہ' رملہ کہاں ہو؟ ارے تمہیں کیا ہوا؟''

''مجھے..... مجھ سے پوچھ رہے ہیں آپ کہ مجھے کیا ہوا ہے؟''

''رملہ تمہارے لہجے میں اتنی اجنبیت ڈیئر! کیا بات ہے اور رنگت کیسے پیلی ہورہی ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''رمیز صاحب' آپ کا کھیل ختم ہوگیا ہے' مجھے مت فریب دیں۔ آپ کا بھرم ٹوٹ چکا ہے۔ دو غلا پن اُتر گیا ہے۔ میں ہی پاگل تھی' تم مجھ میں کسی

اور کا چہرہ تلاشتے رہے اور میں اس جھوٹی محبت پر ایمان لے آئی۔ یہی میرا جرم ہے نا کہ میں نے مجازی خدا کے حکم کو حکم خداوندی سمجھ کر نبھایا' کہ یہی میری ماں کی خوشی تھی اس کی تربیت تھی کہ میری وجہ سے رمیز کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ انہوں نے مجھے یہی سبق دیا تھا کہ بیٹی شادی کے بعد تمہارے شوہر کی پسند ہی تمہاری پسند ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ مقدس بندھن میں باندھ کر مجھے لوٹا جارہا ہے۔ رمیز میں نے تو خدا کے حکم کو مانا ہے نا جس نے شوہر کو بلند رتبہ بخشا ہے۔ پھر تم نے مجھے کیوں فریب دیا؟ تم مجھے نفرت سے دھتکار دیتے۔ مجھے اپنے دل کی بات بتادیتے۔ اللہ کی قسم میں اسے نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیتی۔ اپنے ہاتھوں سے تمہاری محبت کو سجا کر اس آنگن میں لے آتی۔ مگر تم نے تو مجھے ایسا فریب دیا ہے کہ میں اپنی نظروں میں ہی گر گئی ہوں۔ اب یہاں رہنا میرے لیے ناممکن ہے۔ بس تم سے اتنی التجا ہے کہ مجھے طلاق نہ دینا کیونکہ سب مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ اگر تم نے مجھے طلاق دے دی تو ہوسکتا ہے کہ امی پھر کسی کے پلّے باندھ دیں جب کہ میں نے تنہا جینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

''پلیز رملہ' میری بات سنو۔''

''نہیں رمیز! میں نے سب کچھ سن لیا ہے' اب مزید سننے کی تاب نہیں۔ تم مرد عورت کو کٹھ پتلی ہی سمجھتے ہو۔ جو تمہارے اشاروں پر ناچتی رہے۔ تین بول پڑھا کر لاتے ہو اور پھر بنا کسی جرم کے تین لفظ بول کر طلاق کا کلنک بھی عورت کے ماتھے پر سجادیتے ہو۔ واہ خدایا تُو نے بہت طاقتور بنایا ہے مرد ذات کو..... سنو رمیز! جس کا بہروپ تم نے مجھے دینے کی کوشش کی ہے' وہ یقیناً بہت خوب صورت ہوگی اور خوش نصیب بھی کہ تم سے بچھڑ کر بھی تم سے بچھڑ نہیں سکی۔ تم اس سے شادی کرلینا بہت جلد تاکہ کسی اور کو فریب اور دھوکا نہ دے سکو.....''

''پلیز رملہ رکو' تم غلط کررہی ہو' اس طرح گھر چھوڑنا سوچو.....''

''اب سوچنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ سمجھوتا ہمیشہ لڑکیاں کرتی ہیں مگر رمیز اب میں سمجھوتا نہیں کرسکتی۔ تم نے میری انا کو مجروح کیا ہے۔ میں نے اپنی پسند ناپسند خودداری سب کچھ داؤ پر لگا کر تمہاری آواز پر لبیک کہا مگر اس کا صلہ یہ ہے کہ تم نے جھوٹی محبت کا کھیل کھیلا' بیوی سے..... کتنی عجیب بات ہے' ہاں اگر تم مجھے اپنی محبت کے بارے میں پہلے بتادیتے اور مجھے شافعہ بنانے کے بجائے رملہ ہی رہنے دیتے تو میں سمجھوتا کرلیتی' کاش تم نے میرے ظرف کو آزمایا تو ہوتا مگر اب میں پل پل اس اذیت کے ساتھ نہیں جی سکتی کہ جس چھت تلے میں رہ رہی ہوں اس کے نیچے ایک فریبی اور دھوکے باز شخص بھی ہے۔ جس کے ساتھ میرا تعلق گہرا بھی ہے مگر اس کے ساتھ کھوکھلا بھی.....''

وہ گھر چھوڑ کر آ گئی' رمیز نے بعد میں ملنے کی کوشش کی مگر اس نے ملنے سے انکار کردیا' پھر اس نے سنا کہ رمیز نے شافعہ کے ساتھ شادی کرلی ہے اور اس نے تمام یادوں کو اپنے من میں دفنا کے نئی زندگی کا آغاز کیا اور ایک اسکول میں جاب کرلی۔

''رملہ! اندھیرا کیے کیوں بیٹھی ہو.....؟ باہر دیکھو کتنا اچھا موسم ہے۔''

اس نے سوچا امی موسموں کا تعلق بھی دل کی

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

خوشیوں سے ہوتا ہے اگر دل شاداں و مسرور ہو تو تپتی دھوپ بھی ٹھنڈی پھوار بن جاتی ہے لیکن اگر دل اُداس ہو تو بہار بھی خزاں دکھائی دیتی ہے۔

''رملہ بیٹی کیا بات ہے باہر آؤ۔'' اور پھر وہ اندر آ گئیں۔ ''تم رو رہی ہو؟''

''نہیں تو ایسے ہی آنکھوں میں کچھ پڑ گیا ہے۔''

''رملہ میری جان مجھ سے اپنا دُکھ چھپا رہی ہو۔ میں تمہاری ماں ہوں جو تمہاری رگ رگ سے واقف ہے۔ میں تو اسی وقت ٹھٹک گئی تھی جب تم اسکول سے آ کر کمرے میں بند ہو گئیں۔ میں نے سوچا تم اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لو' کیا رمیز سے ملاقات ہوئی ہے؟''

''نہیں امی! ملاقات تو نہیں البتہ راستے میں اسے دیکھا تھا۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ایسا تو ہو جاتا ہے نا۔''

''تمہیں دیکھ کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ کاش میں اتنی جلد بازی سے کام نہ لیتی۔ ظاہر دیکھا باطن کو پرکھا ہی نہیں۔''

''نہیں امی ایسا مت سوچا کریں۔ اس میں آپ کا کیا قصور' یہ سب قسمت کا کھیل ہے۔ میرے نصیب میں یہی لکھا تھا۔''

''تم بھی تو ضدی ہو' شافعہ اور رمیز دونوں تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری شادی کرنا جرم تو نہیں ہے تم اسے معاف کر دو اور سمجھوتا کر لو۔ اگر سمجھوتا نہیں کر سکتی تو طلاق لے لو۔ تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ میں تمہارا کہاں تک ساتھ دے سکتی ہوں۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ بھیڑیے ہیں ہر طرف۔ جو گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ عورت کا تنہا رہنا بہت مشکل ہے۔ جب تم اسکول جاتی ہو میں کس طرح ہولتی رہتی ہوں' یہی میری بات مان لو۔ سر پر کسی مرد کا سایہ ہونا آج کل کے دور میں بے حد ضروری ہے۔ رمیز نہیں تو کوئی اور.....''

''پلیز امی! آئندہ ایسی بات مت کیجئے گا کیونکہ جو بندھن آپ نے باندھا تھا وہ میں نے سچے دل سے قبول کیا تھا اور اپنے سچے اور پاک جذبے اس فریبی شخص کے نام کر دیے تھے۔ اس لیے میں اب کسی اور کو فریب نہیں دے سکتی۔ کیونکہ باوجود اس سے بچھڑنے کے وہ اب بھی میرے لیے معتبر ہے کہ اس سے رشتا ہی ایسا تھا اور یہ جذبے تو دل کے گہرے سمندر میں چاہے ہزاروں سال بھی پابند سلاسل رہیں' یادوں' خیالوں اور خوابوں کی نگاہوں سے اوجھل رہیں' تب بھی پوری شدت کے ساتھ زندہ رہتے ہیں اور امی وہ شخص جسے آپ نے میرا شریک سفر بنایا تھا۔ وہ آج بھی اپنی تمام تر فریب کاریوں کے باوجود میرے اندر موجود ہے میں اسے نہیں بھلا سکتی۔ نہ اس سے سمجھوتا کر سکتی ہوں اور نہ کسی اور کا تصور کر سکتی ہوں۔ بس مجھے اسی طرح جینے دیں میں بہت خوش ہوں۔''

''ٹھیک ہے رملہ بیٹی! جس میں تم خوش ہو وہی میری خوشی ہے۔ خدا تمہیں سدا خوش اور اپنی امان میں رکھے۔''

''بس امی مجھے یوں ہی دعائیں دیتی رہا کریں.....'' اس نے امی کا ہاتھ تھام کر کہا اور ان گنت آنسوؤں کو پلکوں کی دہلیز پر روک لیا۔

چمگادڑ

جناب ایڈیٹر نئے افق
تسلیمات و آداب!
آپ کا پرچا گزشتہ دنوں لکھنؤ سے ممبئی جاتے ہوئے اپنی ہم سفر پاکستانی فیملی کے ذریعے دیکھا۔ بلکہ انہوں نے مجھے تحفتاً عنایت کر دیا۔ ان کا شکریہ۔ ماشا ۔اللہ اردو کا اچھا پرچا ہے۔ کہانیوں کا معیار بھی اعلیٰ ہے۔ خاص طور پر سچی کہانیوں کا پورشن مجھے پسند آیا ایک کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ یہ کہانی میرے بچپن کی ہے اس کا مرکزی کردار شاید اب دنیا میں نہیں رہا لیکن اس کے دیگر کردار آپ کو اپنے ہاں بھی ملیں گے۔

بہت سی دعاؤں کے ساتھ
رافعیہ نور الامین
باندرہ ممبئی (انڈیا)

سلور پارک کے بنگلہ نمبر ۵ کے بارے میں لوگ بس اتنا جانتے تھے کہ وہاں شریف صاحب رہتے تھے۔ جو اسم بامسمّٰی تھے۔ ان کے گھر کا کتا تک شریف تھا' نہ کبھی کسی کی ٹانگ لیتا تھا' نہ کسی آنے والے پر بھونک بھونک کر اس کے اوسان خطا کرتا تھا۔ بلکہ آنے والے کو بڑی سلامت روی سے شریف صاحب تک پہنچاتا تھا۔ ویسے وہاں بھی کبھی چندہ مانگنے والوں کے سوا اور کوئی آتا بھی کم ہی تھا۔ چندہ مانگنے والے تو بھکاری کالونی تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں تو شریف صاحب کے پاس باپ اور دادا کا چھوڑا ہوا بہت کچھ تھا۔ بس ایک اولاد نہیں تھی۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ انہوں نے زندگی میں کبھی سر سے سہرا باندھا ہی نہ تھا۔ وہ ایک خاموش زندگی گزارنے کے عادی تھے اور دنیا میں کوئی ایسی عورت پیدا ہی نہیں ہوئی تھی جو اُن کی خاموشیوں کو شور میں بدل دے۔

پڑوسیوں کو بھی شریف صاحب میں کسی طرح کی دل چسپی نہیں تھی۔ عرصہ تک گھڑی بند ہو تو لوگ اُدھر دیکھنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی لیے جب ان کے گھر سے ایک شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آئی تو بھی کسی نے پروا نہیں کی۔ سوچا کسی مہمان کا بچہ ہوگا۔ وہ بچہ کون تھا۔ یہ راز ان کا ملازم حفیظ بھی نہیں جان سکا تھا۔

اسے خود حیرت تھی کہ خود رو پھول کی طرح یہ کہاں سے اُبھ آیا۔ پھر اس نے سوچا کہ اس کا مالک شادی بیاہ کے جنجال میں پھنسے بغیر ہی اپنی زندگی کو خوش رنگ بناتا آیا تھا اور بچہ اسی محبت کی نشانی معلوم ہوتا تھا۔

حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ شریف صاحب کی تنہا زندگی اتنی بے مقصد بھی نہیں تھی۔ وہ دولت جو انہیں ورثے میں ملی تھی وہ ایک آرام دہ اور بے فکر زندگی تو دے سکتی تھی' لیکن ذہنی تسکین نہیں۔ ان کے کچھ کامپلکس تھے' جنہوں نے انہیں ہمیشہ سوسائٹی کلب اور دوست و احباب سے الگ تھلگ رکھا تھا' لیکن خدمتِ خلق سے وہ باز نہ رہے۔ نیچا نگر کی جھگی جھونپڑیوں میں ان کا آنا جانا تھا۔ پیسا بٹتا ہے تو دُکھ بھی بٹ جاتے ہیں۔ اس سے آگے کچھ اور جاننے کی نہ کسی کو ضرورت رہتی ہے نہ فرصت۔ انہیں بوکھلا دینے والے سوال کوئی نہیں کرتا کہ وہ کون ہیں' کہاں سے آئے ہیں' کیا کرتے ہیں؟ جب کہ اعلیٰ سوسائٹی میں انسان اور اس کی شخصیت کا پوسٹ مارٹم کر دیا جاتا ہے۔

ان ہی جھگی جھونپڑیوں میں وہ رہتی تھی' جسے سب تورا کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ کون تھی۔ اس کا اصلی نام کیا تھا' یہ کوئی نہیں جانتا تھا کیونکہ اس نے کسی کو بتایا ہی

www.pkdigest.com

Pdfby Roadsign

نہیں۔ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتی تھی یہ بھی کسی کو پتا نہیں تھا۔ اس کے جھونپڑے کے کسی طاقچے میں یا دیوار پر یسوع مسیح یا بھوانی ماں کی تصویر نہیں لگی تھی۔ نہ کلمۂ طیبہ کی فریم کی ہوئی تحریر' کیوں کہ اس کے جھونپڑے کی کوئی دیوار ہی نہیں تھی۔ بس ایک سائبان تھا اور دیواروں کی جگہ چیتھڑے لٹکے تھے' لیکن عورت افزائش نسل کا مقدس فرض انجام دیتے ہوئے یہ تھوڑی دیکھتی ہے کہ اس کا بچہ کسی محل میں جنم لے رہا ہے' یا اصطبل میں یا کسی گپھا میں۔ بس تورا نے بھی اپنا فرض ادا کردیا۔ ننگے' بھوکے خون میں لتھڑے ہوئے ایک لوتھڑے کو جنم دے کر۔ پاس پڑوس کی عورتوں نے جیسے تیسے بچے کو پیدا کروادیا۔

تورا کوئی بوڑھی تو ہو نہیں گئی تھی' لیکن ان کا خیال غلط نکلا۔ تورا نے عین جوانی میں ہی اس بوڑھی دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔ اپنے بچے کو ایک روتا بسورتا بچپن دے کر' اور اسی بچے کو ہی شریف صاحب نے جھیل لیا تھا۔ انہوں نے تو محض ایک بے سہارا کو سہارا دیا تھا' لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ بچہ ان کی تمام تر توجہ کا مرکز بن جائے گا۔ گھر کے خاموش ماحول میں بچے کی کلکاریاں حفیظ کو بھی بھلی لگنے لگیں۔

ایک دن شریف صاحب باہر برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اچانک ہتھیلیاں چٹخاتا' ناچتا گاتا تیسری جنس کا ایک غول گھر میں داخل ہوا۔ شریف صاحب جو ایک خاموش اور شریفانہ زندگی کے عادی تھے۔ اس غول بیابانی کو آتا دیکھ کر بوکھلا گئے۔ اس سے پہلے کہ غول انہیں دیکھتا وہ بے تحاشا اخبار پھینک کر اندر بھاگ آئے اور دروازہ بند کرلیا۔ ان کا چہرہ زرد تھا اور ماتھا عرق آلود۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہے تھے۔ حفیظ نے انہیں فوراً پانی کا گلاس پیش کیا۔ اسے حیرت اس بات پر ہوئی کہ مالک کو اس قدر پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ وہ خود اکثر اس قبیلے کے افراد سے چھیڑ چھاڑ کرلیتا تھا اور ان کی رکیک' محابہ اور معنی خیز گالیاں سن سن کر ہنستا تھا۔

اس درمیان تیسری جنس نے ڈھول بجا بجا کر گانا ناچنا شروع کردیا۔

ہاں ہاں رے للا ہاں ہاں رے للا
جیو جیو رے للا جیو جیو رے للا

شریف صاحب بہ مشکل اُٹھے اور الماری سے دو سو روپے نکال کر حفیظ کو دیے کہ وہ انہیں چلتا کردے۔ حفیظ نے سو روپے راستے میں ہی اپنی جیب میں کھسکا لیے اور چند لمحے بعد واپس آکر بولا۔

''صاحب! وہ پانچ سو روپے سے کم پر نہیں مانتے۔''

شریف صاحب کسی بھی قیمت پر انہیں چلتا کرنے کو تیار تھے۔ حفیظ نے چار سو روپے میں اس ہنگم شور کو دفعان کیا۔ حفیظ تین سال سے شریف صاحب کے ہاں نوکری کر رہا تھا۔ شریف صاحب کو اس پر مکمل بھروسا تھا' لیکن ایک عجیب بات یہ تھی کہ حفیظ کو کبھی ان کی خواب گاہ میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ شریف صاحب صبح کو اپنی نگرانی میں ہی کمرے کی صفائی کراتے۔ ان کی غیر موجودگی میں کمرہ مقفل رہتا۔

ایک روز جب شریف صاحب غسل خانے میں تھے' بچے نے اپنا پیدائشی حق استعمال کر کے چلانا شروع کردیا' کچن میں کھانا بناتے ہوئے حفیظ نے اس کے رونے کی آواز سنی اور چپ ہو رہا اس کا خیال تھا کہ شریف صاحب ضرور اس کی بوتل تیار کر رہے ہوں گے اس لیے وہ ندیدہ' بے صبر رو رہا ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد بھی اس کی چیخیں بند نہ ہوئیں تو وہ پیلی اُتار کر چلا آیا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے بچے کو نہ سنبھالا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

کیونکہ وہ بچہ اب شریف صاحب کے لیے دنیا کی عزیز ترین چیز بن گیا تھا۔ اس کا خیال صحیح نکلا۔ شریف صاحب کمرے میں نہیں' غسل خانے میں تھے۔ حفیظ ان کی عادتوں سے واقف تھا۔ انہیں غسل خانے میں

کافی وقت لگتا تھا۔ اس نے بچے کو اٹھالیا اور اسے بہلانے لگا۔ لیکن آج بچے نے بھی پھیپھڑوں میں ہوا بھرلی تھی کہ شرط باندھ کر روئے گا۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ کھنے جیسی بچکانہ چیز سے بھی نہیں بہلے گا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر ڈھیر ساری پرفیومز کی شیشیاں رکھی تھیں۔ جدھر وہ بار بار ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ شریف صاحب کو بس یہی تو ایک شوق تھا۔ بہترین خوش بو میں عورتوں کے لیے بنی تھیں یا مردوں کے لیے پرفیومز کو تباہی سے بچانے کے لیے حفیظ نے ڈریسر کا خانہ کھولا کہ شاید وہاں کوئی ایسی چیز نکل آئے جس سے بچہ بہل جائے' لیکن وہ اچنبھے میں پڑ گیا۔ کیوں کہ وہاں سلمہٰ ستارے لگی ایک سرخ ساڑی اور عورتوں ہی کے استعمال کی کچھ چیزیں رکھی تھیں۔ حفیظ نے کھٹ سے دراز بند کردی۔ جاسوسی کے الزام میں اس پر پھٹکار پڑ سکتی تھی۔ وہ چپکے سے بچے کو لیے باہر نکل گیا۔ اس کا شباب یقین میں بدل گیا تھا کہ ہو نہ ہو وہ چیزیں بچے کی ماں کی یادگار ہی تھیں۔ جو شاید وہ چھوڑ کر چل بسی تھی۔ ایسی صورت میں شریف صاحب کا بچے سے والہانہ پیار بعید از قیاس نہیں تھا۔

دوسری بار کمرہ صاف کرتے ہوئے جب حفیظ نے سرخ چوڑی کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا پایا تو اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اب اس نے سوچا کہ وہ ساڑی اور چوڑیاں کسی مرحومہ کی نشانی نہیں تھی۔ بلکہ کوئی چاند سا چہرہ پچھلے دروازے سے شریف صاحب کی خواب گاہ میں طلوع ہوا تھا۔

عام طور پر شریف صاحب دس بجے کے آس پاس سو جایا کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی حفیظ کی بھی چھٹی ہو جاتی تھی' لیکن ایک رات حفیظ کے تجسس نے اسے سونے نہیں دیا۔ رات گئے دبے پاؤں اس نے شریف صاحب کے بیڈ روم میں جھانکا تو سن سے رہ گیا کیونکہ خود شریف صاحب سرخ ساڑی میں ملبوس ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھے سنگھار کر رہے تھے اور ان کے ہاتھوں میں وہی سرخ چوڑیاں تھیں۔

حفیظ دبے پاؤں واپس ہو گیا۔ لیکن صبح ہونے پر اس کے رویے میں فرق آگیا تھا۔ اب شریف صاحب کا ایک ایسا راز اس کے ہاتھ لگ گیا تھا کہ جس کے سہارے وہ ان سے ہر بات منوا سکتا تھا۔

ایک روز حفیظ ایک عورت کو لے آیا اور اپنے آقا سے کہنے لگا کہ اب وہ بچے کے گندے پوتڑے نہیں دھوئے گا۔ بلکہ وہ عورت بچے کے کام کیا کرے گی' لیکن شریف صاحب نے فوراً اس عورت کو چلتا کیا اور حفیظ کو بھی ڈانٹ پلائی وہ کسی اور کا گزر اپنے گھر میں نہیں چاہتے تھے۔ انہیں کیا پتا تھا کہ جس راز کو وہ راز رکھنا چاہتے تھے وہ حفیظ پر کھل چکا ہے۔ شریفوں کے ہاتھ کسی کا راز ان کی شرافت کی قدروں کو اور بھی زیادہ ٹھوس بناتا ہے اور وہی راز کمین کے ہاتھوں ہتھیار بن جاتا ہے اور حفیظ نے کبھی شرافت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ یوں بھی اب اس کے اطوار میں ڈھٹائی اور نافرمانی آگئی تھی۔ اب وہ اس گھر میں اپنی شرائط منوا کر رہنا چاہتا تھا اور اس کی بے ہودگی شریف صاحب کی برداشت سے باہر ہوتی جارہی تھی۔

تقدیر کی ستم ظریفی کے باوجود شریف صاحب رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ اس فطری ہیجان کو تو وہ دبا نہیں سکتے تھے۔ جو انہیں عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار پر مجبور کرتا تھا' لیکن ان کے نفس کی شرافت مسلّم تھی۔ اس کا سب سے بڑا گواہ وہ بچہ تھا جو اُن کے زیر سایہ پل رہا تھا۔ وہ اسے اس بے رحم دنیا کے ہر حملے سے بچائے رکھنا چاہتے تھے۔ اور اسی ارادے کو انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ وہ ایسے انسان تھے جو سماج کا ایک حصہ ہوتے ہوئے بھی اس سماج سے الگ تھلگ زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔

حفیظ کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آکر ایک دن جب انہوں نے سخت دست کہا تو اس نے ہمیشہ کے لیے ان کی نوکری چھوڑ دی اور ایک زیادہ خطرناک ارادہ

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

لیے چلا گیا۔

نتیجے کے طور پر تیسری جنس کا وہی غول شریف صاحب کے گھر آدھمکا وہ بے دھڑک ان کا دروازہ پیٹ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔

''ہے ہے ہمارے ہی کھم کے ہو اور ہم ہی سے آنکھ چُراتے ہو۔'' ایک نے تالی پیٹ کر کہا۔

''تم دو محلوں میں رہتے ہو اور ہم بھیک پر جئیں۔''

شریف صاحب کانپتے ہاتھوں سے کھڑکی' دروازے بند کرتے جا رہے تھے' لیکن سیدھے سادے الفاظ جب فحاشی پر اُتر آئے تو انہیں دروازہ کھولنا ہی پڑا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ سب اندر گھس آئے کچھ تو صوفوں پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے اور کچھ نے آزادی سے گھر کا دورہ شروع کر دیا۔

''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟'' شریف صاحب نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ہے ہے جانی تمہارے پاس تو بہت دولت ہے۔'' ایک نے انداز بناتے ہوئے کہا۔

اتنے میں جانگی بچے کو اُٹھا لائی اور شریف صاحب نے تڑپ کر اسے ان کرخت ہاتھوں سے چھین لیا۔

''ہم تمہیں لینے آئے ہیں اور اس بچے کو بھی۔'' زرینہ نے دانت میں خلال کرتے ہوئے کہا۔

''میں پولیس میں خبر کر دوں گا۔'' شریف صاحب نے اپنی ساری ہمت یکجا کر کے کہا۔

لیکن اتنا کہنا تھا کہ ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ ان سب نے انہیں چڑیلوں کی طرح گھیر لیا اور انہیں پھٹکارنے اور کوسنے لگے جلد ہی شریف صاحب کو اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے دھمکی دے کر اچھا نہیں کیا۔ ان کی دشمنی مول لینا کوئی کھیل نہیں تھا۔ ان کا جو حشر ہوتا' سو ہوتا لیکن وہ اس معصوم بچے کو اس غول کے بے رحم ارادوں کے حوالے نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں ایک اور ترکیب سوجھی۔

''کتنے پیسے لوگے؟'' انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

جیسے ساری چمگادڑیں ایک ساتھ خاموش ہو گئیں۔

سودا طے ہوا اور طے شدہ رقم لے کر وہ سب جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

''ہم تو تجھے ساتھ لے جانے آئے تھے بے وفا لا پیسا ہی دے دے۔'' ایک نے کہا۔

''مگر کان کھول کر سن لے۔'' ایک ادھیڑ عمر والے نے کہا۔

''تیری کمائی میں ہمارا برابر کا حق ہے۔ جس دن تُو نے آنا کانی کی ہم اس بچے کو غائب کر دیں گے یا پھر یہ بچہ ابھی ہمارے حوالے کر دے ہم پھر کبھی تیری اٹاری پر تھوکیں گے بھی نہیں۔''

شریف صاحب نے اس طرح بچے کو سینے سے چمٹا لیا جیسے وہ سب واقعی اسے چھین لے جائیں گے۔

وہ سب پیسا لے کر چلتے بنے' لیکن شریف صاحب کے شب و روز ان چمگادڑوں کے حوالے ہو گئے۔ جو اُن کی شخصیت کے اندھیرے سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھیں۔ کئی بار انہوں نے سوچا کہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلتے بنیں' لیکن جانتے تھے کہ گھاگ اور ڈھیٹ آنکھیں اب رات دن ان کا پہرہ دیتی تھیں پولیس کی مدد لینے کا مسئلہ تو جوں کا توں باقی رہتا۔

چمگادڑیں شریف صاحب کی دولت کی شریانوں سے اس طرح لپٹی تھیں کہ ان کی تجوری کے زخم مندمل نہیں ہو پائے تھے۔ ایک بار تو تنگ آ کر انہوں نے سوچا کہ بچے کو چمگادڑوں کے حوالے کر دیں تا کہ گلو خلاصی ہو' لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے خود کو لعنت ملامت کی۔ زندگی میں وہ بچہ ہی ایسا تھا کہ جو ان کا نہ ہوتے ہوئے بھی ان کا تھا۔ وہ اس کرب کو سمجھتے تھے۔ جس نے ان کے نفس کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ اس بچے کو موت کے حوالے کر سکتے تھے۔ لیکن چمگادڑوں کے حوالے نہیں جو اسے خود بھی اپنے قبیلے کا ایک فرد بنا لیتے وہ اس کی مردانگی کے ضامن تھے۔

www.pkdigest.com

ایک دن شریف صاحب نے چمگادڑوں کے ایلچی کو پیسا دینے سے صاف منع کر دیا۔ ایلچی جواب سن کر انہیں وارننگ دیتا ہوا چلا گیا کہ اب کی بار وہ اکیلا نہیں آئے گا۔ اس کے بعد شریف صاحب کی زندگی کا رہا سہا سکون بھی ختم ہو گیا۔ ہر کھٹکے پر وہ چونک پڑتے۔ انہوں نے اکیلے باہر نکلنا بھی بند کر دیا بچے کو کس پر چھوڑا جائے؟ رات کو سوتے وقت بھی پستول تکیے کے نیچے رہتا تھا انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر وہ بچے کو چمگادڑوں سے نہ بچا سکے تو اس کا خاتمہ کر دیں گے۔ وہ کسی بھی صورت اسے چمگادڑ نہیں بننے دیں گے۔

ایک رات کو جب کھٹکا ہوا تو شریف صاحب اُچھل کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہی تھے خون چوسنے والے چمگادڑ۔ وہ ان کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہے تھے شریف صاحب کا دل اُچھل کر حلق سے آ لگا۔ جیسے انہیں دل کا دورہ پڑ رہا ہو۔ انہوں نے سوچا وہ اکیلے ان سب کا مقابلہ کیسے کریں گے؟ وہ ناسور جو جڑ پکڑ چکا تھا۔ اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ وہ سب تیسری جنس کے لوگ برآمدے میں پہنچ چکے تھے۔ جیسے بدروحیں ہوں۔

برآمدے میں جلتے بلب کی روشنی میں شریف صاحب نے دیکھا کہ بچے کے لیے نئے کپڑے لے کر آئے تھے ان کا ارادہ اٹل تھا۔

انہوں نے دھیرے دھیرے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ آواز شریف صاحب کے دل و دماغ پر ہتھوڑوں کی طرح پڑی۔

باہر گروہ میں کچھ کھسر پھسر ہوئی اور اب کے دروازہ کچھ زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ پھر ایک ہاتھ دروازے کے اوپر ٹوٹے شیشے میں سے چٹخنی کی طرف پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران میں شریف صاحب پر سے قیامت گزر گئی۔ ذہن میں طوفان سا اُٹھا۔ پھر سکوت سا چھا گیا۔ وہ مصمم ارادے سے بیڈ روم میں گئے اور سائلنسر لگے پستول کو سوئے ہوئے بچے پر داغ دیا پھر اسی کیفیت میں بڑھ کر انہوں نے خود دروازہ کھول دیا۔

سارا غول کمر مٹکاتا چہلیں کرتا اندر داخل ہو گیا۔

''کہاں ہے بچہ؟ اے ہے بچے کو لاؤ ناں۔'' چمیلی نے کہا۔

''ہم اس کے لیے کپڑے لائے ہیں۔'' زیتون نے بچے کے کپڑے آگے بڑھا دیے۔

''ہم ہارے اور تم جیتے۔'' انہوں نے کہا۔ ''بچہ تمہیں مبارک ہو۔ ہم چمگادڑ نہیں ہیں کہ زندگی بھر تمہارا خون چوستے رہیں۔ ہم بھی انسان ہیں مجبور' بے بس' بدنام......''

ان سب کے چہروں کے بے باک' ڈھیٹ نقاب اُتر چکے تھے۔ وہ سب چہرے اُداس ہو گئے تھے۔ انہوں نے وہ کپڑے شریف صاحب کے ہاتھوں میں پکڑا دیے اور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ منا سا کرتا پاجامہ' زردوزی صدری اور کارچوبی ٹوپی۔

''ٹھہرو۔'' شریف صاحب نے بہ مشکل کہا اور اندر گئے انہوں نے خون میں لتھڑے ہوئے بچے کو وہ کپڑے پہنا دیے۔ اسے لال چادر میں لپیٹے اپنے سینے سے لگا لیا اور باہر آ گئے۔

''چلو۔'' انہوں نے کہا۔

سب ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ جب شریف صاحب تھکے تھکے قدموں سے گیٹ سے باہر نکل آئے تو سب نے انہیں نرغے میں لے لیا اور ساتھ چلنے لگے۔

پھر کبھی کسی نے انہیں کوٹھی نمبر ۵ میں آتے جاتے نہیں دیکھا۔

Pdf by Roadsign

آلۂ قتل

لاش سب کے سامنے تھی مگر قتل کی وجوہ اور آلۂ قتل غائب تھا۔ ایک پر تجسس کہانی' جس کی ہر سطر آپ کو چونکا دے گی۔
اس رقیب کا قصہ جو دنیا میں ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ قانون کے ایک ذہین محافظ کا قصہ' اسے یقین تھا کہ قاتل اسی گھر میں موجود ہے۔

پروفیسر کی گہری نیلی آنکھیں ڈاکٹر پر جمی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نسبتاً کم عمر اور خوب صورت تھا۔ اس نے راکھ دان میں سگریٹ مسلی اور بساط کی طرف متوجہ ہو کے ایک فیل آگے بڑھایا۔ ''بہت خوب ہمیشہ کی طرح تمہاری یہ چال بھی دلیرانہ ہے۔'' پروفیسر نے لمحہ بھر کے لیے بساط کا جائزہ لیا پھر رُخ (توپ) کو اُٹھایا اور فیل کو زد میں لے لیا۔

''آج میں پوری طرح محتاط ہوں۔'' پروفیسر نے ڈاکٹر کی سنجیدگی اور انہماک کو دیکھتے ہوئے کہا پھر قدرے جھک کر اپنے اور ڈاکٹر کے مہروں کی ممکنہ حرکات کا تعین کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے گہرے انہماک کے ساتھ بساط کا طواف کرتے ہوئے مہروں کو نگاہوں میں تولا اور اپنا فرزین (وزیر) اُٹھا کر جارحانہ انداز سے آگے بڑھا دیا۔ جو پروفیسر رحمان کی کوئین کے بالکل سامنے آ گیا۔ پروفیسر کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم پھیل گیا۔

''میں اچھی طرح جانتا ہوں تم جس چیز کو حاصل کرنے کا عزم کر لو اسے پانے کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں صَرف کر دیتے ہو جب کہ میں دماغ کو اتنا تھکانے سے گریز کرتا ہوں۔''

''میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔'' ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''پھر میں تم سے کھیلتے وقت اس قدر ہارتا کیوں رہا ہوں۔'' پروفیسر تیزی سے بولا۔

''مائی ڈیئر! قسمت۔'' ڈاکٹر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''قسمت.....؟'' پروفیسر نے تلخ لہجے میں کہا۔

''ہاں ایک لحاظ سے تم اسے قسمت کہہ سکتے ہو' میری خراب چالیں تمہاری خوش قسمتی بن جاتی ہیں۔''

''خیر میں کچھ دیر کے لیے تسلیم کیے لیتا ہوں کہ جیت بعض لوگوں کی عادت بن جاتی ہے لیکن اس کے لیے شروع میں بہت قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ جہدِ مسلسل سے گزرنا پڑتا ہے۔ رسک ناگزیر ہو جاتا ہے۔'' ڈاکٹر نے ناصحانہ لہجے میں کہا اور نگاہیں بساط سے ہٹا کر کمرے میں موجود تیسری خالی نشست کو دیکھنے لگا پھر کمرے کے کونے میں آتشدان کے پاس رکھے پیانو کو دیکھ کر اس کی اُداس نگاہ واپس لوٹ آئی۔ وہ چند لمحوں کے لیے کھو سا گیا۔

پروفیسر نے کھنکھارتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔

''آج تمہاری بھابی سائرہ سرِشام ہی کسی سہیلی کی سالگرہ میں شرکت کے لیے چلی گئی تھی اور کل شام اس کی اپنی سالگرہ ہے۔ تم بھی نوٹ کر لو آخر تم ہمارے فیملی ممبر ہی ہو۔'' پروفیسر نے آزردہ لہجے میں کہا۔ چہرے پر اضمحلال سا چھا گیا۔ گردن جھک گئی۔ ڈاکٹر خاموشی سے کسی چال میں محو تھا۔ مہرہ آگے بڑھاتے ہوئے اس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو چونک اُٹھا۔

''کیا بات ہے پروفیسر صاحب میرے برادر۔'' ڈاکٹر نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''آہ..... ڈاکٹر صفدر علی کیا بتاؤں میں گزشتہ کئی ماہ

سے شدید اندرونی صدمے سے نڈھال ہوں۔ میری روح مضطرب اور بے چین ہے۔ زندگی پھیکی اور بے کیف ہو کر رہ گئی ہے۔ تمہاری بھابی سائرہ جسے میں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں' جس کے ساتھ میں نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف پسند کی شادی کی تھی۔ اب مجھ سے اُکتا گئی ہے۔ وہ کسی اور مرد میں دلچسپی لینے لگی ہے۔'' پروفیسر نے افسردہ لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی سی چھا گئی۔ چہرے کی جھریوں میں اضافہ ہو گیا۔

''پروفیسر صاحب! میرے خیال میں آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے' بھابی ایسی نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کی بیماری کی وجہ سے گھبرا کر ڈپریشن میں مبتلا ہوتے ہوئے انہوں نے بیرونی ماحول میں دلچسپی بڑھا دی ہو۔'' ڈاکٹر نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ڈاکٹر یہ غلط فہمی یا مفروضہ نہیں۔ اس کا رویہ یکسر تبدیل ہو چکا ہے۔ تمہاری آمد پر وہ ضرور خوش باش دکھائی دیتی ہے۔ پیانو بجاتی ہے' چائے کافی اور ڈرائی فروٹ کا فوری بندوبست کرتی ہے۔ شطرنج کی بازی دیکھتی رہتی ہے لیکن تمہارے جاتے ہی وہ بجھ سی جاتی ہے۔'' پروفیسر نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر کا چہرہ سرخ ہو گیا تاہم اس نے ملائمت سے کہا۔

''پروفیسر صاحب یہ انتہائی افسوس ناک مغالطہ ہے جس کی تائید میں میرے خیال میں حقیقی شواہد دستیاب نہیں۔ وہ ایک خوش لباس' خوش ذوق' خوش گفتار اور مہمان نواز خاتون ہیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ اس طرح پایا ہے۔ جہاں تک آپ کو نظر انداز کرنے کا تعلق ہے۔ اس کا سبب آپ کی بیماری کی طوالت ہے۔''

''میرے دوست تم اس نادیدہ دشمن کو کیوں بھول رہے ہو جو مجھ پر قاتلانہ حملے کر چکا ہے۔ جس کی بدولت میں گاڑی میں مجروح ہو کر حادثے کے بعد اپنی ٹانگ کی ہڈی تڑوا کر وہیل چیئر پر پڑا ہوں۔'' پروفیسر سرد ہوا کے شدید جھونکوں کی شائیں شائیں سن کر چونک پڑا۔

''وہ ایسی ہی منحوس رات تھی جب ڈیفنس سے واپسی پر ایک نامعلوم ٹرک نے میری گاڑی کو ٹکر مارتے ہوئے سڑک سے نیچے گرین بیلٹ میں پھینکتے ہوئے جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔ میری خوش قسمتی کہ میں بچ نکلا۔'' پروفیسر کی مضطرب آواز کافی بلند ہو گئی۔

''یہ معاملہ واقعی پراسرار اور تشویش ناک ہے نہ جانے کون نادیدہ اور خطرناک دشمن میرے پیارے دوست کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ پہلے رائفل سے فائر کیا گیا تھا تو ایک حیرت انگیز اتفاق نے آپ کو بچا لیا۔ کیلے کا چھلکا پاؤں کے نیچے آ گیا تھا۔ اُدھر گولی چلی اِدھر پاؤں پھسلا' حملہ مری میں ایک ہوٹل کی چھت سے کیا گیا تھا اور انہوں نے اس بگڑے ہوئے رئیس زادے کی شکل بھی دیکھی تھی جسے آپ نے بھابی سائرہ کے ساتھ کراچی کے مضافاتی علاقے میں فنکشن سے واپسی پر طوفانی رات میں اپنی گاڑی میں ایک لڑکی کی عزت سے کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ جسے آپ نے پہچان لیا تھا وہ آپ کے رہائشی علاقے طارق روڈ پر غنڈہ گردی پھیلائے ہوئے تھا۔ آپ نے پولیس کو موبائل پر فون کیا تھا' تھانے دار نے اس طرف سے آنے والی ایک موبائل پولیس کار سے رابطہ قائم کیا' جس کے نتیجے میں اس نوجوان کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس ناہنجار نے آپ کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔'' ڈاکٹر نے صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

"وہ دشمن بعد کی بات ہے میرا پہلا کرب میری خوب صورت بیوی ہے۔ جو میری پروا نہیں کرتی میں نوکروں کے رحم و کرم پر ہوں' تیسرا احساس بے بسی مجھے نڈھال کیے دے رہا ہے۔ میں اپنی مرضی سے چل پھر نہیں سکتا' کہیں آ جا نہیں سکتا۔ میں نے کئی بار تنہائی' بے بسی اور اُداسی کا دکھڑا سنایا لیکن وہ کسی بات پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں۔ اسے ازدواجیات اور گھریلو ماحول میں دلچسپی لینے کی سرزنش کی لیکن اس کی بیرونی سرگرمیاں بڑھتی چلی گئیں۔" پروفیسر کے لہجے میں گہرے غم کی جھلکیاں تھیں۔

"لیکن ڈاکٹر میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب بھی تم ہو' یہ تمہاری ذات تھی جس نے سائرہ کو مجھ سے دور کہیں اور پہنچا دیا۔"

"کیا مطلب' تم براہِ راست میری انسلٹ کر رہے ہو' میں نے کتنی محنت سے تمہارا علاج کیا تمہیں دوبارہ اپنے اعضاء کو ہلانے کے قابل بنایا اور تم....." ڈاکٹر اُٹھ کھڑا ہوا' طیش کے عالم میں اس کی گردن کے پٹھے کھنچے ہوئے تھے۔

"بیٹھ جاؤ' ڈیئر۔" پروفیسر نے اب کی بار نرم لہجے میں کہا۔

"دورانِ علاج تم نے جو پابندیاں مجھ پر عائد کی تھیں۔ آہ وہ منحوس پابندیاں..... آج سائرہ انہی کے باعث مجھ سے دُور ہونے لگی ہے۔ تمباکو بند' شراب بند' ہر وہ کام بند جس سے خون کا دوران تیز ہو جائے۔ یہاں تک کہ بیوی کے ساتھ سونا تو دور کی بات ہے' اس سے پیار بھی بند۔ اُف میں کس قدر احمق تھا۔"

"یہ پابندیاں تم پر اس لیے لگائی گئی تھیں کہ تم زندہ رہنا چاہتے تھے۔"

"ہاں میں زندہ رہنا چاہتا تھا لیکن ایک زندہ لاش کی طرح نہیں۔ تمہیں میری باطنی کیفیت کا اندازہ نہیں' میرا دل غم سے پھٹا جا رہا ہے۔ میں اب سمجھا ہوں تم نے ناحق مجھے ہارٹ اٹیک سے بچایا کاش میں زندہ نہ رہتا۔ میری کوٹھی کے گرد پولیس فورس متعین ہے۔ مہمانوں اور ملنے جلنے والوں کو پریشانی اور کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے اس کا انتہائی افسوس ہے۔ کل پروفیسر عثمانی جو یونیورسٹی میں میرے انتہائی محترم دوست ہیں ان کی تلاشی کچھ اس طرح سے لی گئی کہ وہ دروازے سے ہی واپس لوٹ گئے۔" پروفیسر نے غم زدہ لہجے میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"آپ کی حفاظت کے لیے یہ بہت ضروری اقدام ہے آپ کے دوست ڈی آئی جی نثار احمد خان نے بڑا عمدہ انتظام کر رکھا ہے۔ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا کہ آپ پر کسی نادیدہ دشمن کا حملہ کامیاب ہو جائے۔" ڈاکٹر نے پروفیسر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ لیکن پروفیسر بہ دستور خلاء میں گھورتا رہا۔ چہرہ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں ساکت تھا۔ دفعتاً اس کی آواز سے پھر غم بہنے لگا۔

"تمہاری بھابی کا لب و لہجہ بھی بدل گیا ہے۔ ملائمت' ہمدردی' دل بستگی' ازدواجی جذبات سرد پڑ چکے ہیں۔ وہ بن سنور کر باہر نکلنے کے لیے بے چین دکھائی دیتی ہے۔ یہ ضرور کوئی گہرا چکر ہے۔ جو مجھے دھیرے دھیرے اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔"

"محض وہم ہے تمہارا' تم بیماری کی وجہ سے چڑ چڑے اور وہمی ہو گئے ہو اور بھابی نازک مزاج خاتون ہیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے کچھ اثر لے لیا ہو۔ میں سالگرہ پارٹی کے بعد خود ان سے درخواست کروں گا کہ وہ آپ کی دیکھ بھال پر خصوصی توجہ دیں۔"

"اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جب دل میں

ہی کوئی اور بس جائے تو زبان کہاں ساتھ دیتی ہے۔ جذبات و احساسات کہاں اپنا فرض ادا کرنے کے قابل رہتے ہیں۔" پروفیسر نے غم ناک لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر کے وزیر نے پروفیسر کی ملکہ کی طرف پھر پیش قدمی کی۔ پروفیسر چونک اُٹھا۔

"تم آج پھر جیتنے کے موڈ میں ہو۔" ڈاکٹر دھیرے سے مسکرایا۔ انگلیاں سنہرے بال سہلا رہی تھیں۔

"پروفیسر صاحب میں کئی دنوں سے یہ چاہ رہا ہوں کہ کوئی بازی آپ سے دانستہ طور پر ہار جاؤں آپ کو فتح مندی سے سرشار ہونے کا موقع فراہم کروں۔ یہ آپ کے بیمار دل کے جذبے کے لیے خوش گوار اور مسرت انگیز کیفیت ہوگی۔ آپ کے حوصلے اور اعتماد میں بھی اضافہ ہوگا۔ لیکن کیا کروں شاید میرے بساط اُلٹنے کی لاشعوری صلاحیت' ذہانت اور ہر انسان کے ضمیر میں ودیعت ہونے والی فتح مندی کے جذبے کی ارادت مجھے ہر بار تند و تیز چالیں چلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔"

"میرا دل اتنا کمزور بھی نہیں۔" پروفیسر خلاف معمول زور سے ہنسا۔

"حالات کچھ بھی ہوں لیکن مردانہ وار مقابلہ مجھے بے حد پسند ہے۔" چند چالوں میں ہی بازی کافی سنسنی خیز ہو گئی لیکن پھر اچانک پروفیسر کی ٹانگ کی تکلیف مزید بڑھ گئی اور بازی ادھوری رہ گئی۔

"ڈاکٹر نے جلدی سے جیب سے کچھ ٹیبلٹس نکالیں اور زود اثر پین کلر کا انتخاب کر کے کچھ دور رکھتے ہوئے میز سے پانی کا گلاس لے کر گولی ریپر سے آزاد کرتے ہوئے پروفیسر کو تھما دی۔ پروفیسر نے لرزتی انگلیوں سے گولی حلق سے اُتار لی۔

ڈاکٹر نے اسے آرام کا مشورہ دیا اور وہیل چیئر دھکیل کر اسے بستر تک پہنچا دیا اور ملازم کو بیل بجا کر بلوایا اور اسے پروفیسر کا سر دبانے کا حکم دیا۔ پروفیسر نے آنکھیں بند کر لیں اس کا تنفس بھی تیز چل رہا تھا۔

ڈاکٹر نے بساط کی ادھوری بازی پر ایک افسردہ نگاہ ڈالی اور گھڑی دیکھتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ پروفیسر صاحب کی بیوی ابھی تک سالگرہ سے واپس نہیں آئی تھی۔

اگلے روز اتوار کی رات حسبِ معمول ماڈل ٹاؤن میں واقع پروفیسر کی دو کنال کی شان دار رہائش گاہ کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ ٹیکسی واپس جا رہی تھی۔ ڈاکٹر اور پروفیسر نوجوانی کے زمانے کے بے تکلف دوست تھے۔ دوستی کی بنیاد زندہ دلی اور باہمی ایثار و خلوص پر مبنی تھی۔ گیٹ پر کھڑے پولیس آفیسر اکرام نے ڈاکٹر کی اچھی طرح تلاشی لی۔ ڈاکٹر نے اپنی کل متاع آفیسر کے سامنے کر دی۔ جس میں پرس اور نیا سگار' خوب صورت لائیٹر اور موٹا سا خوش نما فونٹین پین شامل تھا۔ یہ تینوں اشیاء کا تحفہ ڈاکٹر کا دوست اس کے لیے امریکا سے لایا تھا۔ پہرے دار نے تلاشی کے مراحل کے اطمینان کے بعد ایک نظر ان اشیاء کو دیکھا اور فوراً واپس جیب میں رکھنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر مسکراتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

ڈاکٹر بالائی منزل کی نشست گاہ میں پروفیسر کے قریب کھڑا تھا۔ ڈاکٹر کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ پروفیسر شطرنج کی بساط پر موجود تھا۔ لیکن کس حالت میں؟ وہ دونوں ہاتھوں سے سینے کو تھامے بساط کے مہروں پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے سینے سے خون بہہ بہہ کر سفید مہروں کو سرخ کرتا ہوا فرش پر گرنے لگا تھا۔ ڈاکٹر مبہوت ہو گیا

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

جیسے اب کبھی حرکت نہیں کر سکے گا۔ اس کا عزیز دوست موت کی نیند سو گیا تھا۔ اس کے خون آلود ہاتھ میں سفید پتھر کی ملکہ دبی ہوئی تھی۔ پروفیسر کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھوں میں حیرت اور خوف منجمد دکھائی دے رہا تھا۔ ایک انتہائی بے رحمانہ قتل ایک سنگ دل انسان کر چکا تھا۔ ''آہ..... پروفیسر۔'' ڈاکٹر کے جھے ہوئے قدموں اور سُتے ہوئے چہرے میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے ہونٹ پھڑ پھڑائے۔ عہد نوجوانی کی یادیں اس کے تصور کے پردے پر رقصاں ہونے لگیں۔ پروفیسر کی باتیں' مسکراہٹیں' قربانیاں' جذبات کی ساری کیفیات ڈاکٹر کے قلب پر وارد ہونے لگیں۔ لاش کو بغور دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں درد کرنے لگیں۔ اس نے کچھ دور میز پر رکھے آئینے میں جھانکا اس کی بھوری آنکھیں آج سرخ سرخ دکھائی دے رہی تھیں۔ پروفیسر کے خون کے دھبے گویا اس کی آنکھوں میں چھپ سے گئے تھے۔ آخر وہ اس کا سب کچھ تھا۔ نامساعد حالات میں پروفیسر نے اس کی مالی اعانت کی تھی اسے پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھنے میں بھی مدد اور رہنمائی دی تھی۔ اس کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ آج وہ فرشتہ سیرت انسان وہ عظیم دولت وہ مخلص ہستی اس کے سامنے اپنے خون میں لت پت پڑا کسی سنگ دل انسان کا افسانہ سنا رہا تھا۔ جو پہلے بھی دو ناکام حملے کر چکا تھا۔ ڈاکٹر سکتے کی کیفیت سے نکلا اور اسے ہوش سا آ گیا۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔ لڑکھڑایا پھر سنبھل گیا۔ زینہ طے کرتے ہوئے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ وہ نیچے بڑے پارٹی ہال میں جا کر پھر لڑکھڑا گیا۔ ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ مہمانوں کی آمد سرِ شام شروع ہو چکی تھی۔ سائرہ زینے کے سامنے دیوار کے پاس رکھا پیانو بجا رہی تھی۔ دو تین مہمان محویت سے سن رہے تھے۔ سائرہ انتہائی خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ہلکے سبز رنگ کا بہترین تراش کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے شانے عریاں تھے۔ ڈاکٹر کو بدحواس دیکھ کر سب چونک پڑے۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے سائرہ کے سامنے جا کر بڑے کرب کے ساتھ پروفیسر کے قتل کی منحوس خبر سنائی۔ سائرہ چیخ مار کر زینے کی طرف بھاگی۔ ڈاکٹر اور مہمان بھی اُوپر کی طرف لپکے۔ وہ سب نشست گاہ میں پہنچے تو روح فرسا منظر نے ان کے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ سائرہ قریب جا کر بین کرنے لگی۔ پروفیسر کے بال چومنے لگی۔ چہرہ اوپر اُٹھانے لگی۔ ڈاکٹر نے مہمانوں کو ہدایت کی کہ کسی چیز کو نہ چھوا جائے۔ سائرہ کے اشارے پر ڈاکٹر نے موبائل فون پر ڈی آئی جی نثار احمد سے رابطہ قائم کیا اور انہیں المناک صورت حال سے آگاہ کیا۔ ڈی آئی جی دوست کی ہلاکت کا سن کر حیرت سے اُچھل پڑا' پھر گہرے دُکھ کا اظہار کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے فون سائرہ کو تھما دیا۔ ڈی آئی جی نثار احمد ہنگامی میٹنگ میں مصروف تھا۔ اس نے فوری طور پر محکمہ خفیہ کے ذہین ترین سراغ رساں انسپکٹر کامران کو قتل کی اس واردات کا چارج دیتے ہوئے پروفیسر کوٹلی کی طرف روانہ کر دیا اور انسپکٹر اکرام اور دوسرے ماتحتوں کو باز پرس کرتے ہوئے اپنی ڈیوٹی سے نہ ہلنے کی ہدایت دی۔

نشست گاہ میں پہنچ کر انسپکٹر کامران نے ماحول کا طائرانہ جائزہ لیا۔ کچھ عرصے سے پروفیسر اس کمرے میں مقیم تھا لہٰذا پروفیسر کی کتابوں کی الماریاں' بریف کیس' رائیٹنگ ٹیبل وغیرہ ان کے بستر کے قریب لگا دی گئی تھی۔ کمرے کی مغربی دیوار میں موجود بغیر

سلاخوں والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ انسپکٹر کامران نے بساط کے سامنے آ کر مقتول کا جائزہ لیا۔ گولی شطرنج کی میز کے سامنے آ کر پروفیسر پر چلائی گئی تھی۔ اسے چیخنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا' نشانہ دل کا لیا گیا تھا۔ ورنہ نچلی منزل کے لوگ اور ملازم وغیرہ باخبر ہو جاتے اور لاش ڈاکٹر کی آمد سے قبل ہی دیکھ لی جاتی۔ خاموش جانچ پڑتال اور چہروں کو پڑھتے ہوئے انسپکٹر کامران سب سے پہلے ڈاکٹر صفدر علی سے مخاطب ہوا۔ ڈاکٹر نے رومال سے آنکھوں کی نمی خشک کرتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''میں حسب معمول شام کے آٹھ بجے نشست گاہ میں پہنچا تو پروفیسر صاحب بساط کے مہروں کے اُوپر مُردہ حالت میں پڑے تھے۔ کوئین ان کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ کمرے کی مغربی کھڑکی کھلی ہوئی تھی میں نے باہر نہیں جھانکا اور بھاگ کر نیچے جاتے ہوئے مسز رحمان سائرہ صاحبہ کو حادثے کی اطلاع کر دی۔ وہ خطرناک دشمن اپنا کام کر گیا جو پہلے بھی دو مرتبہ پروفیسر صاحب کی جان لینے کی ناکام کوشش کر چکا تھا۔'' ڈاکٹر تڑپ کر بولا۔ پھر کھلی کھڑکی کی طرف دیکھ کر دوبارہ کہنے لگا۔ ''وہ بدمعاش اس راستے سے کمرے میں آیا اور اسی راستے سے فرار ہو گیا۔ میری عقل اور سمجھ یہی کہتی ہے۔ کمرے کی یہ عقبی کھڑکی چند فٹ نیچے چوڑے ٹیرس کی سمت کھلتی ہے۔ ٹیرس عقبی برآمدے تک چلا جاتا ہے۔ برآمدے کے اختتام پر بھی زینہ ہے اس راستے کا استعمال تقریباً متروک ہے۔ زینے کے اختتام پر سامنے چند گز کے فاصلے پر کوٹھی کا باغ پھیلا ہوا ہے۔ وہ قاتل ضرور اس راستے سے گزر کر باغ کی پچھلی دیوار پھلانگ کر فرار ہوا ہو گا۔''

ڈاکٹر کے قیاسات سن کر انسپکٹر کامران مسز سائرہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''آپ گھر کی قیمتی اشیاء کا جائزہ لے لیں۔'' سائرہ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ واپس لوٹ آئی اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار تھے۔

''انسپکٹر صاحب تجوری اور دوسری قیمتی اشیاء اپنے مقامات پر محفوظ ہیں۔'' پھر سائرہ نے انسپکٹر کامران کے مقابل آتے ہوئے اسے اس مفرور لڑکے کے متعلق تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ جس نے تھانے اور عدالت میں پروفیسر کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی اور جو آج سے تین سال قبل چھ ماہ کی قید کے بعد ہی جیل توڑ کر بھاگ نکلا تھا۔ جس کے فوری بعد وہ پروفیسر صاحب کی آبائی کوٹھی میں لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ انسپکٹر کامران نے اس بگڑے رئیس زادے سکندر کی گرفتاری کے لیے لاہور کی پولیس کو پوری طرح الرٹ کر دیا۔ مسز سائرہ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق سکندر کا خاکہ بھی پولیس ڈیپارٹمنٹ نے فوری طور پر تیار کر لیا۔ پولیس کالوں سے فارغ ہو کر انسپکٹر کامران نے شطرنج کی بساط پر پڑی خون آلودہ لاش کے گرد ایک چکر کاٹا۔ ایک جگہ اس کی نگاہ جم گئی۔ سفید کوئین پروفیسر کی اکڑی ہوئی انگلیوں کی سخت گرفت میں دی ہوئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر پروفیسر کے بستر' الماریوں' نزدیک باتھ روم اور کمرے کا گھوم پھر کے جائزہ لیا لیکن کوئی غیر معمولی بات یا سراغ نہ ملا البتہ پروفیسر کی رائٹنگ ٹیبل کی دراز سے اس نے سائرہ کی تصویر نکال کر چپکے سے اپنی جیب میں ڈال لی یہ تصویر پروفیسر کی مقفل دراز میں احتیاط سے رکھی ہوئی ڈائری میں موجود تھی۔ اس وقت فنگر پرنٹس والے بھی آ پہنچے اور لاش کے اردگرد اور کمرے کے مختلف مقامات سے انگلیوں کے

www.pkdigest.com

Pdf by Roaling

نشانات ایکسپوزر پاؤڈر ڈال کر تلاش کرنے لگے۔ اب انسپکٹر کامران کمرے کی عقبی کھڑکی کے قریب آیا کھڑکی کے پٹ باہر کی جانب کھلے ہوئے تھے۔ یہ واردات کا ایک اہم پوائنٹ تھا۔ اس نے کھڑکی کے خلاء سے نیچے جھانکا چھ فٹ نیچے ٹیرس پر سگریٹ کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ وہ اُچک کر کھڑکی کے فریم سے نیچے ٹیرس پر اُتر گیا اور ٹکڑا اُٹھا کر غور سے دیکھنے لگا۔ یہ رتھ مین سگریٹ کا جلا ہوا ٹوٹا تھا۔ انسپکٹر کامران ہاتھوں پر باریک دستانے کمرہ واردات میں داخل ہوتے ہی چڑھا چکا تھا۔ اس نے سگریٹ کا ٹکڑا فنگر پرنٹ کے ماہر کو آواز دے کر تھما دیا اور خود ٹیرس پر چلنے لگا۔ تقریباً دو منٹ چلنے کے بعد وہ برآمدے تک جا پہنچا۔ برآمدے سے تقریباً چالیس گز کے فاصلے پر عقبی زینہ دکھائی دے رہا تھا۔ انسپکٹر کامران اِدھر اُدھر تیز نگاہ ڈالتا ہوا عقبی زینے تک پہنچ گیا اور نیچے اُترنے لگا۔ جلد ہی وہ سیڑھیوں سے اُتر کر باغ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے فرش سے متصل باغ کی سرخ روشنی دور تک جاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ انسپکٹر کامران نے اِدھر اُدھر تجسس نگاہ ڈالی روش کے پاس ہی ایک گملے کے قریب سگریٹ کا ایک اور جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ گملے میں لگے پودے کے سرخ سرخ پھول مجرم کی جارحیت کی داستان سنا رہے تھے۔ انسپکٹر کامران نے ٹکڑا اُٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ اب وہ باغ پر طائرانہ نگاہ ڈالتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ باغ کا وسطی حصہ بڑا خوب صورت تھا۔ شاداب درخت اور سرسبز پودے تر شے ہوئے تھے رنگین پھولوں کی کیاریوں سے مہک اُٹھ رہی تھی جو گول دائرے کی صورت میں نشست گاہ کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ چلتے چلتے انسپکٹر کامران باغ کی عقبی دیوار کے قریب ایک گھنے درخت کے پاس آ کر رُک گیا۔ جس کی جھکی ہوئی گھنی شاخیں خوب پھیلی ہوئی تھیں اس درخت پر چڑھنا بے حد سہل تھا۔ انسپکٹر کامران نے جوتے اُتارے اور تیزی سے درخت پر چڑھنے لگا۔ ایک موٹی سی مضبوط شاخ دیوار تک جا رہی تھی اور شاخ کے پتوں نے دیوار کے کچھ حصے کو اس طرح چھپا لیا تھا کہ کوئی شخص بھی وہاں باآسانی چھپ کر بیرونی ماحول کا جائزہ لے سکتا تھا۔ دیوار پر نصب لائٹوں کی روشنی میں ہر چیز واضح دکھائی دے رہی تھی۔ باغ کی روشیں اور مختلف مقامات بھی لوہے کے ستونوں پر نصب روشنیوں سے منور تھے۔ انسپکٹر کامران نے باہر پھیلے ہوئے محافظوں پر نگاہ ڈالی سب اپنی اپنی جگہ مستعد تھے۔ وہ واپس اُترا اور درخت کے اِردگرد اُگی ہوئی گھاس اور جھاڑیوں کا جائزہ لینے لگا۔ جلد ہی سگریٹ کا ایک اور جلا ہوا ٹکڑا مل گیا جسے انسپکٹر کامران نے اُٹھا کر سگریٹ کے دوسرے ٹکڑے کے ساتھ پلاسٹک کے لفافے میں محفوظ کر لیا۔ انسپکٹر کامران نے عمارت سے باہر نکل کے محافظوں سے باز پُرس کی ان کا جائزہ لیا' سوالات کیے۔ لیکن ان کی کوتاہی کا کوئی عمل دخل دکھائی نہ دیا۔ اب وہ واپس بالائی منزل کی نشست گاہ میں پہنچا۔ فنگر پرنٹ کے ماہرین کی رپورٹ حوصلہ افزا نہیں تھی۔ کمرے سے کسی نئے آدمی کی انگلیوں کے نشانات نہیں مل سکے تھے۔ مختلف اشیاء پر پروفیسر' سائرہ اور ڈاکٹر اور ملازمین کے نشانات ہی ثبت تھے۔ فرش چونکہ بالکل صاف تھا لہٰذا قدموں کے نشانات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مسز سائرہ اپنی آنکھوں کی نمی خشک کرنے میں مصروف تھی جب کہ ڈاکٹر صفدر اور رشتہ دار بھی سوگوار کھڑے تھے۔ سالگرہ پارٹی المناک حادثے کی وجہ سے کینسل کر دی گئی تھی۔ ڈی آئی جی نثار احمد خان اپنے عزیز

دوست کی موت کی خبر کے بعد انتہائی مصروفیت کے باوجود وقت نکال کے موقع واردات پر پہنچ چکے تھے۔ وہ محافظوں پر برس پڑے تھے۔ غم و غصے کی شدت سے ان کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے۔ سب پولیس والے سہمے ہوئے تھے۔ انسپکٹر کامران نے سب کو جمع کرتے ہوئے اعلانیہ یہ عہد کیا کہ وہ اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر مجرم کو گرفتار کر لے گا۔ ڈی آئی جی نثار احمد خان مضطرب حالت میں واپس لوٹ گئے۔ اگر قاتل ان کے سامنے آ جاتا تو وہ اسے کچا ہی چبا ڈالتے' انہیں مرحوم سے بے حد محبت اور اُنسیت تھی۔ ملازموں اور مہمانوں کو کریدنے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ انسپکٹر کامران پولیس کے دوسرے آفیسرز اور مہمان تک حیرت میں غوطہ زن تھے کہ محافظوں کی موجودگی میں پروفیسر کو کس طرح قتل کر دیا گیا۔ اگر گھر کا کوئی فرد ملوث تھا تو آلۂ قتل کہیں نہ کہیں مل جانا چاہئے تھا۔ جو بھرپور تلاش کے باوجود دستیاب نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ غالب خیال یہی تھا کہ وہی مفرور لڑکا سکندر جو جیل توڑ کر بھاگ نکلا تھا وہ کسی نہ کسی طرح دیوار میں شگاف بنا کر اندر آ پہنچا تھا اور پروفیسر کو اپنے انتقام کا نشانہ بنا کر فرار ہوا تھا۔ سائرہ نے یاد کرتے ہوئے انسپکٹر کامران کو بتایا کہ ایک بھاری آواز نے ایکسیڈنٹ کے بعد پروفیسر صاحب کو فون پر دھمکی بھی دی تھی کہ سیکورٹی کے باوجود اسے دوسری دنیا روانہ کر دیا جائے گا۔ انسپکٹر کامران نے ڈاکٹر کی آمد سے قبل آنے والے ملاقاتیوں کو بلوا کر پوچھ گچھ کی جن میں پروفیسر کے پنجاب یونیورسٹی کے دوست احباب اور عیادت کے لیے آنے والے عزیز و اقارب شامل تھے۔ لیکن کوئی سراغ نہ ملا سب اچھی طرح تلاشی دینے کے بعد اندر داخل ہوئے تھے۔ اب سب طرف سے توجہ ہٹا کر انسپکٹر کامران کی نگاہ مسز سائرہ پر جم گئی۔

"مسز رحمان آپ اس وقت کہاں تھیں جب ڈاکٹر صاحب کی گھر میں آمد ہوئی اور وہ زینہ طے کرتے ہوئے اُوپر پہنچے اس وقت رات کے نو بجنے والے تھے۔" انسپکٹر کامران شطرنج کی بساط سے کچھ فاصلے پر آمنے سامنے لگے ہوئے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے سامنے مسز سائرہ اور پاس ہی ڈاکٹر صفدر براجمان تھا۔ تمام مہمانوں کو قتل کی تفتیش تک کے لیے روک لیا گیا تھا اور محافظوں کو مستعد کر دیا گیا تھا کہ کوئی شخص بغیر اجازت باہر نہ جائے۔ سائرہ نے اپنی خوب صورت آنکھوں کو

لا..... ہور

"نام مردانہ، چال زنانہ اور چال چلن زنانہ۔ لاہور مجھے ہمیشہ ایک طوائف ہی لگا جسے جو کچھ مرضی دے دو پھر بھی کہتی ہے۔ لا..... ہور جو ہندوؤں کے گھر میں پیدا ہوئی تو انہوں نے سمجھا پیدا ہوا اور اس کا نام لاہور رکھا۔ حالانکہ نام میں کیا رکھا ہے۔ کام دیکھنا چاہیے۔ میانوالی ہی کو دیکھ لو پورے شہر میں نام کے علاوہ شاید ہی کوئی زنانہ چیز ملے۔ میرا دوست کہتا ہے لاہور بڑا معتبر ہے جس کی وجہ اس کا ہندو ہونا بتاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بقول ہندو مذہب سب سے پرانا ہے۔ یہ تو اس وقت بھی تھا۔ جب انسان نے کپڑے پہننے شروع نہیں کیے تھے۔ ٹھیک کہتا ہے۔ ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کو دیکھ لو تو یقین ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں نے اسے باندی بنا کر رکھا۔ شہنشاہ اکبر نے اسے اپنے حرم میں لے لیا تو اسے چار دیواری کی چادر اوڑھا دی جو انگریزوں نے آ کر اتار دی اور اسے ایسے ہی کر دیا جیسے اپنی بیویوں کے لیے رکھتے ہیں۔ چادر اتری تو وہی ہوا جو ہوتا ہے اس کا پیٹ پھولنے لگا اور پھول پھول کر بس پھیلاؤ ہی رہ گیا۔"

(علیزہ علی، کراچی)

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

رومال سے خشک کرتے ہوئے اداس لہجے میں کہا۔

”انسپکٹر صاحب میں شام سات بجے گھر سے شاپنگ کے لیے نکلی تھی۔ دو ملازم میرے ساتھ تھے ہم لوگ رات آٹھ بجے کے قریب سالگرہ کیک اور دوسری اشیاء لے کر واپس لوٹے تھے۔ ہال کی دوسری آرائش اور رات کا کھانا وغیرہ میری دوسری ملازمہ اور خادمائیں تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ گھر لوٹنے کے بعد میں پروفیسر صاحب کو دیکھنے اوپر گئی تھی لیکن مجھے جلدی نیچے انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے آنا پڑا تھا۔ میرے اوپر جانے کے بعد پروفیسر صاحب نے چائے اور خشک میوہ جات ملازم سے منگوائے تھے آپ ملازم دینو سے پوچھ سکتے ہیں۔“ وہ خاموش ہوگئی اور اپنے سرخی مائل بالوں کو چہرے سے جھٹکنے لگی۔ وہ اس وقت مجسمہ غم بنی ہوئی تھی لیکن پھر بھی بے حد خوب صورت اور حسین و جمیل دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے شانے عریاں تھے اور بدن پر ہلکے سبز رنگ کا بہترین لباس تھا۔ انسپکٹر کامران نے اس قدر حسین اور خوب صورت عورتیں بہت کم دیکھی تھیں۔ نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا مرمریں بدن اور موسم بہار کی نوشگفتہ کلی کی مانند کتابی چہرہ۔ انسپکٹر کامران بھی چند لمحوں تک دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسی لمحے ڈاکٹر نے سگار سے گہرا کش لیتے ہوئے دھوئیں کے مرغولے فضا میں اچھال دیے۔ چند لمحوں کے لیے سائرہ اور انسپکٹر کامران کی نگاہوں کے سامنے سیاہ دھند چھا گئی چہرے دھوئیں میں اوجھل ہوگئے۔ جب دھواں چھٹا تو انسپکٹر کامران نے اپنی ناقدانہ نگاہیں پھر مسز سائرہ پر مرکوز کردیں۔ ڈاکٹر اب مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ انسپکٹر نے کنکھیوں سے اس کے تیور بھانپ لیے۔

”مسز رحمان معاف کیجیے گا میں ایک چھوٹی سی گستاخی کا مرتکب ہونے جارہا ہوں۔“

”کیا مطلب!“ سائرہ نے جملہ کاٹ دیا۔ ڈاکٹر بھی چونک کر آگے جھک گیا۔

”صرف اتنی سی بات مسز سائرہ آپ مجھے پروفیسر رحمان سے شادی سے قبل کی اپنی مصروفیات سے آگاہ فرمادیں۔ ہم ہر طرح سے سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیس کا ہر زاویے سے جائزہ لے کر ہی کامیابی کی منزل تک پہنچا جاسکتا ہے۔“

”کوئی بات نہیں انسپکٹر صاحب۔“ سائرہ نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”میرا دل صاف ہے میں ہر بات کا صاف اور واضح جواب دینا پسند کروں گی۔“

”یہ آپ کی نوازش ہوگی اور آپ کے دشمن کی موت۔“ انسپکٹر کامران دھیرے سے مسکرایا۔

”انسپکٹر صاحب!“ سائرہ نے ایک گہرا سانس لیا اور ایک اداس نگاہ شطرنج کی بساط پہ پھر پروفیسر کی خالی کرسی پر ڈالی۔ وہ کھکارتے ہوئے اور آنکھوں کو رومال سے خشک کرتے ہوئے بولی۔

”پروفیسر صاحب کی اور میری پہلی ملاقات کراچی میں ناظم آباد میں واقع میرے فلیٹ میں ہوئی تھی۔ میں ان دنوں ٹی وی کی اداکارہ تھی۔ پروفیسر صاحب ان دنوں فارغ تھے اور اپنے والدین کی جائیداد کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ ٹی وی کے ایک ڈرامے میں میری پرفارمنس سے وہ بے حد متاثر ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے ایک اچھے انداز میں میرے فلیٹ پر تشریف لائے تھے۔ ہم دونوں کی ملاقات خوش گوار ثابت ہوئی اور رفتہ رفتہ ازدواجی زندگی میں تبدیل ہوگئی۔“ وہ سانس لینے کے لیے رکی تو انسپکٹر کامران نے پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب اس زمانے میں بھی پروفیسر

www.pkdigest.com

صاحب کے دوست تھے یا بعد میں دوستی کی شروعات ہوئی تھی۔“ انسپکٹر کامران نے ڈاکٹر کو بھی اپنے سوال اور نگاہ میں شامل کرلیا۔

”جی ہاں جناب! اس زمانے میں بھی ان کے سچے دوست اور رفیق تھے۔ دو چار مرتبہ تو وہ پروفیسر صاحب کے ساتھ بھی میرے ہاں تشریف لائے تھے۔“

”کراچی آپ نے اس غنڈے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا یا کچھ اور وجوہات تھیں۔“ انسپکٹر کامران نے اپنی نگاہیں سائرہ کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔

”اس نقل مکانی کی وجہ اس غنڈے کی دھمکیاں ہی تھیں۔ چونکہ وہ جیل توڑ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا تھا لہٰذا ہم خوف زدہ تھے ایک بار کراچی میں اس نے ہمارا تعاقب بھی کیا تھا۔ جو ٹریفک کے سرخ سگنل کی وجہ سے منقطع ہوگیا تھا۔ چنانچہ ہم نے کراچی کو خیر باد کہہ دیا۔ جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔“ اب انسپکٹر کامران صوفے پہ سرک کر ڈاکٹر صفدر کے مقابل آگیا اور اپنی تیز نگاہیں اس کے چہرے پر جمادیں۔ جیسے اس کے باطن میں جھانکنا چاہتا ہو۔

”میں کیا عرض کروں؟“ ڈاکٹر صوفے پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس کے افسردہ چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ڈاکٹر صاحب آپ کس طرح پروفیسر صاحب سے متعارف ہوئے آپ کے کلینک سے تو میں واقف ہوں ایک بار جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ شادمان میں مارکیٹ کے پاس واقع ہے۔“ انسپکٹر کامران نے استفسار کیا۔ ڈاکٹر نے سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا اور پھر متوجہ ہوا۔

”انسپکٹر صاحب میں ان دنوں بے حد مالی دشواریوں کا شکار تھا۔ والدین بچپن میں ہی گزر گئے تھے کٹھن مراحل طے کرتے ہوئے جوانی کی منزل پر قدم رکھا تھا۔ مجھے لڑکپن سے ہی شطرنج کا کھیل بہت اچھا لگتا تھا اور میں اچھا خاصا کھیلنے بھی لگا تھا۔ یہ ذہنی ورزش مجھے بہت پسند ہے۔ کراچی میں ناظم آباد کے ایک شطرنج کے مقابلے میں میری اور پروفیسر صاحب کی پہلی بازی جمی تھی۔ جو میں جیت گیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ شطرنج کی بازیاں پھیلتی ہوئی دوستی میں تبدیل ہوکر یہاں تک آپہنچیں۔“ ڈاکٹر نے بھی پروفیسر کی خالی نشست پر اداس نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔

”جب پروفیسر صاحب لاہور شفٹ ہوئے تو میں پلاسٹک سرجری کے لیے انگلستان چلا گیا۔ واپسی پر مجھے لاہور میں ہی کلینک کی جگہ ایک دوست کے تعاون سے مل گئی تھی چنانچہ میں نے اپنی پریکٹس

بہار آگئی

ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک پروفیسر فلسفہ کے طلبہ کے سامنے لیکچر دے رہا تھا کہ چند طلبہ کھڑکی سے باہر دیکھ کر مسکرانے لگے۔ لیکچر میں طلبہ کی توجہ کم ہوتی دیکھ کر پروفیسر کھڑکی کے قریب آیا باہر دیکھا تو قریب ہی ایک پودا نظر آیا۔ جس کے سب پتے خزاں میں جھڑ چکے تھے اور اب اس کی شاخوں سے ننھی ننھی ریشمی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ واپس ہوا اپنی ٹوپی اور چھڑی اٹھائی اور طلبہ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا۔

میرے بچو! ”بہار آگئی ہے۔“ اور یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ بہت دنوں تک اس کا کوئی پتا نہ چل سکا۔

(رابعہ حسن لنگاہ......خانیوال)

Pdfby Roadsign

لاہور سے ہی شروع کی تھی۔ کراچی میں میرے تعلیمی سفر میں پروفیسر صاحب نے میری متعدد بار مدد کی تھی۔ وہ میرے محسن اور مربی تھے۔ مجھے بے حد دکھ محسوس ہو رہا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں اب کبھی اس کمرے میں نہ آؤں۔ مجھے ہر طرف پروفیسر کا چہرہ دکھائی دے رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ وہ شدید جذباتی کیفیت میں تھا۔ جب کہ انسپکٹر کامران غیر جذباتی انداز سے کیس کا تجزیہ کر رہا تھا۔ سائرہ بھی مضطرب اور بے چین دکھائی دے رہی تھی۔ انسپکٹر کامران نے سوالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

''آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ میں اڑتالیس گھنٹے یعنی دو دن کے اندر اندر کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا۔'' انسپکٹر کامران نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا اور موبائل فون آن کر کے پولیس فورس سے مفرور لڑکے کی تلاش کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ لیکن کسی طرف سے بھی کوئی حوصلہ افزا رپورٹ نہ ملی۔ رات کے دو بجنے والے تھے۔ ڈاکٹر سائرہ کے ساتھ کمرے سے نکلا اور دوسری منزل کے مہمان خانے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی رہائش کا بندوبست اوپر ہی کر دیا گیا تھا۔ باقی کچھ مہمان نچلے کمروں میں ٹھہرائے گئے تھے اور چند ایک کو اوپری کمروں میں رہنے کی ہدایت کر دی گئی۔ تھے۔ سائرہ اپنے بیڈ روم میں جا کر دروازہ بند کر چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عمارت پر گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ انسپکٹر کامران نشست گاہ میں ٹہلتا ہوا واردات کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا لیکن کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ ڈاکٹر پر اسے پہلے پہل کافی گہرا شبہ ہوا تھا۔ لیکن پوری عمارت اور باغ چھاننے کے بعد بھی آلۂ قتل برآمد نہیں ہو سکا تھا۔ لہٰذا لامحالہ یہ قتل اس مفرور لڑکے کی کارستانی معلوم ہو رہا تھا۔ بظاہر یہ کیس سیدھا سادا تھا کوئی ٹیڑھ نہیں تھا۔ لیکن انسپکٹر کامران جان چکا تھا کہ کہیں نہ کہیں دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ کیونکہ محافظ پوری طرح اپنی ڈیوٹی پر مستعد تھے۔ پھر آخر قتل کیسے ہوا؟ اس کا تجربہ کار ذہن بھی الجھنے لگا۔ وہ قتل کی بہت سی پیچیدہ اور پراسرار وارداتوں کا سراغ لگا چکا تھا لیکن اس کیس میں ابھی تک کوئی سراغ ملتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ صرف لڑکے کی تلاش ہی جستجو کا مرکز بن گئی تھی۔ رات ڈھلنے لگی۔ انسپکٹر کامران کی بے چینی بھی بڑھتی چلی گئی۔ وہ ایک بار پھر پروفیسر کی الماریوں اور رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔

اگلے دن صبح سے شام تک انسپکٹر کامران مفرور مجرم سکندر کی دستیابی کے لیے اقدامات کرتا رہا۔ لیکن شام ڈھلنے تک کوئی سراغ نہ ملا۔ اب اس نے کراچی پولیس کو بھی الرٹ کر دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ مل گئی تھی جس کے مطابق پروفیسر کو لگنے والی تین گولیاں کسی چھوٹے سے سپائی ریوالور کی تھیں۔ جس کی گولی کا وزن تین گرام کے قریب تھا۔ لاش کو متفقہ رائے سے پولیس تفتیش تک کے لیے سرد خانے میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔ چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے اور اتنا ہی وقت باقی تھا اس کے ریکارڈ کو شاندار بنانے کے لیے۔ وہ اکثر اسی دورانیے میں مجرم کو اپنے جال میں پھانس لیا کرتا تھا۔ رات کے وقت اس نے مہمانوں، پروفیسر کے رشتہ داروں، مسز رحمان اور ڈاکٹر صفدر کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ وقفے وقفے سے ان کے کمروں کے چکر کاٹتا رہا، اندر جھانک کر زیرو کے بلب کی روشنی میں جائزہ لیتا رہا لیکن کوئی مشکوک بات یا سراغ ہاتھ نہ لگا۔

دوسری صبح رحمان منزل میں طلوع ہو چکی تھی۔ سورج کی نارنجی کرنوں سے باغیچہ جگمگا رہا تھا۔ سبزہ اور

پھول نکھرے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔ ڈاکٹر صفدر صبح کی سیر سے واپس لوٹا تو کچھ پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب مزاج بخیر ہیں، کچھ گھبرائے ہوئے اور مضطرب معلوم ہوتے ہیں۔'' انسپکٹر کامران نے تاڑتے ہوئے کہا۔ جو خود بھی باغیچے کی جانب سے ٹہل کر آ رہا تھا۔

''کچھ نہیں انسپکٹر صاحب ایک تو رات نیند نہیں آئی، دوسرا پروفیسر صاحب کا چہرہ بار بار نگاہوں میں اترنے لگتا ہے۔ مجھے جب بھی نشست گاہ میں شطرنج کی بساط پر خون میں نہائی ہوئی پروفیسر کی لاش کا خیال آتا ہے۔ میرے اعصاب کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ میں اندر سے ٹوٹ جاتا ہوں۔ اضمحلال مجھے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ میں پیشے کے اعتبار سے سرجن ہوں، میں نے بے شمار زخمی جسم، کٹے پھٹے وجود دیکھے ہیں آپریشن کے وقت جسموں کی چیر پھاڑ کی ہے لیکن کبھی بھی مجھ پر دہشت طاری نہیں ہوئی۔ میرے اعصاب مجروح نہیں ہوئے لیکن پروفیسر کی لاش اُف۔'' ڈاکٹر لرز کر رہ گیا۔

''مجھے اپنی نگاہوں کے سامنے اب بھی دکھائی دیتی ہے۔ کاش میں اس درندے کی کھال اتار سکتا۔'' ڈاکٹر نے جذباتی لہجے میں مٹھیاں دباتے ہوئے کہا۔

''حوصلہ رکھیے ڈاکٹر صاحب!'' انسپکٹر کامران نے ان کا شانہ دباتے ہوئے کہا۔

''وہ درندہ صفت آدمی قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ آدمی کو اس کے برے عمل کی سزا ضرور ملتی ہے۔ کوئی شخص قدرت کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں، میں اور آپ بھی نہیں۔'' ڈاکٹر موڈ بدلنے کے لیے سگار نکال کے لائٹر سے سلگانے لگا۔

کچھ دیر بعد انسپکٹر کامران مفرور مجرم کی دستیابی کے سلسلے میں خود عملی طور پر جدوجہد کرنے کے لیے رحمان منزل سے باہر نکل آیا۔ سائرہ اور ڈاکٹر صفدر اس کی کوشش کو سراہتے ہوئے دروازے تک چلے آئے تھے۔ انسپکٹر کامران نے مڑتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

''اب شام کو ملاقات ہوگی میری کامیابی کے لیے دعا ضرور کیجیے گا۔'' دونوں نے سر کو اثبات میں جنبش دے کر جواب دیا۔ ڈرائیور سرکاری جیپ پورٹیکو سے پہلے ہی باہر نکال چکا تھا۔ انسپکٹر کامران سوار ہو کر لمحہ بہ لمحہ نظروں سے دور ہونے لگا۔

دونوں واپس پلٹے تو کچھ مہمانوں نے انہیں گھیر لیا اور معلوم کرنے لگے کہ ان کی بندش کب ختم ہوگی۔ وہ اپنے گھر جانے کے لیے بے چین اور مضطرب تھے۔ عزیز و اقارب بھی پریشان اور رنجیدہ تھے۔ سائرہ انہیں تسلی دیتے ہوئے جلد ہی بندش کے خاتمے کی یقین دہانی کرانے لگی۔ ڈاکٹر اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ سائرہ اوپری منزل کی طرف بڑھ گئی۔

رحمان منزل سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر آنے والے پہلے موڑ سے ٹرن لیتے ہی انسپکٹر کامران

نظم

کہیں فریب تو نہیں ہے
تیرا یوں مسکرانا
میرے پاس آنا
ادائیں دکھانا
نغمے محبت کے گنگنانا
نظریں جھکا کر مجھے کہنا
مجھے تم سے محبت ہے
یہ سب میری جاں
کہیں فریب تو نہیں ہے

(محمد ذیشان تشنہ مغل ..... سمندری، کراچی)

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

نے ڈرائیور کو جیپ آہستہ کرنے کا اشارہ کیا اس نے جیب سے موبائل اور مسز سائرہ کی تصویر نکال کے ہاتھ میں پکڑی اس نے کراچی کے متعلقہ تفتیشی افسر سے موبائل فون پر رابطہ قائم کیا اور سائرہ کا حلیہ بتا کر ناظم آباد' طارق روڈ اور تفریحی ریستورانوں میں اس کے متعلق تفتیش کا حکم دیا۔ وہ سائرہ کی زندگی کے ہر گوشے سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شک کا دائرہ کردار کی جانچ پڑتال کی طرف گامزن تھا۔

شام کے وقت انسپکٹر کامران رحمان منزل میں واپس آیا تو اس کا چہرہ جوش کی ہلکی سی کیفیت سے معمور تھا۔ تاہم اس نے خود کو پرسکون رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ سائرہ اور ڈاکٹر سے مل کر وہ نشست گاہ میں چلا آیا۔ اس کی مخصوص مہلت ختم ہونے والی تھی' اڑتالیس گھنٹے تیزی سے اختتام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس نے دو دن قبل رات دس بجے کیس پر کام شروع کیا تھا۔ لہٰذا صبح نو بجے تک کا وقت اس کے پاس تھا۔ اپنے شان دار ریکارڈ میں نیا اضافہ کرنے کے لیے۔

رات کے وقت بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے ڈاکٹر کی آنکھ کھل گئی۔ اسے تمباکو کی طلب ہوئی وہ بستر سے اترا اور چند قدم کے فاصلے پر کرسی پر رکھے کوٹ کی جیب کو ٹٹولا تو دھک سے رہ گیا اس کا نیا سگار اور خوب صورت لائیٹر غائب تھا اس کی انگلیاں جیبیں ٹٹول کر واپس لوٹیں۔ موٹا فاؤنٹین پین بھی موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر ایسے تحائف کی چوری پر سیخ پا ہوگیا۔ جھنجلاہٹ' غصے اور طیش سے اس کی حالت بگڑ گئی۔ چہرے کے عضلات درشتگی اور اشتعال سے کھنچ گئے۔ اس نے باہر جانے کا ارادہ کیا لیکن پھر دوسروں کے آرام کا خیال اسے واپس لے آیا۔ شدید طلب سے اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے ہی رات کا پچھلا پہر بیت لیا اور صبح کا سورج طلوع ہوا۔

صبح سات بجے ہی انسپکٹر کامران نے تمام مہمانوں اور گھر کے افراد کو نیچے پارٹی ہال میں جمع ہونے کا حکم سنا دیا۔ کیس کے خاتمے کا وقت آپہنچا تھا۔ سائرہ اور ڈاکٹر بھی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہال کے وسط میں آکر بے تابی سے انسپکٹر کامران کو دیکھ رہے تھے۔ ڈی آئی جی نثار احمد خان بھی آنکھیں ملتے ہوئے آپہنچے تھے۔ مہمانوں کے لیے ملازم گھر کی تمام کرسیاں لگا چکے تھے۔ لوگ خاموش اور اداس تھے لیکن ان کی بے چینی عروج پر تھی۔ نگاہیں چہروں اور جسموں کو ٹٹول رہی تھیں۔

سب کی بے تاب کیفیتوں کو ایک طائرانہ نگاہ سے دیکھ کر انسپکٹر کامران نے ہال کی وسطی میز کے گرد ٹہلتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ اگاتھا کرسٹی کے کردار پرکول پائرٹ کی مانند انکشاف کرنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نے چوری ہونے والی اشیاء کا تذکرہ کیا۔ انسپکٹر کامران نے کہا وہ اشیاء بھی ابھی برآمد ہوجائیں گی۔

"ہاں تو محترم حاضرین! پرسوں رات نو بجے ڈاکٹر صفدر علی نشست گاہ میں پہنچے تو پروفیسر رحمان کا قتل ہوچکا تھا۔ کمرے کی مغربی کھڑکی کھلی تھی۔ میں نے چارج سنبھالتے ہی دروازے پر متعین انسپکٹر اکرام کی جانچ پڑتال کے بعد اوپر آکر صورت حال کا جائزہ لیا۔ مسز سائرہ اور ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ ان کی جان کے درپے تھا۔ جسے طوفانی رات میں کسی لڑکی کو پامال کرتے ہوئے پروفیسر نے دیکھ کے پولیس کو مطلع کردیا تھا۔ اتفاق سے اس طرف سے گزرتی ہوئی پولیس کار موقع پر آپہنچی تھی اور لڑکے کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے تھانے اور عدالت میں لڑکے کے خلاف

بیان دیا تو لڑکا غضب ناک ہوگیا کہ پروفیسر کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس نے دو قاتلانہ حملے بھی پروفیسر پر کیے لیکن پروفیسر بچ گئے اگرچہ کار کے حادثے میں ان کی ٹانگ کی ہڈی بُری طرح ٹوٹ گئی تھی۔ نشست گاہ سے فنگر پرنٹس اٹھائے گئے لیکن پروفیسر' ڈاکٹر' سائرہ صاحبہ اور ملازم کے علاوہ قاتل کی انگلیوں کے نشانات نہیں مل سکے تھے۔ میں نے کھلی کھڑکی سے ٹیرس پر رکھے مین سگریٹ کا ٹکڑا پڑا دیکھا تو نیچے اُتر کر اٹھالیا اور ٹیرس سے برآمدے میں چلا گیا پھر زینے سے اُتر کر باغ کے گھنے درخت کا جائزہ لیا' باغ کی روش کے آغاز میں بھی سرخ پھولوں والے پردے کے پاس سگریٹ کا ایک اور ٹکڑا مل گیا اس طرح درخت سے اُتر کر قریب ہی ایک جھاڑی میں سگریٹ کا تیسرا ٹکڑا موجود تھا۔ یہ علامتیں تھیں کسی کی آمد اور فرار کی' لامحالہ یہی سوچا جاسکتا تھا کہ باہر متعین پہرے دار غافل ہوگئے تھے۔ خیر ہم نے اس لڑکے کا حلیہ مسز سائرہ سے سن کر اس کی گرفتاری کے لیے چھاپہ ماریمیں لاہور اور کراچی میں تشکیل دے دیں لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ اپنی قید سے قبل کی تمام ممکنہ جگہوں سے غائب تھا۔ کل صبح ہی مجھے قاتل کا سُراغ مل گیا تھا اور جب میں گھر سے تفتیش کی غرض سے باہر چلا گیا تو واپسی پر قتل کے محرکات بھی معلوم ہوگئے تھے۔" انسپکٹر کامران نے سانس لینے کے لیے سلسلہ منقطع کیا۔

"قاتل کون ہے۔" خوف سے لبریز آوازوں کا شور مہمانوں کی طرف سے بلند ہوا۔

"وہ کون ہے؟ وہ سنگ دل انسان کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے مضطرب لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے کی سلوٹیں باغی کشمکش کی غمازی کررہی تھیں۔ شاید وہ اپنی اشیاء کی دستیابی کے لیے بے تاب تھا۔

"ڈاکٹر صفدر صاحب!" انسپکٹر کامران نے ڈاکٹر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں معذرت خواہ ہوں آج رات میں ایک معمولی سی چوری کا مرتکب ہوا ہوں۔ میں تفتیشی راؤنڈ پر آپ کے کمرے کے باہر سے گزرا تھا۔ مجھے بھی پائپ کی شدید طلب ہورہی تھی۔ میں آپ کے کمرے میں گیا کرسی پر پڑے کوٹ کی جیب سے سگار' لائیٹر اور اس کیس کے نکات لکھنے کے لیے موٹا سا خوب صورت فاؤنٹین پین بھی اٹھالیا۔

"کیا مطلب آپ؟" ڈاکٹر چلایا تھا۔ "آپ نے قانون کا محافظ ہوکر چوری کی' میں آفیسرز سے آپ کی شکایت کروں گا۔ میں رات بھر تمباکو نوشی کے لیے کس قدر بے چین اور مضطرب رہا ہوں آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ افسوس آپ نے اپنے منصب کا بھی خیال نہ کیا اور اس قدر گھٹیا حرکت کرڈالی۔ لائیے میری چیزیں میرے حوالے کردیجیے یہ میرے انتہائی پیارے دوست کے تحائف ہیں۔"

"ضرور کیوں نہیں ڈاکٹر صاحب۔" انسپکٹر کامران کا ہاتھ جیب میں رینگ گیا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر بے تابی کا عجیب عالم تھا۔ انسپکٹر کامران کا ہاتھ جیب سے باہر نکلا تو اس میں ڈاکٹر کا خوش نما سگار' لائیٹر اور موٹا فونٹین پین بھی تھا۔ ڈاکٹر نے قدم آگے بڑھایا۔ انسپکٹر کامران نے نگاہیں ڈاکٹر کے چہرے پر گاڑتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"لیکن....."

"لیکن کیا!" ڈاکٹر جھنجلا کر چلا اُٹھا۔

"لیکن! ایک قاتل کو ایک معمولی سی چوری کے مواخذے کا حق نہیں دیا جاسکتا۔"

"کیا مطلب!" کمرے میں حیرت کا بم پھٹا۔ ڈاکٹر بڑے زور سے اُچھلا۔ اس کی نگاہوں میں دنیا

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

جہاں کی حیرت سمٹ آئی۔ مہمان اور ڈی آئی جی نثار احمد خان بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے انسپکٹر کامران کے ہاتھوں کی جنبش کو دیکھ رہے تھے۔ حیرت تعجب اور سسپنس سے سب کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔

انسپکٹر کامران نے سگار کی نال کے نیچے گول سے مٹھ نما حصے پر لگے ایک چھوٹے سے ہک میں لائیٹر کے سرے کو پھنسا دیا۔ پھر موٹا فوئیٹن پین جو اندر سے دُہرا سسٹم رکھتا تھا اسے سگار کی نال کے آگے فٹ کر دیا۔ ڈاکٹر کا رنگ اُڑ گیا' وہ بھاگنے لگا۔ دروازے کے باہر کھڑے دو سپاہی اندر آئے اور انہوں نے ڈاکٹر کو پکڑ لیا۔

لائیٹر نے ہک میں اٹکنے کے بعد ایک موٹے ٹرائیگر کی صورت اختیار کر لی تھی۔ انسپکٹر کامران نے ٹرائیگر پر دباؤ ڈالا تو سگار کی مٹھ میں موجود میکنزم حرکت میں آ گیا اور پین کے اندر کھوکھلے حصے میں موجود جان لیوا گولی نب جیسی فائر کی صورت میں نکلی جو سپاہیوں کے نرغے میں جکڑے ڈاکٹر کے کندھے کے اُوپر سے گزر کر ایک بلب پر لگی جو چُور چُور ہو گیا۔ سائرہ پتھر کے بت کی مانند پھٹی پھٹی نگاہوں سے انسپکٹر کامران کے ہاتھ میں موجود ''آلۂ قتل'' کو دیکھ رہی تھی۔

''قاتل باہر سے نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب یہ خوب صورت آلۂ قتل محافظوں کی آنکھوں کے سامنے اندر لائے اور پرزوں کو جوڑتے ہوئے بے آواز پستول سے پروفیسر کو موت کی نیند سلا دیا۔ ایسے ہتھیار یورپ اور امریکا میں تیار کیے جاتے ہیں۔ کسی جرائم پیشہ نے یہ اسمگل شدہ شے ڈاکٹر کے ہاتھ فروخت کی ہوگی۔'' انسپکٹر کامران ڈاکٹر کے سامنے آ کر رُک گیا۔

''ڈاکٹر صاحب اڑتالیس گھنٹے پورے ہونے سے دو گھنٹے قبل میں نے آپ کو گرفتار کر کے اپنے ریکارڈ میں نیا اضافہ کر دیا ہے۔ مجھے تمہاری ذہنیت پر افسوس ہے تم نے ڈاکٹری کے مقدس پیشے کو بدنام کیا اپنے محسن کا خون کر دیا۔ مجرم چاہے کتنا ہی چالاک اور ذہین کیوں نہ ہو وہ قانون سے بڑا نہیں ہو سکتا۔''

''لیکن اس کمینے نے یہ حرکت کیوں کی؟'' غصے سے پیچ و تاب کھاتا ڈی آئی جی بھی انسپکٹر کے پاس آ کھڑا ہوا۔ مہمانوں کی آوازیں بھی استفساری تقاضے میں بلند ہوئیں۔ انسپکٹر کامران اچانک بڑی تیزی سے سائرہ کی طرف پلٹا جو بے چینی سے سٹ پٹا کر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

''اِن کے لیے۔'' انسپکٹر کامران نے جلتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس حسین ساحرہ کے لیے جن کا کاٹا عام طور پر پانی نہیں مانگا کرتا۔

''یہ کیا بک رہے ہیں آپ؟'' سائرہ غصے سے چلائی۔

''خاموش رہو۔'' انسپکٹر کامران زور سے گرجا۔

''یہ پروفیسر کو دھوکا دے رہی تھی۔ یہ کراچی میں ٹی وی آرٹسٹ تھی۔ پروفیسر ان سے متاثر ہو گیا۔ پروفیسر کی دولت دیکھ کر یہ شادی کے لیے تیار ہو گئیں۔ لیکن پروفیسر کا دوست ڈاکٹر جو کم عمر اور نسبتاً خوب صورت تھا۔ ان کے دل کو بھا گیا۔ لیکن دولت کی خاطر پروفیسر سے شادی کر لی۔ ڈاکٹر سے میل جول بھی برقرار رہا۔ پروفیسر نے ان کی آوارگی کے قصے سن کر اور تصدیق کرتے ہوئے متعدد بار سرزنش کی لیکن انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ شروع شروع میں سائرہ صاحبہ پروفیسر رحمان کے ساتھ خوش تھی لیکن جب ڈاکٹر باہر سے واپس لوٹا تو پرانا عشق جاگ اُٹھا۔ اب ڈاکٹر کے دل میں پروفیسر کی طرف سے نفرت سی بیٹھ گئی۔ کیوں کہ وہ سختی سے سائرہ کو بلاوجہ

گھر سے باہر جانے سے روکنے لگا تھا۔ ایک روز پروفیسر نے رات کے پچھلے پہر اپنی حسین بیوی کو خیش کے عالم میں تشدد کا نشانہ بنا ڈالا۔ بس یہیں سے ڈاکٹر کھول اُٹھا اور غم و غصے سے پاگل سا ہو گیا۔ وہ سائرہ کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ سائرہ نے اپنی کمزوری سے دکھا دی تھی۔ ڈاکٹر اس دن سے پروفیسر کے خون کا پیاسا بن گیا۔ قاتلانہ حملے پروفیسر پر اس لڑکے نے نہیں بلکہ ڈاکٹر نے کسی کرائے کے بندے سے کروائے تھے اور جال اس مفرور لڑکے کے گرد بُن دیا گیا جو اتفاق سے ٹریفک کے ایک حادثے میں مارا جا چکا ہے۔'' مہمانوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے سب کی نفرت بھری نظریں دیکھ کر ڈاکٹر کا سر جھک گیا۔

انسپکٹر کامران نے پھر سلسلہ کلام جاری کیا۔

''پروفیسر نے اپنی ڈائری کے چند صفحات میں آوارگی کے قصے درج کر رکھے تھے جنہیں دیکھ کر کلیو مل گیا۔ یہ کہانی اس خون کی داستان ہے جو دنیا میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ یہ مثلث بھی دولت' حسن اور رقابت پر مشتمل ہے۔ کراچی کے ریستورانوں میں پروفیسر سے چھپ کر سائرہ کے ڈاکٹر سے ملنے کے شواہد مل گئے ہیں۔ پھر سب سے بڑا ثبوت مجھے اس وقت ملا جب میں کل صبح تفتیش کے لیے رحمان منزل سے باہر نکل گیا تھا۔ کچھ دور جیپ میں سفر کرنے کے بعد میں واپس لوٹ آیا اور عقبی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو کے فرضی قاتل والے راستے سے ہوتا ہوا اوپری منزل پر آ گیا۔ پھر میں ڈاکٹر کے کمرے کی کھڑکی تک جا پہنچا۔ میری توقع کے مطابق سائرہ صاحبہ اور ڈاکٹر صفدر جذبات کی رُو میں بہہ رہے تھے۔ مسز سائرہ پر والہانہ جذباتی خود سپردگی طاری تھی جب کہ ڈاکٹر بگڑ رہا تھا کہ اسے یہاں آ کر بے تابی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انسپکٹر جا چکا ہے لیکن کوئی اور بھی دیکھ سکتا ہے۔ لیکن حسن و جذبات کا سیلاب کہاں رُکنے والا تھا۔''

انسپکٹر کامران یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس وقت دو لیڈی کانسٹیبل اندر داخل ہوئیں اور ہتھکڑی لیے سائرہ کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ قتل کے پروگرام میں شامل تھی اور جذباتی گفتگو انسپکٹر کامران ٹیپ میں ریکارڈ کر چکا تھا۔ جس کی عدالت میں ضرورت تھی۔ اس وقت ڈی آئی جی نثار احمد خان نے چونک کر انسپکٹر کامران سے پوچھا۔

''یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہیں آلۂ قتل کی حقیقت کا علم کیسے ہوا؟ یہ نکتہ بڑا دلچسپ ہوگا۔''

''یقیناً۔'' انسپکٹر کامران مسکرایا۔ ''پرسوں صبح ڈاکٹر سیر کرتے ہوئے باغ میں رات کی رانی کے پودوں کے پاس ٹہل رہا تھا۔ وہ اچانک سانپ کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ اسی لمحے ڈاکٹر نے پودوں کو گھورتے ہوئے اپنے سگار لائیٹر اور قلم کو یک جا کر لیا۔ اِدھر سانپ نے حرکت کی اِدھر ڈاکٹر نے فائر کر دیا۔ سانپ کا سر اُڑ گیا۔

''اور تم کہاں تھے؟'' ڈی آئی جی فوراً بول اُٹھا۔

''میں عقبی دیوار کے پاس پھیلے درختوں کے درمیان ٹہلتے ہوئے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔'' ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

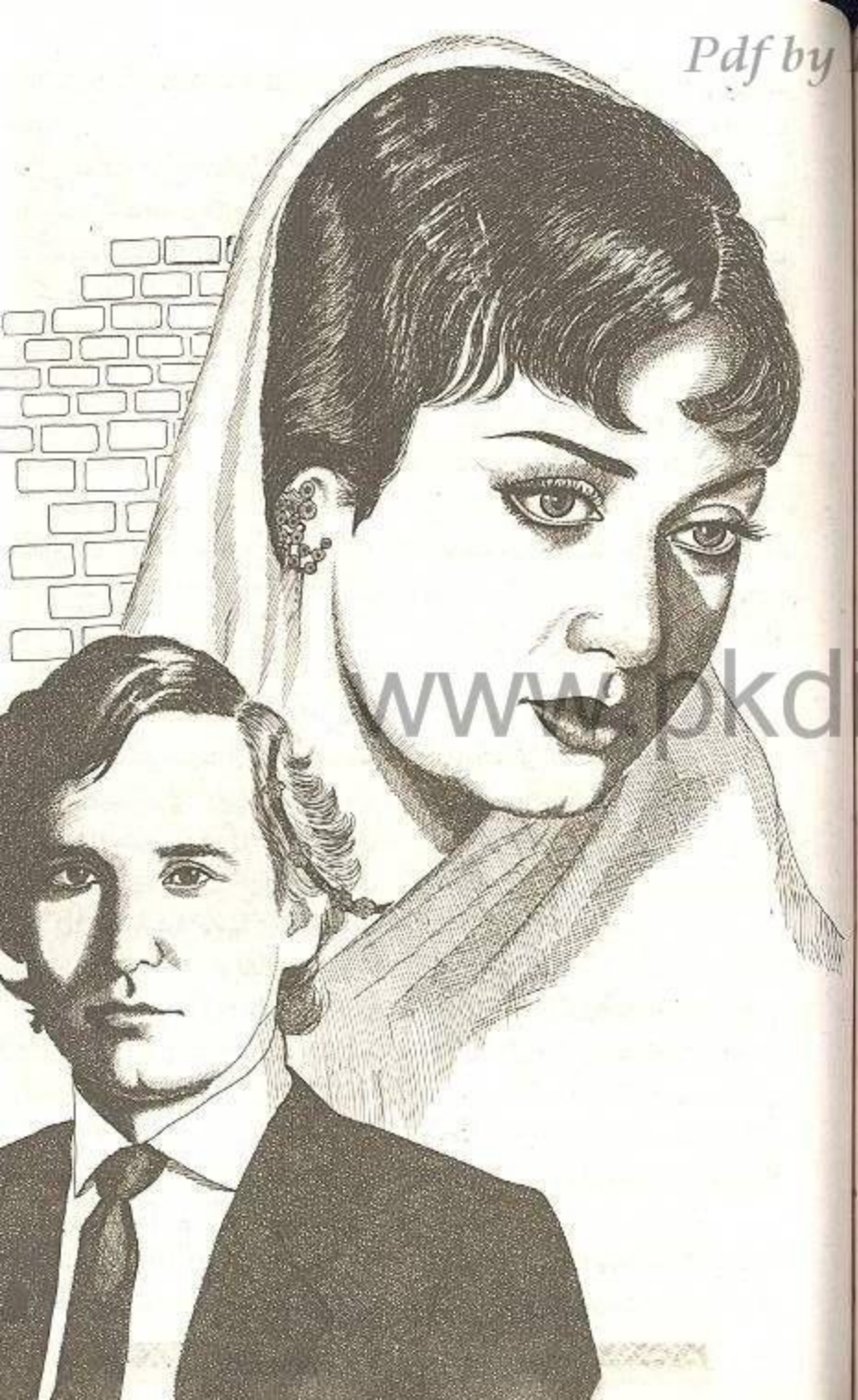

آزمائش

محترم مدیر نئے افق

السّلام علیکم! میں کوئی ادیب نہیں نہ ہی لکھنے کے فن سے آشنا ہوں۔ میرا تعلق دور پرے سے آپ کے پرچے کے کہانی کار ابنِ آدم سے تھا۔ انہوں نے ہی میری نفرتوں سے محبتوں تک کے سفر کی روداد کو کہانی کے رنگ میں ڈھالا۔ تاہم میں نے اس کی اشاعت کی اجازت نہیں دی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ مجھے جانیں آج جب کہ میں اپنی زندگی کی شاید آخری گھڑیاں شمار کر رہا ہوں یہ کہانی آپ کو ارسال کر رہا ہوں کہ محترم ابنِ آدم نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ جب بھی میں اس کہانی کو چھپوانا چاہوں تو ان کے حوالے سے آپ کو ارسال کردوں۔ امید ہے آپ اپنے اور محترم ابنِ آدم کے تعلق کو خاطر میں ضرور لائیں گے۔ اگر آپ کو یہ پسند نہ آئے تو ضائع کردیجیے گا۔

والسلام
شہاب اکرالعین
سعودی عرب

سینٹرل جیل کے مین گیٹ تک اس کے ساتھ قیدیوں کا انبوہ کثیر تھا۔ وہ ان کے درمیان پھنس کر ایسے چل رہا تھا' جیسے کوئی بڑا لیڈر یا روحانی پیشوا اپنے چاہنے والوں کی والہانہ چاہتوں کے درمیان چل رہا ہو۔ اس کے گلے میں تازہ پھولوں اور نوٹوں کے اتنے ہار تھے کہ دائیں بائیں چلتے دو آدمیوں نے ہاروں کو سہارا دے رکھا تھا۔

گیٹ کے پاسبان بھی ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اس بانکے قیدی کو دیکھ رہے تھے جس کی رہائی کا منظر جیل کی تاریخ میں انوکھی مثال قائم کر رہا تھا۔ انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران روح فرسا مناظر تو دیکھے تھے۔ لڑکھڑاتے ہوئے مدقوق چہروں والے رہائی کی خوشی میں تمتماتے چہروں والے اور جیل کی چہار دیواری سے مانوس اور مغموم لوگ' بہت کچھ دیکھا تھا لیکن یہ منظر ان کے لیے نیا اور حیران کن تھا۔

شہاب نے جیل کی سوگوار اور بے مہر فضا میں اخلاق اور انسانیت نوازی کی نئی طرح ڈالی تھی۔ سفاک قاتلوں سے لے کر اتفاقیہ حوادث کے مارے قیدی اس کی شخصیت کے سحر میں جکڑ گئے تھے۔ اس نے جیل کے اسکولوں سے لے کر چکیوں تک علم و دانش اور ہمدردی کی نئی لہر دوڑا دی تھی۔ اس نے افسران اعلیٰ سے جیل میں کئی ایسی اصلاحات نافذ کروائی تھیں' شاید ان ہی وجوہ نے عمر قید میں اتنی رعایتیں دی تھیں کہ وہ دس برس کی سزا کاٹ کر رہا ہو گیا تھا۔

انتظامیہ کو یقین تھا کہ شہاب اکبر معاشرے میں اپنا مجروح وقار دوبارہ حاصل کرلے گا' لیکن اس کے قریب ترین دو ساتھی جانتے تھے کہ ہر لحظہ مسکرانے والا شہاب ایسا پہاڑ ہے جس کے سینے میں لاوے کا دوزخ دہک رہا ہے۔ شہاب نے اُبلتا ہوا لاوا اپنی ذات کے روزن سے صرف بالے اور فخرو کو ہی دکھایا تھا۔ دونوں ڈاکے کے جرم میں پانچ برس کی سزا بھگت رہے تھے اور پندرہ روز بعد انہیں بھی جیل سے چھٹی ملنے والی تھی۔

جب شہاب گیٹ سے نکل کر باہر آیا تو اسے بہ یک وقت دو احساسات نے گھیر لیا تھا۔ اس نے خود کو یکا و تنہا محسوس کرتے ہوئے گردن موڑ کر پیچھے

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

دیکھا کتنے ہی ہاتھ اسے خدا حافظ کہتے لہرانے لگے تھے۔

اس نے بھی ہاتھ اٹھایا اور پھر جیسے اس کے اندر کا لاوا اُبلنے لگا' اسے درندگی کا احساس ہوا کیونکہ اس کے نتھنے زور زور سے پھڑکنے اور حلق سے بتدریج غراہٹیں بلند ہونے لگی تھیں۔

پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد اس نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ ٹیکسی اس کے قریب آ کر رکی' ڈرائیور نے باہر جھانک کر حسب عادت پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

''کہاں؟'' شہاب کے اندر سے گڑگڑاہٹ اُبھری۔ ''کسی ہوٹل تک لے چلو۔''

اس نے سیٹ پر خود کو گرایا اور ٹیکسی چل پڑی تھی۔

ہوٹل کے فرنشڈ روم کے گداز بیڈ پر وہ چت لیٹا دیوار پر آویزاں ایک پینٹنگ کو یک ٹک گھورے جا رہا تھا۔ تصویر ممتا کے جذبات کی عکاس تھی۔ ایک شیر خوار بچہ جھولے میں لیٹا انگوٹھا چوس رہا تھا اور ماں جھولے کو اُلارے دے رہی تھی۔ شہاب اکبر کی آنکھیں تصویر پر لگی ہوئی تھیں' لیکن وہ خود دس برس پیچھے ماضی کی ایک رات کا شہاب اکبر بن گیا تھا۔

☆

پانی کی بالٹی فرش پر اوندھی کر کے ثریا خانم جوں ہی مڑی اس کی آنکھیں خوف اور حیرت سے برف کی ڈلیوں جیسی جامد و ساکت ہو گئی تھیں۔ سامنے ایک طویل قامت نقاب پوش دہلیز پر پاؤں پھیلائے کھڑا تھا۔ بالٹی پر اس کی گرفت بھی منجمد ہو گئی تھی' حالانکہ اس کے ہاتھ پاؤں بے جان ہو گئے تھے' لیکن بالٹی پھر بھی فرش پر نہ گری تھی۔

''گھبرائیے نہیں خانم!'' نقاب پوش کی کھرکھراتی آواز اُبھری۔ ''میں آپ کا دشمن نہیں' مجھے ایک مجبوری یہاں تک لے آئی ہے۔ براہِ کرم آپ دوسرے کمرے میں چلی جائیں۔''

مہربان سے لہجے نے ثریا کے ذہن کو قدرے گرمی دی اور اس کے تالو سے چپکی زبان میں قوت گویائی عود کر آئی۔ ''آپ...... آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟'' ثریا نے ہچکولے کھاتی زبان سے پوچھا۔

''نقاب پوش کی ناک سے پھنکار سی ابھری۔ اس نے گردن کو جھکا دیا اور ایک قدم اٹھا کر بولا۔

''پہلے سوال کا جواب ہے آپ کا ہمدرد اور دوسرا جواب ہے میں آپ کے بیٹے کو لے جانے آیا ہوں۔''

''کہاں؟'' ثریا کی زبان سے بے ساختہ آواز نکلی۔ ''نن...... نہیں۔''

''وہاں ثریا خانم!'' وہ جمی ہوئی آواز میں بولا۔ ''جہاں وہ سلامتی کے ساتھ رہے گا۔ جہاں قاتل ہاتھ اس کی گردن تک نہیں پہنچ سکیں گے۔''

وہ اُچھل کر ثریا کے نزدیک آیا اور مضبوط ہاتھوں میں نازک سی گردن آ گئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے ثریا کا پھڑکتا ہوا جسم جکڑ لیا تھا۔

پھر اس نے بڑے احترام اور آرام کے ساتھ ثریا خانم کو دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر کاؤچ پر رکھ دیا اور بوجھل بوجھل قدموں سے چلتا ہوا دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ساگوان کے منقش جھولے میں فواد سویا ہوا تھا اور اس کے پھول جیسے نرم اور گلابی چہرے پر بڑی پیاری مسکان کھیل رہی تھی۔

وہ لحظہ بھر جھولے کو ہولے ہولے ہلکورے دیتا اور بچے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اسے بہت آہستگی سے اٹھایا اور چادر کی بکل میں چھپا کر برق رفتاری سے کھلی کھڑکی کے راستے باغیچے میں کود گیا کیونکہ اس نے قدموں کی چاپ سن لی تھی۔ وہ درندے جن کی آمد سے پہلے وہ اپنا کام اطمینان سے کر لینا چاہتا تھا۔ وقت سے قبل ہی پہنچ گئے تھے۔ تاریک باغیچے میں درختوں اور خودرو جھاڑیوں سے بچتا ہوا کمپاؤنڈ وال تک پہنچا اور پھر ایک درخت پر بندر کی مانند چڑھتا چلا گیا۔

باہر ایک فرلانگ دور مرسڈیز اس کی منتظر تھی۔

اگر وہ اندھا موڑ نہ ہوتا تو اسے کار کے ساتھ کھڑا ٹریفک سارجنٹ دور سے ہی دکھائی دیتا اور دائیں بائیں نکل جاتا' لیکن موڑ کی وجہ سے وہ جلد باز خرگوش کی مانند پھاہی میں پھنس گیا تھا۔ جونہی وہ موڑ مڑا ٹریفک سارجنٹ نے اسے دیکھ لیا۔ اس وقت صرف اس کا چہرہ بے نقاب تھا جب کہ بچے کے گرد چادر لپٹی ہوئی تھی۔

''یہ گاڑی آپ کی ہے نا؟'' سارجنٹ نے اس کے قیمتی لباس اور مردانہ وجاہت سے متاثر ہوتے ہوئے مہذب لہجے میں پوچھا۔

''یس آفیسر!'' اس نے جواب دیا۔

''معاف کیجیے گا جناب!'' سارجنٹ بولا۔ ''آپ کی گاڑی نے تنگ سڑک بلاک کر رکھی ہے' دوسری غلطی اگنیشن میں لگی ہوئی چابی ہے۔ آپ کی گاڑی چوری ہو جاتی تو مصیبت ہماری آتی۔''

''آئی ایم سوری آفیسر!'' وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

''دراصل مجھے دور نہیں جانا تھا۔'' اس نے دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر بچہ رکھ دیا اور سارجنٹ نے موٹر سائیکل کو کک مار کر اسٹارٹ کر لیا۔

سارجنٹ جب نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے اطمینان کی گہری سانس لی' بچے کو اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے کرتے ہوئے اس کی رگ و پے میں فخر و انبساط کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔ اسے اتنی آسانی اور کامیابی کی امید نہ تھی کیونکہ اس نے ثریا خانم کو کبھی بزدل اور نروس نہیں سمجھا تھا۔

اپنے بیڈ روم میں داخل ہو کر اس نے بہ آہستگی بچے کو بیڈ پر لٹایا اور اس کے لیے دودھ گرم کرنے کچن میں چلا گیا۔ اس نے ننھے مہمان کی خدمت خاطر کا پہلے ہی انتظام کر رکھا تھا۔ گو اسے بچوں کو بہلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا' لیکن ایک یقین اس کے ساتھ تھا کہ بچے پیار بھری لوریوں سے بہل جایا کرتے ہیں۔

دودھ فیڈر میں ڈال کر وہ ہولے ہولے چلتا مینٹل پیس پر رکھی تصویر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ فریم میں مدبر چہرے والی خاتون تھیں۔ اس نے گردن کو ذرا سا خم دے کر خاتون کو تعظیم دی۔

''اماں جی! میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ آپ کے احسانات کا پورا صلہ دے دیا ہے' صرف یہ کہوں گا کہ آج میں نے آپ کے مقدس دودھ کی لاج بچائی ہے۔ میں آپ کے خاندان کا آخری چراغ طوفانوں سے بچا لایا ہوں۔ آپ کے مرحوم بیٹے نجیب خان کی نشانی اور آپ کی بہو ثریا خانم کا سہارا ایک ظالم کے دست برد کی بھینٹ چڑھنے نہیں دیا۔'' اس نے آستین سے آنسو پونچھے اور پلٹ کر بچے کے اوپر جھک گیا۔

بچہ فطرتاً ہی صابر اور بھاگوان تھا یا اس کی روح نے وقت کو پہچان لیا تھا۔ صرف ایک بار رویا اور فیڈر سے دودھ پیتے پیتے سو گیا۔ صبح تک وہ اس کے سینے سے ہی لپٹا رہا تھا۔ اس نے ناشتا تیار

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

کرنے کے دوران ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ بچے کو گہوارہ جیسے صاف ستھرے اور با اعتماد ادارے کے حوالے کردے گا اور خود گاہے گاہے اس سے مل لیا کرے گا۔ کیونکہ وہ خود مصروف تھا اور کسی عورت پر بچے کی پرورش کا کلی انحصار نہیں کرتا تھا۔

چائے کا سپ لے کر اس نے اخبار سامنے پھیلایا فرنٹ پیج کی ہیڈ لائن افغان جنگ سے متعلق تھی۔ پھر اس کی نگاہیں حسب عادت سرخیوں پر دوڑنے لگیں۔ معاً اس کی نگاہوں کو جیسے اچھو ہو گیا تھا۔ پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر بکھر گئی۔ خبر کیا تھی اس کے لیے بم کا دھماکا تھا۔

''درندہ صفت قاتل نے ایک عورت کو ہلاک کردیا۔''

''راولپنڈی ۲۳ جون (کرائم رپورٹر) آج رات ایک سفّاک القلب جنسی دیوانے نے چوہدری نجیب خان مرحوم کی نوجوان بیوہ کو درندگی کا نشانہ بنایا اور پھر اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کردیا اس کا شیر خوار بچہ بھی گم ہے۔ اس سے قبل بھی گزشتہ ہفتے ایسی ہی ایک لرزہ خیز واردات میں ایک نوجوان طالبہ شبانہ قتل ہو چکی ہے۔ عوام میں خوف و ہراس اور غصے کی لہر دوڑ گئی ہے۔ عوامی حلقوں نے اس درندے کو جلد از جلد گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا ہے پولیس سرگرمی سے قاتل کو تلاش کر رہی ہے۔ تہلکہ خیز انکشافات کی توقع ہے۔''

وہ اخبار اُچھال کر دوڑتا ہوا بیڈ روم میں داخل ہوا اور بچے کو اٹھا کر اسی تیزی سے باہر نکل آیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ کار میں تھا۔ ایک گھنٹے کی خطرناک ڈرائیونگ کے بعد وہ ایک پرانی حویلی میں داخل ہوا۔ بابا بدرالدین بکریوں کے باڑے میں تھا۔ سیدھا اُدھر ہی چلا گیا۔

''ایں چوہدری بیٹے تم!'' بدرالدین نے حیرت سے پوچھا۔ ''حیریت تو ہے ناشہر میں؟''

''ہاں بابا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایک امانت لے کر آیا ہوں۔'' اس نے بچے کو ان کی طرف بڑھایا۔ ''مجھ سے آپ کوئی سوال نہیں کریں گے بابا سوائے اس وعدے کے کہ اس امانت کی پاسبانی اپنی جان سے بڑھ کر کریں گے۔''

''چلو سوال نہ سہی پر یہ تو بتائے گا یہ کون ہے؟''

''ہاں بابا! سب کچھ بتاؤں گا۔'' اس نے بدر بابا کو ساری بات بتادی۔

''بڑی وزنی امانت ہے بیٹے۔'' بدرالدین نے بچے کو لے لیا۔ ''لیکن تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں نے یہ امانت کسی کو سونپی تو وہ ذات صرف خدا کی ہوگی۔''

''شکریہ بابا!'' وہ ممنون لہجے میں بولا۔ ''شاید مجھے گرفتار کرلیا جائے' قانون اور چوہدری حبیب خان دونوں طاقتور ہیں بابا' اگر وہ جیت گئے تو میں اپنی ساری جائداد اس بچے کے لیے وقف کر جاؤں گا۔ بس اسے چوہدری حبیب خان سے بچانا۔ آپ مجھ سے کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔ مجھے جب بھی آپ کی ضرورت ہوگی میرا کوئی آدمی آجایا کرے گا۔ میں نہیں چاہتا چوہدری کے کتے آپ کی بُو بھی پالیں۔''

جب وہ بچے کو با اعتماد اور محفوظ ہاتھوں میں دے کر کار میں بیٹھا تو خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ ساری پریشانی جیسے بدرالدین نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔

کار اس کی اپنی نہیں تھی' اگر بچے کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ رات کو ہی کار اپنے دوست ناصر کو واپس کردیتا۔ ناصر مضافاتی علاقے میں رہائش پذیر تھا۔

پھر اسے کار کی فوری ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کار وہ آرام سے واپس کرنا چاہتا تھا۔

حویلی کا بڑا دروازہ کھول کر وہ آہستہ آہستہ کار اندر لے گیا اور ایک جیپ کے ساتھ روک کر اُترا تو وہ خطرہ اس کے سامنے کھڑا گھور رہا تھا۔ جس کی آمد کے قدموں کی چاپیں صبح اس نے سن لی تھیں' اگر وہ چاہتا تو فرار کی کوشش کرسکتا تھا' مگر اس نے خطرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فرار اسے ناکردہ جرم کا مجرم بنانے میں معاون ثابت ہوگا۔

وہ متوازن قدم اٹھاتا برآمدے میں داخل ہوا۔ سامنے ایک پولیس انسپکٹر اور ناصر بیٹھے تھے بلکہ دونوں پتھرائی ہوئی نگاہوں سے اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ حیرت ان کو ہو رہی ہوگی مگر وہ انسپکٹر کی جیپ دیکھ کر ساری بات سمجھ گیا تھا کہ ناصر کی کار ہی پولیس کو لے آئی تھی۔

''اچھا ہوا شہاب!'' ناصر نے سلام کا جواب دے کر کہا تھا۔ ''مجھے امید ہے انسپکٹر کی غلط فہمی اب دور ہو چکی ہوگی۔''

''کیسی غلط فہمی؟'' شہاب نے متعجب لہجے میں پوچھا۔

''فرمایئے انسپکٹر صاحب؟''

''تشریف رکھیں مسٹر شہاب!'' انسپکٹر نے متبسم انداز میں کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''غلط فہمی نہیں بس ہماری ایک مجبوری ہوتی ہے' ہم لوگ اپنے سائے کو بھی شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔''

''شہاب!'' ناصر نے آنکھ کا ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے جیسے التجا کی تھی۔ ''گاڑی کا فالٹ معلوم ہوا؟''

''ہاں' صرف بیٹری کے تاروں میں فالٹ تھا۔''

''مسٹر شہاب!'' انسپکٹر سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''گزشتہ رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان آپ گاڑی کے ساتھ کہاں کہاں گئے تھے؟''

''تقریباً آدھے شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں انسپکٹر!'' شہاب نے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا تھا۔ ''دراصل گرمی بہت تھی۔'' وہ ناصر کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔ ''بڑی مدت بعد شاندار کار فل ٹنکی کے ساتھ ملی تھی' بس سڑکوں اور فضاؤں میں دوڑاتا رہا تھا۔''

''نئے محلے کی گلی نمبر پندرہ میں آپ کی گاڑی کھڑی تھی' کیا آپ ثبوت کے ساتھ بتانا پسند کریں کہ وہاں کیوں اور کس کے پاس گئے تھے؟''

''جی ہاں ثبوت اور وثوق کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ وہاں میں اپنی بھابی ثریا خانم کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا۔''

''اوہ شہاب تم.....!'' ناصر کی چیخ نکل گئی تھی۔ ''تم.....تم.....وہاں.....!''

''ہاں دوست!'' شہاب نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ان کی خیریت معلوم کرنا میرے فرائض میں شامل رہا ہے جب بھی فراغت پاتا ہوں ان کو سلام کرنے ضرور جاتا ہوں۔''

''تم نے وہ خبر.....'' ناصر ہانپ سا گیا تھا۔ ''اوہ میرے خدا تمہیں نہیں معلوم کہ ثریا خانم کو قتل.....!''

''نہیں۔'' شہاب کے حلق سے دہاڑ اُبھری۔ ''نہیں ناصر.....نہیں.....!''

انسپکٹر نے ڈائری سے اخبار نکال کر سامنے رکھ دیا۔

گو اس کے لیے وہ جاں کاہ خبر نئی نہ تھی پھر بھی اس کی اداکاری فطری ہی تھی اور دکھ آنکھوں سے

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

بہہ نکلا تھا۔ پہلے تو وہ بچے کی وجہ سے رو بھی نہ سکا تھا کیونکہ رونے کے لیے اس کے پاس بہت وقت تھا۔ لیکن بچے کو بچانے میں اگر وہ تاخیر کرتا تو پھر بے بسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

''جی ہاں اس وقت وہ فرش دھو رہی تھیں۔ میں بس کھڑے کھڑے سلام دعا کر کے واپس آ گیا تھا۔''

''دیکھیے میں شک نہیں کرتا۔'' انسپکٹر بولا۔ ''مگر حالات اور شواہد ایسے ہی ہیں۔ آپ میرے ساتھ تھانے تک چلیں گے۔ ویسے تفتیشی پارٹیاں مصروفِ تفتیش ہیں' مجھے امید ہے اصل قاتل مل جائے گا۔''

''اگر تھانے میں میری حاضری قتل اور قاتل پر روشنی ڈال سکتی ہے تو میں ضرور چلوں گا۔''

''شکریہ!'' انسپکٹر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مجھے آپ جیسے نوجوان سے یہی توقع تھی آیئے چلیں۔''

''سنیے انسپکٹر!'' ناصر بھی اٹھ کر ساتھ ہو لیا تھا۔ ''اگر آپ شہاب کو گرفتار کر رہے ہیں تو قانونی مدد کے لیے وکیل بلانے کی اجازت تو ہو گی نا؟''

''نہیں۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''فی الحال ہمارے پاس ان کو گرفتار کرنے کا کوئی جواز نہیں۔''

تھانے کی فضا میں عجیب بے آواز شور تھا جو صرف روح محسوس کر رہی تھی۔ اسے ایک کرسی پر بٹھا کر انسپکٹر نے ایک کانسٹیبل کو اشارے سے اس پر نگران مقرر کر دیا۔ سب کچھ خاموش تھا' لیکن وہ دیکھ اور محسوس کر رہا تھا کہ مکڑی اس کے گرد جالا بن رہی ہے' مگر وہ بے حس و حرکت ہی رہا جیسے وقت کے سحر نے اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔

''میں آپ کو گرفتار کر رہا ہوں مسٹر شہاب!'' انسپکٹر نے دس منٹ بعد دفتر میں آ کر کہا۔ ''مقتولہ کے لواحقین نے ٹھوس وجوہ کے تحت آپ کو ہی قاتل قرار دیا ہے۔ گو میں ذاتی طور پر ابھی پر یقین نہیں۔ ہمیں بیڈ روم تک آپ کے پاؤں کے پرنٹس کے ساتھ کچھ دوسرے پرنٹ بھی ملے ہیں۔ ان میں آپ کے پرنٹس بالکل نمایاں ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہو گی ہے آپ گیلے فرش پر چل کر اندر گئے ہوں گے لیکن بچے کے جھولے کے اردگرد صرف آپ کے ہی نقش ثابت ہیں۔''

''اس لیے کہ میں فواد کو دیکھنے گیا تھا۔ شہاب نے بتایا۔ ''میں نے جھولے کے قریب بیٹھ کر اسے پیار کیا تھا۔''

''ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو۔'' انسپکٹر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''لیکن یہ آپ کا بیان ہے' قانون صرف آنکھیں رکھتا ہے۔ استغاثہ بااثر بھی ہے اور گواہ بھی رکھتا ہے۔ بہر کیف یہ فیصلہ عدالت ہی کر سکتی ہے مجھے اوپر سے آپ کی گرفتاری کا حکم مل چکا ہے کیونکہ عوام اور پریس واویلا کر رہے ہیں۔''

''رپورٹ کس کی طرف سے درج ہوئی انسپکٹر؟''

''چوہدری حبیب خان۔'' انسپکٹر نے بتایا۔ ''آپ کے مربی اور علاقے کے بڑے زمین دار۔''

''پھر تو شاید مجھے کوئی قانون دان بھی نہ بچا سکے۔''

''نہیں مسٹر شہاب! اگر استغاثہ معقول گواہی پیش نہ کر سکا تو قانون قدموں کے نشان اور کار کی موجودگی کو ہی حتمی ثبوت نہیں مانے گا۔ ابھی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی سامنے نہیں آئی' اگر آپ واقعی قاتل نہیں تو آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔''

انسپکٹر کی آخری گفتگو تھی جس میں احترامِ

انسانیت اور ہمدردی تھی۔ اس کے بعد تو اس انسپکٹر کا چہرہ ہی نہیں رویہ اور لب و لہجہ بھی درندوں جیسا ہو گیا تھا' کیونکہ چوہدری حبیب خان اپنی لمبی کار اور اوپر کی سفارش کے ساتھ خود تھانے آیا تھا۔

لیکن درندگی کی انتہا اور تشدد کی آخری ڈگری بھی مایوس ہو گئی۔ ان لوگوں کا بس ایک ہی سوال تھا کہ بچہ کہاں ہے؟ انہوں نے ایک دفعہ بھی اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ قتل کا اعتراف کرے۔ اس نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ میں نے ہی ثریا خانم کو قتل کیا ہے۔ اس تک یہ پیش کش بھی پہنچائی گئی تھی کہ اگر وہ بچے کے بارے میں بتا دے تو چوہدری حبیب خان اسے معاف کر دیں گے' مگر اس نے ہر ضرب اور ہر سوال کا ایک ہی جواب دیا تھا کہ اسے بچے کا کچھ علم نہیں۔

''شہاب!'' ناصر نے رو دینے والے انداز میں التجا کی تھی۔ ''انہیں بتا کیوں نہیں دیتے؟ سنو شہاب! میں خود بڑے چوہدری سے مل چکا ہوں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں بچا لیں گے وہ ایسا کر سکتے ہیں دیکھو شہاب زندگی اس قدر ارزاں شے نہیں پھر تمہاری ذات پر غلیظ ترین الزام لگایا گیا ہے۔ انہیں بتا دو' میں جانتا ہوں تم قاتل نہیں ہو لیکن بچے کے بارے میں تم جانتے ہو۔''

''انسپکٹر سے کہو مجھے کسی اچھی جگہ لے چلے' پھر صرف تم میرے قریب ہو گے اور میں تمہیں بتاؤں گا' لیکن اس سے قبل تمہیں ایک مقدس قسم کھانا ہو گی کہ جو کچھ میں بتاؤں گا وہ صرف تمہاری ذات تک محدود رہے گا۔''

''نہیں۔'' ناصر نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں حقیقت سے صرف پولیس کو ہی نہیں لوگوں کو بھی آگاہ کرنا چاہوں گا تاکہ جو غلاظت تم پر اچھالی جا رہی ہے وہ دھل جائے۔''

''تو پھر سن لو' میں نے قتل نہیں کیا۔'' شہاب نے سرگوشیانہ انداز میں بتایا۔ ''ثریا خانم میرے رضاعی بھائی نجیب خان کی بیوہ ہونے کے ناتے میری ماں تھیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ یہی مقام دیا ہے۔''

''پھر تم وہاں کیوں گئے تھے اور چادر میں لپیٹ کر کیا لائے تھے؟''

''نجیب خان کی آخری نشانی۔'' شہاب نے زیرِ لب سرسراتی آواز میں کہا۔ ''بس اب تم چلے جاؤ' اگر تم نے زبان کھولی تو تمہارا شمار بھی ظالموں میں ہو گا۔''

''تو تم اس بچے کی خاطر رسوائی کی موت مرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں یہ رسوائی اور موت مجھے شہرت یافتہ ہزار زندگیوں سے عزیز ہے۔''

''کیا تم مجھے تفصیل نہیں بتاؤ گے؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے میرے دوست!' شہاب نے سلاخوں پر پیشانی رکھ دی۔ ''اگر بچ گیا تو کبھی سکون سے سناؤں گا اور اگر سزائے موت ہو گئی تو تمہیں آخری ملاقات پر سب کچھ بتا کر قربان گاہ تک جاؤں گا۔''

''اچھا پیارے خدا حافظ۔'' پولیس' چوہدری حبیب اور ناصر کی ذاتی آخری کوشش بھی ناکام رہی تھی۔

❁.....☆.....❁

پہلی پیشی پر جب شہاب کو عدالت میں لایا گیا تو اس سفاک اور درندہ صفت قاتل کو دیکھنے کے لیے عدالت کے احاطہ میں پریس رپورٹرز اور لوگوں کا جمِ غفیر تھا۔ پولیس کو اسے پسِ نقاب عدالت تک لے جانا پڑا تھا پھر بھی نہ جانے ایک چودہ پندرہ برس

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

کی لڑکی کو کس طرح پتا چل گیا۔ شاید کمرہ عدالت کے دروازے میں کھڑی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس سے قبل کہ کوئی مداخلت کرتا' وہ لڑکی ایک دم اس کے سامنے آ گئی اور اس پر تھوک دیا۔

''غلیظ کتے۔'' وہ سپاہی کے ہاتھوں میں تڑپ کر چیخی۔

''مجھے تم سے شدید نفرت ہے۔'' شہاب نے بُری طرح اپنا ہونٹ کاٹ لیا۔ وہ اسے پہچان گیا تھا۔ وہ ثریا خانم کی چھوٹی بہن مدیحہ خانم تھی..... وہ لڑکی جو ثریا نے اس کے لیے نہ صرف پسند کر رکھی تھی بلکہ وہ شہاب سے اجازت بھی لے چکی تھی اور اپنی امی سے مدیحہ کو شہاب کے لیے مانگنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

''آہ!'' شہاب نے جلتی سانسوں کو سوچ دی۔ ''مدیحہ خانم! تم سامنے آئیں بھی تو کس روپ اور کس جگہ آئیں۔ کاش میں تمہیں سچ بتا سکتا۔''

ناصر نے ایک نوجوان وکیل کی خدمات حاصل کر لی تھیں' جب کہ چوہدری حبیب خان ایک نام ور قانون دان عدالت میں لایا تھا۔ پہلی پیشی میں دس پندرہ منٹ بس ابتدائی اور رسمی کارروائیاں ہوئیں اور وکیل استغاثہ نے کوئی قانونی نقطہ سامنے رکھ کر مقدمے کی تاریخ لے لی۔

دوسرے روز اس کا وکیل یونس راجا جیل میں اس سے ملاقات کرنے آیا۔ ناصر بھی ساتھ تھا' لیکن شہاب تک صرف وکیل ہی کو جانے کی اجازت دی گئی تھی۔

''آپ کا مورال کیسا ہے شہاب؟' وکیل نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

''دیکھ لیجیے مسکرا رہا ہوں۔'' شہاب نے جواب دیا۔ ''رہا مورال کا معاملہ تو جس طرح درد حد سے بڑھ جائے تو احساس درد مٹ جاتا ہے' اسی طرح مجھے پیدائش سے ہوش سنبھالنے تک اتنے دکھ ملے ہیں کہ میرے اندر سے دکھ کا احساس جاتا رہا ہے۔ شاید میں اپنے حصے کا رونا بچپن کو ہی دے چکا ہوں۔''

''مجھے بہت کچھ ناصر کی زبانی معلوم ہو چکا ہے۔'' وکیل نے کہا۔ ''میں آپ کی ہمت اور عقل کو داد دیتا ہوں۔ نامساعد حالات کے طوفانوں سے جس طرح آپ نے جنگ جیتی ہے' وہ بڑی جرأت مندی تھی میں امید کرتا ہوں آپ بالکل اسی جرأت ذہانت سے موجودہ جنگ بھی لڑیں گے۔''

''اب جنگ انصاف اور دولت کے درمیان ہے راجا صاحب!'' شہاب نے ہنس کر کہا۔ ''میں تو صرف تماشائی ہوں۔''

''نہیں شہاب!'' یونس زور دار آواز میں بولا۔ ''آپ بھی ایک فریق ہیں یا یوں سمجھیے محاذ پر میں لڑ رہا ہوں اور آپ سپلائی لائن کے انچارج ہیں' میرے لیے راشن اور گولہ بارود آپ سپلائی کریں گے۔''

''وہی تو نہیں ہے میرے پاس.....''

''ہے۔'' وکیل نے دھمک کر کہا۔ ''آپ کو اپنے گودام کا تالا توڑنا ہوگا' ورنہ ہم جنگ ہار جائیں گے۔''

''میں تو ہار تسلیم کر کے ہی یہاں تک آیا ہوں وکیل صاحب!''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میں لڑنا نہیں چاہتا' دیکھیے راجا صاحب! بعض اوقات کوئی اہم محاذ بچانے کی خاطر چھوٹے اور غیر اہم محاذ سے پسپا ہونا پڑتا ہے کسی بڑے مقصد کی خاطر چھوٹا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔''

''آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ اس رات ثریا خانم سے ملنے کیوں گئے تھے؟''

''میں عموماً ان سے ملتا رہتا تھا۔ وہ ملاقات بھی بس ایک معمول کی ملاقات ہی تھی۔''

''نہیں شہاب! کھل جاؤ دوست! مجھے بتایا گیا ہے کہ ثریا خانم اور آپ کے تعلقات عرصے سے کشیدہ تھے؟''

''جی ہاں بظاہر.....''

''وضاحت کیجیے۔''

''چوہدری خاندان شروع ہی سے ہمارے میل جول کو ایک شرم ناک نام دیتا تھا۔ اس لیے جب نجیب بھائی ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تو میں نے بظاہر خود کو ثریا خانم سے دور کر لیا تھا۔''

''اور در پردہ ملتے تھے۔''

''جی ہاں۔'' شہاب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس لیے کہ وہ میرے بھائی کی امانت تھی اور میں ان کا محافظ تھا۔''

''اس رات بھی آپ اس لیے گئے تھے کہ اسے کوئی خطرہ تھا کیوں یہی بات ہے نا؟''

''شاید یہی وجہ رہی ہو۔'' شہاب بولا۔ ''لیکن میں ایسی بات عدالت تک نہیں لے جانا چاہوں گا۔''

''کوئی خوف؟''

''شاید خوف ہی ہو۔''

''قانون آپ کو پورا تحفظ دے گا' اس خوف کا نام مجھے بتائیں میں اسے عدالت میں بے نقاب کروں گا۔''

''سوری وکیل صاحب! میں اپنی مدد نہیں کر سکتا۔'' ایک دم اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

''جہنم میں جاؤ۔'' نوجوان وکیل نے بے بسی سے دانت پیس لیے۔ اس کی آواز شہاب کی چوڑی پشت سے ٹکرائی تھی۔ ''جو اپنی مدد آپ نہیں کرتے ان کی مدد تو خدا بھی نہیں کرتا۔''

شہاب کو تو پہلے ہی یقین تھا کہ آزمائش منجانب اللہ ہی اُتری ہے اور اس نے صبر و شکر کے ساتھ اس کڑی آزمائش کو قبول کرتے ہوئے عہد بھی کر لیا تھا کہ مقصد کو بچانے کی راہ میں اگر ذلتوں کے علاوہ موت بھی آئی تو اس کے عہد اور حوصلے میں کوئی تریڑ نہیں پڑے گی۔

❀.....☆.....❀

عدالت کا وسیع و عریض کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں چوہدری حبیب خان اس کے پروردہ حواری' مقتولہ ثریا خانم کے والد اور ریٹائرڈ کرنل آفتاب احمد اور ان کے پہلو میں گلاب کی سوگوار کلی جیسی مدیحہ خانم بیٹھی نفرت انگیز نگاہوں سے کٹہرے میں کھڑے شہاب کو گھور رہی تھی۔ شہاب نے صرف ایک طائرانہ نگاہ حاضرین پر ڈالی اور بے شمار نفرت برساتی ہوئی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی نگاہوں کا مرکز سپاٹ اور خاموش دیوار کو بنا لیا۔

فاضل جج نے انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر متین اور پُر وقار نگاہوں سے حاضرین کی جانب دیکھا اور کارروائی کی اجازت دے دی۔

''جناب والا!'' صفائی کے وکیل کی گونج دار آواز اُبھری۔ ''میرا موکل اعلیٰ تعلیم یافتہ' دانش ور اور ایک استاد ہے۔ میرے موکل کا ماضی تلخیوں' ناکامیوں' حسرتوں اور اذیتوں کا مجموعہ ہے لیکن اس کا حال اور معاشرے میں اس کا مقام کردار اور نیک شہرت اس بات کی روشن دلیل ہے کہ میرے موکل نے کبھی منفی اثرات قبول نہیں کیے۔ ماضی کے

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

حوالے سے ایسے شخص کو معاشرے کا ناسور ہونا چاہیے تھا ایسے بچے جن کو گھٹی میں ہی محرومی ملتی ہے۔ وہ محبت' ہمدردی' انسانیت اور نیکی کی روشنی سے محروم ہو کر اندھیری گلیوں میں کھو جاتے ہیں' لیکن میرے مؤکل نے کبھی اندھیروں کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا' کیا ایسا شخص اس وقت جنسی درندہ اور قاتل بن سکتا ہے؟ جب روشنی اس کے دل و دماغ اور سماجی مقام کو منور کر رہی ہو۔'' وکیل نے لوگوں کی جانب چہرہ گھمایا۔ ''نہیں جناب والا! ایسا نہیں ہوتا' میرے مؤکل کے خلاف ایک سازش کی گئی ہے۔ اس سازش کی بنیاد تک جانے کے لیے مجھے اپنے مؤکل کے ماضی میں جانا ہوگا۔''

''جناب والا!'' مخالف وکیل نے اٹھ کر احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''میرا فاضل نوجوان دوست عدالت عالیہ کا وقت ضائع کر رہا ہے۔ جناب عالی! ملزم کا ماضی جیسا بھی ہے قتل جذبۂ انتقام کے تحت کیا گیا ہے۔''

''میرے محترم اور فاضل بزرگ!'' نوجوان وکیل نے جواباً کہا۔ ''شاید بھول رہے ہیں استغاثہ کی کہانی کی بنیاد میرے مؤکل کے ماضی سے اٹھائی گئی ہے۔ لہٰذا فاضل عدالت کے لیے ضروری ہے کہ ملزم کا ریکارڈ سامنے لایا جائے۔''

''بے شک۔'' مخالف وکیل کے لبوں پر مسکراہٹ اُبھری۔

''جناب والا! میں فاضل عدالت کا وقت ضائع کیے بغیر ملزم کے ماضی کے حوالے سے وہ بنیادی حقائق بیان کرنے کی اجازت چاہوں گا' جو قتل کے محرک بنے ہیں۔ جناب والا ملزم چوہدری خاندان کے ایک منشی کا بیٹا ہے۔ جس کی ماں پیدائش کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے مر گئی تھی۔ ان دنوں چوہدری کریم بخش کی دوسری بیگم کی گود میں ایک ماہ کا بچہ تھا۔ اس نیک دل خاتون نے منشی کے بچے کو گود لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح ملزم شہاب حویلی میں نجیب خان کے دودھ شریک بھائی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ چوہدری کریم بخش کو دودھ پلانے کی حد تک کوئی اعتراض نہ تھا' لیکن وہ نہیں چاہتے تھے ایک خادم کا بیٹا' چوہدری کے بیٹے کے ساتھ رہے۔ اس لیے بیگم صاحبہ نے دودھ پلانے کا وقت تقسیم کر لیا اور منشی اس مقررہ وقت پر بچہ ان کی گود میں دے دیتا تھا۔ جب منشی کا بچہ تین برس کا ہوا تو چوہدری کریم بخش فوت ہو گئے۔ چوہدری کریم بخش کا بیٹا نجیب خان اور دوسرا اس کا دودھ شریک بھائی شہاب تھا' نجیب خان نے اپنا حق مانگا جو اسے بخوشی دے دیا گیا۔'' وکیل نے رک کر ثریا خان کے والد کی جانب دیکھا۔ ''جناب والا! یہاں سے دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ نجیب خان اور شہاب جو گود سے یونیورسٹی تک شانہ بہ شانہ رہے تھے۔ دوسری حویلی میں بھی مل کر رہنے لگے' پڑوس میں ایک اور حویلی تھی جس میں کرنل آفتاب احمد رہائش رکھتے تھے۔ ان کی بیٹی ثریا خانم اتفاق سے نجیب اور شہاب کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ زمانہ طالب علمی میں ثریا اور شہاب ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ اس پسند نے شہاب کو جرأت دی اور اس نے کرنل آفتاب سے ثریا کا رشتا مانگ لیا' جسے نہ صرف مسترد کیا گیا بلکہ آفتاب صاحب نے شہاب کو بے عزت کر کے حویلی سے نکال دیا کیونکہ وہ ایک سچے باپ کے بیٹے کو اپنی بیٹی نہیں دینا چاہتے تھے' پھر شہاب بہ غرض ملازمت شہر چلا گیا اور اس کی عدم موجودگی میں نجیب خان' ثریا کو اس کی مرضی کے خلاف حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔'' وکیل نے

سانس لینے کے لیے رک کر پھر حاضرین کو دیکھا۔

''جناب والا یہی وہ اصل نقطہ ہے جس کے گرد نجیب اور شہاب کی دشمنی گھومنے لگی تھی۔ میں فاضل عدالت کی توجہ اس حادثے کی جانب مبذول کرنا چاہوں گا جسے اتفاقی حادثہ قرار دے دیا گیا تھا۔ ایک رات جب کہ ثریا پہلے بچے کی ولادت کے سلسلے میں حسب رواج میکے میں مقیم تھی تو نجیب خان کی خواب گاہ میں آگ بھڑک اٹھی اور صبح نجیب خان کی جلی ہوئی لاش ملبے سے برآمد ہوئی وہ بھی شہاب کی رقابت کی آگ تھی' جناب والا! جس نے اپنے رقیب کو جلا کر اپنا راستا صاف کر دیا تھا' لیکن وہ بھول گیا تھا کہ عورت جب بیوی اور پھر ماں بن جاتی ہے تو اپنے تمام جذبوں کے دھارے شوہر اور بچے کی جانب پھیر دیتی ہے۔ یہ بھول اسے ثریا تک لے گئی اور جب ثریا نے اسے اس کا مقام بتایا تو ملزم نے مشتعل ہو کر اس کا گلا گھونٹ دیا اور اس کے بچے کو اغوا کر لیا۔''

عدالت کا وقت ختم ہو گیا تھا' اس لیے اگلی تاریخ تک کارروائی ملتوی کر دی گئی۔

پھر کئی پیشیاں ہوئیں۔ نوجوان وکیل نے بھی دلائل دیے لیکن وہ ایسے سپاہی کی مانند تھا جس کی سپلائی لائن کٹ چکی ہو' اس کی بندوق میں کوئی گولی نہ تھی' شہاب نے دانتوں پر دانت جما کر جو چپ اختیار کر لی تھی' اس کی وجہ سے وہ بے بس ہو گیا تھا۔

اس کا مخالف وکیل عمر تجربے اور استغاثہ کی فل سپورٹ سے پوری طرح لیس تھا' صفائی کا کوئی گواہ نہ تھا جب کہ استغاثہ نے کرنل آفتاب کے علاوہ تین اور گواہ پیش کر کے ثابت کر دیا تھا کہ قاتل شہاب ہی ہے۔ آفتاب صاحب نے تو صرف وکیل کے بیان کی تائید کی تھی۔ جب کہ تین گواہوں کا تعلق چوہدری حبیب خان سے تھا' جنہوں نے حلف اٹھا کر عدالت کو بتایا کہ انہوں نے شہاب کو فرار ہوتے دیکھا تھا۔

جب فاضل عدات نے انصاف اور قانون کے تقاضے پورے کرتے ہوئے ملزم کو بولنے کا حق دیا تو اس نے کٹہرے کا سہارا لے رکھا تھا۔ اس کا چہرہ دکھ اور بیماری کی وجہ سے اُترا ہوا تھا۔

''جناب عالی!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں اس رات اپنی بھابی کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا۔ میں نے ان کے بیٹے فواد کو پیار کیا تھا اور واپس نکل گیا تھا۔ بس اس سے آگے مجھے کچھ معلوم نہیں.....''

فاضل عدالت نے استغاثہ کے دلائل اور گواہوں کے بیان کی روشنی میں شہاب کو سزائے موت سنا دی' جو اپیل کے ذریعے سزائے عمر قید میں تبدیل ہو گئی تھی۔

❁.....☆.....❁

ٹیلی فون کی گھنٹی جوں ہی گنگنائی شہاب ایک دم ماضی کے گرم صحرا سے نکل آیا۔ ماضی کی یادوں میں کھو کر وہ جیسے بھول گیا تھا کہ وہ ایک آزاد شہری کی طرح شہر کے بڑے ہوٹل کا معزز مہمان ہے۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو! کیا بات ہے؟'' وہ بھرائی آواز میں بولا۔

''سر! مسٹر ناصر ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔'' کاؤنٹر گرل نے مؤدب آواز میں بتایا۔ تب اسے یاد آیا کہ اس نے آتے ہی ناصر کو فون پر اطلاع دے دی تھی۔

''ٹھیک ہے' اوپر بھیج دیں۔''

''بہتر سر!'' کاؤنٹر گرل نے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

اس نے اُٹھ کر انگڑائی لی اور گداز قالین پر برہنہ پا ٹہلنے لگا۔ دو تین منٹ بعد دستک کے جواب میں اس نے دروازہ کھول دیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس نے ناصر کے لیے باہیں پھیلا دیں وہ دوڑ کر اس کی باہوں میں آ گیا۔

''تم..... تم!'' ناصر اس کے شانوں پر ہاتھ مار کر غرایا۔

''گدھے ہو ایک دم گدھے.....''

''شکریہ۔'' شہاب ہنسنے لگا۔ ''شریف النفس جانور کا نام دیا ہے تم نے۔''

''کیا تم میرے گھر کا راستا بھول گئے ہو؟'' ناصر نے شاکی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''ہاں۔'' شہاب کی ناک سے پھنکار اُبھری۔ ''میں وہ مسافر ہوں جو باہر آ کر ستوں کا ادراک کھو بیٹھا ہے۔ پھر گھر نام کی جگہ کبھی میری زندگی کے قدموں سے آشنا ہی نہیں رہی۔''

''بکواس بند کرو اور جوتے پہنو!'' ناصر نے چیخ کر کہا۔ ''تم میرے ساتھ جا رہے ہو۔''

''کہاں پیارے؟'' شہاب بیڈ پر پھسل گیا۔

''گھر.....''

''نہیں دوست!'' شہاب نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''مجھے گھر کبھی راس نہیں آتے کتنے گھروں سے عارضی رشتے جوڑے گئے نہیں پیارے اب گھر سے بچھڑنے کا دکھ سہنے کی مجھ میں قوت نہیں رہی' پھر میں گھر کا تصور لے کر باہر نہیں آیا۔ گھروں میں انسان رہتے ہیں جب کہ میں انسان نہیں رہا۔ میں تو دہکتا ہوا انگارہ ہوں اور انگارے گھروں میں نہیں رہتے مجھے اپنی ذات کے تنور میں ہی رہنا ہے ناصر! میں مجبور ہو گیا تھا یہاں آ کر' ورنہ کسی کو بھی اطلاع نہ کرتا۔ نجیب اور ثریا کے بعد اس بھری دنیا میں صرف تم ایسے شخص ہو جس سے میں مل سکتا تھا اور مل رہا ہوں.....''

''تم کیا کرنا چاہتے ہو شہاب؟'' ناصر نے اس کی سرخ آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

''میں!'' اس کے حلق سے کراہٹ اُبھری۔ ''میں نجیب اور ثریا کے قاتلوں کو تلاش کرنے باہر آیا ہوں۔''

''احمق نہ بنو شہاب!' ناصر تڑخ کر بولا۔ ''بھول جاؤ سب کچھ نئی زندگی کا آغاز کرو۔''

''اونہہ نئی زندگی۔'' وہ ہنسنے لگا۔ ''کیا غلاظتوں کے ساتھ شہاب معاشرے میں کسی زندگی کا تصور کر سکتا ہے؟ نہیں ناصر نہیں' شہاب نے ہمیشہ وقار اور عزت سے جینا سیکھا ہے' کیا لوگ ایک جنسی درندے اور قاتل کو قبول کر لیں گے مجھے یہ داغ دھونے ہیں ناصر! اگر تم معاونت نہیں کر سکتے تو کم از کم مجھے پابند تو نہ کرو۔''

''ٹھیک ہے۔' ناصر بولا۔ ''بے شک تمہیں خود کو بے گناہ منوانا ہوگا' لیکن جلد بازی نہیں کرنے دوں گا۔ آدمی' آدمی کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے میں نے دس برسوں میں سیاست کے میدان میں شہرت اور ساکھ کمائی ہے میرے ساتھ چلو' جو کچھ کرنا چاہو گے میں نہیں روکوں گا۔''

''میں نہیں چاہتا ناصر کل میرے نام کے ساتھ تمہاری ساکھ خراب ہو جائے۔''

''چلو تو سہی۔'' ناصر زچ ہو کر بولا۔ ''تمہیں فی الحال آرام کی ضرورت ہے۔''

تین روز شہاب ایسے ہی خاموش اور سوگوار ناصر کی حویلی کے ایک فرنشڈ بیڈ روم میں بند رہا' جیسے خوف ناک طوفان سے قبل فضا ساکت اور سوگواریت میں ڈوب جاتی ہے۔ ناصر نے بھی

اسے نہ چھیڑا تھا۔ اس کا خیال تھا جذبات جب سوچنے کی راہ پر چل پڑیں تو عقل کی روشنی انسان کو جذباتی لہروں سے بچا لیتی ہے لیکن چوتھے روز شہاب خواب گاہ سے یوں انگڑائی لے کر باہر آیا' جیسے شیر طویل نیند اور آرام لینے کے بعد اپنی کچھار سے نکلتا ہے۔

تین گھنٹوں کی مسافت طے کر کے وہ ایک گاؤں میں داخل ہوا۔ اس دن عام تعطیل تھی۔ بچے گلیوں میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہ جانی پہچانی گلیوں سے گزرتا جب بدرالدین کے دروازے پر پہنچا تو بدرالدین کی پوتی رقیہ جھاڑو پر کوڑا کرکٹ اٹھائے دروازے سے نکل رہی تھی۔ اجنبی کو دیکھ کر وہ ایک دم سکڑ سی گئی۔

''بابا بدرالدین اندر ہیں؟'' شہاب نے پوچھا۔

''جی..... وہ بیمار ہیں۔'' لڑکی نے نگاہیں جھکا کر بتایا۔

''آپ کون ہیں؟''

''ان سے کہو شہر سے شہاب آیا ہے۔''

اسی وقت ایک خاتون دوپٹہ سینے پر پھیلاتی سامنے آ گئی۔ ''اوہ شہاب بھائی آپ!''

''کیسی ہو زینت! کیا یہ تمہاری بیٹی رقیہ ہے؟''

''اندر آئیں نا۔'' زینت بولی۔ ''اپنے چاچا جی کو سلام نہیں کیا تم نے؟''

وہ زینت سے باتیں کرتا اندر داخل ہوا۔ بدرالدین بیماری کے باوجود اسے دیکھ کر لپک کر اٹھا اور دیر تک شہاب کو سینے سے لگائے اس کی پشت سہلاتا رہا۔

''مجھے امید نہیں تھی بیٹے!'' وہ رونے لگا۔ ''اچھا ہوا تم میری زندگی میں ہی آ گئے ہو' زینت جا فواد کو لے آ۔ ہاں دودھ اور انڈے بھی لے آ شہاب کے لیے۔''

''میں آ گیا ہوں بابا آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔'' شہاب بدرالدین کے ہاتھوں کو دبانے لگا۔ ''فواد کون سی جماعت میں ہے بابا؟''

''چھٹی جماعت میں۔'' بدرالدین نے بتایا۔ ''اِدھر چھ سال کی عمر میں داخلہ ملتا ہے نا' بڑا ذہین اور سعادت مند بچہ ہے' کیا تو اسے اپنا نام بتائے گا شہاب؟ میں نے یہ نام اس کے سامنے کبھی نہیں لیا۔''

''ہاں بابا اسے بتانا پڑے گا۔''

زینت کے ساتھ ایک گورا چٹا صحت مند لڑکا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بیٹ اور تن پر اُجلا لباس تھا۔ البتہ بال بکھرے ہوئے تھے' شاید کہیں کرکٹ کھیل رہا تھا۔

''السلام علیکم!'' اس نے دروازے سے داخل ہوتے ہی سلام کیا۔

''وعلیکم السلام بیٹے!'' شہاب نے سلام کا جواب دے کر اسے گلے سے لگا لیا۔

''فواد بیٹے! یہ تمہارے انکل ہیں۔'' بدرالدین نے بتایا۔

''ولایت میں تھے۔''

فواد نے خاموش نگاہوں سے شہاب کے سراپا کا جائزہ لیا۔ شام تک وہ فواد سے باتیں کرتا رہا' لیکن اس نے مصلحتاً اپنا نام نہیں بتایا۔ فواد کی صحت اور تعلیمی معیار نے شہاب کے اندر سے دس برسوں کی ساری اذیت جیسے چوس لی تھی۔ اس کی قربانی رائیگاں نہیں گئی تھی۔ اس نے جس ننھے سے پودے کو اپنی عزت اور آزادی کا خون دیا تھا' وہ اس کی آرزو کے مطابق ہی پروان چڑھ رہا تھا۔

گاؤں سے واپس جا کر اس نے شہر میں ایک

www.pkdigest.com

Pdfby Roadsign

فلیٹ کرائے پر حاصل کیا جس میں ٹیلی فون کی سہولت بھی موجود تھی۔ دوسرے دن ضروریات زندگی خریدتا رہا۔ اس کی آمد سے شہر میں صرف ناصر آگاہ تھا اور اسے ناصر کی زبان اور ذات پر مکمل بھروسا تھا۔

اس نے اپنے چہرے میں کچھ تبدیلیاں کیں اور ایک ضرورت مند کا روپ دھار کر چوہدری حبیب خان کی حویلی میں گیا۔ حویلی کا گیٹ تبدیل کر کے لوہے کا لگوالیا گیا تھا اور اس کی پیشانی پر کال بیل کا بٹن بھی لگ گیا تھا۔

اس نے اللہ کا نام لے کر بٹن پر انگلی رکھ دی اندر گانگ بجنے کی آواز سنائی دی' فوراً ہی گیٹ میں چوکور کھڑکی کھل گئی اور مونچھیل چہرہ سامنے آگیا۔ وہ شخص شہاب کے لیے اجنبی تھا۔ قدرت مظلوم کی طرف دار دکھائی دے رہی تھی۔ اگر وہ آشنا ہوتا تو شہاب کو خود کو چھپانے کے لیے بھرپور اداکاری کرنا پڑتی۔

''چوہدری صاحب نہیں ہیں کل آنا۔'' اس نے کھڑاک سے طاقچہ بند کرنا چاہا مگر شہاب نے پھرتی دکھائی اور کنڈی لگانے سے قبل ہی کھڑکی کھول دی۔ ''بہرے ہو.....؟''

''بڑے بھائی! میں بہت دور سے آیا ہوں۔ میرے ساتھ میری بیوی بھی ہے چوہدری اللہ دتہ صاحب نے بھیجا ہے۔''

چوکیدار نے شانوں تک گردن باہر نکال کر دائیں بائیں دیکھا وہ یقیناً نووارد کی بیوی کو دیکھنا چاہتا تھا۔

''اُسے اُدھر ایک عزیز کے گھر چھوڑ کر آیا ہوں۔'' شہاب نے بتایا۔ اندر تو آنے دو بڑے بھائی!''

چوکیدار نے گیٹ کھول کر شہاب کو اندر آنے دیا۔ شہاب نے چہرے کی مناسبت سے لباس بھی دیہاتی طرز کا پہن رکھا تھا۔ جو منصوبہ اس نے بنایا تھا اس کے لیے اسے ایک بے غیرت اور خودغرض دیہاتی کا کردار ادا کرنا تھا۔

گیٹ کے ساتھ دیوار کے سائے میں ایک چارپائی رکھی ہوئی تھی۔ شہاب نے بیٹھ کر للچائی نگاہوں سے حقے کی جانب دیکھا۔

''نشہ پانی کرتے ہو تو ڈال لو تمباکو۔'' چوکیدار نے منقش تھیلی شہاب کی طرف اچھالی۔ ''گھر والی کو ساتھ ہی لے آتے ویسے کام وام کیا جانتے ہو تم لوگ.....؟''

''بادشاہو!'' شہاب نے تمباکو کو ہتھیلیوں میں ملتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ''چوہدری کو پسند آگئے تو سارے کام کر لیں گے۔ بات تو مالک کی پسند کی اوّل سے ناجی۔''

''دیکھ بھائی! اپنے چوہدری ذرا شوقین مزاج ہیں اچھا ڈنگر ہو یا بندہ خوب قدر کرتے ہیں۔ مجھ کو دیکھا اچھے چمڑے اور آنچ پاؤں کی بیوی ساتھ ہے وہ اندر راج کرتی ہے اور میں باہر موجیں مارتا ہوں۔''

''دیکھ بھائی اگر سفارش سے کام لگوادے گا تو تیری خدمت بھی کریں گے۔''

''سپارش زنانی کی آنکھ میں ہوتی ہے بھائی!'' چوکیدار نے حقے کا کش لگا کر دھواں ناک اور مونچھوں سے اگلتے ہوئے آنکھ دبائی۔ ''جالے آ بھاگوان کو چوہدری آئے گا تو پیش کردوں گا۔''

''آج نہیں۔'' شہاب بولا۔ ''اپنی بہن کے گھر ہے وہ نہیں مانے گی۔ ہاں اگر چوہدی نے بلانے کو بولا تو کل لے آؤں گا۔''

شہاب نے باتوں اور واضح اشاروں میں خود کو

ایک ضمیر فروش اور عورت کی کمائی پر زندہ رہنے والا شوہر ظاہر کر کے چوکیدار نظام خان سے دوستی بنالی۔ نظام خان خود بھی اسی قماش کا بندہ تھا۔ اس نے بھی اپنی نوجوان بیوی ایک بھیڑیے کی کھوہ میں دھکیل کر حویلی میں اپنی جگہ بنائی تھی۔ شہاب کی آمد پر وہ خوش تھا کہ چوہدری نیا مال پاکر اس کی بیوی کو پرانی جوتی کی طرح باہر پھینک دے گا۔ وہ حویلی میں رہتے ہوئے بھی اپنی بیوی سے نہیں مل سکتا تھا۔ چوہدری کا یہی حکم تھا۔

رات آٹھ بجے نظام کی زبانی اسے خبر لگی کہ بڑا چوہدری حویلی کے گیسٹ ہاؤس میں آچکا ہے۔ شہاب کی کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ اندر کی بھڑکتی آگ کے شعلے اس کے نتھنوں کی دیواروں کو ٹھوکریں مارنے لگے۔ وہ وقت جسے اس نے دس برسوں کے ایک ایک لمحے میں سوچا تھا اس کے قریب آگیا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ علاقے کا نیا تھانے دار مہمان ہے اور چوہدری حبیب خان نے شہر کے کچھ معززین کو بھی مدعو کر رکھا ہے کیونکہ آنے والے انتخابات میں وہ پہلی بار صوبائی اسمبلی کے لیے انتخاب لڑنا چاہتا تھا۔

جوں ہی نظام خان گیٹ کی طرف گیا' شہاب سرونٹس کوارٹرز کی قطار کی اوٹ میں جانے پہچانے راستوں سے خود کو چھپاتا ہوا چوہدی کی خواب گاہ میں داخل ہوگیا خواب گاہ جدید فرنیچر اور دیگر لوازمات سے آراستہ تھی۔ بڑے چوہدری کے وقت میں بھی وہ اندر آیا تھا لیکن چوہدی رحمت حبیب خان نے بہت سی تبدیلیاں کرلی تھیں ان میں ساؤنڈ پروف نظام بھی شامل تھا۔

شہاب نے لحظہ بھر جائزہ لیا' پھر بیڈ کے نیچے رینگ گیا۔ گداز قالین پر وہ ٹانگیں سیدھی کر کے آرام سے لیٹ گیا اور اپنے دل کی دھڑکنوں اور وال کلاک کی ٹک ٹک سنتے سنتے اونگھ گیا۔ کمرہ مکمل ائرکنڈیشنڈ تھا اور وہ نظام کے تنور جیسے گرم کوارٹر سے نکل آیا تھا۔ بدن کو راحت ملی تو نیند بھی کہیں سے در آئی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز مدھم ہی تھی لیکن اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ سیاہ سلیپروں میں دو سبک گلابی گلابی زنانہ پاؤں بیڈ کی جانب اٹھتے چلے آرہے تھے۔ وہ بیڈ پر جھکی اور بیڈ شیٹ درست کرنے لگی۔ اس کے نیل پالش پاؤں کے ناخن دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ نظام خان جیسے ریچھ نما مرد کی بیوی کس قدر خوب صورت ہے۔

پاؤں پیچھے ہٹے اور شہاب کی سماعت سے مدھم مدھم موسیقی کی لہریں ٹکرانے لگی تھیں' پھر وہ دروازہ کھلا اور دو براؤن شوز اندر آئے۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' مانوس سی آواز نے پوچھا۔ وہ آواز شہاب کی سماعت میں گرم تیل انڈیلنے لگی تھی۔

''جو کچھ ہر رات کرنے آتی ہوں۔'' مترنم آواز نے جواب دیا۔

''تمہیں پیغام نہیں ملا تھا؟'' چوہدری حبیب نے پوچھا۔ ''تمہیں آج کی رات مہمان کے پاس رہنا ہوگا۔''

''مہمان کے پاس؟'' عورت نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا یہاں مہمان کو کھانے کے بعد اپنی عورت بھی دینے کا رواج ہے؟''

''بکواس نہیں!'' چوہدری کے حلق سے دہاڑ ابھری۔ ''تم میری عورت نہیں ہو.....''

''چوہدری!'' عورت بولی۔ ''یہ تم سب مرد ایک جیسے ہی بے غیرت ہوتے ہیں۔''

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

''زبان بند کتیا۔'' چوہدری نے چٹاخ سے تھپڑ مارا۔ ''میں کہہ چکا ہوں تم عورت نہیں ہو' میری ایک پسندیدہ کتیا ہو' کیا میں اپنے دوستوں سے اچھی نسل کے کتے لیتا اور ان کو تحفے نہیں دیتا رہتا؟ تم بھی اسی جنس سے تعلق رکھتی ہو۔''

''میں نہیں جاؤں گی چوہدری!'' وہ بپھرنے لگی۔ ''ایک بے غیرت نے تمہارے آگے ڈال دیا اور تم کسی اور کے آگے ڈالنا چاہتے ہو۔ مجھے تم سب سے نفرت ہے۔''

''دیکھ رضیہ! تو جانتی ہے میں گستاخی کی کیا سزا دیا کرتا ہوں۔ کل تمہیں پھر میرے پاس آنا ہے' میں نہیں چاہتا تمہیں سزا دوں چلی جا' تیرے جانے سے میرا بھلا ہوگا۔ نیا تھانے دار میرے مخالفین کا بندہ ہے میں اسے تیرے تعاون سے خریدنا چاہتا ہوں۔''

''پھر میں ہی کیوں؟'' رضیہ بولی۔ ''اگر اسے کوئی عورت ہی تیرے قدموں میں جھکا سکتی ہے تو مجھ سے اچھی بلکہ نئی لڑکی تیرے گھر میں ہے رابعہ خانم.....''

''بکواس نہ کر عورت!'' چوہدری نے شاید اسے لات ماری تھی وہ شہاب کے سامنے قالین پر اوندھی جا پڑی' پھر شڑاپ کی آواز کے ساتھ رضیہ کے حلق سے دل دوز چیخ ابھری۔ چوہدری پر وحشت طاری ہوگئی تھی۔ رضیہ نے اس کی چھوٹی بہن کا نام لے کر چوہدری کے سینے میں خنجر گھونپ دیا تھا۔

ساؤنڈ پروف کمرے میں رضیہ کی چیخیں جذب ہو رہی تھیں وہ سارے کمرے میں کراہیں لیتی چیخ رہی تھی اور چوہدری تواتر کے ساتھ ہنٹر برسا رہا تھا۔ شہاب نے خود کو بڑی مشکل سے روکا تھا کیونکہ اس کا مشن رضیہ کی مدد سے کہیں زیادہ اہم تھا۔

جب رضیہ مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہوگئی تو چوہدری باہر نکل گیا۔ رضیہ قالین پر بکھری پڑی تھی تھوڑی دیر بعد چوہدری کے ساتھ نظام خان بھی اندر آیا تھا۔

''نظام خان! اپنی اس گندی زبان والی کتیا کو اٹھا کر کوارٹر میں لے جا۔'' نظام خان نے گھٹنے ٹیک کر رضیہ کو باہوں میں بھرا۔

''اور سن مکھن کے کوارٹر میں جا کر اسے میری طرف سے بول دو' وہ آج رات مہمان خانے میں رہے گی۔''

نظام خان کے نکلنے کے بعد چوہدری نے غصے سے کواڑ بند کیے اور وارڈ روب سے شب خوابی کا لباس نکال کر پہننے لگا پھر وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ شہاب بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اسے کچھ وقت اور گزرنے کا انتظار تھا۔ مکھن بھی رضیہ بن سکتی تھی اور نظام مکھن کا جواب چوہدری تک پہنچا نے آسکتا تھا۔ لہٰذا دانتوں پر دانت جما کر اسے گزرتے وقت کی اذیت برداشت کرنا ہی تھا۔

اس نے کلائی موڑ کر ریڈیم ڈائل گھڑی کو دیکھا پونے بارہ کا وقت تھا اور کمرے میں چوہدری کے خراٹے مسلسل نشر ہو رہے تھے۔ سبز نائٹ بلب کی روشنی بھی اونگھ رہی تھی۔

وہ ایڑیوں اور پشت کے بل انچ انچ سرکتا ہوا باہر نکلا اور جھک کر چوہدری کی پیشانی پر انگشت شہادت بجائی۔ چوہدری نے کروٹ بدلی تو شہاب نے اس کے کان کی لو کو چٹکی میں بھر کر دبایا۔

''اٹھ جاؤ چوہدری بہت سو لیے تم۔'' چوہدری کی کھلی اور حیرت سے پتھرائی آنکھوں پر جھک کر اس نے کہا۔

''تم کون ہو؟'' چوہدری نے پوچھا اور پھر

دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔

''دروازہ بند ہے چوہدری حبیب خان اور تمہاری آواز بھی اس طرح باہر نہیں جائے گی' جس طرح یہاں آنے والی عورتوں کی فریادیں باہر کوئی نہیں سن سکتا اٹھو اور صوفے پر بیٹھو۔''

''ٹھیک ہے۔'' چوہدری نے اٹھنے کے لیے ہاتھ ٹیکے اور پھرتی سے دایاں ہاتھ تکیے کے نیچے ڈال دیا۔

شہاب نے بھی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چوہدری کی کلائی پر کھڑی کٹ ماری' چوہدری کے منہ سے کرب ناک آواز ابھری اور اس کا ہاتھ جھول گیا۔

''سنو چوہدری!'' شہاب کی سرد آواز ابھری۔ ''میں تمہارے جسم کی ایک ایک ہڈی چٹخاؤں گا۔''

چوہدری نے ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کا سہارا دیا اور بیڈ سے آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ شہاب نے تکیہ الٹ کر چوہدری کا ریوالور اٹھا لیا۔ چوہدری صرف ہاتھ کے درد سے کچھ اس قدر حواس باختہ دکھائی دینے لگا تھا کہ برہنہ پا ہی صوفے پر جا کر ہانپنے لگا۔ شہاب نے ریوالور گو الٹ پلٹ کر دیکھا اور ٹانگیں پھیلا کر چوہدری کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''تم نے پہچانا مجھے چوہدری؟'' شہاب نے ہڈیاں برمانے والی تند و تیز اور سرد آواز میں پوچھا۔ تو چوہدری نے تھوک نگل کر نفی میں سر ہلا دیا۔

''میں شہاب ہوں۔''

''نن..... نہیں'' چوہدری ہاتھ کے درد کو بھول کر اچھلا پھر اس کے منہ سے سسکی نکل گئی۔ اس نے فوراً ہی لٹکتا ہوا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ''تم..... تم.....''

''ہاں' مجھے تو تم نے جیل کی اونچی دیواروں کے اندر دھکیل دیا تھا لیکن مجھے قرض چکانے تو آنا ہی تھا۔''

''کیا تم جیل سے فرار ہو کر آئے ہو؟''

''جس طرح بھی آیا ہوں تمہارے سامنے ہوں۔'' شہاب نے کہا۔ ''سنو چوہدری حبیب خان بچپن میں جو بھی ظلم تم نے روا رکھا اسے میں بھول گیا تھا۔ دانش گاہوں اور کتابوں نے میرے اندر سے وہ ساری نفرت دھو ڈالی تھی' لیکن وہ غلیظ دھبا جو تم نے ثریا کے حوالے سے میرے ماتھے پر لگایا ہے' اسے میں بھول سکتا ہوں نہ لوگ بھولے ہوں گے' میں وہی داغ دھونے آیا ہوں' لیکن سوائے تمہارے چوہدری دنیا کا کوئی صابن اور سارے سمندروں کا پانی بھی وہ دھبا دور نہیں کر سکتے۔ صرف تم ہی وہ دھبا میرے ماتھے سے صاف کرو گے۔''

''کیا چاہتے ہو؟'' چوہدری نے قدرے سنبھل کر پوچھا۔

''میں نے وہی کچھ سنا تھا جو مجھے بتایا گیا تھا۔''

''جھوٹ مت بول شیطان!'' شہاب نے اس کے پاؤں پر ضرب لگائی اور چوہدری بلکتا ہوا صوفے سے لڑھک گیا۔ شہاب نے اسے بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور صوفے پر پھینک دیا۔ ''تم ہی وہ شخص ہو جسے تب اور اب معلوم ہے کہ قاتل شہاب نہیں ہے۔ قاتل تمہارے پروردہ وہ غنڈے تھے جن کے ذمے فواد کو اغوا کرنے کی ڈیوٹی تم نے لگائی تھی۔''

''فواد کو تم نے ان سے پہلے اڑا لیا تھا۔'' چوہدری پاؤں سہلاتے ہوئے بولا۔

''چلو آج تمہارے سامنے اعتراف کرتا

www.pkdigest.com

Pdf by Roaksign

ہوں۔" شہاب بولا۔ "لیکن ثریا کو تمہارے غنڈوں نے قتل کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے میں بھی تمہارے سامنے اعتراف کر لیتا ہوں۔"

"اب خود پر ایک احسان اور کر ڈالو چوہدری حبیب خان ورنہ میں تمہارے جسم کے ایک ایک ریشے کو الگ کر دوں گا۔ مجھے قاتلوں کے نام بتا دو۔"

"پھر تم ان کا موجودہ مقام بھی پوچھو گے' کوئی فائدہ نہیں شہاب! کیونکہ میں نہیں جانتا وہ دونوں کہاں ہیں۔"

"پہلے نام بتاؤ۔"

"بیٹھ جاؤ شہاب!" چوہدری دوستانہ لہجے میں بولا۔ "جس دھندے اور جن لوگوں کی تم بات کر رہے ہو یقین کرو کسی کو کچھ یاد نہ ہوگا لوگوں کے پاس اپنے اتنے مسائل ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں کے چہرے اور کردار یاد نہیں رکھتے لوگ صرف حال کو دیکھتے اور پہچانتے ہیں۔ میں تمہیں اتنی دولت دوں گا کہ لوگ صرف تمہاری دولت کی باتیں کرنے لگیں گے' تمہارا کوئی گھر اور خاندان نہیں ہے' تم اس دولت سے اپنا گھر کسی اجنبی شہر میں بنا لینا۔ بولو دوست کتنی دولت چاہتے ہو۔"

شہاب نے جھک کر اس کا پاؤں پکڑا اور ہاتھوں کو دھوبی پٹڑے کا انداز دے کر زوردار جھٹکا مارا۔ ہڈی ٹوٹنے اور چوہدری کی دل خراش چیخ کمرے میں بکھر کر دیواروں میں جذب ہوگئی۔

"بولو' نام بولو!" شہاب نے ہانپ کر کہا۔ "کیا تم نے سنا نہیں۔ میں نے تمہاری ایک ایک ہڈی اور ریشے کا نام لیا تھا۔"

"جمالا اور کمالا دونوں بھائی وہاں گئے تھے۔" چوہدری نے کراہتے ہوئے بتایا۔ "خدا کی قسم وہ واپس میرے پاس نہیں آئے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میں ناکامی کی ان کو کیا سزا دوں گا۔ میں نے ان سے ثریا خانم کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ مجھے تو صرف جائداد کے وارث کی موت درکار تھی۔ انہوں نے ثریا کے ساتھ منہ کالا کیا۔ یقیناً اس نے پہچان لیا ہوگا اس کا منہ بند کر کے وہ اسی رات یہ شہر چھوڑ گئے تھے۔"

"وہ کہاں کے رہنے والے تھے چوہدری؟"

"تلہ گنگ سے میرے پاس بھیجے گئے تھے۔"

"آج اعتراف کی رات ہے چوہدری!" شہاب اس کے قریب ہو کر جھکا۔ "اپنے بھائی اور جائداد کے وارث نجیب خان کے قتل کا بھی اعتراف کر لو' دیکھو یہ عدالت نہیں صرف ایک بے ننگ و نام شخص ہے۔"

"ہاں۔" چوہدری نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اسے بھی میرے ہی حکم پر جلایا گیا تھا۔"

"اب اپنی سزا بھی خود ہی تجویز کر لو حبیب خان!" شہاب کی آواز میں درندگی عود کر آئی تھی۔ "دیکھو میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا' مگر دس برس کی اذیت ناک سزا سنائی گئی تھی تم نے دو انسانوں کی جان لی ہے۔"

"مم..... مجھے معاف کر دو شہاب!" چوہدری نے ایک دم غوطہ لگایا اور شہاب کے پاؤں پر چہرہ رگڑنے لگا۔ "جتنی دولت چاہو لے لو' چابیاں لے کر سیف سے خود نکال لو۔"

"نہیں!" شہاب نے اس کے چہرے پر ضرب لگائی۔

"کتابوں کے علم نے مجھے انسانیت سے محبت کرنا سکھایا ہے۔ عفو و درگزر بھی انسان کے ساتھ روا

ہے تم انسان نہیں ہو عفریت ہو' تم ناگ ہو' میں تمہیں معاف کر کے انسانیت پر ظلم نہیں کر سکتا۔"

"میں..... میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"پہلے وعدہ کرنے والی زبان دکھاؤ' شہاب نے جھک کر اس کی ٹھوڑی پر مکا مارا۔ پھر اس کا گلا ایک ہاتھ سے جکڑ لیا۔ "زبان باہر نکال چوہدری" گلا گھٹنے سے چوہدری کی زبان باہر نکل آئی۔ شہاب نے اس کی ٹھوڑی پر زور دار ضرب لگائی۔ زبان دانتوں تلے آئی تو یوں کٹتی چلی گئی جیسے کسی نے مکھن میں چاقو گھونپ دیا ہو۔ چوہدری کا چہرہ اور شہاب کے ہاتھ خون آلود ہو گئے چھینٹے اس کے کپڑوں تک آئے تھے۔ "یہی وہ زبان ہے جس نے کتنے معصوم لوگوں پر ظلم توڑنے کا حکم دیا تھا۔ اب یہ زبان تمہارا ساتھ نہیں دے گی چوہدری!" پھر اس نے ادھ موئے چوہدری کا دوسرا بازو بھی شانے کے جوڑ سے الگ کر دیا۔

"اب تم کچھ لکھ سکو گے نہ بول سکو گے' ہاں ٹانگیں چھوڑ رہا ہوں تاکہ تم ہر نشان عبرت کھلی آنکھوں سے دیکھ سکو۔" لیکن چوہدری اس کی آواز سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

شہاب نے گہری گہری سانسوں کے بعد سر کو دو تین جھٹکے دیے اور کندھے اُچکاتا ہوا چوہدری کے گداز بیڈ پر لیٹ گیا۔ قتل گاہ اور خون کے چھینٹوں کے درمیان رات گزارنے کا فیصلہ فوری تھا نہ ہی تھکاوٹ اصل وجہ تھی وہ اس گھر کا بھیدی تھا۔ اس نے نظام خان کی زبانی معلوم کر لیا تھا کہ پاسبانی کے لیے اب بھی رات دس بجے سے صبح چار بجے تک حویلی میں دو خونخوار کتے کھول دیے جاتے ہیں۔ چوہدری کے کتوں کی خونخواری کی کئی خونچکاں داستانیں وہ بچپن سے سنتا آیا تھا۔ اس لیے باہر نکلنے کی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے ٹائم پیس اٹھا کر چار بجے کا الارم لگایا اور چوہدری کی چادر اوڑھ کر یوں سو گیا جیسے اس کا اپنا بیڈ روم ہو یا وہ چوہدری کا معزز مہمان ہو۔

الارم نے اسے ٹھیک چار بجے جگایا۔ اس نے اُٹھ کر پہلے چوہدری کو دیکھا وہ صوفے سے ٹیک لگائے دیوار کو گھور رہا تھا۔ شاید اس کی بے ہوشی بھی الارم کی آواز نے ہی توڑی تھی یا اس نے اپنی بے بسی کا اعتراف کر لیا تھا۔ شہاب نے باتھ روم میں جا کر غسل کیا اور پھر چوہدری کو اسی طرح سل پتھر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ اس نے برآمدے میں رک کر فرش پر زور' زور سے پاؤں مارے لیکن حویلی گہرے سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اس نے عقبی راستے کا انتخاب کیا تھا۔

سات بجے وہ چوہدری کی زمینوں کے نگران سجاول خان کے ڈیرے پر بیٹھا اس کی بہو کے ہاتھوں کا تیار کیا ہوا۔ مزے دار ناشتا کر رہا تھا۔ اس نے خود کو جمالے اور کمالے کا دوست بتایا تھا' ناشتے کا وقت تھا اس لیے سجاول خان نے اچھے میزبان کا فرض ادا کرتے ہوئے اسے ناشتے میں شریک کر لیا تھا۔

"جوان! وہ دونوں بھائی غالباً دس بارہ برس قبل یہاں تھے۔" سجاول نے ناشتے کے بعد حقے کا کش لگا کر بتایا۔

"اچھا جی!" شہاب بولا۔ "دراصل جی میں خود بھی دس بارہ برس بعد کراچی سے واپس آیا ہوں۔ ہم تینوں روزی کمانے گھروں سے ایک ساتھ نکلے تھے' ان سے میری ملاقات چکوال اڈے پر ہوئی تھی' جو دورانِ سفر دوستی میں بدل گئی تھی۔ وڈے چوہدری نے ان کو رکھ کر مجھے جواب دے دیا

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

تھا۔ یہاں بھی وڈے چوہدری کے سامنے ہماری پیشی ہوئی تھی۔"

"میرا خیال ہے وہ کہیں دور نکل گئے ہیں۔" سجاول نے کہا۔ "چوہدری صاحب نے ان کی کھوج میں آدمی بھیجے تھے۔ مگر وہ گھر نہیں گئے۔"

"نکل گئے ہوں گے۔" شہاب نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"وہ جی کہتے ہیں ناں شیر، مرد اور پکھیرو ایک جیسے ہوتے ہیں۔ روزی کی تلاش میں کبھی بھی بندے کو بھی لمبی اڈاری مارنی پڑتی ہے، ویسے ان کا پنڈ کون سا ہے؟"

"پنڈ تو مالوم نہیں۔" سجاول نے حقے کی نے سے داڑھی کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "سنا تھا اپنے وڈے چوہدری کے دوست ملک رستم خان نے ان کو بھیجا تھا۔"

"ملک رستم خان کا پنڈ تو آپ جانتے ہو گے جی؟"

"ہاں بھائی ملک کا تو کیا نام ہے پنڈ تلہ گنگ سے کچھ دور ہے اس پنڈ میں ایک دفعہ میں چوہدری صاحب کے ساتھ شکار کھیلنے گیا تھا وہ وڈا مشہور بندہ ہے کئی گاؤں کا مالک ہے۔"

"چنگا جی! آپ کی بہت مہربانی۔" شہاب نے اٹھ کر ہاتھ ملایا اور چل پڑا۔

بالے اور فخرو نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ باہر آتے ہی قاتل کو قبر کی گہرائی سے بھی گھسیٹ لائیں گے، لیکن شہاب اول تو اپنی آگ خود ہی بجھانا چاہتا تھا، دوسری وجہ اس آگ کی تپش تھی۔ جو اسے کہیں ٹھہرنے نہ دیتی تھی، جس طرح جون کی کڑی دوپہر میں کوئی بچہ برہنہ پا گلی میں نکل آیا ہو۔

اگر اسے بحیثیت شہاب اپنی منزل تک سفر کرنا ہوتا تو ناصر کی نئی پجیرو اس کے لیے وقف تھی، لیکن اسے جس منزل مراد تک جانا تھا وہاں تک اسے کچی سڑکوں کی دھول اپنے پاؤں پر جمانا ضروری تھی۔ دوسری وجہ یہ رہی تھی کہ وہ اپنی آگ میں ناصر کی سیاسی ساکھ کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ ناصر کے اصرار کے باوجود اس نے منزل تک تنہا جانے کا فیصلہ سنایا تھا۔

چکوال سے اس نے تلہ گنگ کے لیے بس پکڑی ملک رستم خان واقعی وڈا بندہ تھا پنڈی سے چکوال تک اس کے ہم نشست ملک رحیم داد نے اسے ملک رستم کا شجرہ نسب تک بتا دیا تھا۔ اسے ملک رستم خان کو صرف سیڑھی بنانا تھا۔ اگر وہ مضبوط سیڑھی نہ ہوتی تو بھی اسے پاؤں رکھنا ہی تھا کہ جمالے اور کمالے کو اس نے اپنے دوست حبیب خان تک پہنچایا تھا۔ شہاب کو یقین تھا کہ ملک رستم خان ہی وہ آخری کرن ہے جس کی روشنی میں وہ کمالے اور جمالے تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

شام ڈھلے جب وہ ملک رستم خان کے وسیع و عریض مہمان خانے میں داخل ہوا تو اس کا چہرہ گرد آلود تھا۔ ملک رستم خان موجود تھا اور شکاری کتوں کا دستہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ہر کتے کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ شہاب کو یقین تھا کہ ملک رستم خان اخبار کے ذریعے جان چکا ہو گا کہ اس کے دوست حبیب خان پر کیا بیت چکی ہے۔ اس لیے اس نے اسی حوالے کو استعمال کیا تھا۔

ملک رستم خان کو ایک ملازم نے مہمان کی آمد سے آگاہ کیا تو وہ ہاتھ دھونے کے بعد شہاب تک آیا تھا۔ شہاب کو وہ مہذب اور رکھ رکھاؤ نبھانے والا ہی لگا تھا۔ پُرتپاک انداز میں مل کر اس نے کتوں کی پریڈ ختم کر دی۔ جب کتے چلے گئے تو شہاب نے بات شروع کرتے ہوئے رازدارانہ آواز میں کہا۔

"میرا نام دلاور خان ہے، میں دس برس قبل جمالے اور کمالے کے ساتھ چوہدری حبیب خان کی خدمت میں تھا۔ پھر جب کمالے اور جمالے کو وہاں سے بھاگنا پڑا تو ساتھی ہونے کے ناتے مجھے بھی راہِ فرار اختیار کرنا پڑی تھی اب چوہدری پر جو حملہ ہوا ہے اس میں ہم تینوں کے نام لیے جا رہے ہیں۔"

"اوہ۔" ملک نے ہنکارا بھرا۔ "کرنی تو بھرنی ہی پڑتی ہے۔ میں نے چوہدری سے اسی لیے تعلق توڑ لیا تھا۔"

"لیکن ہم تعلق توڑ کر بھی محفوظ نہیں ہیں جناب!"

"تم کہیں کام وام کرتے ہو؟" ملک نے پوچھا۔

"جی کرتا تھا۔" شہاب نے تھوک نگل کر جواب دیا۔ "اب تو چوہے کی طرح چھپتا پھر رہا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" ملک مونچھوں میں مسکرانے لگا۔ "کل تمہیں محفوظ مقام کی طرف روانہ کر دیا جائے گا۔ کمالا اور جمالا دونوں میری زمینوں پر ہیں، جب پولیس اور چوہدری کے آدمی ان کو تلاش کر رہے تھے، تب بھی وہ میری پناہ میں تھے۔ تم بھی ان کے ساتھ رہ کر کام کرو اور خوب عیش کرو لیکن تمہیں زمینوں تک محدود رہنا پڑے گا جس طرح وہ دونوں دس برس سے قید تنہائی کاٹ رہے ہیں۔"

"شکریہ جناب!" شہاب نے ممنون لہجے میں کہا۔ "زندگی بڑی پیاری ہوتی ہے، مجھے وہ قید منظور ہے۔"

شہاب نے کمال رازداری سے جیب میں رکھا ہوا جدید اور حساس ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا تھا جو ناصر نے ایسے ہی موقعوں کے لیے اسے فراہم کیا تھا۔ ایسا ہی جدید اور چھوٹا ریوالور بھی اس کی دوسری جیب میں موجود تھا۔ وہ مکمل تیاریوں کے ساتھ بھیڑیوں کے بھٹ میں داخل ہوا تھا۔

"ملک صاحب!" شہاب نے کہا۔ "میں ایک بات کی وضاحت کروں گا، میں اس واردات میں ان کا ساتھی نہیں تھا۔"

"کس واردات کا ذکر کر رہے ہو؟" ملک نے پوچھا۔

"چوہدری حبیب......!"

"نہیں جناب! میرا مطلب ثریا خانم کے قتل سے تھا۔"

"اوہ!" ملک ہنسنے لگا۔ "بھئی میں جانتا ہوں وہ دونوں تھے مجھے انہوں نے ساری بات بتا دی تھی۔"

"اوہ شکر ہے۔" شہاب بولا۔ "یہ اچھا ہوا کہ آپ گواہ ہیں کہ قاتل جمالا اور کمالا ہیں۔"

"ہاں گواہ، لیکن خاموش کیونکہ دونوں میری خاموشی کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ جس طرح تمہیں پناہ دے کر میں بھول جاؤں گا کہ کبھی کوئی دلاور نام کا بندہ ادھر آیا تھا۔"

"میں بھی آپ کا بے دام بندہ بن کر رہوں گا ملک صاحب!"

"ہاں، مجھے یقین ہے، ایسے بندے وفادار ہی رہتے ہیں۔ وہاں تم دیکھو گے دلاور خان کمالے اور جمالے جیسے کتنے ہی مفرور قاتل اور ڈکیت میری وفاداری کا دم بھر رہے ہیں۔ میں ان کو تحفظ دے رہا ہوں اور وہ میری زمینوں کو اپنی باہوں کا تاوان دے رہے ہیں۔"

شہاب نے وہ رات ملک رستم خان کے گھر بسر

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

کیا۔ مقصد کی پہلی سیڑھی اس نے پانی سے باہر نکال لی تھی۔ ملک رستم خان کا بیان اس کی جیب میں محفوظ ہوگیا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اس سیڑھی پر رک کر اپنے سارے داغ دھبے صاف کرسکتا تھا‘ لیکن وہ اصل قاتلوں تک خود جانا چاہتا تھا۔

صبح جب ملک رستم خان اسے لینے کے لیے مہمان خانے میں داخل ہوا تو شہاب بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ ”ملک صاحب! میں رات بھر سو نہیں سکا۔“ شہاب بولا۔ ”وہ دونوں قاتل ہیں اور جب وہ فرار ہوئے میں چوہدری کی حویلی میں تھا‘ وہ مجھے دیکھتے ہی غلط فہمی کا شکار ہوجائیں گے اور مجھے خطرہ ہے وہ مجھے بھی گواہ مان کر قتل کردیں گے۔ نہیں ملک صاحب! مجھے کسی اور خدمت پر لگا دیجیے۔“

”اوں‘ بات تمہاری معقول ہے دلاور خان! تم یقین دلانے کی پوزیشن میں نہیں ہو کہ اب بھی تم چوہدری کے وفادار نہیں۔ ٹھیک ہے تم میرے فروٹ فارم میں کام کرنا۔“

شہاب نے سکون کی سانس لی‘ ورنہ وہ بے حد پریشان تھا کہ ملک رستم خان جب اسے بطور دلاور خان‘ کمالے‘ جمالے کے سامنے لے جائے گا تو وہ دونوں اس کی آشنائی سے انکار کردیں گے اس کے بعد نتیجہ جو نکلتا شہاب کے لیے دل خوش کن ہرگز نہیں ہوتا۔

فروٹ فارم ابھی نرسری کے مرحلے میں تھا۔ اس لیے اس جنگل میں ابھی منگل نہیں بنا تھا۔ برساتی نالے کو ملک رستم خان نے روک لیا تھا اور واٹر پمپ مشین کے ذریعے ایک میل دور پانی پہنچایا جارہا تھا۔ شہاب کی ڈیوٹی اسی ویرانے میں مشین چلانے پر لگی تھی۔ مشین کی حفاظت کے لیے جو ٹینٹ لگایا گیا تھا۔ اسی میں بندے کے لیے بھی فرشی بستر کی جگہ بنائی گئی تھی۔

کونے میں ٹین کے کنستر اور ڈبے پڑے ہوئے تھے۔ شہاب نے ٹینٹ سے چند قدم دور پتھروں کا چولھا بھی دیکھ لیا تھا۔ دو راتیں وہ ٹینٹ میں پڑا کسی حتمی فیصلے کی چڑھائی اترائی سے لڑتا رہا۔ دونوں قاتل چند ایکڑ دور خاردار تاروں کے حصار میں تھے وہ چاہتا تھا کہ دونوں یا ایک بہ رضا و رغبت اعتراف ریکارڈ کروائے لیکن اس مقصد کے لیے راہ و رسم کی استواری ضروری تھی۔ ان کو اعتماد میں لینے کے لیے دوستی اور دوستی کے لیے وقت درکار تھا۔ جب کہ وہ اس ویرانے میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ ان میں سے کوئی اسے پہچانتا نہ ہو۔ تیسری رات جب گیدڑ رو رہے تھے اور چوتھے پانچویں دن کا چاند غروب ہو رہا تھا۔ وہ خاردار تاروں سے الجھتا ہوا اس حصے میں داخل ہوگیا جو صرف فصلوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہ فیصلہ اس نے ناچار ہوکر کیا تھا۔ کوئی اور سبیل بھی نہ تھی۔ ملک رستم خان کی بند بریکٹوں سے وہ باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ وہ کسی تیسرے آدمی کو درمیان میں ڈال گواہ بھی نہیں بنانا چاہ رہا تھا۔ اسے تو وہ آگ کا سمندر اپنی ہی باہوں کے زور پر عبور کرنا تھا۔

لالٹین کی زرد روشنی میں ایک شخص ہیر وارث شاہ پڑھ رہا تھا اور اس کے گرد بیٹھے آٹھ آدمی سنگی بتوں کی طرح سن رہے تھے۔ شہاب بھی کئی لمحے آواز کے اتار چڑھاؤ میں ڈوبتا اُبھرتا دیوار سے لگا کھڑا رہا تھا۔ اس میں جیسے ہمت ہی نہیں رہی تھی کہ کلام سنانے اور سننے والوں کے درمیان اپنی ذات کی مداخلت کرے پھر کتاب بند ہوئی اور سامعین اٹھ اٹھ کر جانے لگے صرف کتاب والا رہ گیا تو شہاب بولا۔ ”ملک نے جمالے کو فارم میں بلایا ہے۔“

”تم کون ہو؟“ اس شخص نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”میں نیا مشین آپریٹر دلاور خان ہوں۔“

”چل۔“ اس نے کتاب سرہانے کے نیچے رکھی اور کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں ہی جمالا ہوں۔“

شہاب اس حسن اتفاق پر حیران رہ گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ حق کے متلاشی کی مدد قدرت کررہی ہے۔ جمالے نے ایک کوٹھری میں جھانک کر دیکھا اور پھر آگے بڑھ گیا‘ تیسری کوٹھری کے دروازے پر ایک شخص کھڑا تھا۔ ”کمالا آئے تو اسے بتا دینا۔“ جمالے نے کہا۔ ”میں فروٹ فارم جارہا ہوں ملک صاحب نے بلایا ہے۔“ شہاب تو تاروں سے نکل کر آیا تھا‘ لیکن واپسی پر اسے ایک میل تاروں کے ساتھ ساتھ چلنا پڑا تھا۔ جمالا کھردرے مزاج کا آدمی تھا اس لیے چند باتوں کے بعد بند تک دونوں خاموش ہی رہے تھے۔

”اندر تو اندھیرا ہے۔“ جمالے نے ٹینٹ کے نزدیک رک کر کہا۔

”تیل کم تھا۔“ شہاب نے بتایا۔ ”ہوسکتا ہے بتی بجھا کر سوگئے ہوں۔“

”جوؤ‘ بتاؤ ان کو۔“ جمالے نے کھردری آواز میں کہا۔

شہاب جھک کر ٹینٹ میں گیا اور لالٹین روشن کرتے ہی اس نے گردن باہر نکال کر جمالے کو اندر بلالیا۔

جمالے نے کندھے سے اپنی کلہاڑی اتار دی اور جھک کر اندر داخل ہونے لگا تو شہاب نے ایک طرف ہٹ کر اس کے لیے رستا چھوڑ دیا۔ جمالا اندر داخل ہوا اور خالی بستر دیکھ کر زخمی ناگ کی مانند پھنکارتا جونہی پلٹا شہاب کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر ساکت ہوگیا۔

”دو قدم الٹے چلو اور بستر پر بیٹھ جاؤ جمالے!“ شہاب نے برفیلی آواز میں کہا۔ ”اس میں بارہ کیپسول ہیں لیکن تمہارے لیے نہیں ہاں اگر تم اپنی حماقت کی وجہ سے غلطی کر بیٹھے تو الگ بات ہے۔“

”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“ جمالا پاؤں تھوڑے سے کھول کر غرایا۔

”ہم باتیں کریں گے جمالے! ڈھیر ساری باتیں‘ آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ شہاب نے جواب دیا تو جمالا دو قدم ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ”تم قانون کے بارے میں جانتے ہو کہ ایک جرم کی ایک ہی سزا ہوتی ہے اور تمہارے جرم کی سزا میں بھگت آیا ہوں۔“

”تم!“ جمالا اچھل پڑا۔

”ہاں دوست میں ہوں وہ بکرا جو تم بھائیوں پر قربان ہوگیا تھا۔ آرام سے بیٹھے رہو جمالے آرام سے‘ میں تمہیں قتل کرکے دوبارہ جیل نہیں جانا چاہتا بڑی بری جگہ ہے جیل ہاں میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔ مجھے دس برسوں کی قیمت ادا کرو۔“

”کیا چاہتے ہو؟“

”صرف جواب مجھے بتادو ثریا خانم کو قتل کرکے اس کا بیٹا تم کہاں لے گئے تھے؟“

”میری بات تسلیم کرلوگے؟“

”ہاں لیکن شرط یہ ہے کہ بات سچی ہو۔“

”سچ ہی ہے قتل کا جواز ہی اس کا بیٹا بن گیا تھا۔ خدا کی قسم ہم اسے قتل نہیں کرنا چاہتے تھے‘ میں نے اس پر تشدد کیا تھا لیکن وہ ایک ہی جواب دیتی رہی تھی کہ فواد کو کوئی پہلے ہی لے گیا ہے۔“

”چلو مان لیا۔“ شہاب نے طویل سانس لی۔

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

”میں فواد کو حاصل کر کے چوہدری حبیب سے سودا کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوہ!“ جمالے نے قہقہہ لگایا۔ ”تم کب آئے ہو شہر سے؟“

”میں کئی روز سے تمہاری تلاش میں سفر کر رہا ہوں۔“

”چوہدری اب دنیا کے سودے کرنے کے قابل نہیں رہا میرے دوست! سنا ہے اس نے دوسری منزل سے کود کر خودکشی کر لی ہے۔“

شہاب نے آنکھیں موند کر وہ خبر نگل لی۔

”مجھے صرف ایک دکھ اور شکوہ ہے جمالے!“ شہاب نے ٹھہری ٹھہری آواز میں کہا۔ ”تمہیں اس مرنے والی کا دامن داغ دار نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

جمالے نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف چہرہ جھکا لیا۔ شہاب ہولے ہولے چلتا اس کے قریب گیا۔ ”بتاؤ گے جمالے! وہ درندہ کون تھا تم یا کمالا؟“

”پرانی بات ہے شہاب! جو ہو گیا اب گندگی کو کریدنے سے کیا فائدہ؟“

شہاب کی لات گھومی اور جمالا ڈکراتا ہوا الٹ گیا۔

”جواب دو سور!“ شہاب دہاڑا۔ ”بولو کون تھا وہ......؟“

”وہ حرکت مجھ سے ہوئی تھی۔ کمالے نے مجھے روکنا چاہا تھا لیکن ثریا کی قمیص جب پھٹی تو میں شیطان بن گیا۔ پھر اسے ہلاک کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ رہا تھا۔ وہ میرا نام اور صورت جان گئی تھی۔“

”تو قتل بھی......“

”ہاں میں نے ہی اسے قتل کیا تھا۔“ جمالے نے روتے ہوئے اعتراف کر لیا۔ ”مجھے معاف کر دو شہاب!“

”ٹھیک ہے جمالے! جاؤ اور اپنا منہ بند رکھنا۔“ شہاب ایک طرف ہٹا تو جمالا دوڑتا ہوا منٹ سے نکل گیا۔

❁......☆......❁

ناصر کے ڈرائنگ روم میں شہاب کے ساتھ ایس پی راشد رانا بیٹھا بڑے انہماک سے ٹیپ ریکارڈر سے ابھرتی آواز سن رہے تھے۔ شہاب نے اپنی کارکردگی کی رپورٹ مع ٹیپ ریکارڈر ناصر کے حوالے کر دیا تھا اور ناصر نے اپنے سماجی اور سیاسی اثر و رسوخ کا سہارا لے کر ایس پی کو اپنے گھر بلا لیا تھا۔

جمالے کی آواز تو ایس پی صاحب کے لیے نامانوس تھی لیکن ملک رستم خان کی آواز انہوں نے پہچان کر ہونٹ کاٹ لیے تھے کیونکہ ملک رستم خان کا شمار بھی ممتاز سماجی اور سیاسی لوگوں میں تھا لیکن قانون کی نگاہ میں وہ بھی مجرم تھا۔

دوسرا دن ناصر اور شہاب نے بڑا مصروف گزارا۔ ناصر اپنی پوزیشن کے مدِنظر کچا ہاتھ ڈالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہ ممتاز قانون دانوں اور دیگر افسران سے مشورے لے کر ہی شام کو بیگم آفتاب سے ملنے گیا تھا۔ کیونکہ ثریا خانم کی وہ ماں تھی اور وہی قاتلوں کے خلاف مقدمہ کرنے کی مجاز تھی۔

بیگم آفتاب نے ناصر کی اطلاع پر جو رپورٹ درج کروائی اس میں جمال اور کمال پسران سمندر خان کے نام تھے اور اعانت جرم میں اس نے ملک رستم خان کا نام بھی رپورٹ میں درج کروایا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ اگر ملک رستم خان باہر گیا تو وہ اپنے اثر و رسوخ سے جمالے اور کمالے کو بچانے کی کوشش کر سکتا تھا۔

www.pkdigest.com

تنویر کی گرفتاری جس دن عمل میں آئی اسی دن ناصر کی زبانی شہاب نے سنا کہ ملک رستم خان کو سلطانی گواہ بنا دیا گیا ہے اور جمالے کے بیان کی روشنی میں کمالے کو رہا کر دیا گیا ہے۔ ٹیپ شدہ بیان میں بھی اس نے کمالے کو بے گناہ قرار دیا تھا۔ غالباً ایک بُرے انسان نے بھائی ہونے کے ناتے اپنے بھائی کو بچا لیا تھا۔

❁......☆......❁

”اوہ۔“ اس رات ناصر نے کافی کا سپ لے کر ہنکارا بھرتے ہوئے پوچھا۔ ”اب تمہارے اندر کے شہاب کی طبیعت کیسی ہے؟“

”پُرسکون اور خوش۔“ شہاب نے اخبار اس کے سامنے رکھ کر جواب دیا۔ ”پریس نے پولیس کے خوب لتے لیے ہیں، پر جو میری ذات پر لگا ہوا ایک ایک دھبا کیسے صاف ہوا ہے۔“

”میری جان!“ ناصر پیار سے بولا۔ ”یہ سب کچھ میری موجودگی میں کاتب کے حوالے کیا گیا تھا۔“

اس کا مطلب ہے تمہارا شکریہ ادا کروں۔“

”ہاں مروت کا تقاضہ تو یہی ہے۔“ ناصر نے جواب دیا۔ ”لیکن زبان سے نہیں عمل سے۔“

”تو لاؤ جوتے پالش کر دوں تمہارے۔“

”جوتے نہیں دوست!“ ناصر سنجیدہ ہو گیا۔ ”اگر پالش کرنا چاہتے ہو تو میری فرم پالش کرو جو میری مصروفیات اور عدم توجہ کی وجہ سے روبہ زوال ہے۔“

”یار سچ پوچھو تو اس مچھندر کو کام کی واقعی اب ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔“ شہاب بولا۔ ”اچھا بتاؤ کس پوسٹ کے لیے بھرتی کرو گے؟“

”جنرل منیجر!“ ناصر نے جواب دیا۔ ”کیوں کہ میرے پاس کلرک کی کوئی اسامی خالی نہیں ہے چند ماہ بحیثیت جی ایم کام کرو وعدہ رہا جونہی کلرک اِدھر اُدھر ہوا تمہیں چانس دیا جائے گا۔“

”وعدہ۔“ شہاب نے ہاتھ بڑھایا جس پر ناصر نے زور سے ہاتھ مارا۔

اسے چارج سنبھالے ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ فرم کی بگڑی ہوئی ساکھ کو سنوارنے میں اس قدر مصروف رہا تھا کہ بیگم آفتاب نے تین بار ٹیلی فون پر اسے رات کے کھانے پر بلایا، مگر ہر بار مصروفیت کا جواز دے کر معذرت کر لی۔

دراصل وہ اس چودہ پندرہ سال کی لڑکی کا چہرہ کبھی بھول ہی نہ سکا تھا جس نے پریس فوٹو گرافروں اور پبلک کی موجودگی میں اس کے چہرے پر تھوک کر چیختی آواز میں کہا تھا۔ ”غلیظ کتے مجھے تم سے شدید نفرت ہے۔“

جب بھی بیگم آفتاب نے اسے دعوت دی اس کی آنکھوں کے سامنے وہ نفرت انگیز چہرہ گھوم جاتا اور کانوں میں گرم قطرے ٹپکنے لگتے اور وہ گھبرا کر سوری کہہ کر ریسیور رکھ دیتا۔ وہ اس گھر میں کیسے داخل ہوتا جس گھر میں وہ لڑکی اب بھی موجود تھی۔

انٹرکام کا بزر گنگنایا تو شہاب نے فائل کو دیکھتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔ ”ایک خاتون جو اپنا نام بتانا نہیں چاہتیں، ملنا چاہتی ہیں سر!“ شہاب کی سیکرٹری نے بتایا۔

”مس صدیقی! آپ ان کو کسی طرح ٹال نہیں سکتیں؟“ شہاب نے جھنجھلاتے لہجے میں کہا۔ ”میں بے حد مصروف ہوں۔“

”میں اپنی سی کوشش کر چکی ہوں سر!“

”اچھا بھیج دیں پھر، اور ساتھ کافی بھی!“ شہاب نے گہری سانس لے کر کہا اور پھر فائل پڑھنے لگا۔

Pdf by Roadsign

معروف صحافی ادیب اور شاعر مشتاق احمد قریشی کی ایک اور معرکۃ الآرا تالیف

امام الائمہ حضرت امام ابوحنیفہ قدس سرہ اہل سنت اور فقہ حنفی کے بانی ہیں
حنفی فقہ کے بانی امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ
کی سیرت حیات اور ان کی فقہی زندگی اور کام کے بارے میں ایک مختصر جائزہ

امام اعظم ابوحنیفہ

حیات و فقہی کارنامے

تلخیص و تالیف: مشتاق احمد قریشی ◆ ہدیہ: ایک سو پچاس روپے

منگوانے کا پتہ
نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی 74400 فون: 021-35620771/2
اسلامی کتب خانہ المحمد مارکیٹ غزنوی روڈ لاہور۔ فون: 042-37116247

گداز قالین کی وجہ سے پاؤں کی چاپ قدم قدم قالین میں جذب کرتی جب وہ ٹیبل کے قریب آئی تو شہاب نے چہرہ اوپر اٹھایا اور پھر وہ ہڑبڑا کر نیم استادہ ہوگیا۔

''مجھے یقین تھا کہ میں پہچان لی جاؤں گی۔'' لڑکی نے نہایت ہی متین لہجے میں کہا۔ ''دس برس گزرنے میں دس برس ہی ہوتے ہیں لیکن سوچنے میں دس صدیوں پر محیط ہوجاتے ہیں۔ میں نے دس برسوں کو سوچ کر گزارا ہے ایک ایک لمحہ سوچتی رہی ہوں۔''

''آپ تشریف نہیں رکھیں گی مس آفتاب؟'' شہاب کو اپنی آواز ڈولتی اور بکھرتی سنائی دی تھی۔

''مسٹر شہاب اکبر!'' وہ بولی۔ ''ایک گندی امانت آپ کے چہرے سے واپس مانگنے آئی ہوں۔''

''بیٹھ جاؤ' بیٹھ جاؤ مدیحہ......!'' شہاب سسک اٹھا۔ ''میں سرتاپا غلاظتوں میں پھینک دیا گیا تھا مگر مجھے کبھی بدبو کا احساس نہیں ہوا کیونکہ میں مطمئن تھا مجھے اپنی صداقت اور قربانی پر فخر تھا لیکن آپ نے جو کچھ دیا تھا اور جو کچھ کہا تھا اس کو میں بھی دس برس ایک ایک لمحہ سوچتا اور خود سے گھن محسوس کرتا رہا ہوں۔''

''میں وہی کچھ واپس لینے آئی ہوں۔'' مدیحہ نے میز پر ہتھیلیاں ٹیک کر کہا۔ ''کیا میں یہ کہوں کہ تھوکا چاٹنے آئی ہوں۔''

''نہیں' آپ کا آنا کافی ہے۔'' شہاب بولا۔ ''میں اب سے خود کو صاف سمجھنے لگا ہوں۔''

''لوگ آپ کو بھول گئے ہوں گے۔'' مدیحہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''لوگوں کو کچھ کہنے کے لیے کچھ اور مل گیا ہوگا مصروف لوگ پرانے قصے یاد نہیں رکھتے لیکن میں نہیں بھول سکی کیونکہ آپی جان مرنے سے دو روز قبل شہاب اکبر سے ایک ایسا رشتا جوڑ گئی تھیں جسے یاد رکھنا تھا۔ میں اعتراف کروں گی کہ وہ یاد کوئی خوش گوار نہ تھی میں نے دس برس نفرت کو یاد رکھا ہے۔''

''میرا خیال ہے اس پھوڑے کو دکھانے کے علاوہ بھی کچھ باتیں اور رسمیں ہیں۔'' شہاب نے انٹرکام کا بٹن دبا کر ریسیور میں کہا۔ ''مس ابھی تک کافی نہیں آئی......؟''

ایک منٹ کے بعد سکریٹری نے دونوں کے سامنے گاڑھی کافی کے مگ رکھ دیے۔

''میں ایک آس اور مان لے کر آئی ہوں شہاب!'' مدیحہ کافی میں چمچ ہلاتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں امی جان سے کہہ کر آئی ہوں کیا آپ میرا مان رکھیں گے شہاب؟''

دونوں کرنل آفتاب کی پجوک میں پہلو بہ پہلو بیٹھے جب مین گیٹ سے باہر نکلے تو مدیحہ نے بریکوں پر پاؤں رکھ کر چہرہ بائیں طرف گھما کر شہاب کی جانب دیکھا اور زیرلب مسکرا کر بولی۔

''ابھی شام اور ڈنر کا وقت دور ہے اگر آپ کو کوئی کام نہ ہو تو......''

''لالہ زار کی جانب چلیے۔'' شہاب نے ونڈ اسکرین پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

''شہاب!'' مدیحہ بولی۔ ''میں بعض معاملوں میں بے صبری ہوں ایک بات پوچھوں؟''

''اگر آپ کو یقین ہے کہ اس کا جواب میرے اختیار میں ہے تو......!''

''فواد کہاں ہے؟''

''میں بتانے نہیں آپ کو دکھانے لے جا رہا ہوں۔'' شہاب نے جواب دیا۔ ''مجھے معلوم ہے

www.pkdigest.com

Pdfby Roadsign

آنٹی مجھ سے یہی سوال پوچھیں گی۔"

"اوہ میرے خدا!" مدیحہ چیخ اٹھی۔ "تو کیا فواد پنڈی میں موجود رہا ہے؟"

"ہاں۔" شہاب بولا۔

"آپ نے..... آپ نے ہمیں کیوں نہیں بتایا؟ پاپا فواد کے لیے آخری سانس تک تڑپتے رہے تھے۔"

"اگر میں بتا سکتا تو شاید دس برس اپنی زندگی سے نفی نہ کرتا۔"

"لیکن کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ اس کا دشمن زندہ تھا' قاتل ثریا کو نہیں فواد کو قتل کرنے آئے تھے اور میں اسے کچھ دیر پہلے بچا کر لے گیا تھا۔ چوہدری حبیب نے جیل میں پیش کش بھجوائی تھی کہ فواد کے بدلے مقدمہ واپس لے لیا جائے گا' اگر میں بک جاتا تو آج شاید ہم فواد سے ملنے نہ جا رہے ہوتے۔"

"اوہ..... میرے خدا۔" مدیحہ رو پڑی۔ "آپ..... آپ کتنے عظیم ہیں اور ہم کس قدر گھٹیا سوچ پالتے رہے ہیں۔"

"ایسا مت سوچو' بس ایک آزمائش تھی۔" شہاب بولا۔

"اللہ کا شکر ہے ہم سرخرو ہوئے۔"

مدیحہ کار سے اُتر کر گلی میں دوڑتی شہاب سے آگے نکل گئی تھی۔ اس کا انگ انگ بے قرار ہو گیا تھا۔ وہ اڑنا چاہتی تھی' لیکن اسے چند قدم جا کر شہاب کے لیے رکنا پڑا تھا۔ شہاب اس کے دلی اضطراب سے پوری طرح آگاہ اور متفق تھا۔ فواد اس کی مرحومہ بہن کی واحد نشانی تھی۔

دروازہ رقیہ نے کھولا تھا۔ شہاب کے ساتھ اجنبی لڑکی کو دیکھ کر وہ سمٹ سی گئی۔ شہاب نے اندر داخل ہو کر رقیہ کو پیار کیا اور مدیحہ کو ساتھ لے کر چھوٹا سا صحن عبور کرتا اندر داخل ہوا۔ فواد ہوم ورک کر رہا تھا۔ شہاب کو دیکھ کر اچھل کر اٹھا اور مدیحہ نے دوڑ کر اسے باہوں میں بھر کر چومنا اور رونا شروع کر دیا۔

"فواد!" شہاب نے حیران بچے کو بتایا۔ "یہ تمہاری آنٹی مدیحہ ہیں' تمہیں آنٹی زینت نے بتایا تھا ناں.....!"

"جی ہاں انکل! آنٹی نے نانی اماں کے بارے میں بتایا تھا مجھے۔" فواد' مدیحہ کی گود میں سمٹ کر بولا۔ "آپ نانی اماں کو کیوں نہیں لائے انکل؟"

"ہم تمہیں لینے آئے ہیں بیٹے! تمہاری نانو اماں نے تمہیں بلایا ہے۔" مدیحہ نے اس کے بالوں پر چہرہ رگڑتے ہوئے کہا۔

"تمہیں مدّو آنٹی کبھی یاد نہیں آئی فواد؟"

"میں دادا جان اور آنٹی سے اجازت لے آؤں۔" فواد گود سے نکل گیا۔

جب فواد چلا گیا تو مدیحہ نے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کیا اور فواد کی کتابیں دیکھنے لگی۔

"شہاب! ان محسنوں سے اجازت لے دیجیے۔ میں فواد کو اب اپنے پاس رکھوں گی۔"

"ابھی نہیں۔" شہاب بولا۔ "تعلیمی سال ختم ہو رہا ہے' نیا اسکول اور ماحول بہتر نہیں ہوگا۔"

"پھر..... پھر مم..... میں اسے رکھ سکوں گی نا اپنے پاس؟" مدیحہ پھر رونے لگی تھی۔

"کیوں نہیں' آپ کے سوا فواد کا ہے ہی کون؟"

"نہیں۔" مدیحہ بولی۔ "آپ ہیں سب کچھ اس کے میں تو آپ سے مانگ رہی ہوں۔"

واپسی کا سفر بھی عجیب تھا۔ پچھلی نشست پر بیٹھے دونوں ایک دوسرے میں اس قدر مگن تھے کہ

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شہاب کو بار بار پس منظر کو عقب نما آئینے کی مدد سے دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ کھیل رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے اور اس وقت چونکے تھے جب شہاب نے شوفر کے انداز میں دروازہ کھول کر انہیں اتارا تھا۔

مدیحہ نے کال بیل بجائی۔ دروازہ کھولنے اس کی بوڑھی انا بی آئی تھی۔ مدیحہ کو ایک خوب صورت نا محرم کے ساتھ بے حجاب دیکھ کر انا بی کے ماتھے کی جھریاں اور بھی گہری ہو گئی تھیں۔

"امی جان!" ایک بند دروازے کو بجا کر مدیحہ بولی۔ "اندر آنے کی اجازت دیجیے۔ آج میں بہت سی خوشیاں آپ کے لیے سمیٹ لائی ہوں۔"

"آؤ بیٹے دروازہ کھلا ہے۔" اندر سے بیگم آفتاب کی نحیف آواز سنائی دی۔ مدیحہ نے اندر جا کر کچھ کہا اور پھر اس نے جھانک کر باہر کھڑے شہاب اور فواد کو بلا لیا۔ شہاب نے اندر جانے سے قبل فواد کی انگلی تھام لی تھی۔

"آداب آنٹی!" شہاب نے سر کو خم دے کر سلام کیا۔ بیگم آفتاب نے اسے جواباً بہت سی دعائیں دی تھیں۔

"آپ کی امانت آنٹی..... فواد!" شہاب نے فواد کو اٹھا کر پلنگ پر بیٹھا دیا۔ بیگم آفتاب کے منہ سے چیخ نکل گئی پھر انہوں نے فواد کو سینے سے لگا کر باقاعدہ بین شروع کر دیے۔ چند منٹ بعد' مدیحہ نے ہی دونوں کو الگ کیا تھا۔

نو بجے وہ چاروں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کھانے میں مصروف تھے تو وہ سوگوار ماحول اور ربسورتے چہروں کو دیکھنے کے عادی در و دیوار حیران حیران تھے کہ برسوں کے بعد قہقہوں کی موسیقی سنی جا رہی تھی۔

"شہاب بیٹے!" بیگم آفتاب سوپ میں چمچ ہلاتے ہوئے بولیں۔ "میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میری ثریا نے مدیحہ کو تمہارے لیے مانگ لیا تھا۔ بیٹے میں شاید اسی روز کے لیے زندہ رہی ہوں' مدیحہ جانتی ہے ڈاکٹر مایوس ہیں' آج تم نے ایک امانت ہمیں لوٹائی ہے' میں چاہتی ہوں میرے بیمار کندھوں پر ثریا جو امانت رکھ گئی ہے وہ تم جلد سے جلد اتار لے جاؤ۔"

"آنٹی! آپ جئیں گی۔" شہاب بولا۔ "آپ کو ہماری خاطر جینا ہے۔ دیکھیے آنٹی ابھی میں سفر میں ہوں میرا نہ کوئی گھر ہے نہ بینک میں کچھ ہے۔ مجھے آپ کے لیے اور مدیحہ کی خاطر بہت کچھ کرنا ہے۔"

"بس کوئی بات نہیں۔" بیگم صاحبہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"تم مدیحہ اور ثریا کے حوالے سے میرے بیٹے ہو' یہ سب کچھ تمہارا ہے' کیا تم ایک ماں کو سکون کی موت نہیں دینا چاہتے؟"

"پلیز امی جان!" مدیحہ نے تڑپ کر کہا۔ "میں رونے لگوں گی۔؟"

"ٹھیک ہے آنٹی!" شہاب بولا۔ "میں آپ کی خوشی کے لیے کل ناصر کو یہاں بھیج دوں گا۔"

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

دشت جنوں

بھائی عمران احمد
السّلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور ترقی سے نوازے۔
سب سے پہلے میں اپنے ان تمام قارئین کی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری تحریروں کو پذیرائی بخشی اور اپنے مشوروں اور تنقید کے ذریعے ہر ماہ میری رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ گو میں باقاعدہ افسانہ نگار نہیں لیکن قارئین اور آپ کی حوصلہ افزائی نے مجھے لکھاری بنا دیا ہے۔ اس ماہ دشتِ جنوں کے ساتھ حاضر ہوں امید ہے آپ کے اور تمام دوستوں کے معیار پر پوری اترے گی۔
والسّلام
شہلی ارشاد
کراچی

اس رات میں دیر تک جاگتی رہی۔ میری آنکھوں میں دور دور تک نیند کا شائبہ نہیں تھا' حالاں کہ میں لمبی ڈیوٹی سے واپس آئی تھی۔ میں ایک ائر ہوسٹس ہوں' لمبی فلائٹ ہوتی ہے تو ہمیں سونے کا بھی ٹائم نہیں ملتا' بعض اوقات ایک دو دن کا Stay مل جاتا ہے تو نیند لیتے ہیں مگر کبھی کبھی فوری فلائٹ کے ساتھ واپس بھی آنا پڑتا ہے' میں بنکاک جانے والی فلائٹ میں گئی تھی اور چند گھنٹوں کے بعد واپس آ گئی اسی فلائٹ میں وہ مجھے ملا تھا۔

پتا نہیں اس میں ایسی کیا بات تھی کہ میرا دل کھنچ کر اس کی جانب چلا گیا۔ حالاں کہ جس فیلڈ میں' میں ہوں یہاں روزانہ ہزار طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے' مگر میرا دل کبھی کسی کی جانب مائل نہیں ہوا' شاید اس لیے کہ وہ بہت خوب صورت تھا' مجھ سے بھی زیادہ۔ میں اسمارٹ تو ہوں مگر اتنی حسین نہیں ہوں' یہ بات میں بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔

میرا گھرانہ بہت زیادہ ماڈرن تو نہیں ہے' مگر پھر بھی امی اور بھائیوں نے مجھ پر بہت زیادہ اعتماد کرتے ہوئے مجھے اپنا کیریئر بنانے کی مکمل آزادی دی تھی' والد حیات نہیں تھے' دو بھائی بڑے ہیں اور ایک چھوٹی بہن ہے۔

مجھے ائر ہوسٹس بننے کا بہت شوق تھا' جب اپنی اس خواہش کا اظہار میں اپنی دوستوں اور بھائیوں کے آگے کرتی تو سب ہی یہی کہتے کہ تم ائر ہوسٹس نہیں بن سکتیں' کیوں کہ تم خوب صورت نہیں ہو۔

بس اسی وجہ سے میں نے بھی ضد پکڑ لی کہ چاہے کچھ بھی ہو میں تو اب ائر ہوسٹس ہی بن کر دکھاؤں گی' اگر ایسی بات نہ ہوتی تو شاید میں یہ خیال اپنے دل سے نکال بھی دیتی۔

میں نے دن رات کوشش کی اور اپنے اندر ہر طرح کی وہ خصوصیات پیدا کر لیں کہ میرا سلیکشن ہو گیا پھر تو سب نے مجھے خوب خوب سراہا کہ میں نے جو ٹھانی اسے کر کے دکھایا۔

یہ جاب کرتے ہوئے مجھے پورے دو سال ہو گئے تھے' اب تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی رہا مگر آج جو میں نے اسے دیکھا تو جیسے وہ میرے دل میں بس گیا۔ ذہن میں اس کی شکل چیک کر رہ گئی' میں نے کروٹ لیتے ہوئے ایک ٹھنڈی آہ بھری کہ مجھے اچھا بھی لگا تو ایک ایسا شخص جس کا کوئی اتا پتا ہی نہیں ہے' حد یہ کہ مجھے اس کا نام بھی معلوم نہیں' کراچی جیسے

بڑے اور انسانوں کے جنگل جیسے اس شہر میں پتا نہیں وہ کہاں رہتا ہے؟ کون ہے؟ اس کا خاندان کیا ہے؟ پتا نہیں وہ مجھے دوبارہ کبھی ملے گا بھی یا نہیں؟ پھر ایسی ہی مایوسی والی باتیں سوچتے سوچتے میں نیند کی وادی میں اتر گئی اور ساری رات اس کے سپنے دیکھتے ہوئے گزار دی۔

پھر اکثر غیر ارادی طور پر میں فلائٹ میں سوار مسافروں میں اس کو تلاش کرتی رہتی مگر وہ مجھے دکھائی نہیں دیا' پھر آہستہ آہستہ میں اسے بھولنے لگی۔

تقریباً ایک مہینے کے بعد بنکاک جانے والی فلائٹ میں وہ مجھے نظر آیا۔ اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن کئی گنا بڑھ گئی اور میرا شدت سے دل چاہا کہ میں دوڑ کر اس کے پاس جاؤں اور پوچھوں۔

"تم کہاں تھے؟ اتنے دنوں سے مجھے دکھائی کیوں نہیں دیئے' تمہاری یاد میں' میں کتنی راتیں جاگی ہوں' تمہارے لیے کتنی بے قرار رہی ہوں' مگر میں ایسا نہ کر سکی اور نہ ہی کر سکتی تھی' میری نسوانی انا میرے آڑے آ گئی' مگر بہر حال میں بہانے بہانے سے اس کے پاس کئی مرتبہ گئی۔ وہ بھی مسکرا مسکرا کر مجھے تھینک یو کہتا رہا' مجھ سے برداشت نہ ہوا تو پوچھ ہی بیٹھی۔

"یور گڈ نیم سر.....؟"

"جی.....!" اس نے چونک کر پوچھا۔

"سر میں آپ کا نام جان سکتی ہوں۔" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"راحیل!" اس نے ایک قاتل مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا' اس کے دانت بہت خوب صورت تھے' مسکرانے میں تھوڑے تھوڑے نمایاں ہوتے تو بہت بھلے لگے۔

"مجھے روحن کہتے ہیں۔" میں نے اس کے بناء پوچھے ہی اپنا نام بتا دیا تو وہ مسکرا دیا۔

اس کے بعد میں اس مختصر سی بات چیت کو کتنی مرتبہ اپنے تصورات میں دُہراتی رہی اور خوش ہوتی رہی۔ حسن اتفاق کہ میری ایک ہفتے کی چھٹیاں تھیں۔ اس روز میں اپنی بہن کے ساتھ ڈولمن مال میں گھوم رہی تھی کہ وہ مجھے دکھائی دے گیا۔ پھر میں اپنے آپ کو اس کے قریب جانے سے نہ روک سکی اور اس کے قریب جا پہنچی اور اس طرح اس سے ملی' جیسے ابھی اچانک ہی اس پر میری نگاہ پڑ گئی ہو۔

"آپ راحیل صاحب ہیں ناں.....؟" میں نے پُرمسرت نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی! اور آپ غالباً روحن ہیں۔" اس نے عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"غالباً نہیں' یقیناً!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر ہم میں تھوڑی سی بات چیت ہوئی اور اس نے مجھے اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دے دی' جو میں نے فوراً قبول کر لی۔ ہم قریبی ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل کیں' اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ریڈی میٹ گارمنٹس کا بزنس کرتا ہے اور اسی سلسلے میں اس کا بنکاک آنا جانا رہتا ہے' اس کے کئی بہن بھائی تھے' وہ ان ہی کے ساتھ رہتا ہے' میں نے ڈرتے ڈرتے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ کہیں انگیج تو نہیں ہے' اس نے بتایا کہ ابھی تک تنہا ہی ہوں' کیوں کہ اسے اپنی پسند کی کوئی لڑکی ملی ہی نہیں۔

"مگر لگتا ہے کہ شاید اب ایسا نہیں ہوگا۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا تو میرے دل کی کلیاں مسکرا اٹھیں اور میں سرتاپا جھوم اٹھی۔

میری چھوٹی بہن بور ہونے لگی اور اس نے گھر چلنے کے لیے کہا تو میں مجبوراً کھڑی ہو گئی' جب میں چلنے لگی تو اس نے مجھ سے میرا موبائل نمبر مانگا تو میں

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

ایک شوخ ادا سے پوچھا۔ ''کیا کریں گے؟''

''جب ہمارا دل ہمیں تنگ کرے گا تو ہم آپ کو تنگ کریں گے اگر آپ بُرا نہ مانیں تو.....'' اس نے آہستہ سے کہا تو میں نے ہنستے ہوئے اسے اپنا نمبر دے دیا اور اس کا نمبر لے لیا۔

اور پھر ہماری فون پر باتیں ہونے لگیں' میں اور وہ جب فارغ ہوتے تو ملاقات بھی کر لیتے۔ میں جس شہر اور جس ملک جاتی وہاں سے اس کے لیے کوئی نہ کوئی گفٹ ضرور لے کر آتی جیسے وہ خوشی سے قبول کر لیتا اس نے بتایا کہ اس نے میرا ذکر اپنے گھر میں اپنی بہنوں اور بھابیوں سے کیا ہے۔

''تم کسی دن مجھے اپنے گھر لے چلو' میں تمہارا گھر دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمہاری امی اور سارے گھر والوں سے ملنا چاہتی ہوں۔'' میں نے پُرشوق لہجے میں کہا۔

''تمہیں میرا گھر اچھا نہیں لگے گا' چھوٹا سا گھر ہے اور اس چھوٹے سے گھر میں بہت سارے لوگ رہتے ہیں۔ دو بھائی شادی شدہ ہیں اور ان کے بچے بھی ہیں۔ دو بہنیں کنواری ہیں' امی ابا ہیں۔'' اس نے کہا۔

''تو کیا ہوا' میرے نزدیک چھوٹے بڑے گھر کی کوئی اہمیت نہیں ہے' گھر چھوٹا ہونے سے کچھ نہیں ہوتا بس گھر میں رہنے والوں کے دل بڑے ہونے چاہئیں اور ان میں خلوص ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے تمہاری بات اچھی لگی ہے' تمہاری سوچ بہت اچھی ہے۔ میں تمہیں اپنے گھر ضرور لے چلوں گا۔'' اس نے کہا اور میں تیار ہو گئی۔

مگر اس بات کو بھی بہت دن گزر گئے وہ مجھے اپنے گھر لے جانے میں ٹال مٹول کرتا رہا' پھر میرے بہت ضد کرنے پر ایک دن وہ مجھے اپنے گھر لے جانے پر راضی ہو گیا۔ میں اپنی کار میں تھی' تب اس نے کہا ''آؤ گھر چلتے ہیں۔''

وہ راستا بتاتا رہا اور میں ڈرائیو کرتی رہی' وہ جس علاقے میں رہتا تھا میں کبھی وہاں نہیں گئی تھی۔ تنگ گلیاں اور چھوٹے چھوٹے مکانات تھے' میں نے پوچھا۔ ''اس علاقے کا نام کیا ہے؟''

تو اس نے بتایا۔ ''اس علاقے کو ملیر کہتے ہیں۔''

میں نے ملیر کا نام تو سنا تھا مگر کبھی دیکھا نہیں تھا۔

گلی اتنی تنگ تھی کہ میری کار اندر گلی میں نہیں جا سکتی تھی' اس لیے گلی کے باہر روڈ کے کنارے کار پارک کی اور پیدل چلتی ہوئی اس کے گھر پہنچی' گلی کے وسط میں اس کا دو منزلہ مکان تھا۔

اندر چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا' جس میں لکڑی کا بہت معمولی فرنیچر تھا اور بوسیدہ سا قالین بچھا ہوا تھا۔ میرا دل اس کا گھر دیکھ کر عجیب سا ہو گیا' مگر ان ساری چیزوں پر میری محبت حاوی ہو گئی اور میں نے یہ سوچ کر اپنا سر جھٹک دیا کہ اگر اس گھر میں میرے رہنے کی گنجائش نہ نکلی تو میں راحیل کے ساتھ اپنے گلشن اقبال والے فلیٹ میں شفٹ ہو جاؤں گی' میرے گھر والے میری تنخواہ نہیں لیتے تھے اور میں نے پیسے جمع کر کے وہ فلیٹ خریدا تھا اور اسے فی الحال کرائے پر دے دیا تھا اور اس سے بھی میری آمدنی میں اضافہ ہو گیا تھا' مجھے راحیل کہیں سے کچھ نہیں چاہئے تھا' مجھے تو صرف راحیل چاہئے تھا اور میں اس سے اتنی زیادہ محبت کرنے لگی تھی کہ اس کی محبت میں پاگل ہو رہی تھی۔

مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر راحیل اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنی امی اور بھابیوں اور بہنوں کو ساتھ لے آیا' ان لوگوں کو دیکھ کر بھی مجھے خاصا شاک لگا' راحیل سے بھی ان کا بیٹا اور بھائی نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی امی بہت گندے طریقے سے پان چبا رہی تھیں۔ کپڑے بھی ملگجے تھے' بھابی شاید کچن سے

ہاتھ دھوئے بنا ہی اٹھ کر آ گئی تھیں۔ پسینے میں کپڑے تر ہو رہے تھے۔ اس کی امی نے باتوں ہی باتوں میں بتایا کہ ''راحیل نے صرف میٹرک پاس کیا ہے۔ پھر یہ بزنس میں لگ گیا۔ بہت اچھا کماتا ہے' میرا یہ کماؤ پوت سارے گھر کا خیال رکھتا ہے۔ خوب صورت بھی ہے اس لیے اس کے پیچھے بہت لڑکیاں مرتی ہیں۔ پر ہم شریف اور عزت دار لوگ ہیں۔ شریف گھرانے سے اپنی بہو لائیں گے۔'' اس کی بھابی نے اپنی ساس کی بات کی حمایت کی۔

ان لوگوں نے میری کافی خاطر مدارات کی' اور جب میں چلنے لگی تو دوبارہ آنے کے لیے کہا' میں خوش ہو گئی کہ میں یقیناً اس کی امی کو پسند آ گئی ہوں۔ راحیل نے میرے بارے میں تو پہلے ہی انہیں بتایا ہوا تھا۔

بعد میں راحیل نے مجھے بتایا کہ اس کی امی اور بھابی' بہنیں مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ راحیل کی زبانی یہ سن کر مجھے بڑی تسلی ہوئی اور میں دن رات راحیل کی دلہن بننے کے خواب دیکھنے لگی۔

راحیل کے گھر والے مزید مجھ سے خوش ہو جائیں یہ سوچ کر میں ان سب کے لیے تحائف بھجوانے لگی' کبھی اس کی امی کے لیے کبھی بھابیوں کے لیے اور کبھی بہنوں کے لیے' وہ لوگ میرے لائے ہوئے تحائف بڑی خوشی سے قبول کر لیتے۔

میں نے راحیل پر زور دینا شروع کیا کہ تم اپنی امی کو میرے گھر اپنا رشتہ لے کر بھیجو' تو اس نے کہا۔

''ابھی تو مجھ سے بڑے ایک بھائی موجود ہیں اور دو بہنیں ہیں۔ اس لیے پہلے بڑے بھائی اور کم از کم ایک بہن کی شادی ہو گی تب کہیں جا کر میرا نمبر آئے گا۔ تم خود ہی سوچو کہ ان لوگوں کی شادی سے پہلے میں اپنی شادی کے بارے میں امی سے کہتے ہوئے اچھا لگوں گا۔''

''ٹھیک ہے اگر تم ابھی شادی نہیں کر سکتے تو منگنی تو ہو ہی سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں جلدی کس بات کی ہے' تم صبر نہیں کر سکتیں۔'' اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں میں صبر نہیں کر سکتی۔'' میں نے مخمور نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں.....؟ ایسی بھی کیا بات ہے؟'' اس نے براہ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بھاری لہجے میں پوچھا تو میں شرما گئی اور کہا۔

''میرا دل چاہتا ہے کہ تم ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہو' کبھی ہم دور نہ ہوں۔''

''میرا بھی دل یہی چاہتا ہے مگر کیا کروں..... مجبوری کا نام صبر ہے' سو وہ تو کرنا ہی پڑے گا۔'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پتا ہے میری برتھ ڈے آ رہی ہے۔'' میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

''واؤ.....! کب؟'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

''بزاز بردست دن ہے' اس دن سارے پاکستان میں چھٹی ہوتی ہے' پچیس دسمبر۔'' میں نے کہا تو وہ ہنس دیا اور بولا۔

''اس مرتبہ میں تمہاری سالگرہ مناؤں گا' اپنے طریقے سے اور صرف تم اور میں ہوں گے' دوسرا کوئی نہیں۔ رات بارہ بجے کیک کٹے گا۔ تم سارا انتظام مجھ پر چھوڑ دو' اس دن تم میری مہمان ہو گی۔'' اس نے کچھ اس طرح کہا کہ میں خوشی سے نہال ہو گئی۔ اپنے اوپر ناز ہونے لگا کہ راحیل مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے۔

اتفاق سے ایک دن بعد میری فلائٹ تھی مگر چوبیس کی صبح مجھے واپس بھی آنا تھا' راحیل نے مجھے برتھ ڈے کے پروگرام کے بارے میں نہیں بتایا کہ وہ

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

ایک سرپرائز ہوگا۔

چوبیس کو جب میں واپس آئی تو شام کو راحیل کا فون آیا اور اس نے مجھے سی سائیڈ پر بلایا اور تاکید کی کہ خوب اچھی طرح بن سنور کر آنا۔

میں نے اس دن راحیل کا پسندیدہ بلیک کلر کا سوٹ پہنا' وائٹ باریک زرقون کی جیولری پہنی' آئینہ دیکھا تو اپنے اوپر خود ہی پیار آ گیا۔ میرے اندر ایک عجیب سی کشش پیدا ہوگئی تھی' پیار بھی انسان کو حسین بنا دیتا ہے۔ ویج' ریسٹورنٹ پر راحیل میرا منتظر تھا' ہم نے ساتھ ڈنر کیا پھر ساحل پر گیلی ریت پر ٹہلتے ہوئے ہم نے اپنے سہانے مستقبل کی ڈھیر ساری باتیں کیں۔

رات گیارہ بجے راحیل نے چلنے کے لیے کہا تو میں نے پوچھا "اب کہاں جانا ہے؟"

"یہی تو سرپرائز ہے۔" اس نے کہا تو میں بناء پوچھے بناء سوچے اس کے ساتھ چل دی' وہ اپنے کسی دوست کی کار مانگ کر لایا تھا' کار میں میرے گفٹ رکھے تھے' وہ مجھے لے کر ایک ہوٹل میں آیا اور گاڑی سے گفٹ کے پیکٹ نکالتے ہوئے بولا۔

"میں نے ایک کمرہ بک کروایا ہے' ہم یہاں برتھ ڈے منائیں گے۔" کیک بھی وہی لے کر آیا تھا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آج کی یہ برتھ ڈے میری زندگی میں اندھیرے بکھیر دے گی' میں تو خوشی اور حسرت سے اس کی محبت میں اندھی ہو رہی تھی۔

ہم روم میں آ گئے' راحیل نے ایک پیکٹ اٹھا کر مجھے دیا اور بولا۔

"اس میں تمہارے لیے ایک ڈریس ہے اور جیولری ہے' تم یہ پہن کر آؤ اتنے میں کیک پر موم بتیاں لگاتا ہوں۔" میں نے پیکٹ کھولا تو اس نے کہا۔

"پیکٹ اندر جا کر کھولنا اور کچھ مت کہنا۔ اگر تم نے یہ نہیں پہنا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔"

میں ہنستی ہوئی اندر چلی گئی اور پیکٹ کھول کر ڈریس نکالا اور ایک شرمگیں مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی اور منہ سے بے ساختہ نکلا "بہت شریر ہو تم۔"

وہ ایک کھلے گلے کی بہت مہین کالے رنگ کی میکسی تھی اور بلیک کلر کے پتھروں کا نازک سا جیولری سیٹ تھا' میں نے ڈریس پہنا اور شرما گئی مگر چوں کہ حکم محبوب تھا اس لیے باہر آ گئی۔

راحیل کیک پر موم بتیاں جلائے میرا منتظر تھا' وہ اس ڈریس میں مجھے دیکھتا رہ گیا' اور میری خوب خوب تعریف کی' پھر ہم نے مل کر ٹھیک بارہ بجے کیک کاٹا اور ایک دوسرے کو کھلایا۔

اور پھر راحیل نے ہلکے میوزک پر میرے ساتھ رقص کیا' اس کا التفات بڑھتا ہی جا رہا تھا اور میرے قدم تو محبت میں پہلے ہی بہکے ہوئے تھے دماغ سے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت ختم ہو چکی تھی' اگر کچھ سامنے تھا تو راحیل کا چہرہ اس کی آنکھیں اس کے جام پلاتے ہوئے لب.....!

جب ہوش آیا تو سب کچھ اندھیروں میں ڈوب چکا تھا' میری آبرو کا جنازہ نکل چکا تھا۔

"یہ کیا ہو گیا راحیل.....؟" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"مم..... میں بہت شرمندہ ہوں روہن' مجھے معاف کر دو' مجھے خود نہیں پتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔" اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں شرمندگی تیرتی دیکھی تو میں بے تابی سے آگے بڑھی اور کہا "اب اس طرح بیٹھنے سے کیا حاصل ہوگا اب تو تمہیں جلد ہی کوئی بولڈ اسٹیپ لینا ہوگا۔ تم کل ہی اپنی امی سے بات کرنا۔"

"ہاں ہاں تم فکر نہ کرو' میں کل ہی امی سے بات کروں گا اور تمہیں اپنا لوں گا۔" اس نے جلدی سے کہا۔

رات کا ایک بج چکا تھا' اس لیے میں نے کہا کہ فوراً گھر چلو' کافی رات ہوگئی ہے اور پھر وہاں سے راحیل اپنی کار میں اور میں اپنی کار میں گھر واپس آ گئی' اپنے گھر والوں کو میں نے یہی بتایا کہ میں اپنی فرینڈز کے ساتھ کھانے پر گئی تھی اور پھر.....!

کتنے ہی دن ہو گئے راحیل سے میری ملاقات نہیں ہو سکی' میں جب بھی اسے کال کرتی اس کا موبائل بند ملتا تھا' آخر ایک دن میں اس کے گھر جا پہنچی' وہ مجھے گھر پر نہیں ملا' اس کی امی اور بھابیاں تھیں۔ میں نے اس کی بھابی سے پوچھا کہ راحیل نے میرے متعلق گھر میں کوئی بات کی ہے تو اس کی بھابی نے حیرت سے پوچھا کہ کس قسم کی بات' تب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اور راحیل نے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔

"اچھا.....!" انہوں نے خوب کھینچ کر لفظ اچھا حیرت بھرے انداز میں کہا۔

"اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے' کیا راحیل نے گھر میں کبھی بھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔" میں نے کہا۔

"مجھے واقعی یہ سن کر بہت حیرت ہو رہی ہے' کیوں کہ راحیل کی منگنی تو ہو چکی ہے اور وہ اپنی منگیتر سے بہت محبت کرتا ہے' وہ ہماری رشتہ دار ہے.....!" اس کی بھابی نے رحم آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

اور ان کے منہ سے راحیل کی منگنی کی خبر سن کر مجھے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے' وہ میری بدلتی ہوئی حالت دیکھ ہی رہی تھیں' پھر بولیں۔

"تم اپنے آپ کو سنبھالو' راحیل آئے گا تو میں اس سے بات کروں گی' اس نے تمہیں یہ دھوکا کیوں دیا' اتنی بڑی بات تم سے کیوں چھپائی۔"

"نہیں!" میں نے کھڑے ہو کر سختی سے کہا۔ "آپ راحیل سے کوئی بات نہیں کریں گی' نہ اسے میرے آنے کا بتائیں گی اور نہ یہ بتائیں گی کہ آپ نے مجھے اس کی منگنی کی خبر سنا دی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے نہیں بتاؤں گی' مگر یہ بات کہ تم گھر پر آئی تھیں' چھپی نہیں رہ سکتی۔ اس لیے کہ میں نہیں بتاؤں گی تو گھر کا کوئی اور فرد بتا دے گا۔" انہوں نے کہا۔

راحیل کی یہ بھابی مجھے پورے گھر میں کچھ بہتر لگی تھیں' مگر میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ راحیل نے میرے ساتھ کیا کیا ہے' اس کے دل میں میری محبت تھی ہی نہیں۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اسے کتنا چاہتی ہوں' اپنا سب کچھ اس پر لٹا دیا' میں بھی کتنی احمق تھی۔ اس کے اور اس کے گھر والوں کے لیے کتنے قیمتی تحفے لاتی رہی اور وہ مجھے احمق لڑکی سمجھ کر سب کچھ وصول کرتا رہا اور اب مجھ سے مل بھی نہیں رہا۔ میں نے چلتے چلتے اس کی بھابی سے پوچھا۔

"کیا راحیل نے اپنے موبائل فون کی سم بدل لی ہے؟"

"ہاں' کہہ رہا تھا کہ اس کا موبائل فون کسی نے چھین لیا ہے' اس لیے دوسرا فون لیا ہے' نمبر بھی نیا ہے۔" اس کی بھابی نے کہا۔

"پلیز مجھے اس کا نیا نمبر دے دیں۔" میں نے کہا تو انہوں نے مجھے راحیل کا نیا نمبر دے دیا۔

اس رات بھی میں سو نہیں سکی' بار بار اپنی حماقتیں یاد آ رہی تھیں اور یہ خیال آ رہا تھا کہ راحیل مجھے کس طرح الو بناتا رہا' میں نے اس کو فون کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کا نمبر ملایا' تو اس نے فون کاٹ دیا' میں نے کم

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

ازکم دس مرتبہ ٹرائی کیا مگر وہ ہر بار فون کاٹتا رہا اور پھر تنگ آ کر موبائل ہی آف کر دیا' میں ساری رات فون ملاتی رہی مگر فون آف ملتا رہا' تب میں نے دوسری سم خریدنے کا پروگرام بنایا۔

میں نے سم بدل کر راحیل کو فون کیا تو اس نے فوراً فون ریسیو کر لیا۔ اس کے ہیلو کہنے کے جواب میں' میں نے چند لمحوں کی خاموشی اختیار کی' جب اس نے دو تین مرتبہ ہیلو کہا تو میں نے کہا۔

''راحیل میں ہوں روبن.....!'' جواب میں مجھے اس کی گہری سانس لینے کی آواز آئی۔

''اوں ہوں! فون بند مت کرنا راحیل.....! تم کیا سمجھ رہے تھے کہ سم بدل لینے سے میں تم تک پہنچ نہیں پاؤں گی۔ مجھے صرف اتنا بتا دو اپنی پوری سچائی اور ایمان داری کے ساتھ کہ تم نے کبھی مجھ سے تھوڑی سی بھی محبت کی تھی' یا پہلے ہی دن سے تم نے مجھے ایک احمق لڑکی سمجھ کر بے وقوف بنایا ہے۔''

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہا۔

''بولو پلیز راحیل جواب دو' میں تمہارا ہر جواب ذہنی طور پر سننے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اب میں تمہیں تمہاری اس بات کا کیا جواب دوں۔ اگر مجھے تم سے لگاؤ نہیں ہوتا تو میں تمہارے ساتھ اتنا سارا وقت کیسے گزارتا۔'' اس نے مردہ لہجے میں کہا۔

'میں نے یہ نہیں پوچھا ہے کہ تمہیں مجھ سے لگاؤ تھا یا نہیں' میں نے لفظ محبت استعمال کیا ہے' اگر تم مجھ سے پوچھو گے تو میرا جواب یہ ہوگا کہ راحیل میں نے تم سے بہت ٹوٹ کر محبت کی ہے' اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ تمہیں چاہا ہے' میں اسی محبت کے بارے میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔'

اب بھی اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہا۔

''تم اس لیے خاموش ہو راحیل کہ تمہارے پاس میری اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے اور اگر کوئی جواب ہے بھی تو وہ تم مجھے دینا نہیں چاہتے' کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ تمہارا جواب نفی میں ہوگا۔''

''تم غلط سمجھ رہی ہو' ایسا کچھ نہیں ہے دراصل میں اپنی اس دن والی حرکت پر اتنا زیادہ شرمندہ تھا کہ تمہارا سامنا ہی نہیں کر پا رہا تھا۔''

''اور میرا تم سے پیچھا چھوٹ جائے تم نے اپنے فون کی سم ہی بدل ڈالی۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔

''اب بھی تم غلط سمجھ رہی ہو' میرا موبائل چھن گیا تھا۔'' اس نے زچ ہو کر کہا۔

''اچھا چلو تمہاری بات مان لیں' تم یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے گھر والوں سے شادی کی بات کی یا نہیں' کیوں کہ پہلے کی بات اور تھی میں انتظار کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ مگر اب کی بات اور ہے' اب اگر ہمارا یہ گناہ دنیا کے سامنے آ گیا تو میں کیا کروں گی۔'' میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا میں راحیل سے اس کی منگنی والی بات دانستہ چھپا گئی' اور اس کا ذکر نہیں کیا۔

''وہ..... وہ..... دراصل.....!'' اس نے گھبرا کر کہا اور چپ ہو گیا۔

''وہ..... وہ کیا کر رہے ہو' صاف کیوں نہیں بتاتے' میرے صبر کا امتحان کیوں لے رہے ہو۔'' میرا لہجہ خود بخود تیز ہو گیا۔

''میں نے گھر میں بات کی تھی۔'' اس نے نیچی آواز میں کہا اور اس کے لہجے کا کھوکھلا پن بتا رہا تھا کہ وہ صاف جھوٹ بول رہا ہے۔

''پھر..... پھر کیا کہا سب نے؟'' میں نے جان بوجھ کر اپنے لہجے سے بے تابی عیاں کی۔

''امی نے صاف انکار کر دیا' وہ کہہ رہی تھیں کہ میں ایسی لڑکی کو بہو نہیں بنا سکتی جو نوکری کرتی ہو' راتوں کو گھر سے باہر رہتی ہو اور مردوں سے آزادانہ میل جول رکھتی ہو۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں مانیں۔'' اس نے کہا۔

''ظاہری بات ہے' وہ مجھ سے تمہاری شادی پر راضی کیسے ہو سکتی ہیں' کیوں تمہاری منگنی تو کئی سال پہلے وہ اپنی بھانجی سے کر چکی ہیں۔'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ میرے منہ سے اپنی منگنی کی خبر سن کر وہ سناٹے میں آ گیا ہوگا۔ اس لیے دوسری جانب مکمل خاموشی چھا گئی۔

''سانپ کیوں سونگھ گیا تمہیں راحیل احمد..... اگر ایسی ہی بات تھی تو تم نے میرے ساتھ محبت کا یہ کھیل کیوں کھیلا۔ کیوں مجھے اتنا بڑا دھوکا دیا کہ میں نے تمہیں اپنا سب کچھ مان کر تم پر اپنا تن من سب کچھ وار دیا۔'' میں یہ کہہ کر سسک پڑی۔

''خوامخواہ آنسو بہا کر مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش مت کرو' میں تمہارے پیچھے نہیں لگا تھا بلکہ تم خود آگے بڑھی تھیں۔ مجھے نہ تو اندازہ تھا اور نہ ہی میرا ارادہ تھا کہ وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا' میں سمجھا کہ تم محض وقت گزارنا چاہتی ہو۔ میں نے بھی تمہارے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا اور تم سے دوستی کر لی' ہم شریف لوگ ہیں روبن بیگم اور ہماری بہو بیٹیوں کے یہ چھن نہیں ہوتے' جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ اور اب آئندہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی مت کرنا' میں تم سے شادی تو کیا تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ شادی تو میں اپنی منگیتر سے کروں گا کیوں کہ وہ تمہاری طرح آوارہ پھرنے والی نہیں' ایک شریف لڑکی ہے اور میں اسی سے محبت کرتا ہوں۔'' اور یہ سب کہہ کر اس نے فون کاٹ کر آف کر دیا' کیوں کہ بار بار نمبر ملانے پر بھی اس سے رابطہ نہ ہو سکا۔

اتنی ذلت تو مجھے کبھی بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ راحیل نے کیا سمجھ رکھا تھا مجھے' میں کوئی فاحشہ ہوں' آبرو باختہ ہوں۔ میری عصمت و عفت کی اس کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں۔

میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی' ساری رات تڑپتی رہی۔ آنکھیں بند کرتی تو دنیا والوں کی نگاہوں سے شعلے نکلتے اور ہاتھوں میں پتھر دکھائی دیتے' مجھے ایسا لگا جیسے سب مجھے سنگسار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

پھر اس صدمے سے میں بیمار ہو گئی' پورے ایک ماہ میں بستر پر رہی۔ بخار تھا کہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ میری طبیعت بہتر ہونے لگی۔ بیماری کے دوران میں نے راحیل کو فون نہیں کیا۔

بخار اتر چکا تھا مگر کمزوری بہت زیادہ تھی۔ امی میرے لیے یخنی بنا کر لائیں اور محبت سے اپنے ہاتھ سے پلانے لگیں' مگر پہلا چمچہ لیتے ہی مجھے زور کی ابکائی آئی اور جی متلانے لگا۔ اس وقت تو اصل بات سمجھ میں نہیں آئی' مگر مسلسل ایسا ہونے سے امی مجھے ایک بار پھر ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے دوائیں دیں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تب ایک دن ڈاکٹر نے میرے کچھ ٹیسٹ کروائے اور رپورٹس دیکھ کر امی سے بولی۔

''آپ ان کی کون ہیں؟''

''میں اس کی امی ہوں۔'' امی نے کہا۔

''کیوں کیا بات ہے خیریت تو ہے؟'' امی نے تشویش سے پوچھا۔

''ہاں سب خیریت ہے' ان کے شوہر کیا ملک

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

سے باہر ہوتے ہیں جو ایک بار بھی ان کے ساتھ نہیں آئے۔“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”شوہر......!“ امی نے حیرت سے کہا انہیں ڈاکٹر کی بات سن کر جھٹکا تو لگا مگر سنبھل کر بولیں۔

”بات کیا ہے آپ مجھے تو بتا دیں۔“

”یہ ماں بننے والی ہیں...... مگر چوں کہ فزیکلی یہ بہت کمزور ہیں۔ اس لیے ان کے لیے ضروری ہدایات دینی تھیں‘ خیر کوئی بات نہیں‘ میں آپ کو ہی سمجھا دیتی ہوں۔“

وہ پتا نہیں کیا کیا کہہ رہی تھیں‘ نہ تو میں کچھ سن رہی تھی اور یقیناً امی کو بھی کچھ سنائی نہیں دے رہا ہوگا‘ وہ خاموش بیٹھی رہی اور خاموشی سے ڈاکٹر کے کلینک سے مجھے لے کر گھر آ گئیں۔ راستے میں بھی انہوں نے مجھ سے نہ تو کچھ پوچھا اور نہ کہا۔

گھر آ کر میں تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ لاک کر دیا اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی‘ جس بات کا مجھے خوف تھا وہی ہوا‘ میں کیا کروں...... راحیل تم نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا‘ اب میں اپنے گھر والوں کو کیا جواب دوں گی۔

امی مسلسل دروازہ بجا رہی تھیں‘ مگر میرے دماغ کی عجیب حالت ہو رہی تھی‘ ڈیپریشن اتنا شدید تھا کہ دماغ شٹ ڈاؤن ہو گیا اور میں بے ہوش ہو گئی۔

باہر امی کے ساتھ ساتھ بھائی بھی آ گئے۔ امی اور بہن رونے لگیں‘ مجھے ہوش ہی کہاں تھا جو دروازہ کھولتی بالآخر کسی نہ کسی طرح لاک کو کھولا گیا اور سب اندر آئے تو میں بے ہوش پڑی تھی۔

بعد میں بھائیوں کو میری اس حرکت پر تشویش ہوئی تو امی نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ بھائی کا تو غصے سے خون کھولنے لگا۔ مگر امی نے انہیں سمجھایا کہ پہلے روہن سے بات کر لو پھر کوئی قدم اٹھانا۔

تقریباً تین چار دن کے بعد میں اس قابل ہوئی کہ کچھ بتا سکوں۔ امی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سب کچھ بتا دیا۔

”اس کو تو تم سے شادی کرنی پڑے گی‘ ورنہ میں اسے جان سے مار دوں گا۔“ میرے بھائی نے کہا۔

”وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تو کیا زبردستی کروائیں گے۔“ میں نے مردہ لہجے میں کہا۔

”ہاں زبردستی ہی کرواؤں گا۔ بس تم مجھے اس کے گھر کا ایڈریس دو۔“ میرے بھائی وقار نے کہا تو میں نے راحیل کے گھر کا محل وقوع اچھی طرح سمجھا دیا۔ بھائی کی سمجھ میں نہیں آیا تو وہ بولا کہ تم میرے ساتھ آؤ اور مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر راحیل کے گھر کی جانب چلا اور گلی کے کونے سے راحیل کا گھر اچھی طرح ذہن نشین کر کے آ گیا۔

”بیٹا! کیا تم اسے اغوا کرو گے‘ دیکھو کوئی غیر قانونی کام مت کرنا‘ میں روہن کی وجہ سے پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ اب تم مجھے کسی اور پریشانی میں مبتلا مت کر دینا۔“ امی نے وقار بھائی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ وقار بھائی کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی‘ وہ گورنمنٹ ملازم تھے اور ایک اونچے عہدے پر فائز تھے اور ان کے تعلقات بہت وسیع تھے۔

”امی آپ فکر نہ کریں‘ سارے کام قانون کے دائرے میں رہ کر ہوں گے اور راحیل کا تو باپ بھی نکاح کرے گا۔“ وقار بھائی نے دانت پیستے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر چلے گئے پھر کسی کو فون کیا اور باہر چلے گئے‘ رات کو نو بجے کے قریب گھر آئے اور مجھے اور امی کو اپنے ساتھ لے کر کہیں جانے لگے‘ امی نے پوچھا کہ کہاں لے جا رہے ہو‘ تو اطمینان سے بولے۔

”پولیس اسٹیشن......“

”ارے یہ کیا کر دیا تم نے...... کیا راحیل کے

خلاف ایف آئی آر کٹوا دی‘ ارے بیٹا پولیس تھانہ کورٹ...... تمہیں کچھ اندازہ ہے‘ ان سب چکروں میں کتنی رسوائی ہوگی ہماری...... جس کو نہیں پتا ہے اسے بھی پتا چل جائے گا‘ آج کل ٹی وی چینل پر معمولی معمولی خبر بھی آ جاتی ہے‘ ہمیں نہیں جانا تھانے‘ تم گاڑی واپس گھر کی جانب موڑ لو۔“ امی نے برہمی سے کہا۔

”جیسا آپ سمجھ رہی ہیں ایسا کچھ نہیں ہے‘ آپ بس دیکھتی تو جائیں۔“ وقار بھائی نے گاڑی مسلسل آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

پولیس اسٹیشن کی عمارت کے اندر قدم رکھتے ہوئے میں بُری طرح لرز رہی تھی‘ پتا نہیں وقار بھائی کیا کرنے والے ہیں۔

ہم وقار بھائی کے ہمراہ اندر پہنچے تو مجھے اور امی کو ایک دوسرے روم میں بٹھوا دیا گیا اور وقار بھائی اے ایس پی کے روم میں بیٹھ گئے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اے ایس پی وقار بھائی کے دوست کا بھائی ہے۔

ہمارے وہاں پہنچنے کے تقریباً بیس منٹ کے بعد ہی پولیس موبائل میں بٹھا کر پولیس والے راحیل کے ابا اور دونوں بھائیوں کو جو گھر پر موجود تھے تھانے لے آئے اور یہ پیغام دے دیا کہ راحیل گھر آئے تو اسے تھانے بھیج دینا۔

اے ایس پی صاحب نے مجھے اپنے روم میں بلوایا اور کہا کہ یہ لڑکی وہ ہے جس سے راحیل نے محبت کا ناٹک کیا شادی کا جھوٹا وعدہ کیا اور اب یہ بنا نکاح کے اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔

پہلے تو اس کے ابا خاموش رہے پھر بولے ”ہاں میں نے اس لڑکی کا اپنے گھر میں ذکر سنا تھا‘ یہ تو خود راحیل کے پیچھے پڑی تھی‘ اگر یہ شریف لڑکی ہوتی تو ایسا ہونے نہ دیتی‘ اس سے پوچھیں کہ راحیل نے زبردستی کی تھی یا پھر اس کی مرضی شامل تھی......“

ان کی بات ٹھیک تھی‘ انہوں نے ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا مگر بہرحال جو کچھ بھی ہوا اس کا حل سیدھا سادا تو یہی ہے کہ راحیل مجھ سے نکاح کرے‘ مگر راحیل تو راحیل اس کے ابا بھی راضی نہیں ہو رہے تھے۔

”ٹھیک ہے جب تک راحیل گرفتاری نہیں دے دیتا ان تینوں کو لاک اپ میں ڈال دو‘ اس کی گرفتاری ہو جائے تو اس کی ایف آئی آر کاٹ دیتے ہیں۔ حدود اور زنا بالجبر کا مقدمہ اور دھوکا دہی کا مقدمہ بنا کر چالان بنا کر کورٹ میں پیش کر دیں گے۔ پھر کورٹ جو فیصلہ چاہے وہی کرے گا‘ لڑکی کی زندگی تو برباد ہو چکی ہے پھر لڑکا کیوں آزادی سے اپنی خوشیاں منائے‘ یہ کام دونوں کی مرضی سے ہوا ہے تو سزا بھی دونوں ہی بھگتیں۔“

اے ایس پی صاحب سے یہ سن کر کانسٹیبل نے ان تینوں کو لاک اپ میں ڈال دیا‘ ہم لوگ ابھی تک تھانے ہی میں تھے‘ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد راحیل تھانے آ گیا‘ اس کی نگاہ جیسے ہی میرے اوپر پڑی اس کے تیزی سے بڑھتے قدم ایک دم رُک گئے اور اس کے چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی۔

”روہن تم...... یہاں......!“ اس کے منہ سے بہ مشکل نکلا مگر میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

راحیل لاک اپ کے سامنے سے گزرا تو اس کے والد نے اسے آواز دی اور بے نقط سنانی شروع کر دیں اس کے دونوں بھائی بھی صلواتیں سنا رہے تھے۔

”ناخلف‘ نا ہنجار تجھے پال پوس کر اس دن کے لیے جوان کیا تھا کہ تو ہمیں زمانے میں ذلیل کرنے

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

والے کام کرتا پھرے' دیکھ لے آج تیری وجہ سے میرے باعزت اور اُجلے دامن پر جیل کا دھبا پڑ گیا ہے۔ اب تیرے اوپر ایک نہیں کئی مقدمے بنیں گے' سڑتے رہنا زندگی بھر جیل میں....." اتنا کہہ کر اس کے والد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

"ابو آپ میری بات تو سنیے۔" راحیل نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

"خبردار جو مجھے ابو کہا' آج مر گیا تیرا ابو' مار دیا تو نے اسے....." انہوں نے اسے زور سے دھتکار دیا۔

راحیل کے ابو کی آوازیں سن کر اے ایس پی صاحب روم سے باہر نکل آئے اور کانسٹیبل سے کہا کہ ان کو لاک اپ سے باہر نکال کر میرے کمرے میں لاؤ۔

کمرے میں لانے کے بعد انہیں پانی وغیرہ پلایا گیا۔ پھر راحیل کے آگے ساری بات رکھی کہ تمہارے سامنے دو چوائسز ہیں۔ نمبر ایک کورٹ میں مقدموں کا سامنا کرو..... یا پھر لڑکی سے نکاح کرلو.....

"راحیل کو نہ جانے کیا ہوا کہ میرے پیر پکڑ کر رونے لگا کہ پلیز مجھے معاف کردو۔"

"بیٹا خالی خولی معافی تو تمہیں نہیں ملے گی' اگر کورٹ کچہری سے بچنا چاہتے ہو تو نکاح کرلو....."

اے ایس پی صاحب نے کہا تو راحیل نے اپنے والد کی جانب دیکھا تو وہ بولے۔

"تم اس سے نکاح کرلو.....!"

"میں نکاح کرنے کے لیے تیار ہوں....." راحیل نے سر جھکا کر مردہ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے تو ابھی یہ کام ہوگا۔" اے ایس پی صاحب نے کہا۔

"کیا مطلب ہے صاحب' ہم نے کہہ تو دیا ہے کہ شادی کردیں گے تو پھر.....!" اس کے والد نے چونک کر کہا۔

"نہیں جناب نیک کام میں تاخیر کیسی اور ویسے بھی مجھے آپ کے دھوکے باز بیٹے کا کوئی بھروسا بھی نہیں ہے' نکاح ابھی اور اسی وقت تھانے میں ہی میرے سامنے ہوگا۔" اے ایس پی صاحب نے حتمی لہجے میں کہا تو کوئی کچھ نہیں بولا۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد نکاح خواں اپنے رجسٹر سمیت تھانے میں آیا اور رات کے ڈھائی بجے تھانے میں میرا نکاح راحیل کے ساتھ ہوا' حق مہر پانچ لاکھ روپے مقرر ہوا۔ نکاح کے بعد اے ایس پی صاحب نے کہا کہ فوراً اس کو رخصت کرکے اپنے گھر لے جانے کی تیاریاں کرو' اگر کوئی آنا کانی کی یا لڑکی کے ساتھ ظلم و ناانصافی کی تو تم سمجھ سکتے ہو کہ میں کیا نہیں کرسکتا۔

جس طرح میرا نکاح ہوا تھا یہ بات تو میں نے اور میرے والدین نے خواب میں بھی نہیں سوچی تھی۔ شاید یہی میری قسمت میں لکھا تھا۔

نکاح کے بعد میرے سسر یعنی راحیل کے والد میری امی سے بہت معذرت کرنے لگے کہ اگر واقعی ایسی ہی گمبھیر صورت حال تھی تو آپ کو کم از کم مجھ سے ایک ملاقات تو ضرور کرنی چاہئے تھی۔ یہ جو کچھ اور جس طرح سے ہوا ہے' نہیں ہونا چاہئے تھا راحیل نے غلطی کی تھی تو میں اسے سمجھاتا۔

"مگر بھائی صاحب راحیل نے روبن سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا اور آئندہ ملنے سے بھی منع کردیا تھا' اس نے بتایا تھا کہ وہ منگنی شدہ ہے اور اپنی منگیتر سے ہی شادی کرے گا کیوں کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو ہم روبن کو اسے بھولنے کے لیے کہتے مگر اب جب ان دونوں کی غلطی رسوائی بن کر سامنے آنے والی ہے تو اس سچویشن میں ہم اور کیا کرتے۔" امی نے کہا۔

"چلیں جو کچھ ہوا سے ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھول جائیں آپ روبن بیٹی کو گھر لے جائیں اب یہ ہماری امانت ہے آپ کے پاس' اپنے گھر والوں کو میں سمجھالوں گا اور باعزت طریقے سے سیکڑوں کے مجمع میں اس کو اپنی بہو بنا کر رخصت کرکے لاؤں گا۔" راحیل کے والد نے گہری متانت سے کہا' وہ یقیناً ایک بہت سمجھدار اور شریف انسان تھے۔

پھر مجھے نہیں معلوم کہ گھر جا کر انہوں نے کس طرح اپنے گھر والوں کو ساری بات سمجھائی اور منوائی' دوسرے ہی روز راحیل کے والدین ہمارے گھر آئے اور شادی کی تاریخ اگلے پندرہ دن کے بعد طے کرکے چلے گئے۔

میں تو جیسے دوبارہ سے جی اٹھی' گھر میں زور و شور سے شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور ہال بک کروایا' باقاعدہ سارے مہمان بلائے گئے' میری بارات آئی اور امی نے ڈھیر سارا جہیز دے کر مجھے رخصت کیا۔

سہاگ رات کو راحیل نے مجھ سے بہت معافی مانگی اور زندگی بھر باوفا رہنے کا وعدہ کیا' ورنہ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ جس طرح ہمارا نکاح ہوا ہے' اللہ جانے راحیل میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اب اس کے دل میں' حقیقت میں کیا تھا میں اس سے واقف نہیں تھی۔

بہت سے رشتہ داروں کو یہ بات پتا بھی چل گئی مگر کسی نے میرے آگے اس کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی میرے سسرال والوں نے میرے ساتھ خراب رویہ رکھا۔

میں نے راحیل سے کہا کہ میں اپنی ڈیوٹی دوبارہ جوائن کرنا چاہتی ہوں۔" تو اس نے کہا کہ امی ابو سے اجازت لے لو' جب میں نے ان سے بات کی تو انہوں نے تھوڑا پس و پیش کیا مگر پھر یہ کہہ کر اجازت دے دی کہ تم اپنا خیال رکھنا آج تک ہماری کسی بہو بیٹی نے ملازمت نہیں کی ہے۔

میں نے تو پہلے بھی اپنی عزت کا خیال رکھا تھا مگر راحیل کو دیکھ کر دل کے ہاتھوں مجبور ہوگئی تھی' پتا نہیں یہ میری غلطی تھی یا میرے نصیب میں راحیل ہی لکھے تھے۔

اس چھوٹے سے گھر کے ایک اسٹور نما کمرے میں رہنا بہت مشکل تھا' حد یہ کہ بیڈ روم سیٹ کمرے میں رکھنے کے بعد بہ مشکل چلنے پھرنے کی گنجائش نکلتی تھی' دوسرے وہ ایک لوئر مڈل کلاس سوسائٹی تھی' میں جب بھی ڈیوٹی پر جانے کے لیے باہر نکلتی تھی تو محلے والے عجیب عجیب نگاہوں سے مجھے گھورنے لگتے۔

ایک اور اہم بات یہ کہ یہاں گھر کے سارے کام عورتیں کرتی تھیں اور میں نے نہ تو کبھی گھر کے کام کیے اور نہ مجھے کرنے آتے تھے۔ کچن کی تو میں نے شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ جب امی نے میرے ذمہ کام لگایا تو میں نے کہا کہ مجھے کوئی کام کرنا نہیں آتا تو انہوں نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا "جو کام تمہیں

اقوالِ زریں

- اپنی خوشی کے لیے دوسروں کی مسرت خاک میں نہ ملاؤ۔
- جو شخص زیادہ سوچتا ہے' وہی سب سے زیادہ کام کرتا ہے۔
- دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک غصہ جوانی کا ہے۔
- دوسروں کے خیالات کی قدر کریں اور کسی سے یہ نہ کہیں کہ وہ غلطی پر ہے۔
- طاقت سے دشمن پر فتح پانا ادھوری فتح ہے۔

(ریاض بٹ..... حسن ابدال)

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

کرنے آنے چاہئیں وہ تمہاری ماں نے نہیں سکھائے اور جن کاموں سے تمہیں روکنا چاہئے تھا ان کی تمہیں خوب کھلی چھوٹ دے دی....."

امی کی باتیں سن کر میں الرٹ ہوگئی کہ آج تو انہوں نے یہ بات کہہ دی ہے کل کچھ اور کہیں گی اور پھر سارے گھر والے شروع ہو جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ وقت آنے سے پہلے ہی میں اپنا دوسرا بندوبست کرلوں۔

میں نے بھائی کو فون کیا کہ میرا فلیٹ کرائے داروں سے خالی کروائیں۔ میرا فلیٹ ائرپورٹ کے نزدیک ہی نئی آباد ہونے والی سوسائٹی میں تھا۔

بھائی نے فلیٹ خالی کروالیا' تب میں نے راحیل سے بات کی کہ اب ہمیں اپنے فلیٹ میں شفٹ ہو جانا چاہئے اور امی کی کہی گئی ساری باتیں ان کے آگے دُہرائیں اور اپنے اندیشے بھی ظاہر کیے۔

"جیسا تم مناسب سمجھو وہی کرو۔" راحیل نے بے نیازی سے جواب دیا' جب سے ہماری شادی ہوئی تھی' راحیل زیادہ تر سنجیدہ ہی رہتے تھے۔ مجھ سے صرف کام کی بات کرتے تھے' البتہ ڈاکٹر سے چیک اپ کے لیے پابندی سے لے جاتے رہے' جب میں نے اپنی ساس کو اپنے فلیٹ میں شفٹ ہونے کے بارے میں بتایا تو وہ بولیں۔

"بیٹا تم دوسرے جی سے ہو' جب تک بچے کی پیدائش نہیں ہو جاتی تم یہیں رہو' وہاں تنہا رہو گی' تیسری منزل سے سیڑھیاں چڑھو اُترو گی تو کوئی بھی مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے اور پھر تمہیں کسی کے سہارے کی ہر وقت ضرورت رہے گی راحیل بھی ایک ایک ہفتے کے لیے گھر سے باہر رہتا ہے۔"

"امی میں سب Manage کرلوں گی۔" میں نے امی سے کہا تو وہ بولیں کہ بھئی ہمارا کام تو تمہیں سمجھانا تھا' اب جو تمہارا دل چاہے وہی کرو۔ تو میں مطمئن ہوگئی اور ان دنوں جب راحیل بھی گھر پر تھے اور میری بھی چار دن تک کوئی فلائٹ نہیں تھی میں نے شفٹنگ کا پروگرام بنالیا۔ راحیل بالکل خاموشی سے جو میں کہتی گئی وہ کرتے گئے' میں ان کی اس خاموشی کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ میں نے جس طرح سے انہیں حاصل کیا تھا وہ اس بات سے شاید خوف زدہ تھے' میں یہ بات بھی نہیں بھولی تھی کہ وہ اپنی منگیتر سے محبت کرتے تھے' مگر میں نے سوچا کہ جب ہم علیحدہ فلیٹ میں رہیں گے تو ہمارے درمیان کوئی دوسرا موجود نہیں ہوگا اور میں اپنی بے پناہ محبت اور چاہت سے راحیل کا دل جیت لوں گی اور انہیں اپنا لوں گی۔

گھر کی شفٹنگ کے دوران میں بہت زیادہ تھک گئی تھی میری طبیعت بھی خراب ہوگئی تو راحیل نے مجھے مکمل آرام کرنے کے لیے کہا۔

میرا فلیٹ تھرڈ فلور پر تھا اور یہاں لفٹ بھی نہیں تھی اس لیے بہت زیادہ سیڑھیاں اُترنا اور چڑھنا پڑتی تھیں۔ میری ڈیوٹی کا دن آیا تو راحیل نے مجھے منع کیا کہ ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم چھٹی لے لو۔ مگر میں نے ان کا کہنا نہ مانا اور ڈیوٹی پر چلی گئی۔ میری واپسی تین دن کے بعد ہوئی۔ میں نے اپنے نئے گھر کی سجاوٹ کے لیے خوب شاپنگ کی اور بازاروں میں خوب گھومی پھری' میں اپنی طبیعت خراب محسوس کرتو رہی تھی مگر سوچا کہ اب گھر جا کر ہی آرام کروں گی۔

میں یہ سارا سامان لے کر جب فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تب دوسرے فلور کی سیڑھیوں پر مجھے زبردست چکر آنے لگے' میں نے اپنے آپ کو لاکھ سنبھالنا چاہا مگر سنبھال نہ سکی' میرا جیسے دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ٹانگیں لرزنے لگیں اور میرے ہاتھوں سے شاپرز نیچے گر گئے اور ساتھ ہی میں بھی سیڑھیوں سے

لڑھکتی ہوئی نیچے آگئی میرے لبوں سے ایک طویل چیخ نکلی اور پھر مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔

مجھے جب ہوش آیا تو میں اسپتال کے بیڈ پر تھی اور اپنی زندگی میں آنے والی سب سے بڑی خوشی سے محروم ہو چکی تھی۔ مجھے بہت زیادہ کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ میرے جسم سے بہت زیادہ خون بہہ چکا تھا اور میری جان بہ مشکل بچ سکی ہے میں ایک ہفتہ اسپتال میں رُکی' پھر میری ساس مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئیں۔ میرا آپریشن بھی ہوا تھا اور اس آپریشن نے مجھے ہمیشہ کے لیے ماں بننے سے محروم کر دیا تھا' میں آئندہ ماں بننے کی صلاحیت سے ہی محروم ہوگئی تھی۔ ایسا کرنا میری جان بچانے کے لیے ضروری تھا' کیوں کہ میرے جسم میں زہر پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔

سب نے میری بہت دل جوئی کی میرا خیال رکھا' وہ وقت بھی گزر گیا ہے آج اس سانحے کو گزرے پورے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ میں نے ائرلائن کی جاب بھی چھوڑ دی ہے' بس گھر میں پڑی رہتی ہوں۔ میری دونوں نندوں کی شادی ہو چکی ہیں۔ میرا کام دن بھر گھر کے کام کرنا اور جیٹھ کے بچوں سے دل بہلانا ہے' میرے اپنے اکاؤنٹ میں کافی رقم ہے۔ جو بچوں پر خرچ کرتی ہوں۔ فلیٹ کو دوبارہ میں نے کرائے پر دے دیا ہے' راحیل پہلے سے بھی زیادہ خاموش رہنے لگے ہیں۔ ان کی خاموشی اور اُداسی دیکھ کر میں نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ اپنی سابقہ منگیتر سے جس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے' شادی کرلیں۔ مگر راحیل ملامت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لیتے ہیں اور بناء کوئی جواب دیئے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ میں سمجھ جاتی ہوں کہ خاموش نگاہوں سے وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں یہی کہ اب ان کی منگیتر جو کبھی تھی اسے ان کی محبت کا یقین نہیں رہا' کیوں کہ انہوں نے اس کی امانت میں خیانت کرتے ہوئے ایک کنواری کو بناء بیاہے ماں بنا دیا۔

میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ میں نے اس محبت کے کھیل میں کیا حاصل کیا۔ اپنا سب کچھ گنوا دیا' ہمیشہ کے لیے اُبھاگن بن گئی' راحیل کو حاصل کر کے بھی پا نہ سکی' ہم دونوں ساتھ تو چل رہے ہیں مگر مل نہیں سکے۔ کبھی سوچتی ہوں کہ محبت میں' میں اتنی خود غرض بن گئی کہ کسی کا کہنا نہ مانا' اگر اس دن میں اپنی ساس کی بات مان لیتی۔ یا راحیل کی بات مان لیتی تو وہ سب نہ ہوتا' اب سوائے پچھتاووں کے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں کسی کو کوئی نصیحت نہیں کروں گی' کیوں کہ میری کہانی پڑھنے والے خود ہی سمجھ جائیں گے کہ میں نے اپنی زندگی میں کیا کیا غلطیاں کی ہیں۔ اپنی کہانی بیان کرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ مجھ جیسی سوچ رکھنے والی احمق لڑکیاں سنبھل جائیں۔ آپ سب سے التماس ہے کہ میرے لیے دعا ضرور کیجئے گا کہ مجھے سکون مل جائے' اللہ تعالیٰ سب کو صراطِ مستقیم پر چلائے (آمین)۔

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

رشتہ

محترم عمران احمد قریشی
امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

محبت کے نرم و نازک دھاگوں سے بندھی رشتوں کی ایک مضبوط مالا کے ساتھ حاضر ہوں کہتے ہیں جذبات کے گھنے اور سایہ دار درخت کو عمر کی آری کبھی نقصان نہیں پہنچا سکتی کیونکہ یہ کبھی مرتے ہیں نہ ان میں کمی آتی ہے۔ یہی اس کہانی کا پیغام ہے جو یقیناً آپ کو اور قارئین کو پسند آئے گا۔

ایم الیاس
کراچی

زیبا اپنی شادی کے پندرہ دنوں کے بعد آج پہلی بار اپنے گھر والوں سے ملنے آئی تھی۔ اسے دیکھ کر مسعود کو ایسا لگا جیسے وہ پورے پندرہ مہینوں کے بعد آئی ہو۔

وہ اسے آج بھی دیکھ کر اس روز کی طرح چونک گئے وہ کسی تروتازہ پھول کی مانند مہک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے حد کشش آ گئی تھی چہرے پر حیا کی دمک نے اسے نکھار دیا تھا۔

زیبا شادی کے پندرہ دنوں کے بعد بھی پہلے دن کی طرح دلہن لگ رہی تھی۔ نیلے رنگ کی بنارسی ساڑی میں ملبوس وہ کسی نئی نویلی دلہن کی طرح شرمائی' لجائی اور سکڑی سمٹی کھڑی تھی۔ زیبا ان سے اور ان کے گھر والوں سے ملنے آئی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ جھجکے جھجکے ان کی طرف اس طرح بڑھی جیسے اس کی راہ میں کوئی چیز مانع ہو وہ ان کے قریب پہنچ کر رکی۔ اس نے اپنا جھکا ہوا خوش نما سر اور لانبی پلکوں کی چلمن اوپر اُٹھائی انہوں نے زیبا کے شانے تھام لیے اور اس کی صاف و شفاف جھیل جیسی گہری اور بے حد سیاہ آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ پھر انہوں نے بے اختیار زیبا کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ جیسے ان کے دل کے کسی کونے میں یہ خواہش نہ جانے کب سے تھی۔ یہ جو جذبہ پیدا ہوا تھا ان کے دل میں کیوں اور کیسے وہ خود نہیں جانتے تھے۔

☆☆.....☆☆

شادی کے دس سال کے بعد جب ان کے ہاں تین بچے ہو گئے تو گھر میں ایک نوکرانی کی ضرورت محسوس ہونے لگی اس لیے بھی کہ وہ دو کمروں کے فلیٹ سے نکل کر لگژری فلیٹ میں آ گئے تھے۔ اس میں تین تو بیڈ روم تھے ایک ڈرائنگ ڈائننگ اور فی وی لاؤنج بھی تھا اور پھر ایک سرونٹ روم بھی تھا۔ اتنا بڑا فلیٹ ان کی بیگم کے بس کا نہیں تھا۔ یہاں جو عورتیں فلیٹوں میں کام کرنے آتی تھیں ان کے نخرے بہت زیادہ تھے اور پیسے بھی بہت زیادہ مانگتی تھیں۔ کام بھی ان کی پسند اور مطلب کا نہیں کرتی تھیں۔ ان کی بیگم دو تین عورتوں کا کام پرکھ کر جواب دے چکی تھیں۔ وہ ایک اچھی ملازمہ کے لیے سخت پریشان تھیں گھر کے کام کاج کے لیے ملازم لڑکے بھی مل جاتے تھے' مگر ان کی بیگم ان لڑکوں کو کام پر رکھنے کے حق میں نہیں تھیں۔ جیسے تیسے کر کے دن گزر رہے تھے۔

وہ کبھی کبھی بیگم کو چھیڑتے تھے۔ ''ملازمہ کا مسئلہ ایک طرح سے حل ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' ان کی بیگم پُر اشتیاق لہجے میں پوچھتیں۔

''وہ ایسے کہ میں دوسری شادی کر لوں۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتے۔ ''دوسری شادی کے لیے ایک عورت کا ملنا آسان ہے مگر گھر کے لیے ملازمہ کا ملنا بہت مشکل ہے۔ دوسری بیوی آئے گی تو وہ نہ صرف تمہاری خوب خدمت کرے گی بلکہ گھر کا سارا کام کاج سنبھال لے گی۔''

ان کی بیگم چڑ جاتیں جیسے وہ واقعی سنجیدہ ہوں۔ ''میں خوب سمجھتی ہوں آپ کا دل مجھ سے بھر گیا ہے۔ اگر آپ کے دل میں دوسری شادی کی حسرت ہے تو شوق سے شادی کر لیں میری طرف سے پوری پوری اجازت ہے' لیکن ایک بات کان کھول کر سن لیں میں اس چڑیل کو اپنے ساتھ اس گھر میں نہیں رکھوں گی۔''

وہ بیگم کی خفگی کو دور کرنے کے لیے انہیں اپنے بازوؤں میں بھر لیتے۔ ''ایک ہی شادی کر کے آج تک پچھتا رہے ہیں کیا ساری زندگی کے لیے ایک روگ کافی نہیں ہے جو دوسرا روگ پال لوں۔''

ایک روز شام کے وقت ایک تیس سال کی عورت آئی تو اس کے ساتھ ایک نو دس سال کی ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ ان کے ایک دوست کا خط لے کر آئی تھی۔ عورت کی وضع قطع اور چہرے مہرے ہی سے لگ رہا تھا کہ وہ بڑی پریشان حال عورت ہے۔ غربت اور تنگ دستی ماں بیٹی کے میلے کچیلے لباس سے ظاہر تھی۔ وہ کام کی تلاش میں تھی۔ وہ عورت ان کی بیوی سے بات کرنے لگی تو انہوں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو انہیں بڑی مرعوب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ انہوں نے بہت کم لڑکیوں میں ایسی معصومیت دیکھی تھی۔ اس چیز نے انہیں بڑا متاثر کیا تھا۔ انہوں نے اسے اشارے سے بلایا تو وہ ان کے سامنے آ کر مودبانہ انداز سے کھڑی ہو گئی تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''زیبا!'' اس نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

''اسکول میں پڑھتی ہو؟''

صرف دو جماعتیں پڑھی ہیں۔''

''صرف دو جماعتیں کیوں؟'' وہ حیرت سے بولی۔ ''تمہیں تو چوتھی یا پانچویں جماعت میں ہونا چاہیے تھا۔''

''اماں نے پڑھنے نہیں دیا۔'' وہ اپنی ماں کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''دو جماعت پڑھتے ہی اسکول سے نکال لیا۔''

''وہ کس لیے۔''

''وہ کہتی ہیں کہ تعلیم غریب کے بچوں کے لیے نہیں ہوتی ہے۔'' اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ ''تعلیم حاصل کرنا امیروں کے بچوں کا حق ہے۔''

معلوم نہیں کیوں اس معصوم سی بچی کا جواب ان کے سینے میں کسی پھانس کی طرح گڑ گیا۔ اس کی ماں بیوی سے بات کر کے فارغ ہوئی تو انہوں نے اس سے کہا۔ ''آج کل تو تعلیم مفت ہے۔ سرکاری اسکولوں کی کوئی کمی نہیں ہے پھر تم نے اپنی بچی کو کیوں نہیں پڑھایا؟''

''آپ سچ کہتے ہیں صاحب جی!'' وہ کسی مجرم کے انداز میں سر جھکا کر بولی۔ ''کتابیں' کاپیاں تو مفت نہیں ملتی ہیں اور نہ سستی ہیں۔ گزر اوقات ہی مشکل سے ہوتی ہے بیٹی کو پڑھا لوں یا پیٹ کو ایندھن سے بھر لوں۔ جاہل تو رہا جا سکتا ہے بھوکا نہیں۔''

دوسرے دن زیبا اور اس کی ماں عافیہ ان کے پاس مستقل طور آ گئیں۔ ماں' بیٹی کو سرونٹ روم دے

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

دیا گیا تھا۔ شرائط یہ طے ہوئی تھیں کہ ماں بیٹی اس گھر میں دن رات رہیں گی۔ دونوں کو نہ صرف تینوں وقت کا کھانا ملے گا بلکہ کپڑے لتے بھی دیے جائیں گے اور اس گھر سے سوا انہیں اور کام نہیں کریں گی۔ انہیں ڈیڑھ سو روپے مہینہ دیا جائے گا۔ عافیہ نے ان کی بیوی کی شرائط قبول کر لی تھیں۔ اس طرح ان کی بیگم کی پریشانی اور سب سے بڑا مسئلہ بڑی آسانی سے غیر متوقع طور پر حل ہو گیا تھا۔

انہیں لڑکی کی بڑی خواہش تھی۔ تیسری مرتبہ ان کی بیوی امید سے ہوئی تھی تب انہوں نے اور ان کی بیوی نے بڑی دعائیں مانگی تھیں کہ خدا انہیں ایک بیٹی دے دے اس لیے کہ ان کے دو لڑکے تھے' مگر قدرت نے ان کی کوئی دعا قبول نہیں کی۔ ان کے ہاں تیسری اولاد بھی لڑکا ہی تھا اب چوتھے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ لہٰذا اب صبر و شکر کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔

زیبا اس گھر میں آئی تو انہیں ایسا لگا تھا کہ کسی حد تک یہ کمی پوری ہو گئی ہے۔ لیکن وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا اپنا خون نہیں ہے اپنی اولاد نہیں ہے یہ ان کی ملازمہ کی بیٹی ہے اس کی رگوں میں کسی اور کا خون دوڑ رہا ہے۔ اس کے اور ان کے درمیان ایک فاصلہ ہے مگر کچھ بھی ہو اس گھر میں ایک بچی کی آواز تو گونجنے لگی تھی۔

ماں اور بیٹی کے پاس اتنے اچھے اور صاف ستھرے کپڑے نہیں تھے۔ جو انہیں پہن سکیں ان کی بیوی نے عافیہ کو تو اپنے پرانے جوڑوں میں سے کچھ جوڑے دیے تھے۔ زیبا کے لیے ایک مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ انہوں نے حل کر دیا اس کے لیے کچھ جوڑے خرید لائے تھے۔ ان کپڑوں میں زیبا اچھی اور بہت پیاری لگنے لگی تھی۔

وہ زیبا کا اپنے بچوں کی طرح خیال رکھتے تھے۔ اپنے بچوں کے لیے ٹافیاں' بسکٹ' اور آئس کریم لاتے تو اس میں زیبا کا بھی حصہ ہوتا تھا۔ عید اور تہواروں پر اس کے لیے بھی کپڑے لاتے رہتے تھے۔ جب کبھی وہ بیوی بچوں کو سیر و تفریح کی غرض سے لے جاتے تھے زیبا بھی ساتھ ہوتی تھی۔ ان کی بیوی نے انہیں کبھی ٹوکا نہیں اور نہ ہی معاملات میں دخل دیا تھا انہیں ان کے جذبات و احساسات کا اندازہ تھا۔ وہ بھی زیبا کو پسند کرتی تھیں اس نے کبھی ان کی چاہتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ عافیہ کام میں بڑی تیز تھی ہر کام بڑی پھرتی اور صفائی سے کرتی تھی۔ زیبا بھی ماں کا ہاتھ بٹاتی رہتی۔ میاں بیوی کو کبھی ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

پانچ چھ سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا تھا۔ ان برسوں میں عافیہ اور زیبا اس گھر کے ایک فرد کی طرح بن کر رہ گئی تھیں۔ ماں بیٹی کی مستعدی اور فرض شناسی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور نہ ہی ان دونوں نے مراعات سے فائدہ اٹھا کر اپنی اوقات بھولنے کی کوشش کی تھی وہ ایک حدود میں رہتی تھیں۔ اب ان دونوں اور اس گھر کے درمیان ایک ایسا مستحکم رشتا قائم ہو گیا تھا۔ جس میں انسیت کا زیادہ دخل تھا یہ رشتا ٹوٹ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی اس جذبے پر کوئی آنچ آ سکتی تھی۔ اس کی اصل وجہ ان کی سمجھ میں جو آئی تھی وہ یہ تھی کہ عافیہ محبت کی بھوکی تھی۔ اس کا اس دنیا میں چند رشتے داروں کے سوا کوئی نہیں تھا اس گھر میں اسے محبت ملی۔ اس محبت نے اس کا دل جیت لیا تھا۔

چھ برسوں میں پہلی بار عافیہ نے ان کی بیوی سے پانچ دنوں کی چھٹی مانگی تھی۔ ”بیگم صاحبہ! آپ

اجازت دیں تو چار پانچ دن کے لیے حیدر آباد ہو آؤں۔“ رشتے داروں سے مل آؤں۔“

ان کی بیوی نے بخوشی اجازت دے دی۔ ”چھ دن کیا چھ سال کے بعد تو جا رہی ہو دس پندرہ دن تو رہ کر آؤ' میرے نزدیک تو تمہیں سال میں ایک مرتبہ ضرور ملنے جانا چاہیے۔“

”میں چار پانچ دن میں ہی آنے کی کوشش کروں گی۔“ وہ بولی۔ ”میں اکیلی جا رہی ہوں زیبا یہاں رہے گی تاکہ آپ لوگوں کو میری غیر حاضری سے تکلیف نہ ہو۔“

دوسرے دن زیبا کو چھوڑ کر عافیہ اکیلی ہی حیدر آباد چلی گئی۔ اس روز وہ شام کے وقت دفتر سے گھر پہنچے تو انہوں نے اپنی بیوی عطیہ کو بے حد پریشان اور متفکر پایا۔ وہ صرف پریشان ہی نہیں تھی بلکہ ان کی آنکھیں نم ناک بھی تھیں۔ وہ گھبرا گئے۔ ”عطیہ! خیریت تو ہے؟“

”خیریت ہی تو نہیں ہے۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

”ابو کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے لاہور سے امی کا فون آیا تھا“

”تم نے مجھے ٹیلی فون کر کے اطلاع کیوں نہیں دی؟“

”میں نے دفتر فون کیا تھا تو پتا چلا کہ آپ دفتر سے نکل چکے ہیں۔“

”میں تو..... تمہارے ساتھ چل نہیں سکوں گا۔“ وہ کہنے لگے۔ ”میرے دفتر میں بہت کام ہے اور شاید ہی چھٹی مل سکے۔ تم ایسا کرو رات کی فلائٹ سے بچوں کو ساتھ لے کر چلی جاؤ۔ لاہور پہنچ کر ٹیلی فون پر ان کی خیریت کی اطلاع دینا میں چھٹی کی کوشش کرتا ہوں جیسے ہی چھٹی ملے گی میں بھی آجاؤں گا۔“

”زیبا کا کیا کریں گے؟“ عطیہ نے پوچھا۔

”اپنے ساتھ لیتی جاؤ۔“ انہوں نے کہا۔

”میں ساتھ لے جاؤں تو پھر آپ کو تکلیف ہو جائے گی۔ عطیہ بولی۔ ”تین چار دن میں عافیہ تو آنے والی ہے۔ آپ کو آنے میں تین چار دن تو لگ جائیں گے اس وقت تک وہ بھی حیدر آباد سے آجائے گی۔“

وہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ لینے پی آئی اے کے دفتر چلے گئے۔ رات کی فلائٹ کے ٹکٹ مل گئے۔ ان کی بیگم نے تیاری کی اور وہ بیگم اور بچوں کو ائر پورٹ چھوڑنے گئے تو زیبا بھی ساتھ تھی۔ وہ دونوں طیارہ اڑنے تک ائر پورٹ پر ہی رہے تھے۔ واپسی پر انہوں نے ایک اسٹاپ پر گاڑی روک کر آئس کریم اور فالودہ کھایا تھا۔ رات گھر پہنچے تو ایک بج رہا تھا۔ زیبا تو اپنے سرونٹ روم میں سونے چلی گئی وہ اپنے بیڈ روم میں آ گئے۔ انہیں مطالعے کی عادت شادی سے پہلے ہی سے تھی اور یوں بھی انہیں بیگم کے ٹیلی فون کا انتظار تھا۔

رات تین بجے ان کی بیگم کا ٹیلی فون آیا کہ ان کے ابو خطرے سے باہر ہیں اور خیریت سے ہیں انہیں چھٹی لے کر آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تین چار دن رک کر واپس آجائیں گی۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس لیے بھی کہ دفتر سے چھٹی ملنا بہت ہی مشکل تھا۔ ان کی بیگم کے ابو کو کچھ ہو جاتا تو انہیں بھی صدمے سے دوچار ہونا پڑتا اس لیے کہ ان کی بیگم خالہ زاد تھیں۔ وہ اپنے خالو کو چاہتے بھی بہت تھے۔

صبح وہ نیند سے بے دار ہوئے۔ نہا کر غسل خانے سے نکلے تو زیبا نے ان کے لیے ناشتا تیار کر

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

کے میز پر رکھ دیا تھا۔ ناشتا کر کے انہوں نے کپڑے بدلے پھر انہیں زیبا کا خیال آیا کہ وہ اتنے بڑے فلیٹ میں اکیلی گھبرائے گی تو نہیں؟ پھر اسے بلا کر انہوں نے پوچھا۔ ”تمہیں اکیلے میں ڈر تو نہیں لگے گا؟“

”نہیں۔“ زیبا نے بے خوفی سے جواب دیا۔

”اماں اور بیگم صاحبہ کئی بار مجھے گھر پر اکیلی چھوڑ کر گئی ہیں۔“

”وہ ایک گھنٹے کے لیے گئی تھیں۔“ وہ بولے۔ ”تمہیں آج پورے نو دس گھنٹے اکیلی رہنا ہوگا۔“

”آپ فکر نہ کریں میں رہ لوں گی۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

”ٹھیک ہے دروازہ بند کر کے اندر ہی رہنا۔ میں چابی لے جا رہا ہوں کسی بھی غیر شخص کو اندر آنے نہیں دینا۔ آج کل حالات اچھے نہیں ہیں۔“

وہ زیبا کو اچھی طرح سمجھا کر اور یہ ہدایت دے کر دفتر چلے گئے۔ پھر انہوں نے لنچ کے وقت گھر ٹیلی فون کر کے اس سے بات چیت کی تو انہیں تسلی ہوئی وہ بالکل خوف زدہ نہیں تھی اور کھانا پکانے میں مصروف تھی انہوں نے زیبا کو بتا دیا تھا کہ وہ گھر سورج ڈوبنے کے بعد پہنچیں گے۔ آج دفتر میں کچھ زیادہ کام ہے۔

وہ رات آٹھ بجے گھر پہنچے تھے ان کے منہ ہاتھ دھو کر آنے تک زیبا نے میز پر کھانا چن دیا تھا۔ انہوں نے رات کے کھانے میں اسے بھی شریک کر لیا تھا پھر اس سے دن بھر کی روداد سنتے رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ بالکنی میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگے۔ زیبا ان کے لیے چائے بنا کر لے آئی پھر برتن میز سے اٹھا کر انہیں دھویا کام سے فارغ ہو کر اس نے ان سے اجازت لی اور اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔

وہ اخبار پڑھ کر اٹھے اور خواب گاہ میں آئے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ انہوں نے کپڑے تبدیل کیے اور سونے کے لیے بستر پر لیٹے تو نیند کوسوں دور تھی گھر انہیں کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ انہیں ایک عجیب سے وحشت ہونے لگی۔ ایک ایسی وحشت جو آج سے پہلے انہیں کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی پھر وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے اور ایزی چیئر پر بیٹھ کر سگریٹ پھونکنے لگے۔

سگریٹ کے پیکٹ تو گھر میں موجود ہوتے تھے۔ سگریٹ تو ان کے پاس تھے البتہ ماچس ختم ہوگئی تھی وہ ماچس کی تلاش میں کچن میں پہنچے بتی جلا کر انہوں نے سارا کچن چھان مارا ماچس کہیں دکھائی نہیں دی۔ زیبا نے ماچس کہاں رکھی ہوگی؟ انہیں زندگی میں پہلی بار اس پر غصہ آیا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں پہنچے۔

زیبا کے کمرے میں اندھیرے کا راج تھا۔ انہیں سوئچ تلاش کر کے اسے آن کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کمرہ روشنی سے جگمگا اُٹھا انہوں نے زیبا کو دیکھا جو ننگے فرش پر گہری نیند سو رہی تھی۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا دوپٹا ایک طرف فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ وہ زیبا کو نیند سے بیدار کرنے کے لیے جھکے تو ایک دم سے اچھل پڑے۔

یہ چھ سال پہلے والی بچی نہیں تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی تھی۔ کوئی جوان لڑکی۔ کب جوان ہوئی انہیں کچھ خبر نہیں تھی۔ ان چھ برسوں میں ایک دن بھی احساس نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے حساب کیا تو زیبا پندرہ سولہ برس کی ہو رہی تھی۔

ساری دنیا سو رہی تھی۔ ساری دنیا سے بے خبر وہ سو رہی تھی۔ کمرے کی فضا پر سناٹا طاری تھا۔ اس

سکوت میں سریلی سانسوں کی گونج دل کی صدا کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے زیبا کا سراپا دیکھا تو اندر کا مرد ایک دم سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ انہوں نے خشک ہوتا ہوا گلا تھوک سے تر کرنے کی کوشش کی تو کانٹے سے چبھنے لگے انہوں نے اپنی نظر کو اس کے سراپا سے ہٹا لیا۔

معلوم نہیں وہ کس طرح اپنے کمرے میں پہنچے۔ انہیں ماچس اپنے کوٹ کی جیب میں مل گئی۔ انہوں نے سگریٹ کو دیا سلائی دکھائی اور کرسی پر اپنے آپ کو گرا دیا لیکن ان کی سوچتی ہوئی آنکھوں کے سامنے زیبا جیسے انگڑائیاں لے رہی تھی۔ کسی کلی کی طرح چٹک رہی تھی اور آبوتاب دکھا رہی تھی۔ دل کی دھڑکن میں دھماکے کی طرح بج رہی تھی۔

وہ جیسے اپنے آپ سے لڑنے لگے اور خود کو سمجھانے لگے۔ وہ ایک معصوم بچی ہے۔ ایک صاف شفاف آئینہ ہے۔ ایک امانت ہے۔ اس کی اور ان کی عمر میں ایک فاصلہ ہے فرق ہے اس سے جو رشتہ ہے وہ مالک اور آقا کا نہیں اپنی ایک بچی کی طرح کا ہے وہ اس کے تصور سے اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ انہوں نے بچاؤ کی کتنی ہی تدبیریں کیں مگر وہ انہیں ڈسنے لگا۔ زہر کی طرح رگ رگ میں پھیلنے لگا تھا۔

یہ آج انہیں کیا ہو گیا ہے؟ وہ اٹھ کر کمرے میں بڑے اضطراب سے ٹہلنے لگے تھے۔ ان کے جذبات قابو میں نہیں تھے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان پر یہ اچانک دوغلی کیفیت کیوں طاری ہوگئی ہے۔ یہ دماغ اور دل مل کر کدھر جا رہے ہیں انہیں بہکا کیوں رہے ہیں۔ اخلاق اور تہذیب کی پابندی کے باوجود وہ اپنے آپ کو روک نہ سکے۔ ہوا بھرے ہوئے غبارے کی طرح وہ زیبا کے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔

وہ جوانی کی بارگاہ میں اس کے طلسم کے اسیر بنے کھڑے رہے۔ جذبات کی فراوانی انہیں بہکا رہی تھی۔ حاکمیت کا احساس انہیں ورغلا رہا تھا۔ وہ آقا تھے۔ ان کی لغزش پر وہ داری کر سکتی تھی۔ زیبا کچھ بھی سہی ایک غریب لڑکی تھی کسی غریب کے لٹ جانے کے بعد اس کے پاس فریاد اور آنسوؤں کے خزانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ وہ اس کا منہ ہر طرح سے بند کر سکتے ہیں۔ روپے پیسے سے نت نئے کپڑوں اور زیورات سے۔ طوفان گزرنے کے بعد غریب رو دھو کر چپ ہو جائے گی۔ ضمیر نے انہیں ٹوکا تو دل سمجھانے لگا۔ اصل رشتا خون کا ہوتا ہے وہ کون سا تمہارا خون ہے۔ یہ تم کیا سوچنے لگے مالک کا اپنے نوکر پر پورا پورا حق ہوتا ہے۔

وہ زیبا کی طرف بڑھے تو ساری کائنات جیسے دم بخود ہوگئی تھی۔ ان کے پیروں میں اس کا دوپٹا آ گیا انہوں نے جھک کر اٹھایا اور زیبا کے پاس دوزانو بیٹھ کر اس کے سینے کو دوپٹے سے ڈھک دیا۔ تب نہ تو ان کے ہاتھ کانپے تھے اور نہ دل دھڑکا تھا۔ اس لیے کہ تب ان کے دل میں کوئی چور نہیں تھا۔

زیبا نے صبح انہیں جگایا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ان کے لیے چائے لے کر آئی۔ انہوں نے اس کو پھر ایک بار مرد کی نظروں سے دیکھا۔ اس کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لینے لگے۔ وہ جوانی کی حدود سے نکل کر شباب کی منزل میں قدم رکھنے والی تھی۔ معصومیت رخصت ہو چکی تھی۔ اس کی اٹھان بڑی غضب کی تھی اور چہرے پر بھی بے حد کشش اور جاذبیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ جوان ہو کر بھی اسے اتنے بڑے فلیٹ میں ایک مرد کی موجودگی سے ڈر نہ تھا اور نہ کوئی خوف دوسری

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

جوان لڑکی ہوتی تو وہ سہمی سہمی سی رہتی۔ بدن میں تھرتھری ہوتی رہتی۔ وہ بڑے حیران تھے کہ اسے اپنے آپ پر کتنا اعتماد ہے۔

ناشتے سے فراغت پا کر وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ زیبا ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ان کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔ چائے تپائی پر رکھنے کی بجائے وہ ان کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی زیبا کی طرف دیکھا۔ یک بارگی ان کے دل میں آیا کہ اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیں۔ قریب کھڑی وہ بڑی تپش دے رہی تھی۔ انہوں نے اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لی تو اس نے پوچھا۔ ”آپ کب آئیں گے؟“

”رات آٹھ بجے تک۔“ ان کی نظریں زیبا کے سراپا میں پیوست ہونے لگیں۔

”رات کھانے میں کیا کھائیں گے؟“

”جو تمہارا جی چاہے پکالو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگے انہوں نے چائے ختم کر کے ڈریسنگ ٹیبل پر خالی پیالی رکھ دی۔ انہوں نے زیبا کے قریب پہنچ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ شرما سی گئی۔ ان کے دل میں میل آ گیا تھا' پھر یک لخت انہیں احساس ہوا کہ زیبا بہت چھوٹی لڑکی ہے اور اس کے درمیان عمر کا فاصلہ ہے۔ نوکر اور مالک کا فاصلہ ہے اس فاصلے کو مٹانا نہیں چاہیے۔ نہیں' گرنا نہیں چاہیے جو فاصلہ قائم ہے اس کا قائم رہنا ہی بہتر ہے۔

زیبا انہیں دروازے تک چھوڑنے آئی تو انہوں نے پوچھا۔ ”کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“

”شام کو آتے وقت ایک نئی فلم کی کیسٹ لیتے آیئے گا۔“ اس نے فرمائش کی۔

”اچھی بات ہے۔“ وہ بولے۔

دفتر میں بھی بہت سارا کام تھا۔ انہوں نے کام کرنے کی کوشش کی مگر ان کا دل کسی کام میں نہیں لگا۔ فائلوں اور کاغذات پر اس کا حسین چہرہ اُبھر آتا تھا۔ اس کے ترشے ہوئے بدن کے تناسب انہیں بہکاتے رہے۔ اس کا خیال ورغلاتا رہا ان کے دل کے کسی کونے میں یہ خیال سانپ کی طرح پھنکارنے لگتا تھا کہ مسعود احمد! تمہیں زندگی میں پھر کبھی ایسا سنہری موقع نہیں ملے گا۔ یہ غریب لڑکی تمہارے ایک اشارے اور لالچ پر پھسل جائے گی۔ یوں بھی تنہائی میں جوانی ڈس جاتی ہے۔ ایک بھرپور جوانی تمہاری منتظر ہے اور تم کیسے احمق مرد ہو جو فطری تقاضوں سے اپنے آپ کو بچا رہے ہو۔ اپنے آپ سے لڑ رہے ہو' اپنے دل کو سمجھا رہے ہو' تم ایک شریف مرد ہو' تم نے اسے ہمیشہ ایک معصوم بچی کی طرح جانا ہے۔ مگر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ وہ ایک عورت ہے اس سے تمہارا کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے۔ تم فطرت سے لڑنا چاہتے ہو۔ یہ ناممکن ہے۔ ناممکن ہے تم فطرت سے بغاوت نہیں کر سکتے۔

لنچ کرنے وہ اپنے دفتر کے ساتھ کے ایک قریبی ائرکنڈیشنڈ ریستوران میں چلے گئے۔ اس ہال کے ایک گوشے میں ایک نوجوان لڑکی جو اپنی یونیفارم سے کسی کالج کی طالبہ لگ رہی تھی۔ ایک مرد کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ وہ مرد اس لڑکی سے عمر میں پندرہ بیس برس بڑا ہوگا وضع قطع اور چہرے مہرے سے رئیس زادہ لگ رہا تھا۔ ان کے ساتھی منصور نے اس جوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو کیسا زبردست رومانس چل رہا ہے۔“

لڑکی اس مرد کی آنکھوں میں جھانک کر جس

والہانہ انداز سے باتیں کر رہی تھی اور اس پر جو سرشاری طاری تھی وہ صاف بتائے دے رہی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں مرد کوئی بات لڑکی سے کہتا تو لڑکی کا چہرہ سرخ ہو کر دہک اٹھتا تھا۔ لڑکی بلا شبہ حسین اور نوجوان تھی۔ زیبا سے دو ایک سال بڑی ہوگی۔

”ان دونوں کی عمروں میں فرق تو دیکھو۔“ انہوں نے اپنے دوست سے کہا۔ ”کیا لڑکی بہت کم عمر نہیں ہے۔“

”میرا خیال ہے لڑکی مرد کی دولت پر مرمٹی ہے۔“ منصور نے جواب دیا۔

”کیا دولت نوجوان لڑکیوں کی کمزوری ہوتی ہے؟“

”عورت کی سب سے بڑی کمزوری ایک پرتعیش زندگی ہوتی ہے۔“ منصور بولا۔ ”عورت مرد کی عمر نہیں دیکھتی ہے وہ اس کی جیب دیکھتی ہے۔“

”کیا ایک نوجوان لڑکی اس مرد کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ نہیں کر رہی ہے۔“

”تم ایک لڑکی کی بات کر رہے ہو' آج ہزاروں لڑکیاں عشق و محبت کے چکر میں تباہ ہو رہی ہیں۔ اس لڑکی کے ماں باپ نے اس لڑکی سے کتنی امیدیں نہیں باندھ رکھی ہوں گی۔ اس کا باپ اس کے مستقبل کے لیے کسی دفتر میں اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہوگا ادھر بیٹی کو نہ تو باپ کی محبت کا خیال ہے اور نہ گھر کی عزت کا۔ اسے اس بات کا ڈر خوف بھی نہیں ہے کہ کل یہ مرد اسے سبز باغ دکھا کر دھوکا دے سکتا ہے۔“

”آخر ان پڑھی لکھی لڑکیوں کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟“ وہ تاسف سے بولے۔

”یہ ساری خرابیاں وی سی آر اور ہندوستانی فلموں کا عطیہ ہیں۔ سچ پوچھو تو ان فلموں نے لڑکیوں' لڑکوں اور گھروں کے ماحول کو بہت خراب کیا ہے ہمارا معاشرہ تیزی سے بگڑتا جا رہا ہے۔“

ان کے ذہن میں زن سے ایک خیال آیا تو کیا زیبا بھی فلمیں دیکھ دیکھ کر بگڑ گئی ہوگی۔ ان کے ہاں نہ صرف وی سی آر تھا بلکہ بارہ فلموں کے ویڈیو کیسٹ تھے۔ ان کی بیگم ہفتے میں تین چار فلمیں وی سی آر پر ضرور دیکھتی تھیں۔ وہ بھی بڑے شوق سے دیکھتی تھی۔ انہیں فلموں سے کبھی ایسی کوئی دل چسپی نہیں رہی تھی۔ شاید ہی انہوں نے کوئی پوری فلم دیکھی تھی۔ نیم عریاں رقص فحش مکالمے اور مار دھاڑ سے بڑی نفرت تھی۔ محبت کے مناظر نہ صرف بے ہودہ بلکہ سنسنی خیز ہوتے تھے۔ تو گویا وہ کسی برف کی طرح پگھل سکتی ہے۔

وہ لنچ کے بعد دردِ سر کا بہانہ کر کے چھٹی لے کر سیدھا اپنے ایک دوست کی دکان پر پہنچے۔ اس کی وڈیو کیسٹ کی دکان تھی۔ تین بجے کا وقت تھا وہ دکان میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ وہ اس سے بولے۔ ”کوئی زور دار ہندوستانی فلم دو جو بار بار دیکھنے کو دل چاہے۔ فلم ذرا.....“

وہ فلیٹ پر پہنچے تو انجانے خیالوں سے ان کے دل کی دھڑکنیں شور مچا رہی تھیں۔ بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ انہوں نے اس خیال سے کہ زیبا دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے کھانا کھا کر سو رہی ہوگی۔ دروازہ بے آواز کھولا۔ ایک چابی ان کے پاس رہتی تھی۔ اندر داخل ہو کر پھر اسی طرح بے آواز بند کیا فلیٹ کے اندر گہرا سکوت طاری تھا۔ البتہ ان کے کمرے سے ایک مرد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ زیبا ان کے کمرے میں ان کے بستر لیٹی کوئی پرانی فلم دیکھ رہی ہے۔ وہ دبے پاؤں

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

کمرے کے پاس جا کر رکے۔ مکالمے بڑے سنسنی خیز اور محبت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ”میری جان میں تم سے محبت کرتا ہوں تم میری زندگی ہو آؤ میرے بازوؤں میں سما جاؤ۔ ہم ایک نئی دنیا میں کھو جائیں ہمیشہ ایک ساتھ جینے مرنے کی قسم کھائیں میری جان زیبا.....!“

وہ ایک دم سے چونکے انہیں خیال آیا کہ وی سی آر اور ٹیلی ویژن تو دوسرے کمرے میں سیٹ کیا ہوا رکھا ہے اور پھر یہ آواز کسی ہیرو کی نہیں ہے۔ کسی کی مانوس آواز ہے۔ ان کی خواب گاہ میں کوئی مرد زیبا کے ساتھ ہے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر خواب گاہ میں جھانکا تو ان کا خیال درست نکلا۔ چوتھی منزل پر جو وکیل صاحب رہتے تھے۔ یہ ان کا خانساماں تھا۔ زیبا اس کے بازوؤں کے حلقے میں اس کے سینے لگی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں پھر کیا تھا وہ دہاڑے۔ ”ذلیل..... کمینے یہ کیا ہو رہا ہے؟“

ان کی دہاڑ دونوں پر بجلی بن کر گری۔ وہ دونوں تڑپ کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ الگ ہوئے وہ لمبے چوڑے اور مضبوط بدن کے تھے انہوں نے لاتوں جوتوں سے اس خانساماں کی ایسی زبردست پٹائی کی وہ بری طرح زخمی ہو گیا۔ اس کا ہونٹ اور جبڑا کٹ گیا اور اس میں سے خون رسنے لگا۔ وہ ایسا بھاگا کہ ہمیشہ ہی کے لیے اس علاقے سے بھاگ گیا۔

وہ دروازے بند کر کے خواب گاہ میں آئے تو زیبا کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دھلی چادر کی طرح سفید پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں دہشت سے پھٹی پھٹی تھیں اسے جیسے غش آ رہا تھا۔ جبھی وہ دیوار کر سہارا لیے کھڑی تھی۔ انہوں نے اسے غصے اور نفرت سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”اچھا تو تم اس لیے پوچھ رہی تھی کہ میں گھر کب لوٹوں گا۔“

زیبا آگے بڑھ کر ان کے پیروں میں گر کر گڑگڑانے لگی۔

”مجھے معاف کر دیجیے۔“ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”یہ ذلیل کب آیا تھا؟“

”آج ہی آیا تھا۔ پانچ سات منٹ پہلے۔“ وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔

”تمہاری اس سے کب دوستی ہوئی؟“

”پانچ دن پہلے۔“ وہ ان کے پیر پکڑ کر اپنا چہرہ رگڑنے لگی۔

”شاباش۔“ وہ زہر بھرے لہجے میں بولے۔ ”محبت کی جماعتیں تم نے بڑی جلدی پاس کر لیں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ روتی اور ہچکیاں لیتی رہی۔

”تمہاری ماں سنے گی تو بہت خوش ہوگی کہ جوان بیٹی نے اس کی غیر موجودگی میں بڑے گل کھلائے۔“

”نہیں، نہیں اماں سے مت کہیں۔“ وہ دہشت سے کانپنے لگی۔ ”میری ماں مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔“

ان کے دماغ میں تیز تیز آندھیاں چلنے لگیں۔ وہ دل میں گزشتہ چھ برسوں کا حساب کرنے لگے۔ انہوں نے اس لڑکی کے لیے کچھ خیال نہیں کیا تھا۔ اسے اپنے گھر کے فرد کی طرح سمجھا اس کا ہر طرح خیال رکھا۔ اگر وہ بروقت نہیں پہنچتے تو یہ کسی کچے پھل کی طرح اس دو ٹکے کے لڑکے کی جھولی میں گر جاتی اس پھل کو داغ لگ جاتا کل اس کا انجام سامنے آ جاتا انہیں موردِ الزام ٹھہرایا جاتا۔ پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔

وہ تو مفت میں شرافت کا ثبوت دے رہے تھے۔ یہ لڑکی ایسی نہیں ہے جیسی وہ سمجھ رہے تھے۔ بڑی گہری ہے، بڑی پہنچی ہوئی ہے۔ اس پر ان کا سب سے زیادہ حق بنتا ہے۔ وہ اپنا حق اس سے وصول کر کے رہیں گے۔ یہ سب کچھ سوچتے سوچتے انہوں نے پیروں پر گری ہوئی زیبا کو دیکھا۔ اس کا رسیلا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ کسی نرم و نازک ڈالی کی طرح لچک رہا تھا۔ انہوں نے جھک کر اس کے بازوؤں کو تھاما اور اٹھایا۔ وہ ان کے بالکل سامنے کھڑی تھی اس کی گرم سانسیں انہیں اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔

”تمہیں کیا سزا ملنا چاہیے۔“ انہوں نے اس کی آنسو بھری آنکھوں میں جھانکا۔

”مجھے معاف کر دیں۔“ وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکا کر ہاتھ سے آنسو پونچھنے لگی۔

”میں تمہیں ایک شرط پر معاف کر سکتا ہوں۔“ انہوں نے ایک شکاری کی طرح اپنا جال پھیلایا۔ ”میں اس واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا۔ نہ بیگم صاحبہ سے اور نہ تمہاری ماں سے۔“

زیبا نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر ان کی آنکھوں میں جھانکا معنی خیز لہجے نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ عورت تھی۔ اس نے دل کی بات ان کی آنکھوں میں پڑھ لی تھی۔ اس کے نزدیک دنیا کے مردوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سارے مرد ایک جیسے ہی تھے۔ ایک مرد محبت کی آڑ لے کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا دوسرا مرد اس کی کمزوری سے، بات ایک ہی تھی۔ اسے تو کہیں نہ کہیں اپنی ہار تسلیم کرنی تھی۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا جیسے اسے ان کی ہر شرط منظور ہے۔

”آج تم میری دلہن ہو گی۔“ وہ بیگم کی الماری کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے وہ بنارسی جوڑا نکالا۔ جو انہوں نے اپنی شادی کی سالگرہ کے موقع پر بیگم کو دیا تھا۔ وہ جوڑا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

”تم نہا کر یہ جوڑا پہن لو۔“

کچھ دیر کے بعد زیبا غسل خانے سے ان کا دیا ہوا جوڑا پہن کر باہر آئی تو وہ اسے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اس کے بال اچھی طرح خشک نہیں ہوئے تھے۔ ان میں نمی تھی اور کہیں کہیں پانی کے قطرے دمک رہے تھے۔ وہ اس کے قریب جا کر کھڑے ہوئے تو اس کے بالوں سے سوندھی سوندھی خوش بُو اٹھ رہی تھی۔ زیبا اتنی حسین اتنی پیاری اور اتنی پر کشش لگی کہ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے انہوں نے زیبا کو اپنے بازوؤں میں بھرا تو اس نے اپنے آپ کو کسی سرد لاش کی طرح ان کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر یک لخت انہیں ہوش آ گیا وہ اپنے بازوؤں کا حلقہ توڑتے ہوئے چیخے۔

”چلو، میری نظروں سے دور ہو جاؤ جا کر لباس تبدیل کرو۔“ وہ رات سونے کے لیے بستر پر لیٹے تو نہیں اس بات کا ذرا بھی پچھتاوا نہیں تھا کہ انہوں نے ایک سنہرا موقع گنوا دیا۔

البتہ انہیں ایک خوشی کا سا احساس ہو رہا تھا کہ انہوں نے ایک لڑکی کی زندگی پر داغ نہیں لگایا۔ اگر وہ بہک جاتے تو یہ داغ تو ان کی زندگی ان کے وجود اور اس گھر پر لگ جاتا پھر خلش کا خنجر ساری زندگی ان کے سینے میں پیوست رہتا۔ اس خلش کو کون نکالتا؟

صبح ہوئی تو زیبا ان کے سامنے آئی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اسے فلیٹ میں تنہا چھوڑ کر کیسے جائیں جوانی کا کوئی بھروسا نہیں۔ کہیں پھر کوئی گل نہ کھلا دے۔ انہیں اپنی موجودگی سے اپنے آپ سے بھی خوف آ رہا تھا۔ ان کی ذات کا بھی کوئی بھروسا

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

نہیں۔ اس وقت زیبا کو دیکھ کر ان کے دماغ میں ایک ہل چل سی ہونے لگی تھی۔ ان کے جذبات اپنا دامن چھوڑنے لگے تھے۔ وہ پھر ایک اذیت میں مبتلا ہو گئے تھے۔

جس وقت وہ ناشتا کر رہے تھے تب عافیہ حیدر آباد سے لوٹ آئی انہوں نے عافیہ کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ انہیں ایسا لگا زیبا کی عزت نہیں ان کی عزت بچ گئی ہو۔ ان کے سینے پر سے چٹان ہٹ گئی ہو عافیہ نہ آتی تو زیبا پر شاید آنچ آجاتی۔

پھر دوسرے روز ان کی بیوی اور بچے بھی لاہور سے آ گئے۔ عافیہ تیسرے روز زیبا کو حیدر آباد لے کر جا کر اپنی بڑی بہن کے ہاں چھوڑ آئی تا کہ اس کی شادی کے لیے کوئی مناسب رشتا تلاش کیا جا سکے۔

دو مہینے گزر گئے ان دو مہینوں میں انہیں اس روز کا واقعہ یاد آ جاتا۔ انہیں یہ سوچ کر خجالت اور شرمندگی سی ہوتی تھی کہ انہوں نے زیبا کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اچھا ہی ہوا تھا انہوں نے حد سے تجاوز نہیں کیا۔ فاصلے طے نہیں کیے ورنہ وہ اپنی ہی نظروں میں گر جاتے پھر انہیں اپنی زبان پر اس روز کی مٹھاس محسوس ہوئی تو وہ سوچتے کہ کاش اس ذرا سے جرم کی تلافی ہو سکے۔

بیس دن پہلے انہوں نے سنا کہ زیبا کی شادی ہونے والی ہے۔ شادی حیدر آباد میں تھی۔ ان کے ہاں سے کوئی شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ زیبا کی شادی کے لیے وہ اور ان کی بیوی نے بہت کچھ کیا تھا۔ شادی کے پندرہ دنوں کے بعد عافیہ بیٹی کو ان سے ملانے آئی اور آج وہ ان کے سامنے دلہن بنی کھڑی تھی۔ ان کے سینے سے لگی تھی۔ ان کی نظروں نے زیبا کو دیکھا۔ اس کے ان گنت روپ تھے جب وہ اس گھر میں پہلی بار آئی تو وہ معصومیت کا پیکر تھی۔

ایک بچی تھی۔ پھر اس پر جوانی آئی۔ اس کی جوانی اور تنہائی نے انہیں کسی ناگن کی طرح ڈس لینا چاہا تھا اس روز زیبا ان کے بازوؤں میں کتنی بے بس، مجبور اور کمزور سی تھی۔ ایک بے جان لاش کی مانند اس نے خود کو ان کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر کسی بات نے انہیں اپنا مقام یاد دلایا تھا۔ آج انہوں نے زیبا کو سینے سے لگایا تو انہیں ایسا لگا جیسے ان کے دل کے کسی کونے میں یہی خواہش تھی۔ یہی جذبہ تھا جو نجانے کب اور کیوں پیدا ہوا تھا اس روز کے جذبے میں میل آ گیا تھا۔ مگر آج کا جذبہ کسی صاف اور شفاف آئینے کی مانند تھا۔ اس میں شفقت تھی۔ محبت تھی اور پاکیزگی تھی۔ وہ زیبا کے جیسے باپ ہوں۔ بھائی ہوں اس جذبے کے تحت انہیں اس کو سینے سے لگا کر کتنی راحت محسوس ہوئی تھی۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا جیسے اس پاکیزگی کے راستے انہوں نے بہت کچھ پا لیا ہو۔ لمحوں کے بعد انہوں نے اس کو سینے سے الگ کر کے اس کا تمتماتا ہوا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا اور پھر انہوں نے اس کی چاندی پیشانی پر بوسہ ثبت کر دیا۔ اس بوسے میں جذبے کی گرمی تھی۔ ان کی آنکھیں نجانے کس خیال کس جذبے سے بھر آئیں۔ وہ پھر ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ جیسے وہ شفقت اور محبت کی بھوکی ہے۔ اسے اس کی ضرورت ہے۔

بزمِ سخن

روبین احمد

حسنین عباس بلوچ...... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

بچھڑ کر مجھ سے رفیق میرے اُداس ہونا تو لوٹ آنا
اکیلے پن کی پہاڑ راتیں نہ کاٹ سکنا تو لوٹ آنا
پرائے دیسوں میں سوائے میرے کون تجھے منا سکے گا
یونہی کسی سے مذاق جھگڑے میں روٹھ جانا تو لوٹ آنا

عبد المالک کیف...... ڈہرکی

کس پر اعتبار کریں کیف اپنے بھی دھوکا دیتے ہیں
ارماں بھی جل جاتے ہیں، سپنے بھی دھوکا دیتے ہیں

ریاض بٹ...... حسن ابدال

خالی ہیں دل فقیر کے کشکول کی طرح
اس شہر بے وفا سے وفا کون کرے گا

حسن اختر پریم...... ناظم آباد

جاگے تو شخص ریت ہی پائیں گے ہر طرف
گر ہو سکے تو خواب میں ساگر نہ دیکھیے

سردار خان...... کراچی

سوکھی ہیں بہت دیر سے پلکوں کی زبانیں
بس آج تو جی بھر کے رُلا دے کوئی آ کے

فقیر محمد بخش لنگاہ...... خانیوال

بچھڑنے والے میری پناہوں کو یاد رکھنا
ہر اک مشکل میں خیر خواہوں کو یاد رکھنا
اگر کبھی دل میں لوٹنے کا خیال آئے تو صابر
میرے گھر کی سلگتی راہوں کو یاد رکھنا

محمد شفاعت حسنین...... خانیوال

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ ؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

نجم الدین...... کراچی

کی محمد ؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

محمد ثقلین...... خانیوال

میرا مقصد بٹھانا تھا اسے جانے کی جلدی تھی
مجھے دکھڑا سنانا تھا اسے جانے کی جلدی تھی
میں محسن روکتا کیسے کہ رُکنا تھا کہاں اس کو
اسے ہر حال میں جانا تھا اسے جانے کی جلدی تھی

نیلما تبسم حسنین...... خانیوال

اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑتے رہے ہم
بے وفا کی یاد میں ہوتی رہی آنکھیں نم
محبت نہ تھی تو رسوا بھی نہ کرتا یوں
مثال کچھ تو رکھتا میری وفاؤں کا بھرم

صابرہ کلثوم صابر
لنگاہ...... خانیوال

کچھ لڑکیاں انجام نظر آتے ہوئے بھی
جب گھر سے نکلتی ہیں تو سوچا نہیں کرتیں

رابعہ حسن صابر لنگاہ...... خانیوال

ہر طرف آپ کی یاد پر لگا کے پہرا
جی کڑا کر کے بیٹھا تھا کہ مت یاد آئے
ناگہاں دل کسی بات پر ایسا دُکھا
میں بہت رویا مجھے آپ نئے افق بہت یاد آئے

زین الدین...... کراچی

احساس کے دامن میں آنسو گرا کر دیکھو
پیار کتنا سچا ہے آزما کر دیکھو
آپ کو بھول کر کیا ہوگی دل کی حالت
کسی آئینے پر پتھر گرا کر دیکھو

نور صبا...... کراچی

نہیں ممکن اندھیروں میں چراغوں کا بجھا دینا
بہت مشکل ہے میری جان تمہیں دل سے بھلا دینا
تمہیں اک دن ستائے گی میری وفا کی قسمیں

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

حسین ہاتھوں سے کاغذ پر مجھے لکھنا اور مٹا دینا

عرفان بھٹی..... ملتان

نہ جانے کون دعاؤں میں یاد رکھتا ہے
میں ڈوبتا ہوں سمندر اُچھال دیتا ہے

ریاض بٹ..... حسن ابدال

گھر کس نے جلایا ہے مجھے کون بتائے
منصف یہاں آگ ہے گواہوں میں دھواں ہے

محمد نعیم..... تھوہا محرم خان

چاہا تھا اسے بلایا نہیں
وہ بھی ضدی تھا پر آیا نہیں
اچھا ہوا بھرم رہ گیا دل میں
آنسو سامنے اس کے بہایا نہیں

سردار خان..... کراچی

اس دل پہ سہہ رہا ہوں زمانے کے میں ستم
کوئی ہو غمگسار تو اس کو بتاؤں میں

کاشف صدیقی..... میانوالی

ایک پل بھی زندہ رہنا اک قیامت تھا ندیم
اور طول عمر کی دعا ملتی رہی

نور الٰہی..... لاہور

اسی لئے تو اجالا ہے میرے سینے میں
میں بھول کر بھی کسی کا دیا بجھا نہ سکا

احمد یار بھٹی..... تونسہ شریف

اب ملاقات میں وہ گرمی جذبات کہاں
اب تو رکھنے وہ محبت کا بھرم آتے ہیں

وسیم عباس..... سرگودھا

نہ تم پیار کا دیپ جلاتے نہ آنکھیں چار کرتے
نہ ہم دل کو لگاتے نہ ہی تم سے پیار کرتے
یہ عشق کی بے قراری تو بے وجہ گلے پڑی وسیم
ہم پھر بھی مارے جاتے جو معافی کا اصرار کرتے

شاہو..... ڈیرہ اسماعیل خان

مایوسی کا میں قائل تو نہیں مگر
میں نے برسات میں جلتے ہوئے گھر دیکھے ہیں

غلام اکرم..... ملتان

انہوں نے مجھ سے کہا تھا کسی سے لو نہ لگا
اجڑ کے سوچ رہا ہوں وہ لوگ سچے تھے

چوہدری نور الٰہی جٹ..... مالٰہی پورہ راوی، لاہور

اس کو دیکھے ہوئے اک عمر ہوئی ہے پھر بھی
یاد آتا ہے مجھے آج بھی پل پل ناصر

محمد اسلم اعوان..... انوکے اعوان، باٹا پور

اسی دل کو اپنے سے ساگر کبھی نہ کم جانا
یہ اور بات کہ ہم سے کوئی سوا نہ ملا

میاں نذیر احمد..... اوکاڑہ

کسی دل کو پھر وہ دکھانے لگے ہیں
سنبھلے میں جس کو زمانے لگے ہیں

مُرید حسین..... رحیم یار خان

اک ٹھہرا ہوا دریا ہے میری آنکھوں میں
جانے کس گھاٹ پہ مارے گی تیری پیاس مجھے

شانی..... ڈیرہ غازی خان

کون بہتے ہوئے اشکوں پر نظر رکھتا ہے
لوگ ہنستے ہوئے چہرے کو دعا دیتے ہیں

محمد بخش الٰہی..... کراچی

اُٹھایا سر جو سجدے سے تو پھر سجدے کو جی چاہا
وہیں کی چیز ساجد نے پھر وہیں رکھ دی

محمد صابر خان..... کوئٹہ

ادائے بے نیازی اس بُت کافر کا شیوہ ہے
سر محفل مگر ٹکرا گئی بار بار آنکھیں

رابعہ حسن..... لاہور موڑ

اجڑی ہوئی دنیا میں اک لہر سی پھر اُٹھی
تم آئے تو یاد آئیں بھولی ہوئی کچھ باتیں

رانی حسن..... پنڈی بھٹیاں

اس کو ناقدری عالم کا صلہ کہتے ہیں
مرگئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

محمد حسن خان..... ملتان

اب کے بچھڑے تو نہ پہچان سکیں گے چہرے
میری چاہت تیرے پندار کو مرجانا ہے

محمد حسین..... لاہور

اپنی چاہت کے سبھی کھول کے رکھنا در تم
ایک دن آئیں گے گھر ہم بھی تمہارے سائیں

محمد اجمل..... پیپلز کالونی

اب کے وہ درد دیئے کہ میں روؤں تمام عمر
اب کے لگا وہ زخم کہ جینا محال ہو

محمد عظیم خان..... نیو کراچی

اگر مل گیا ہے کوئی اے بہتر
بصد شوق ہم سے نگاہیں چرالے
کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

اظہار احمد..... نصرت بھٹو کالونی، کراچی

یا خدا اب کہ یہ کس رنگ میں آئی ہے بہار
زرد ہی زرد ہے پیڑوں پر ہرا کچھ بھی نہیں
میرے ان ہاتھوں کی چاہے تلاشی لے لو
میرے ان ہاتھوں میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

یوسف جدون..... لون پٹیاں ہزارہ

کسی سے ہاتھ کسی سے نظر ملاتے ہوئے
میں بجھ رہی ہوں رواداریاں نبھاتے ہوئے
کسی کو میرے دکھوں کی خبر نہیں، ہو بھی کیسے
کہ میں ہر کسی سے ملتی ہوں مسکراتے ہوئے

ناصر زیدی..... ملیر، کراچی

اندھیرا مانگنے آیا تھا روشنی کی بھیک
ہم اپنا گھر نہ جلاتے تو اور کیا کرتے
میری سوچوں میں کبھی دیکھ سراپا اپنا
میں نے دنیا سے الگ تیری پرستش کی ہے

عاشق حسین..... بارہ امام، کراچی

جس شہر میں مغرور انائیں نہیں ہوتیں
اُس شہر میں نفرت کی فضائیں نہیں ہوتیں
اس گھر میں تو آسیب بناتے ہیں نشیمن
جس گھر میں بزرگوں کی دعائیں نہیں ہوتیں

سردار احمد..... نیو کراچی

انسان جان کر بھی اتنا سمجھ نہ پایا
جانا پڑے گا اک دن یہ ہے جہاں پرایا
خدارا یہ بھید کیا ہے میری سمجھ میں نہ آیا
جانا پڑے گا اک دن یہ ہے مکان پرایا

سید مقصود احمد..... ملیر، کراچی

اور کیا ہوگی پیار کی تمنا اس سے بڑھ کر
پھول چاہت کے تیری راہوں میں بکھرائے ہیں
بندشیں، رسمیں زمانے کی بھلا کر ساری
دیکھئے خود ہی تیری اور چلے آئے ہیں

ظہور حسین..... لاہور

بجھی راکھ میں چنگاریاں ڈھونڈنے سے کیا حاصل
نہ پہلے سے تم ہو نہ پہلے سے ہم ہیں

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

خوشبوسخن

محمد احمد شہزاد

نعت شریف

مسلمانو! سنبھل جاؤ قیامت آنے والی ہے
گناہوں سے کرو توبہ قیامت آنے والی ہے
روشن کرو دلوں کو محبت کے نور سے
تم کو سکوں ملے گا قناعت کے نور سے
پیشانی جگمگائے گی عزت کے نور سے
مٹ جائے گا اندھیرا شرافت کے نور سے
یہ گمراہی، یہ بے دینی مصیبت ڈھانے والی ہے
گناہوں سے کرو توبہ قیامت آنے والی ہے
ٹی وی کو دیکھنے سے فرصت نہیں تمہیں
گویا نماز و روزہ کی حاجت نہیں تمہیں
اب نیکیوں کی کوئی ضرورت نہیں تمہیں
گھٹا تم پر فلک سے آگ برسانے والی ہے
گناہوں سے کرو توبہ قیامت آنے والی ہے
اب باپ کو بھی باپ سمجھتے نہیں ہیں لوگ
عزت بھی اپنی ماؤں کی کرتے نہیں ہیں لوگ
حق بھائی اور بہنوں کا دیتے نہیں ہیں لوگ
کیا کر سکیں گے عزت و تکریم دین کی
تمہاری بے حسی اس نسل کو بہکانے والی ہے
گناہوں سے کرو توبہ قیامت آنے والی ہے
ہر دل میں برائی ہے ہر ایک گھر میں برائی
آنکھوں میں بدی چھائی اور سر میں برائی
بھائی میں برائی ہے برادری میں برائی
گھر کرنے لگی ہے دلِ قیصر میں برائی
گناہوں سے کرو توبہ قیامت آنے والی ہے
(فقیر محمد بخش لنگاہ......خانیوال)

والد کے نام

بچے نے دنیا میں جب ہے آنکھ کھولی
باپ کی آواز نے ''اذان'' کانوں میں گھولی
بیٹی ہے تو دیا اس کو مرتبہ رحمت کا
بیٹا ہوا تو ملا باپ کو رُتبہ ہمت کا
خوش نصیب ہے جو پاتا ہے باپ کی شفقت
پوشیدہ ہے پیروں میں ماں کی جنت
باپ کے نام سے روشن ہوتا ہے خاندان
باپ ہوتا ہے بچے کے لیے سائبان
باپ نے مشکل و کٹھن حالات میں ہے سنبھالا
عزم و ہمت سے رہنے کا طریقہ ہے سکھایا
نیک اولاد ہے ناز باپ کے لیے سرمایۂ حیات
جو کڑی دھوپ میں ہے سایۂ کائنات
(فریدہ جیلانی ناز......میر پور خاص، سندھ)

نورِ صبا

مجھے اس سے محبت ہے مجھے انکار بھی نہیں
پر کبھی کھل کے میں نے کیا اظہار بھی نہیں
پر سچ ہے کہ اسے ستانا میری عادت ہے
پر اس کے بنا اس دل کو قرار بھی نہیں
وہ کہتا ہے کہ تمہاری باتیں دل کو بھلی لگتی ہیں
پر اسے میری باتوں پر اعتبار بھی نہیں
وہ مجھے اپنے دل میں بسانا تو چاہتا ہے
پر اس کے دل میں میرے لیے پیار بھی نہیں
وہ لاکھ بُرا سہی پر اچھا لگتا ہے
دل اس کے معاملے میں ہوشیار بھی نہیں
وہ کہتا ہے کہ تم بن میں جی نہیں سکتا
پر ساتھ میرے چلنے کو تیار بھی نہیں
وہ مجھ سے دور ہے اتنا کہ پالینے کی حد تک
یہ سچ ہے کہ اب ہمارے درمیان کوئی دیوار بھی نہیں
(زین شانی......کراچی)

غزل

مجھے اس سے محبت ہے مجھے انکار بھی نہیں
پر کبھی کھل کے میں نے کیا اظہار بھی نہیں
یہ سچ ہے کہ اسے ستانا میری عادت ہے
پر اس کے بنا اس دل کو قرار بھی نہیں
وہ کہتا ہے کہ تمہاری باتیں دل کو بھلی لگتی ہیں
پر اسے میری باتوں پر اعتبار بھی نہیں
وہ مجھے اپنے دل میں بسانا تو چاہتا ہے
پر اس کے دل میں میرے لیے پیار بھی نہیں
وہ لاکھ بُرا سہی پر اچھا لگتا ہے
دل اس کے معاملے میں ہوشیار بھی نہیں
وہ کہتا ہے کہ تم بن میں جی نہیں سکتا
پر ساتھ میرے چلنے کو تیار بھی نہیں
وہ مجھ سے دور ہے اتنا کہ پالینے کی حد تک
یہ سچ ہے کہ اب ہمارے درمیان کوئی دیوار بھی نہیں
(راؤ چاند......جتوئی)

''ہم وطنو''

اپنے وطن کو سازشِ اغیار سے بچاؤ
مانگو خدا سے معافی رُو کر اسے مناؤ
اللہ کو ہم نے چھوڑا اللہ نے ہم کو چھوڑا
غیروں کی طرز چھوڑو اس کے قریب آؤ
اللہ کے حکم مانو مشکل نہیں ہے پھر کچھ
اب غیرتِ خدا کو نہ اور آزماؤ
کشور کی استقامت، روٹھے خدا سے مانگو
بندوں کی آس چھوڑو اپنے خدا سے پاؤ
دھوکا فریب کاری کا نام ہے سیاست
یہ ہیں حسین دھوکے ان میں اُلجھ نہ جاؤ
وعدے ہیں ان کے جھوٹے دعوے ہیں ان کے خالی
چہرے کے بہت لگے ہیں دھوکا نہ اور کھاؤ
سرائیکی، پٹھان، سندھی، پنجابی و بلوچی
عصبیتوں کو چھوڑو علم وفا اُٹھاؤ
چاروں طرف لٹیرے گھیرے ہوئے ہیں تم کو
فتنہ گروں کا یاں سے نام و نشاں مٹاؤ
شہدا کا خون تم سے ایثار کا ہے طالب
نقشِ قدم پہ ان کے جاں سے گزر ہی جاؤ
عاطر دکھاؤ نقشہ بدر و حنین کا یاں
دیں کا علم اُٹھاؤ عالم میں پھیل جاؤ
(عبداللہ عاطر......منگلا کینٹ)

غزل

آئی خزاں، بہار کا موسم گزر گیا
اب ان کے انتظار کا موسم گزر گیا
سچ بولتے ہوئے بھی فریبی لگے ہیں لوگ
لگتا ہے اعتبار کا موسم گزر گیا
ہر سمت لوٹ مار کا بازار گرم ہے
حالاتِ ساز گار کا موسم گزر گیا
پھیلے ہوئے ہیں چار سُو اب نفرتوں کے جال
اُلفت کے کاروبار کا موسم گزر گیا
ہوتے ہیں قتل چھوٹی چھوٹی بات پر ابھی
اب دل پہ اختیار کا موسم گزر گیا
پھرتے رہیں گے ہاتھ میں کشکول لے کے ہم
جب خود پہ انحصار کا موسم گزر گیا
اب بے مروّتی میں گزارہ کرو قمر
مہر و وفا کا، پیار کا موسم گزر گیا
(ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم)

غزل

دل اپنا جلا کے بیٹھے ہیں
محفل کو سجا کے بیٹھے ہیں
ہر شخص کو ہم نے چھوڑ دیا
سب زخم چھپا کے بیٹھے ہیں
اِک تیری محبت میں جاناں
دنیا کو بھلا کے بیٹھے ہیں

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

ہم آج بھی تیری راہوں میں
اک دیپ جلا کے بیٹھے ہیں
یہ حوصلہ دیکھو رسموں کی
دیوار گرا کے بیٹھے ہیں
ہم رانا جود کے سب قصے
دنیا کو سنا کے بیٹھے ہیں
(قدیر رانا.....راولپنڈی)

غزل

دو گھڑی کے لیے ٹھہر جاؤ
اتنا احسان مجھ پہ کر جاؤ
کٹ رہی ہے حیات کانٹوں میں
میرے دامن میں پھول بھر جاؤ
اب اندھیروں سے خوف آتا ہے
روشنی بن کے تم بکھر جاؤ
فیصلہ ہے تمہارے ہاتھوں میں
جو بھی کرنا ہے کر گزر جاؤ
دیکھتے ہوں گے رہگزر بچے
شام ہونے لگی ہے گھر جاؤ
دیکھو کتنا اُداس ہے موسم
موسمو اب ذرا سنور جاؤ
(رانا حنیف عاطر.....جھڈو)

غزل

تیرے آنگن یہ شور سا کیا ہے
اے مرے دل! تجھے ہوا کیا ہے
میں نے اس شخص کو ہے پوجا جو
مجھ سے پوچھے کہ یہ "وفا" کیا ہے
میں بھی انسان، وہ بھی انساں ہے
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
اے مرے دل کو توڑنے والے!
یہ بتا تجھ کو بھی ملا کیا ہے
میں اسے ربّ سے مانگ لیتا، مگر
عشق میں پھر بتا مزا کیا ہے
جو بھی کرنا ہے کر گزر راغب
ہو کے عاشق تو سوچتا کیا ہے
(راغب عثمانی کیانی.....راولپنڈی)

غزل

وہ بظاہر جو زمانے سے خفا لگتا ہے
ہنس کے بولے بھی تو دنیا سے جدا لگتا ہے
اور کچھ دیر نہ بجھنے دے اے رت سحر
ڈوبتا چاند میرا دستِ دعا لگتا ہے
جس سے منہ پھیر کے رستے کی ہوا گزری ہے
کسی اُجڑے ہوئے آنگن کا دیا لگتا ہے
اب کے ساون میں بھی زردی نہ گئی چہروں کی
ایسے موسم میں تو جنگل بھی ہرا لگتا ہے
شہر کی بھیڑ میں کہاں کھلتے ہیں اس کے نقوش
آؤ تنہائی میں سوچیں گے وہ کیا لگتا ہے
منہ چھپائے ہوئے گزرا ہے جو احباب سے آج
اس کی آنکھوں میں کوئی زخم نیا لگتا ہے
(محسن نقوی.....جھنگ)

غزل

ہوگی گل گوشی کی اتنی بڑی سزا سوچا نہ تھا
موسمِ بہار میں بھی ہوگا چمن مُردہ سوچا نہ تھا
حالات کی تباہ حالی کے باعث
قابلِ دید چہرے بھی ہو جائیں گے بے دید سوچا نہ تھا
دیکھا تو تھا انجام پیار کرنے والوں کا
اپنا بھی ہوگا یہی حال سوچا نہ تھا
گلوں میں رہ کر دیکھیں کئی بہاریں
خزاں میں ہوگا مرجھانا سوچا نہ تھا
پھولوں کی مانند پھیلا کر خوش بوئے وفا فیصل
اک دن مانند گل چل دیا جاؤں گا سوچا نہ تھا
(محمد فہد.....مظفر گڑھ)

ذوق آگہی

عفان احمد

معلومات

☆ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش آپ کے چچا حضرت ابوطالب نے کی تھی۔

☆ جنگ تبوک ۹ ہجری میں لڑی گئی تھی۔

☆ مشہور و مقبول سماجی بھلائی کی تنظیم ایدھی فاؤنڈیشن کے بانی جناب عبدالستار ایدھی صاحب ہیں۔

☆ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں یکم جنوری 1961 سے اعشاری سکوں کا نظام رائج ہے۔

☆ سلطان محمود غزنوی اپنے والد امیر سبکتگین کی وفات پر بادشاہ بنے۔

☆ خلجی خاندان کے پہلے بادشاہ جلال الدین خلجی علاء الدین خلجی کے چچا تھے۔

☆ "یادوں کی برات" حضرت شبیر احمد خان جوش ملیح آبادی کی سوانح حیات ہے۔

☆ لاہور میں شیش محل مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے بنوایا تھا۔

☆ 1917 میں ملک روس میں کمیونسٹ انقلاب آیا تھا۔

☆ واٹر پول کی ایک ٹیم میں سات کھلاڑی ہوتے ہیں۔

(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....ملیر کالونی، کراچی)

چند مفید مشورے

ایک آدمی جس نے دھوپ کے چشموں والی عینک لگائی ہوگی اور کسی قسم کا کوئی چہرے پر ردِ عمل نہ ہوگا، سپاٹ چہرہ۔ سمجھ جائیں وہ ڈاکٹر ہے۔ اسی طرح چہرے پر بھرپور ردِ عمل نظر آئے گا، خوب صورت چہرہ ہوگا سمجھئے یہ انجینئر ہے۔ اسی طرح جس کے پاس بے تحاشا پیسہ ہو اور عقل ہوگی سمجھئے وہ بزنس مین ہے اور وہ جس کے پاس نہ پیسہ ہے نہ دماغ ہے، نہ ہی چہرہ ایسا لگ رہا ہے لیکن زبردست اخلاق والا معلوم ہوتا ہے سمجھ جائیے وہ یقیناً آرمی کا بندہ ہے۔

اعتماد کی انتہا

ایک دفعہ دیہات کے تمام لوگوں نے فیصلہ کیا کہ بارش کے لیے نماز پڑھ کر دعا کی جائے، جس دن نماز پڑھنی تھی تمام لوگ جمع ہو گئے مگر صرف ایک لڑکا چھتری کے ساتھ شامل نماز تھا..... یہ اعتماد ہے۔

۲: ایک بچہ کے احساسات یہ ہیں کہ جب آپ اس کو اُچھالتے ہیں ہوا میں تو وہ ہنستا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آپ اسے پکڑ لیں گے۔ یہ اعتماد کی انتہا ہے۔

۳: ہم سونے سے پہلے کئی قسم کے پلان اور ارادے بناتے چلے جاتے ہیں حالاں کہ اس کی کوئی گارنٹی نہیں کہ صبح زندہ بھی اُٹھیں گے یا نہیں۔ یہ اُمید کی انتہا ہے۔

لطیفہ

ایک خان کے دوست نے ان سے کہا کہ آپ نے اپریل فول منایا؟ ہاں دوست بیوی کے ساتھ۔ ہم نے تین بار طلاق دیا وہ رونے لگی تو ہم نے کہا کہ اپریل فول!!

خوفِ خدا

اذان ہوتی تھی تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کانپنے لگتے تھے رنگ سرخ ہو جاتا تھا۔ کسی نے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا اتنی بڑی ہستی کا بلاوا آیا ہے نامعلوم اس کے فرض ٹھیک سے ادا کر سکوں گا یا نہیں۔

(ابنِ جاوید مقبول.....راولپنڈی)

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

والد کی محبت و شفقت

موت ایک ایسا فلسفہ و تصور ہے جس کے بارے میں ہر ذی روح جانتا ہے۔ یوں تو ہر کسی کی زندگی میں کوئی نہ کوئی متاثر کرنے والی شخصیت ہوتی ہے اس طرح میری زندگی میں بھی میرے والد کی شخصیت ایسی ہے کہ جس کا نقش آج بھی دل پر قائم ہے اور مرتے دم تک اسی طرح قائم رہے گا۔

میرے والد کی شخصیت میرے لیے مشعلِ راہ تھی۔ زندگی کے ہر قدم ہر موڑ پر انہوں نے میری راہ نمائی فرمائی۔ بچپن سے ایک پُر شفقت رویہ' پیار سے سمجھانا اور علم کی طرف راغب کرنا انہوں نے ہی سکھایا۔ ان کی شخصیت ایک بادین' با اصول اور ادبی ذوق رکھنے والی تھی۔

حدیث شریف ہے کہ "ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہے" تو والد کا مرتبہ بھی ماں سے کم نہیں ہے کیونکہ دنیا میں نام اور خاندان کی پہچان ہمیشہ والد کے نام سے ہی ہوتی ہے۔ بچپن کی چاہت سے لے کر پڑھائی' تعلیم و تربیت کا ہر لمحہ ان کی یاد دلاتا ہے۔ انسانوں سے محبت و خلوص کا رشتہ نبھانا اور دوسروں کے کام آنا میں نے ان ہی سے سیکھا ہے۔

ان کے اس دنیا سے جانے کے بعد سے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا میں نے ہر رشتہ کھو دیا ہے۔ ان کی محبت و شفقت سے محرومی کا احساس ہر دم محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں اور نہ ہی ان کو یاد کرنے کے لیے کسی "فادرڈے" کی ضرورت ہے کیونکہ وہ تو ہر لمحہ' ہر وقت ہمارے دل میں رہتے ہیں اور میں اپنے اردگرد ان کے گھنے سائبان کی ٹھنڈک محسوس کرتی ہوں۔

میری ان تمام لوگوں سے گزارش ہے کہ جو لوگ اس نعمت کو اپنے درمیان پاتے ہیں وہ بڑھاپے میں ان کی قدر و احترام کرنا سیکھیں اور ان کو ایک بزرگ کی حیثیت سے اپنے گھر کے سربراہ کے روپ میں ایسے عہدے پر فائز کریں کہ آنے والی نسلیں بھی اس سے فیض یاب ہو سکیں نہ کہ آج کل کے مغرب زدہ لوگوں کی نقل کرتے ہوئے اس عمر میں جب ان کو ہماری خدمت کی ضرورت ہے۔ ہم ان کو ایک کونے میں ڈال دیں یا پھر کسی "اپنا گھر" میں منتقل کر دیں۔ ہمیں کسی چیز کی قدر و اہمیت کا اندازہ ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ چیز ہماری دسترس سے دور ہو جاتی ہے۔

اس لیے میری اس گزارش پر دھیان دیں اور اس نعمت کو حاصل کریں اور ان سے وہ تمام باتیں سیکھ لیں جو وہ آپ کو سکھا کر آپ کی آئندہ زندگی میں ایک لائحہ عمل ترتیب دینے میں مددگار ثابت ہو سکیں۔

آخر میں آپ لوگوں سے پھر التماس ہے کہ والدین کی محبت کو محض "مدرڈے" یا "فادرڈے" تک محدود نہ رکھیں بلکہ زندگی کا ہر لمحہ ان کی محبت و احترام میں گزاریں۔

(فریدہ جیلانی......میر پور خاص' سندھ)

مشورہ

ایک بچے اسد نے اپنے چچا سے پوچھا۔ "انکل کل میں بازار سے صابن کی ٹکیہ لایا۔ اس سے اپنی شرٹ دھوئی تو وہ سکڑ کر چھوٹی ہو گئی' بتائیے میں کیا کروں؟"

انکل نے سوچتے ہوئے بتایا "تم بھی اس صابن سے نہالو۔"

(صباحت......لاہور)

صاف

کالج کی ہیڈ مسٹریس نے شادی کی ایک تقریب سے واپس آ کر اپنی نئی ملازمہ سے پوچھا۔ "فریج کو صاف کیا کہ نہیں؟"

"جی ہاں! بیگم صاحبہ......سب صاف کر دیا ہے

نکال کر انگور اور آم تو بہت مزے دار تھے۔"

(معاویہ......اسلام آباد)

بیمار

ہیڈ پوسٹ آفس پوسٹ ماسٹر نے اپنی زوجہ کو بتایا۔ "میں بیمار ہوں۔ مجھے جانوروں کے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔"

بیوی: "وہ کیوں؟"

شوہر: "روز صبح مرغ کی طرح اُٹھ جاتا ہوں' گھوڑے کی طرح بھاگ کے پوسٹ آفس جاتا ہوں۔ گدھے کی طرح کام کرتا ہوں اور رات کو الّو کی طرح سو جاتا ہوں۔"

(حسن اختر......کراچی)

سیٹ خالی

ایک منطق کے پروفیسر بس میں سفر کر رہے تھے کچھ دیر کے بعد ایک سیٹ خالی ہوئی۔ تب بھی کھڑے رہے تو بیٹھے ہوئے دوسرے پروفیسر نے اشارہ کیا! "جناب سیٹ خالی ہو گئی ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔"

منطق کے پروفیسر صاحب بولے۔ "اس وقت میں بہت جلدی میں ہوں۔ بیٹھنے کا وقت بالکل نہیں ہے۔"

(فرحت اللہ خان......کوئٹہ)

نجات المومنین

ایک دفعہ میں اور حکیم (فقیر محمد چشتی) صاحب موچی دروازے کے اندر ایک امام باڑے میں میر ببر علی انیس یا مرزا دبیر تو نہیں مگر کسی بہادر حسین ارم لکھنوی کا مرثیہ سننے گئے۔ ابھی مجلس شروع نہ ہوئی تھی اور ایک جانب برآمدے میں کچھ طوائفیں جمع ہو رہی تھیں ان میں سب سے نمایاں نجو تھیں۔ کھلا ہوا چمپئی رنگ' سر پر ایک سفید ریشمی دوپٹا جس کے کنارے پر چوڑا انقرئی پلہ لگا ہوا تھا۔ میں نے حکیم صاحب سے کہا ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ ڈبیا کا انگور ہے۔ تشبیہ تھی۔ بہت داد دی پھر فرمایا۔ ذرا میری بھی سنو......عرض کیا۔ کہیے۔ فرمایا۔

خمیرہ گاؤ زباں پہ ورق نقرہ پیچیدہ۔ میں اس طبیبانہ تشبیہ پر پھڑک گیا۔

یہی نجو ایک دن حکیم صاحب کے پاس مطب میں بیٹھی تھی۔ میں جو پہنچا تو حکیم صاحب نے اس سے کہا۔ یہ تمہارے شہر کے بہت بڑے شاعر اور ادیب سالک صاحب ہیں آداب بجالاؤ۔ وہ سرو قد اٹھ کھڑی ہوئی اور جھک کر آداب بجالائی پھر حکیم صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہ لاہور کی مشہور طوائف نجو ہیں۔ آپ اس کوچے سے نابلد سہی لیکن نام تو سنا ہی ہوگا۔ میں نے کہا۔ جی ہاں نام تو سنا ہے لیکن نجو بھلا کیا نام ہوا۔ فرمانے لگے۔ لوگ نجو نجو کہہ کر پکارتے ہیں پورا نام تو نجات المومنین ہے۔ (انتخاب کیا ہے مولانا عبدالمجید سالک کی یاران کہن سے)

(عبدالمجید دین پوری......نوابشاہ)

ایک سے بڑھ کر ایک

ثمرہ اپنے منگیتر آصف کے ساتھ سیر کے لیے باہر جانے لگی تو اسکی ماں عارفہ بیگم نے ثمرہ کو نصیحت کی۔ "اگر آصف تم سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرے تو اسے ہرگز اس کی اجازت نہ دینا۔"

"اور ماما اگر اس نے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کی تو؟" ثمرہ نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

(فرح عادل۔ کراچی)

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

بلیک واٹر

ترجمہ: جریمی سکاہل
ترجمہ: میجر جنرل (ر) شفیق احمد

گزشتہ دنوں پاکستان میں ایک امریکی تنظیم "بلیک واٹر" کی موجودگی اور اس کی ملک دشمن سرگرمیوں کا بڑا چرچا رہا۔ ذرائع ابلاغ چیخ و پکار کرتے رہے کہ یہ کرائے کے قاتل گوریلوں کی ایک پرائیویٹ تنظیم ہے، جو افغانستان میں غیر ملکی فوجوں کے ساتھ ساتھ افغان باشندوں کے خلاف جنگ لڑ رہی ہے اور اس کے ہزاروں ارکان پاکستان میں بھی موجود ہیں، جن کا نہ یہ پتہ ہے کہ کس ملک کے باشندے ہیں اور نہ یہ علم ہے کہ وہ پاکستان میں کیوں آئے ہیں اور کن پراسرار سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ وزیرداخلہ ان کی موجودگی کا انکار کر چکے ہیں، لیکن کئی حکومتی ذرائع نے ان کی تصدیق بھی کی ہے کہ لیکن بلیک واٹر کے حوالے سے ہمارے ذمہ داران کا جو طرزِ عمل اور رویّہ رہا ہے، اس سے نہیں لگتا کہ ہم نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا ہے۔ ایسے میں صحافی دوستوں کی کوششیں قابلِ ستائش ہیں، جو انہوں نے اہلِ وطن کو بلیک واٹر یا XE کی سرگرمیوں سے آگاہ کرنے کے لئے کہیں یا کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے، جب تک پاکستان کی سرزمین ان کے وجود سے پاک نہیں ہو جاتی۔

بلیک واٹر..... پاکستان میں بنیادی طور پر امریکی صحافی جریمی سکاہل کی تہلکہ خیز کتاب "بلیک واٹر" کا ترجمہ ہے۔ جس میں پاکستان کے اندر بلیک واٹر کی خفیہ سرگرمیوں کا احوال ہے۔ اسے عوام الناس کی سہولت کے لئے سابق فوجیوں کی تنظیم ایکس سروس مین کے صدر میجر جنرل (ر) شفیق احمد نے اردو کے قالب میں ڈالا ہے۔

پاکستان میں بلیک واٹر کی خفیہ سرگرمیوں کا احوال لفظ لفظ تجسس، سطر سطر تحیر خیز خوب صورت ناول

آخر کار 82 ایئر بورن ڈویژن کے دستے فلوجا میں داخل ہوئے۔ دوسرے علاقوں کے برعکس فلوجا کے شہریوں نے قابض فوج کے خلاف کسی قسم کے فوری ردِعمل سے گریز کیا اور دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر کاربند رہے۔ یہ پالیسی زیادہ دنوں تک نہ چل سکی۔ قابض فوجیوں کی اوچھی حرکتوں نے انہیں احتجاج پر مجبور کر دیا۔ فوجی گلی کوچوں میں اندھا دھند گاڑیاں دوڑاتے۔ کوئی نیچے آ کر کچلا جائے یا بچ جائے، ان کی بلا سے۔

چیک پوسٹوں پر مقامی لوگوں کو تنگ اور بے عزت کیا جاتا اور بلا اجازت دندناتے ہوئے لوگوں کے گھروں میں جا گھستے اور راہ چلتی عراقی عورتوں کو روک کر پوچھ گچھ کے بہانے بلاوجہ تنگ کرتے یا شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر سرِ عام سڑک پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنا شروع کر دیتے۔ لوگوں کے دلوں میں ان سے نفرت تو پہلے ہی تھی، یہ حرکتیں جلتی پر تیل ثابت ہوئیں اور قابض فوجوں کی شہر میں موجودگی ناقابلِ برداشت ہونے لگی۔ تدبیریں ہونے لگیں کہ یہ کسی طرح شہر کی حدود سے نکل کر باہر کہیں مضافات میں قیام کریں۔

ابھی تدبیریں ہو رہی تھیں اور منصوبے ہی بن رہے تھے کہ ایک صبح اچانک حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ پورے شہر کو خون میں نہلا دیا گیا۔ ہوا یوں کہ جمعہ 25 اپریل کو صدام حسین کی سالگرہ سے چند دن پہلے 82 ایئر بورن بریگیڈ کے سیکڑوں چھاتہ بردار بڑی تیزی سے پورے فلوجا شہر میں پھیل گئے

Pdf by Roadsign

اور اہم عمارتوں پر قبضہ کر کے ہینزل اسٹریٹ میں واقع القاعدہ اسکول کی دو منزلہ عمارت میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کرلیا۔

یہاں پرائمری اور ہائی اسکول کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان میں اشتعال پھیل گیا۔ والدین اور اساتذہ نے کسی نہ کسی طرح حالات کو زیادہ بگڑنے اور دھماکہ خیز بننے سے روکنے کی کوشش کی اور ان کی کوششیں کسی قدر کامیاب بھی رہیں۔

اس دوران شہر میں ایک نئی بات گشت کرنے لگی کہ امریکی سپاہی نائٹ وژن گاگلز پہن کر رات اسکول کی بالائی منزل اور چھت پر چڑھ کر اڑوس پڑوس کی عورتوں کو، جو اپنے گھروں میں اکثر کسی قسم کی چادر اور پردے کے بغیر بے حجابانہ کام کاج میں مصروف ہوتی ہیں، انہیں تاکتے اور جھانکتے ہیں۔ افواہیں پھیلنے پر مقامی عراقی رہنماؤں نے امریکی فوجیوں سے مل کر انہیں صورتِ حال کی نزاکت سمجھاتے ہوئے اسکول کی عمارت خالی کردینے کی درخواست کی۔ ویک اینڈ گزرا، اتوار آیا اور چلا گیا اور سوموار کا دن آ گیا۔ اسکول کی عمارت خالی نہ ہوئی اور 28 اپریل صدام حسین کی 66ویں سالگرہ والے دن بھی کوئی ڈیڑھ سو امریکی فوجی، اسکول میں بدستور موجود تھے۔

رات شہر میں امریکی فوجیوں کی موجودگی اور ناپسندیدہ حرکات کی وجہ سے فلوجا کے شہریوں پر بڑی بھاری تھی۔ مسجد میں امام صاحب نے امریکی قبضے کے خلاف تقریر کی اور اسکول میں رہائش پزیر سپاہیوں کی حرکات پر شدید تنقید کی اور کہا۔

"دشمن طاقت ور ہے۔ مقابلہ کرنا ہے تو کمزوری ظاہر نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں بھی طاقت ور بننا پڑے گا۔"

نماز کے بعد لوگ آنا شروع ہوگئے۔ فلوجا پر امریکی قبضے کے بعد پہلا منظم جلوس اور احتجاجی مظاہرہ ہونا تھا۔ ایک ہفتہ قبل امریکی فوجیوں نے موصل شہر میں فائرنگ کر کے تین مظاہرین ہلاک کر دیئے تھے۔ لیکن فلوجا کے شہری اس سے خوف زدہ نہیں تھے۔ 28 اپریل کی شام ساڑھے چھ بجے بعث پارٹی کے پرانے دفتر کے باہر سیکڑوں لوگ جمع ہوگئے۔ بعث پارٹی کے اس دفتر پر بھی امریکی فوجی قابض تھے اور یہ ان کی کمان پوسٹ تھی۔ اس کے ساتھ جڑا امریکی نواز میئر کا دفتر واقع تھا، جہاں اس وقت مقامی امریکی کمانڈر میٹنگ کر رہا تھا۔ ہجوم "اللہ اکبر" کے نعرے لگا رہا تھا، یا نعرہ بلند ہوتا۔

"صدام حسین نامنظور..... امریکہ نامنظور۔"

فوجی حکام کا دعویٰ ہے کہ ہجوم میں شامل کچھ لوگ ہوائی فائرنگ کر رہے تھے، جو عراق میں احتجاجی مظاہروں کے دوران عام بات ہے۔ لیکن عینی شاہدین کے مطابق اس دن نعرے بازی کے سوا، اس طرح کا کوئی واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں۔ لیفٹیننٹ کرنل ایرک فانٹز نے اس اجتماع کو قانون کی خلاف ورزی اور فوج کے خلاف بغاوت قرار دیتے ہوئے لاؤڈ اسپیکر پر مظاہرین کو سختی سے منتشر ہونے کا حکم دیا۔ ہجوم میئر کے دفتر کے سامنے سے ہٹ گیا اور آہستہ آہستہ شہر کی گلیوں کی طرف چلنے لگا۔ لوگ تھے کہ ان کی تعداد ہر لحظہ برابر بڑھتی جا رہی تھی اور امریکہ مخالف نعروں میں بھی تلخی اور شدت آتی جا رہی تھی۔ القاعدہ اسکول تک پہنچتے پہنچتے ہجوم کے شرکاء کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ہجوم میں کسی نے قابض فوج کو چڑانے کے لیے صدام حسین کی ایک بڑی سی تصویر لہرائی اور نعرہ لگایا۔

"اللہ اکبر..... اللہ سے بڑا کوئی نہیں۔ امریکہ

اللہ کا دشمن ہے۔ ہمیں نہ صدام چاہیے، نہ بش۔ امریکیوں کا کام ختم ہوگیا۔ اب انہیں واپس چلے جانا چاہیے۔"

ہجوم ہینزل اسٹریٹ میں کھڑا نعرے لگا رہا تھا اور امریکی، اسکول کی بالائی منزل سے ان پر گنیں تانے مورچہ بند تھے۔ اور پھر بقول کرنل فانٹز، ہجوم میں سے کسی عراقی نے امریکی سپاہی کو پتھر مار کر زخمی کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسکول کا علاقہ میدانِ کارزار کا منظر پیش کرنے لگا۔

پہلے ہجوم پر دھوئیں کے گولے پھینکے گئے اور اس کے ساتھ ہی فائرنگ شروع ہوگئی اور گولیاں ہجوم پر اولوں کی طرح برسنے لگیں۔ احمد کریم، جس کی ران میں گولی لگی تھی، اس نے بتایا، ہجوم نہتا تھا۔ ہم اسکول کے سامنے امریکی کمانڈر کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لیے جمع تھے کہ فوجیوں نے بغیر کسی قسم کی پیشگی وارننگ اور اشتعال کے، ہم پر فائرنگ شروع کردی۔ ہمارے پاس صدام حسین کی ایک تصویر ہی تو تھی، کوئی اسلحہ نہیں تھا۔

چند لمحوں کے اندر اندر سڑک پر لاشوں اور زخمیوں کا ڈھیر لگ گیا جن میں بچے، بوڑھے، جوان سبھی شامل تھے۔ اور صورتِ حال خاصی ڈراؤنی اور اندوہناک ہوگئی۔ ہیوی آٹومیٹک مشین گنوں سے مسلسل فائرنگ ہوتی رہی۔ اجتماعی فائرنگ کا سلسلہ ختم ہوا تو امریکی سپاہیوں نے انفرادی طور پر بچے کھچے لوگوں کو نشانہ بنانا شروع کردیا۔ زخمیوں کی امداد یا لاشیں اٹھانے کے لیے اسپتال کا عملہ آیا تو اسے ڈرا دھمکا کر بھگا دیا گیا۔

ایک خاتون نے اس دن کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ہم اپنے گھر میں بیٹھے تھے کہ فائرنگ کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ میرے میاں نے اٹھ کر جلدی سے دروازہ بند کرنا چاہا کہ بچے کمرے سے باہر نہ نکلیں اور اس کوشش میں وہ خود گولی کا نشانہ بن گئے۔ ان کا گھر اسکول کے قریب تھا اور خود اسے بھی ٹانگ میں گولی لگی۔

اس رات 75 آدمی زخمی اور کم از کم 13 ہلاک ہوئے۔ مرنے والوں میں چھ معصوم بچے تھے۔ انچارج کرنل نے بیان جاری کیا، امریکی فوجیوں نے مظاہرین کو جوابی فائرنگ کر کے منتشر کرنے میں کمال مہارت کا مظاہرہ کیا۔

اس دوران اگر کوئی گولی لگنے سے ہلاک یا زخمی ہوا ہے تو ہمیں افسوس ہے۔ فلوجا پر گزرنے والی قیامت کے بارے میں امریکی ترجمان کا بیان سامنے آتے ہی اس پر تنقید شروع ہوگئی اور شکوک و شبہات کا اظہار ہونے لگا۔ اور جب ذرائع ابلاغ کے نمائندوں نے جائے واردات پر پہنچ کر اپنے طور پر حالات کا کھوج لگایا تو امریکیوں کے جھوٹ کا پول کھل گیا اور ایک دنیا پر امریکی فوجیوں کی بہیمیت اور بربریت واضح ہوگئی۔

لندن کے دی انڈی پینڈنٹ کے نامہ نگار فل ریفس نے اپنی رپورٹ میں لکھا:

"اسکول کی عمارت پر سامنے کے رخ کسی قسم کا کوئی سوراخ نہیں جس سے یہ تاثر مل سکے کہ ہجوم نے اس عمارت میں مورچہ بند امریکی فوجیوں کے خلاف کسی قسم کا آتشیں اسلحہ استعمال کیا ہے۔ جبکہ مخالف سمت میں واقع گھروں کی دیواریں اور دروازے مشین گن کے فائر سے بری طرح چھلنی ہیں اور جگہ جگہ سے ہاتھ ہاتھ جتنے لمبے کنکریٹ کے ٹکڑے غائب اور پلستر اُکھڑا ہوا ہے۔"

کچھ ایسی ہی رپورٹیں انسانی حقوق کی انجمنوں اور عالمی تنظیموں نے دیں۔ امریکہ کو لوگوں کے دل

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

اور دماغ جیتنے کی تھوڑی بہت جو اُمید تھی، وہ بھی اس واقعے کے بعد جاتی رہی۔ اگلے دن مرنے والوں کے جنازے اُٹھے تو پورے شہر میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ ایک مقامی اسپتال کی ایمرجنسی وارڈ پر کسی نے عراق کا خون آلود پرچم لہرا دیا، جہاں ڈاکٹر، زخمیوں کو بچانے کی سرتوڑ کوششوں میں مصروف تھے۔ فلوجا کے اس قتل عام پر ہر چہرہ غم زدہ اور ہر آنکھ اشک بار تھی۔ لیکن حوصلے اب بھی جوان تھے۔ احمد حسین اسپتال میں اپنے اٹھارہ سالہ زخمی بیٹے کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اسے پیٹ میں گولیاں لگی تھیں اور ڈاکٹروں کے خیال میں اس کا زندہ بچنا محال تھا۔ بوڑھا باپ اب بھی فضا میں بازو لہرا لہرا کر کہہ رہا تھا کہ ہم چپ نہیں بیٹھیں گے۔ یا تو وہ خود فلوجا چھوڑ جائیں گے یا ہم انہیں فلوجا سے نکال پھینکیں گے۔

میڈیا کے کچھ حصوں نے اس سانحے کا موازنہ 1972ء کے قتل عام، جو بعد میں خونی اتوار کے نام سے معروف ہوا، سے کیا۔ تب برطانوی فوجیوں نے آئرلینڈ کے کیتھولک مظاہرین پر فائرنگ کر کے 13 آدمی مار دیئے تھے اور یہی واقعہ بعد میں آگے چل کر آئرش ری پبلکن آرمی کے قیام اور اس کی سرگرمیوں کی بنیاد بنا۔

بدھ کی صبح ہوئی تو ہزاروں آدمی امریکی فوجیوں کے ہاتھوں اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کے قتل پر احتجاج کے لیے سڑکوں پر نکل آئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ امریکی فوجی فلوجا شہر سے نکل جائیں۔ اس مظاہرے کا اختتام بھی کل کی طرح مظاہرین پر امریکی فوجیوں کی فائرنگ اور خون خرابے پر ہوا۔ چار آدمی ہلاک اور پندرہ زخمی ہوئے۔ ایک لاش کی تدفین کے موقع پر امام صاحب نے امریکہ کے دوغلے پن کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

''ہم سمجھتے تھے، ہمیں احتجاج کرنے کی آزادی ہے۔ لیکن گولیوں سے ہمارا استقبال ہوا۔ یہ آزادی نہیں۔ اپنے لیے آزادی کا معیار الگ، ہمارے لیے الگ۔ یہ دوغلا پن کیوں؟ کیا بش اس طرح ہمیں آزادی اور چھٹکارا دلانا چاہتا ہے؟ ہمیں بش منظور نہیں۔ نہ ہم اس کی دی ہوئی آزادی چاہتے ہیں۔ اپنی آزادی عراقی خود لائیں گے۔

فلوجا میں امریکی فوجیوں کی فائرنگ کے دوسرے راؤنڈ کے چند گھنٹے بعد ڈیفنس سیکرٹری رمیز فیلڈ، بصرہ ایئرپورٹ پر اُترا اور اپنے بیان میں کہا۔ ''ہم نے ایک ظالم و جابر ڈکٹیٹر کے پاؤں تلے دبے ذہین، پُرعزم اور پُرجوش عوام کو ایک نئی زندگی اور آزادی دی ہے، جو بڑی اچھی بات ہے۔

دوسری طرف فلوجا میں اس لمحے امریکی فوجیوں نے القاعدہ اسکول خالی کر کے بعث پارٹی کے پرانے دفتر کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ رات کے وقت کسی ستم ظریف نے ایک قریبی دیوار پر ایک بینر آویزاں کر دیا، جس پر موٹے موٹے الفاظ میں لکھا تھا:

''امریکی قاتلو! جلد یا بدیر ہم تمہیں ٹھڈے مار کر یہاں سے نکال پھینکیں گے۔''

اس رات صدام حسین جو تا حال روپوش تھا، کا ایک خط بھی منظر عام پر آیا۔ اس نے لکھا تھا:

''اس وقت ہم سب کی ایک ہی ترجیح ہے۔ امریکی غاصبوں کو اپنے ملک سے نکالنا ہے۔ ان چوروں، لٹیروں اور قاتلوں سے ہاتھ ملانے اور دوستی کرنے والا، ملک کا غدار ہے۔ کوئی خود دار اور غیرت مند عراقی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

اسی رات کسی نے نئے امریکی ہیڈ کوارٹر میں ایک دستی بم پھینک دیا۔ جس سے سات امریکی فوجی بری طرح زخمی ہو گئے۔

فلوجا میں پیش آنے والے واقعات کی بازگشت جلد ہی عراق سے نکل کر پوری عرب دنیا میں پھیل گئی۔ فلوجا کی مزاحمت، بہادری اور جرأت کے نئے نئے قصے، ترانے اور نغمے تخلیق ہوئے۔ سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز تیار ہو کر مارکیٹ میں آ گئیں۔ فلوجا میں پیش آنے والے قتل و غارت کی فوٹیج شامل کر کے عربی رزمیہ فلمیں تیار کر لی گئیں اور فلوجا کے گلوکار صبیح الاہاشم کی آواز میں گائے گیت زبان زد عام ہو گئے۔ اُس کے اس نغمے نے بالخصوص سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ ''فلوجا..... ان کے فوجیوں پر ٹوٹ پڑو..... ان کے زخمی سپاہیوں کو بچانے کوئی نہیں آئے گا..... تمہیں فلوجا کون لایا..... بش؟..... ہم تم کو موت کا جام پیش کریں گے۔''

ایک اور جگہ یوں نغمہ سرا ہوا:

''فلوجا کے باسی چیتے کی مانند اپنے دشمن پر جھپٹتے ہیں۔''

یہ غیبی آواز ایک سال سے بھی کم مدت میں اس وقت بالکل سچ ثابت ہوئی، جب بلیک واٹر کے چار اہلکار فلوجا کے مرکزی بازار میں ان کے ہتھے چڑھے۔ اس دوران واشنگٹن ڈی سی کے مضافات میں ایک نام نہاد، خود ساختہ ٹیررائیسٹ ایل پال بریمر بغداد جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا، جہاں اسے بش کے نمائندے کی حیثیت سے عراق کا انتظام سنبھالنا تھا اور ایرک پرنس کو بغداد میں بش کے اس کارندے کی ذاتی سیکورٹی کی خاطر اپنے پرائیویٹ فوجی مہیا کرنے تھے۔

✿✿✿

عراق پر حملے کے وقت بش انتظامیہ کی کوشش تھی کہ امریکہ کے زیر اثر ملکوں کا ایک ایسا اتحاد قائم ہو جائے، جو عراق کے خلاف جنگ میں اس کا ساتھ دے اور بعد ازاں وہاں قبضہ مستحکم کرنے میں بھی اس کی مدد کرے۔ یہ کوشش توقع کے برعکس زیادہ کامیاب نہ ہو سکی تو واشنگٹن نے تیسری دنیا کے غریب، پسماندہ اور ترقی پزیر ملکوں کا رخ کیا اور وہاں سے ہنگامی بنیادوں پر کرائے کے فوجی بھرتی کر کے اپنی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کی، جو کامیاب رہی۔ یہ بھرتی زیادہ تر ایسے ملکوں سے کی گئی جن کی سیکورٹی اور فوجی فورسز کا ریکارڈ اور شہرت بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کے حوالے سے خاصی ''تابناک اور شاندار'' تھی۔ ہالی برٹن، بیچٹل اور فلور جیسی عراق میں موجود دوسری بڑی تعمیراتی کمپنیوں نے اپنی ضروریات کے لیے ترقی پزیر ملکوں سے الگ بڑی تعداد میں ورکر بھرتی کیے، جس سے عراق میں مختلف نسلوں اور علاقوں کے لوگ جمع ہو گئے۔

جن ملکوں کو اپنی فوجیں لڑنے کے لیے عراق بھیجنے میں کچھ تامل اور تردد تھا، انہیں امریکہ اپنا ساتھ دینے کی ضرورت پر مائل اور آمادہ نہ کر سکا، وہاں امریکہ نے غریب اور بے روزگار افراد کو بھاری بھرکم پُرکشش معاوضوں کا لالچ دے کر ساتھ ملا لیا۔ یہ معاوضے اُن کی توقع اور وہم و گمان سے کہیں زیادہ تھے۔ دوسری سیکورٹی کمپنیوں اور ایجنسیوں کے مقابلے میں جو عام سیکورٹی پروجیکٹس کے لیے سستی لیبر بھرتی کرتی تھیں، بلیک واٹر کی ساکھ اور شہرت اچھی تھی۔ اسے ایک اوّل درجہ کی سیکورٹی ایجنسی سمجھا جاتا تھا جو زیادہ تر اعلیٰ حکومتی اور سفارتی عہدیداروں کی سیکورٹی کے لیے گارڈز بھرتی کرتی تھی۔ بلیک واٹر کی یہ نیک نامی اور شہرت بغداد سے نکل کر واشنگٹن تک پہنچی تو عام امریکی بھی جذبہ حب الوطنی کے تحت اس کے کام کو

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

سراہنے لگے کہ یہ ہماری جنگ جیتنے میں امریکی فوجوں کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔ لیکن عراق میں سیکورٹی کی ذمہ داریوں کا دائرہ تھا کہ برابر بڑھتا اور پھیلتا جا رہا تھا، جس سے یہ خرابی پیدا ہوگئی کہ بہت سے مشکوک اور جرائم پیشہ ماضی کے حامل افراد بھی غیر محسوس طور پر خاموشی سے کرائے کے ان فوجیوں کی صفوں میں شامل ہوتے گئے، جو آگے چل کر بلیک واٹر کی بدنامی کا باعث بنے۔

امریکہ میں غیر ملکی فوجیوں کو تربیت دینا اور ملکی پالیسیوں کے مطابق انہیں خفیہ اور مخصوص آپریشنوں کے لیے تیار کرنا کوئی نئی اور اچنبھے والی بات نہیں۔ لاطینی امریکہ میں یو ایس آرمی کا اسکول، جس کا نیا نام 2001ء سے ویسٹرن ہیمیسفیر انسٹی ٹیوٹ برائے سیکورٹی کوآپریشن رکھ دیا گیا ہے، اس کے قیام کے چھ سے زائد عشروں کے دوران لاطینی امریکہ کے ساٹھ ہزار سے زیادہ فوجی وہاں سے جنگ کے مختلف شعبوں از قسم نشانہ بازی، انٹیلی جنس، دشمن کے علاقے میں افراتفری اور انتشار پھیلانے، تفتیش میں نفسیاتی حربوں کے استعمال اور گوریلا کارروائیاں کرنے کی تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ایک رپورٹ کے مطابق اس اسکول کے فارغ التحصیل فوجی اکثر اغواء، قتل اور تشدد جیسے سنگین جرائم کے لیے بدنام ہیں اور انہیں بنیادی انسانی حقوق کی بھی کوئی زیادہ پروا نہیں ہوتی۔

1980ء سے 1990ء کی دہائی میں دھاندلی کی مکروہ جنگوں میں امریکہ سرگرمی سے ملوث رہا۔ کہیں اسلحہ، تربیت اور کہیں ڈالر فراہم کر کے تاکہ جہاں بھی اس کے مفادات کے خلاف کوئی مقبول عوامی تحریک اور احتجاج بلند ہو، اسے سختی سے کچل دیا جائے۔ عراق کی جنگ میں اور قبضے کے دوران پرائیویٹ شعبے میں غیر ملکی فوجوں کے زیادہ بڑے پیمانے پر استعمال اور تربیت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ لاطینی امریکہ کے ملک امریکی سرپرستی اور ایئر بار سے کام کرنے والے موت کے دستوں اور ظلم و جبر کی پالیسیوں کا شکار چلے آ رہے تھے اور ان کے عوام اور حکومتیں 2003ء کے عراق حملے کے خلاف تھیں۔ لیکن شومئی قسمت، جب عراق میں جنگ چھڑی تو وہی علاقے عراق کی جنگ کے لیے تیار کیے جانے والے کرائے کے فوجیوں کے نئے ریکروٹنگ اور ٹریننگ سنٹر بن گئے۔

غیر ملکی فوجیوں کا سب سے بڑا دستہ جو بلیک واٹر نے عراق بھجوایا، وہ چلی کے گوریلوں پر مشتمل تھا، جن میں سے کچھ چلی کے بدنام زمانہ فوجی آمر جنرل پنوچیٹ کے تربیت یافتہ تھے یا اس کے دور میں چلی کی فوج میں خدمات انجام دیتے رہے تھے۔ یہ ایک ہزار کے لگ بھگ چلین گوریلے کس طرح عراق پہنچے، یہ بھی کسی ڈرامائی کہانی سے کم نہیں۔ ایرک پرنس نے چلی میں بلیک واٹر کو پروموٹ کرنے کے لیے چلی کے ایک سابق فوجی سے رابطہ کیا، جو جنرل پنوچیٹ کا ایک جیالا افسر تھا اور 1990ء میں بطور ترجمان لاطینی امریکہ میں امریکی سفارت خانے میں کام کر رہا تھا۔ امریکی سفارت خانے میں آنے سے قبل وہ ایک عرصہ تک امریکہ کی اسلحہ ساز کمپنیوں اور لاطینی امریکہ کی حکومت کے درمیان رابطے اور پُل کا کام کرتا رہا تھا۔ 2003ء میں جب عراق پر امریکی حملہ شروع ہوا تو پیزارو کو بلیک واٹر یو ایس اے کا پتہ چلا اور اس نے چند دنوں کے اندر اندر کئی سو لاطینی امریکی بڑے کم معاوضے پر بلیک واٹر اور عراق میں کام

کرنے والی دوسری پرائیویٹ ملٹری فرموں کے لیے کرائے کے فوجی کے طور پر بھرتی کر لیے اور یوں چلی میں بلیک واٹر کا پیش رو ٹھہرا۔ پیزارو نے بعد میں اپنے ایک طویل انٹرویو میں بتایا کہ لاطینی امریکہ کے نقطہ نظر سے میری کہانی ناقابلِ فہم لگتی ہے، لیکن ایک امریکی کے نقطہ نظر سے یہ امریکہ کی کامیابی کی کہانی ضرور ہے۔ پیزارو جو اپنے آپ کو مائیک کہلانا زیادہ پسند کرتا ہے، اس کے پاس امریکہ اور چلی دونوں ملکوں کی شہریت ہے۔ وہ 1968ء میں لاس اینجلس میں پیدا ہوا تھا جہاں اس کا باپ پیرا ماؤنٹ پکچرز میں بطور آرٹسٹ کارٹون فلموں کے کرداروں کے اسکیچ بنانے پر مامور تھا۔ 1971ء میں چلی میں انتخابات ہوئے اور ایک مارکسی امیدوار سلواڈور ایلین ڈی ملک کا صدر منتخب ہو گیا۔ انہی دنوں پیزارو اپنی فیملی امریکہ چھوڑ کر اپنے آبائی قصبے سان تیاگو میں لوٹ آئی تھی۔ دو سال بعد ہی ایلین ڈی کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور دنیا کا بدنام ترین آمر امریکہ کی مرضی اور مدد سے اقتدار پر قابض ہو گیا۔ ایلین ڈی نے جس وقت چلی کے صدر کا انتخاب لڑنے کا اعلان کیا تھا، وہ گزشتہ 25 برسوں سے چلی کی سینیٹ کا رکن منتخب ہوتا چلا آیا تھا۔ اس نے چلی کے عوام کی حالت سدھارنے اور انہیں ایک بہتر اور روشن مستقبل دینے کے وعدے اور دعوے پر صدارتی انتخاب میں حصہ لیا اور کامیاب ٹھہرا تھا۔ باوجود یہ کہ اس کے حریف کی پشت پر دائیں بازو کی تمام جماعتیں تھیں اور انہیں سی آئی اے اور کئی معروف غیر ملکی بڑی بڑی کمپنیوں کی سپورٹ بھی حاصل تھی۔ ایلین ڈی کا صدر منتخب ہونا چلی کی سیاسی تاریخ کا بڑا اہم اور تاریخی واقعہ تھا، جو امریکہ اور اس کے حواریوں کو ہضم نہ ہو سکا۔ امریکی سیکرٹری اسٹیٹ ڈین رسک کے مطابق چلی جیسے ایک امریکی ملک میں کسی کٹر مارکسی کا صدر منتخب ہونا سب کے لیے لمحہ فکریہ تھا۔ واشنگٹن میں اقتدار کے ایوانوں کی پریشانی فطری تھی۔ معروف امریکی کمپنیاں، جنہوں نے انتخاب میں ایلین ڈی کے مخالف امیدوار کی حمایت میں مہم چلائی اور رات دن ایک کر دیا تھا، وہ اس کے صدر منتخب ہو جانے سے چلی میں پھیلے اپنے کاروبار کی وجہ سے الگ پریشان تھیں۔ یہ نکسن کا عہد تھا۔ وائٹ ہاؤس میں چلی کے منتخب صدر کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں، جس میں طاقت ور امریکی میڈیا نے بھرپور کردار ادا کیا۔ بنیادی انسانی حقوق کی پاسداری نہ کرنے کا الزام عائد کر کے امریکہ نے چلی کے خلاف اقتصادی پابندیاں لگا دیں۔ صدر نکسن نے ہدایات جاری کیں، چلی کی معیشت کی چیخیں نکال دی جائیں۔ 1973ء تک چلی ہڑتالوں اور احتجاجی جلسے جلوسوں کی گرفت اور لپیٹ میں آ گیا۔ پروپیگنڈا اہم تیز ہو گئی یہاں تک کہ ایلین ڈی کی حکومت ختم ہو گئی اور 11 ستمبر 1973ء کی صبح چلی کی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل پنوچیٹ نے ملٹری ایکشن کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور ایلین ڈی نے خودکشی کر کے اپنی زندگی ختم کر لی۔ انقلاب کے دو دن بعد کی تاریخ میں وائٹ ہاؤس سے ایک خفیہ تار برقی پیغام جاری ہوا۔ ''ہم جنرل پنوچیٹ کو چلی کی خواہشات اور اُمنگوں کے ساتھ برسر اقتدار آنے پر خوش آمدید کہتے ہیں اور یہ امید کرتے ہیں کہ ان کے عہد میں امریکہ اور چلی کے تعلقات مزید گہرے اور مضبوط ہوں گے۔''

جنرل کا اقتدار سترہ سال تک چلا۔ اس دوران عام شہریوں اور مخالفین کے ساتھ جو سلوک روا رکھا

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

گیا، اس کی تفصیلات رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہیں۔ چلی بھر میں کہیں بھی کسی کی عزت، جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی۔ پیزارو اسی جنرل کے عہد میں پلا بڑھا، جوان ہوا اور پھر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس طرح یہ اس عہد میں روا رکھے جانے والے اکثر انسانیت سوز واقعات کا اہم کردار بھی رہا۔

پیزارو کو انگریزی کے علاوہ فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں پر بھی عبور تھا 1991ء میں قومی ملٹری اکیڈمی سے سیکنڈ لیفٹیننٹ بن کر نکلا تو اپنی اس ''زبان دانی'' کی وجہ سے مختلف یونٹوں میں بطور ترجمان فرائض انجام دیئے۔ جب بھی کوئی غیر ملکی فوجی وفد آتا اور چلی کا کوئی جنرل اپنے ہم منصب غیر ملکی سے ملاقات کے لیے جاتا تو پیزارو بطور ترجمان اس کے عملے میں موجود ہوتا۔ 1995ء میں اس کی ایک امریکی افسر سے ملاقات ہوئی، جس نے آگے چل کر دوستی کی شکل اختیار کر لی۔ یہ امریکی پانامہ سے لے کر گلف وار تک کئی معرکوں میں حصہ لے چکا تھا اور جب کبھی وہ اپنی کسی مہم کا احوال سناتا تو پیزارو بڑا متاثر ہوتا اور اسے اپنی زندگی اس کے مقابلے میں بڑی پھیکی اور بے رنگ سی لگنے لگتی اور اس کا دل چاہنے لگتا کہ وہ بھی امریکی فوج کا حصہ بن کر ملک ملک گھومے پھرے۔ اور پھر ایک دن قسمت سے اسے یہ موقع مل گیا۔ اس کے پاس امریکی شہریت بھی تھی، جو امریکی فوج میں بھرتی ہونے کے لیے اس کے کام آئی۔ ابتدائی تربیت کے بعد فورٹ ناکس کے یو ایس آرمر اسکول سے 1996ء میں گریجویشن کی تو کمانڈر نے اپنے دفتر میں بلوایا اور پوچھا۔ تم چلی کی فوج میں بھی رہے ہو؟ اثبات میں جواب ملنے پر اگلا سوال ہوا۔ ہسپانوی بھی بول لیتے ہو؟

پیزارو نے کڑک کر جواب دیا۔ جی ہاں..... انگریزی کی نسبت کہیں اچھی۔''

''بہت خوب! ہمارے پاس تمہیں اسے آزمانے کا خوب موقع ملے گا۔''

ملاقات ختم ہوئی اور اُسے شمالی کیرولینا میں کیمپ لی جیون بھیج دیا گیا۔ پیزارو کا کہنا ہے کہ اگلے تین برسوں میں اسے یو ایس سدرن کمانڈر کے ساتھ ترجمان کے طور پر لاطینی امریکہ کے طول و عرض میں گھومنے کا موقع ملا۔ وہ صرف بولیویا نہیں جا سکا۔ وگرنہ اس کی یونٹ فوجی مشقوں کے لیے جہاں گئی، وہ بطور ترجمان اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ اس دوران اسے غیر ملکیوں کے ساتھ امریکیوں کے تعلقات اور معاملات طے کرنے اور ان کی نفسیات کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ یو ایس سدرن کمانڈ کے ساتھ تین برس گزارنے کے بعد پیزارو نے سوچا کہ اپنے علم اور تجربے کو پرائیویٹ سیکٹر میں آزمایا جائے چنانچہ 1999ء میں اس نے امریکہ کی ایک بڑی اسلحہ ساز فرم جنرل ڈائنامیکس کو اپنی خدمات پیش کیں۔ امریکی فوج کے ساتھ رہ کر اس نے لاطینی امریکہ میں جو دوستیاں بنائیں اور تعلقات استوار کیے تھے، ان کی وجہ سے اسے جنرل ڈائنامیکس میں ایک اعلیٰ عہدہ مل گیا اور اس کے تعلقات کی بدولت اس علاقے میں جنرل ڈائنامیکس کو اپنی مارکیٹنگ اور سیل بڑھانے کا سنہری موقع ملا۔ پیزارو کو لاطینی امریکہ کی حکومتوں کی اسلحہ کی ضرورتوں اور اس کے لیے درکار اور موجود بجٹ کا بخوبی اندازہ تھا۔ اس لیے ہر سودا بڑا ناپ تول کر کرتا۔ جلد ہی کمپنی نے اسے اپنے لاطینی امریکہ کے شعبے کا انچارج بنا دیا۔ اس حیثیت میں وہ آٹومیٹک گرینیڈ لانچر، راکٹ اور مشین گن اور اسی

قسم کے دوسرے خود کار اسلحہ کی فروخت کے معاملات کا نگران تھا۔ پیزارو نے ڈیڑھ سال جنرل ڈائنامیکس کے ساتھ گزارا اور اس دوران اس نے مختلف سودے کر کے اتنا کمیشن اکٹھا کر لیا اور تنخواہ سے پس انداز کر لیا کہ اس نے 2001ء میں خود سے اپنی الگ کمپنی قائم کر لی اور کسی دوسری کمپنی کے ساتھ کام کرنے کے بجائے خود اپنی کمپنی میں کام کرنے لگا۔ اس کا نام اس نے ریڈ ٹیکٹیکا (ٹیکٹیکل نیٹ ورک) رکھا۔ یہ کمپنی لاطینی امریکہ کی حکومتوں اور امریکی اسلحہ ساز کمپنیوں کے درمیان رابطے اور پُل کا کام کرتی تھی۔ لاطینی امریکہ کے ہر ملک کا اپنا ایک ملٹری اتاشی ہوتا، ایک نیول اتاشی ہوتا، ایک ایئر فورس اتاشی ہوتا اور ایک پولیس اتاشی۔ ہر ایک کی ضرورت مختلف تھی۔ پیزارو مختلف سفارت خانوں میں پہنچ جاتا اور متعلقہ اتاشی کے کمرے میں دستک دے کر بے تکلفانہ اندر گھس جاتا اور اپنا آموختہ شروع کر دیتا۔ مثلاً نیول اتاشی کے کمرے میں اُس کا انداز یوں ہوتا۔

''جنابِ عالی! میں جانتا ہوں آپ کو بہترین آب دوز کی تلاش ہے، تارپیڈو چاہئے، ریڈار کی ضرورت ہے، مواصلاتی نظام چاہئے۔''

ملٹری اتاشی اور ایئر فورس اتاشی کے سامنے وہ ان کی دلچسپی اور ضرورت کی اشیاء کے نام گنواتا اور تان اس بات پر ٹوٹتی۔

''ہم آپ کی مدد اور خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ موقع عنایت کریں، کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ قیمت اور معاوضہ بھی بڑا مناسب اور معقول ہوگا۔''

اپنی چرب زبانی سے وہ کچھ ایسا ماحول تخلیق کر دیتا کہ ایک آدھ ملاقات کے بعد ہی 'دوستی' ہو جاتی اور اسلحہ کی مختلف آئٹمز سپلائی کرنے کے آرڈرز مل جاتے۔

2001ء میں پیزارو نے ریڈ ٹیکٹیکا کے نام سے اپنی الگ کمپنی قائم کر لی۔ یہ کمپنی لاطینی امریکہ کی حکومتوں کو امریکہ کی اسلحہ ساز کمپنیوں سے متعارف کراتی اور سامانِ حرب وضرب کی خریداری کے بڑے بڑے سودوں کی ڈیل کرانے میں رابطے اور پُل کا کام کرتی۔ امریکہ میں ہر ملک کا سفارت خانہ موجود تھا جہاں ڈیفنس اتاشی بھی تعینات تھے اور جو اپنے اپنے متعلقہ شعبوں کے معاملات دیکھتے۔ پیزارو نے جلد ہی تقریباً تمام ہی ڈیفنس اتاشیوں کے ساتھ کاروباری تعلقات استوار کر لیے۔ چنانچہ بری، بحری یا فضائی فوج کے کسی شعبے کے لیے جب بھی جدید اور خود کار اسلحہ کی خریداری کا موقع آتا، پیزارو آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کر دیتا۔ اس کا کمال یہ تھا کہ وہ نہ صرف ہر لاطینی امریکہ کے ملک کے اسلحے کی خریداری کی ضرورت سے آگاہ تھا بلکہ اس کے بجٹ پر بھی پوری نظر رکھتا اور پارٹی کو اس کی بجٹ رینج کے مطابق اس کی پسند کے سامان کی خریداری کرواتا۔ اس طرح اس نے ریڈار، حفاظتی سسٹم، رائفلیں، ملٹری ہارڈ ویئر اور دیگر جدید اسلحہ کی خریداری میں لاطینی امریکی ملکوں کی بڑی مدد کی اور خوب پیسہ بنایا۔ اس نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ یورپی اور امریکی کمپنیوں کو بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اسلحے کا تاجر نہیں، اسلحے سے متعلق معلومات اور سوجھ بوجھ کا بیوپاری ہوں اور اپنا علم اور معلومات بیچتا ہوں۔ آپ مجھے تین ماہ تک دس ہزار ڈالر ماہانہ دیتے رہیں، میں آپ کو اپنی تجارتی سوجھ بوجھ دوں گا اور آپ کے سیلز کے لوگوں کو بتاؤں گا کہ سودے کس طرح کرائے جاتے ہیں، انہیں کس وقت کس دفتر

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

جانا ہے اور کس افسر کے گھر کب، کتنی بار اور کتنی دیر تک دستک دینی ہے۔

دوسروں کو اپنی یہ تجارتی سوجھ بوجھ بیچ کر پیزارو نے ایک معقول رقم اکٹھی کر لی تو 2003ء میں ریڈ ٹیکٹیکا کے روزمرہ کے معاملات عارضی طور پر پارٹنرز کو سونپ کر زندگی، فرصت اور دولت کی فراوانی انجوائے کرنے لگا۔ فروری 2003ء میں امریکہ نے عراق پر حملے کی تیاریاں شروع کیں تو سی این این میں ہسپانوی زبان کے شعبے کے ایک دوست پروڈیوسر نے پیزارو کو دعوت دی کہ واشنگٹن آ کر چینل کو جوائن کر لے اور سی این این کے لیے ہسپانوی زبان میں جنگ پر رواں تبصرہ شروع کرے۔ سی این این کے ہیڈ کوارٹر اٹلانٹا میں ایک ماہ کی مختصر سی تربیت کے بعد کام شروع کر دیا گیا۔ معقول معاوضے کے ساتھ دن میں کئی بار ٹی وی اسکرین پر لوگوں کے سامنے نمودار ہوتا۔ اس کا اپنا چارم تھا۔ پیزارو ٹک گیا۔ اس دوران ریڈ ٹیکٹیکا کے معاملات خودکار نظام کے تحت خوش اسلوبی سے چلتے رہے۔

اٹلانٹا میں قیام کے دوران پیزارو کی ملاقات ریٹائرڈ جنرل ویزلے کلارک سے ہوئی' جو ماضی میں نیٹو افواج کا ایک سپریم الائیڈ کمانڈر تھا اور مستقبل کا 2004ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے صدر کے عہدے کا امیدوار۔ ان دنوں ویزلے کلارک بھی سی این این پر رواں تبصرے اور تجزیے پیش کیا کرتا تھا۔ پیزارو کو اس سے اپنے ہسپانوی تبصروں کی تیاری میں بڑی مدد ملی۔ ویزلے کلارک کا شعبہ انگریزی تھا۔ پیزارو کو اگر کہیں مشکل پیش آتی تو وہ ویزلے کلارک کے انگریزی تبصرے اور تجزیے ہسپانوی زبان میں ڈھال کر اپنی طرف سے پیش کر دیتا۔

پیزارو کا تعلق سی این این کے ساتھ اپریل کے آخر تک برقرار رہا۔ اس کے بعد ریڈ ٹیکٹیکا دوبارہ اس کی توجہ اور سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ عراق پر امریکی قبضے کا سلسلہ اور ہنگامہ شروع ہوا تو پیزارو نے فوجی اجتماعات، شوز اور اسلحے کی نمائشوں میں آنا جانا شروع کر دیا۔ جولائی 2003ء میں پیزارو ورجینیا میں کوانٹیکو کے ماڈرن میرین ایکسپو میں گھوم رہا تھا کہ اس کی نظر اسلحے کے ایک اسٹال پر کھڑی غیر معمولی حسین اور طرحدار خاتون پر جم کر رہ گئی، جو بعد میں بلیک واٹر یو ایس اے کی سیلز گرل نکلی جبکہ اسٹال کا انچارج ایک سابق پولیس افسر تھا۔ پیزارو نے بلیک واٹر یو ایس اے کا نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا، اس نے خوب صورت خاتون سے گپ شپ کے لیے اپنے آپ کو ریڈ ٹیکٹیکا کا نمائندہ ظاہر کیا اور خاتون کے حسن کے ساتھ ساتھ بلیک واٹر کے اسٹال کی تعریف کی اور بتایا کہ وہ لاطینی امریکہ میں ان کی پروڈکٹ اور سسٹم کو بیچنے میں ان کی مدد کر سکتا ہے۔ پیزارو سے اس کے ضروری کوائف معلوم کرنے کے بعد بلیک واٹر کے نمائندے کا مشورہ تھا کہ وہ میوک میں واقع بلیک واٹر کے ہیڈ کوارٹر آئے، اس کا یہ دورہ رائیگاں نہیں جائے گا بلکہ اسے وہاں جو کچھ دیکھنے کو ملے گا، اس کی روشنی میں وہ مستقبل کا لائحہ عمل زیادہ بہتر انداز میں تیار کر سکے گا۔

2003ء کے موسم گرما میں پیزارو نے بلیک واٹر ہیڈ کوارٹر کا پہلا دورہ کیا تو عراق میں کرائے کے سپاہیوں کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ بلیک واٹر کے ہیڈ کوارٹر کی سیر نے پیزارو کی سوچ کو ایک نئی جہت عطا کی۔ جس طرح ایک معصوم بچہ کرسمس کی رات

جاگنے کے بعد صبح اپنے سرہانے رکھے کرسمس کے غیر متوقع تحائف کو ملی جلی حیرت اور خوشی سے دیکھتا ہے اور جذبات سے بے قابو ہو جاتا ہے، ٹھیک کچھ ایسی ہی کیفیت سے پیزارو دوچار تھا۔ 21 ویں صدی کے جدید اور روشن دور میں ایک پرائیویٹ آرمی کمپنی کا وجود کسی طرح سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن جو حقیقت تھی اور جس کا اس نے خود کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا، یہ آرمی اپنے آدمیوں کو خود ٹریننگ دیتی تھی اور اس کے لیے اس کے پاس وسیع میدان اور تجربہ کار عملہ موجود تھا، جو دنیا جہان کے مختلف علاقوں سے لائے گئے افراد کو اپنے ٹریننگ سنٹروں میں تربیت دے کر انہیں مستقبل میں امریکہ کے لیے خوف ناک جنگیں لڑنے کے لیے تیار کرتا۔ یہ سب کچھ ایسا تھا، جیسے ڈاکٹر نو کی کوئی پراسرار، جاسوسی، مہماتی اور تحیر انگیز فلم ہو۔ ان میدانوں میں آپ ہر طرح کی ٹریننگ اصلی گولہ بارود کے ساتھ حاصل کر سکتے تھے۔ بکتر بند گاڑیاں، ہیلی کاپٹر، ہر شے موجود تھی۔ ہر چیز بڑی شاندار، حیرت انگیز اور عمدہ تھی۔ پیزارو پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ اسے بار بار گمان گزرتا کہ یہ حقیقت نہیں، وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ یہاں دنیا بھر سے آئے ہوئے لوگ ٹریننگ حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ ان میں سویلین بھی تھے، فوجی بھی، بحریہ اور ایئر فورس، میرین کے لوگ بھی۔ اور اس کے باوجود یہ ایک پرائیویٹ آرمی تھی اور جو کسی حکومت کے بجائے صرف ایک شخص ایرک پرنس کے احکامات ماننے کی پابند تھی۔

یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد پیزارو کی سوچ نے پلٹا کھایا اور وہ جس نے سوچا تھا کہ وہ ان کے سسٹم کو لاطینی امریکہ میں متعارف کرانے اور بیچنے میں ان کی مدد کرے گا، اب خود بلیک واٹر کا حصہ بن جانے کے منصوبے بنانے لگا۔ چلی فوج کے گوریلے اپنی مخصوص شہرت کے حامل تھے۔ قتل، اغواء اور تشدد کے حربوں میں کچھ زیادہ ہی طاق اور چابک دست تھے۔ اور یہ سب کچھ فوجی آمر جنرل پنوچیٹ کے دور کی ضرورتیں تھیں۔ مہذب معاشرے میں ایسے لوگوں کو یقیناً اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، لیکن بلیک واٹر کی ضرورت اور معیار کسی اصول اور ضابطے کے پابند نہیں تھے۔ اسے عراق میں کرائے کے ایسے ہی سپاہی درکار تھے اور یہ ہر طرح سے اس کی توقعات کے عین مطابق تھے۔ گوریلے عام طور پر پندرہ بیس سال کی ایکٹوسروس کے بعد ریٹائر کر دیئے جاتے ہیں حالانکہ ان کی عمر چالیس، پینتالیس سال سے زیادہ نہیں ہوتی اور جسمانی طور پر بھی وہ تندرست اور توانا ہی ہوتے ہیں۔ پیزارو نے سوچا کہ کیوں نہ چلی میں نیوی اور فوج کے ریٹائر گوریلے اور فضائیہ کے سابق چھاتہ برداروں کو تلاش کر کے انہیں عراق میں امریکہ کے لیے خدمات انجام دینے پر آمادہ کیا جائے۔ ایسے لوگ اگر مناسب تعداد میں مل جائیں تو انہیں بلیک واٹر کو بیچ کر دام کھرے کیے جا سکتے ہیں۔ جان پہچان کے چند ریٹائرڈ کرنل، میجر اور کیپٹن چلی میں موجود تھے، واپسی پر انہیں فون کر کے معلوم کرنا شروع کر دیا۔ ''مجھے ایک دو ہفتوں کے اندر نیوی کے کچھ ریٹائرڈ گوریلوں سے ملوا سکتے ہو یا میرے لیے کرائے پر ایک سو کمانڈوز کا بندوبست کر سکتے ہو؟'' جواب ملتا۔ ''ہاں، صرف بیس۔'' مطالبہ ہوتا۔ ''25 کر دو۔'' پھر صاف انکار ہو جاتا۔ ''مشکل ہے، پھر ویسے بھی یہ کچھ غیر قانونی سا کام لگتا ہے۔ نہیں بابا، نہیں۔ مجھے معاف ہی رکھو۔ اس جھنجٹ میں نہ

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

ڈالو۔ تمہیں بھی ناکامی ہوگی۔ یہ خیال چھوڑ دو۔"

پیزارو کا کہنا تھا کہ اس طرح کا منفی ردعمل میرا آتش شوق مزید بڑھا دیتا۔ مجھے یقین تھا کہ میں کچھ بھی غیر قانونی کام نہیں کرنے جارہا۔ میں ٹھیک ہوں۔ قانونی مشیروں نے بھی حوصلہ اور تسلی دی کہ اس کے پلان میں قانون کی خلاف ورزی والی کوئی بات نہیں۔ اس دوران چلی فوج کے کچھ ایسے سابق ارکان سے بھی اس کا رابطہ ہوگیا، جو اس کا ساتھ دینے پر آمادہ تھے۔ پیزارو اور اس کے ساتھیوں نے ایک ریگروٹنگ ایجنسی کی خدمات بھی حاصل کر لیں، جسے ان کے منصوبے کے مطابق افراد بھرتی کرنے میں ان کی مدد کرنی تھی۔ چلی میں اپنا سیٹ اپ قائم کرنے کے بعد پیزارو نے سمجھا کہ اب کام شروع کیا جاسکتا ہے تو وہ امریکہ پہنچا اور بلیک واٹر کے صدر گیری جیکسن سے مل کر اپنا منصوبہ بیان کرنے کی کوشش کی۔ جیکسن کا رویہ بڑا سرد تھا۔ اس نے پوری بات سنے بغیر اسے سختی سے دھتکار کر اپنے دفتر سے نکال دیا۔ پیزارو نے ہمت نہ ہاری اور ورجینیا میں ایرک پرنس سے ملاقات کے لیے اس کے دفتر جا پہنچا۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد بولا۔

"ایک اہم معاملہ ہے، آپ کے صرف پانچ منٹ لوں گا۔"

ایرک پرنس غرّایا۔ "صرف تین۔"

لیکن جب پیزارو نے اس کے سامنے اپنی تجویز رکھی تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور تین منٹ کی ملاقات کئی منٹوں پر محیط ہوگئی۔

ایرک پرنس اپنی بحریہ کی ملازمت کے دوران چلی میں بھی کچھ عرصہ گزار چکا تھا اور اس کے ان دنوں کے کئی دوست اب بھی وہاں موجود تھے۔ چلی نیوی کے گوریلوں کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں اور تربیت کے معیار سے بخوبی واقف تھا۔ اسے پیزارو کی تجویز پسند آگئی اور بولا۔

"شاباش! اگر تم چلی نیوی کا ایک گوریلا بھی لے آؤ جو میرے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو تو سمجھو معاملہ جم گیا۔ تم نے میدان مار لیا۔ اب یہ تم پر ہے یہ کام کس طرح اور کتنی جلدی انجام دیتے ہو۔ سب کچھ تیار ہو جائے تو مجھے پیغام بھجوا دینا، میرے آدمی آجائیں گے جو تمہارے آدمیوں کا جائزہ لینے کے بعد مجھے رپورٹ کردیں گے۔"

پیزارو اگلی ہی صبح پہلی فلائٹ سے واپس سان تیاگو پہنچ گیا۔

چلی پہنچ کر وہ جلد ہی اپنے کام میں جُت گیا۔ سب سے پہلے اس نے ایک وسیع و عریض فارم کرائے پر حاصل کیا۔ یہ سان ٹیاگو کے مضافات میں واقع بڑے عرصے سے خالی پڑا تھا۔ یہاں وہ اپنے مستقبل کے ممکنہ فوجیوں کو ٹریننگ کرتے دیکھ کر ان کی کارکردگی جانچ سکتے تھے۔

12 اکتوبر 2003ء کو ان کی طرف سے ایک بڑے قومی اخبار آئی مرکیوریو میں اس مضمون کا اشتہار چھپا کہ ایک انٹرنیشنل کمپنی کو بیرون ملک ملازمت کے خواہش مند اسپیشل فورسز کے سابق فوجیوں کی تلاش ہے۔ امیدوار اچھی صحت، تندرست جسم اور انگریزی کی شد بد رکھتے ہوں۔ اپنی اسناد ہمراہ درخواست بھجوائیں۔

پیزارو اور اس کے دوستوں کے پاس جلد ہی ملازمت کے امیدواروں کی درخواستیں آنا شروع ہو گئیں اور ساتھ ہی یار لوگوں نے اُڑادی کہ تین ہزار ڈالر ماہانہ تنخواہ کی پیش کش کی جارہی ہے جو چلی میں ایک حاضر سروس فوجی کو ملنے والی چار سو ڈالر ماہانہ تنخواہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ اس افواہ کے

بعد درخواستیں آنے کی رفتار کچھ اور تیز ہوگئی اور دیکھتے دیکھتے ایک ہزار سے زیادہ درخواستیں اکٹھی ہوگئیں۔ ان میں ریٹائرڈ افسروں کے ساتھ ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کی ریٹائرمنٹ میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا لیکن پُرکشش تنخواہ اور مراعات کے لالچ میں ہر کوئی قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینے کے لیے تیار تھا۔

دوسری طرف اخبار میں اشتہار چھپنے کے بعد پورے چلی میں بھونچال سا آ گیا اور معاملہ پارلیمنٹ تک جا پہنچا۔ پیزارو اور اس کے ساتھیوں کے خلاف تحقیقات کا مطالبہ ہونے لگا کیونکہ یہ لوگ سابق فوجیوں کو بیرون ملک ملازمتوں کی پیش کش کر کے باہر بھجوانے کا لالچ دے کر مروّجہ فوجی قانون توڑنے کے مرتکب ہوئے تھے۔ قانون کے مطابق کوئی پرائیویٹ ادارہ یا کارپوریشن کسی جگہ سیکیورٹی اور قیام امن کے لیے اپنے طور پر سابق فوجیوں کو بھرتی کر کے بیرونِ ملک بھجوانے کی مجاز نہیں۔ یہ کام اقوام متحدہ کی درخواست پر ملک کی وزارتِ دفاع انجام دیتی ہے اور اس کے لیے افراد کا انتخاب حاضر سروس فوجیوں میں سے ہوتا ہے، سابق فوجیوں میں سے نہیں۔ لیکن پیزارو اور اس کے ساتھی میڈیا میں برپا اس سارے شور شرابے سے بے نیاز دن رات اپنے کام میں جُتے رہے اور افواہیں اُڑتی رہیں کہ پیزارو چلی میں سی آئی اے کا ایجنٹ ہے۔ امریکی صدر جارج بش سے بھی اس کے قریبی تعلقات ہیں اور ٹیکساس میں اس کے فارم پر اکثر آتا جاتا رہتا ہے جبکہ حقیقت کچھ بھی نہیں تھی۔ پیزارو سرتاپا، ایک ایسا تاجر تھا جسے موقع سے فائدہ اٹھا کر صرف پیسہ بنانے سے غرض تھی۔ اکتوبر کے اختتام تک پیزارو کی ٹیم نے تین سو آدمیوں کا ایک گروپ تیار کرلیا۔ اس نے ایرک پرنس کو پیغام بھیجا۔ "میرے آدمی امتحان کے لیے تیار ہیں۔" اکتوبر کے آخری ہفتے میں واشنگٹن سے تین آدمی ان کا امتحان لینے آگئے۔ تینوں امریکی بحریہ کے گوریلے تھے۔ انہوں نے اپنے حساب سے تین دن تک ان کا ہر طرح سے امتحان لیا اور ان کو دی گئی تربیت کے معیار کی پوری اور کڑی چھان پھٹک کی اور واپس چلے گئے۔

18 دسمبر کو بلیک واٹر والوں کا پیغام آیا۔ "فروری میں اپنے ایک سو آدمی لے کر امریکہ آجاؤ۔ ان کا امریکہ میں دوبارہ امتحان لیا جائے گا۔"

4 فروری 2004ء کو پیزارو اپنے ساتھ 78 آدمیوں کا گروپ لے کر میوک پہنچا۔ جہاں بلیک واٹر کے انسٹرکٹروں نے ان کا دس دن تک ایک بار پھر امتحان لیا۔ کبھی انگریزی بول چال کی استعداد، کبھی رائفل و پستول شوٹنگ اور دوسرا اسلحہ چلانے میں مہارت اور چابک دستی کا مظاہرہ، ڈرائیونگ پر دسترس، لیڈر شپ اور کبھی ناموافق ماحول اور حالات میں جذباتی اور اعصابی دباؤ کے برداشت کا امتحان..... پورے گروپ میں صرف ایک آدمی اپنے مزاج اور غصیلے پن کی وجہ سے ناکام قرار پایا۔ باقی ماندہ لوگوں کو بلیک واٹر میں بھرتی کرلیا گیا۔ یوں 14 فروری 2004ء کو چلی گوریلوں کا پہلا گروپ نارتھ کیرولینا سے بغداد پہنچا اور جاتے ہی اپنی ڈیوٹی سنبھال لی اور ساتھ ہی پیزارو کو بلیک واٹر کی طرف سے کرائے کے مزید 78 سپاہی بھرتی کر کے لانے کا نیا کنٹریکٹ مل گیا۔

گیری جیکسن جو ابتدا میں پیزارو کے منصوبے کے حق میں بالکل نہیں تھا اور اس پر کسی قسم کی بات چیت کو محض وقت کا زیاں قرار دیتا تھا، لیکن چلی

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

گوریلوں کا پہلا دستہ بلیک واٹر کے کڑے تربیتی معیار پر پورا اُترا تو اس کا رویہ یکسر بدل گیا۔ اس نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار یوں کیا کہ چلی گوریلوں کا دستہ مقررہ شیڈول سے پہلے عراق روانہ کردیا گیا ہے کیونکہ ان گوریلوں کو اضافی تربیت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چلی کی مسلح افواج کے ساتھ وابستگی کے دوران انہوں نے جو کچھ سیکھ رکھا تھا اور مختلف آپریشنوں کے دوران جس پیشہ ورانہ مہارت اور چابک دستی کا مظاہرہ کرتے رہے تھے، ان سب باتوں کا تجربہ اور علم انہیں مزید کسی اضافی ٹریننگ کی ضرورت سے بے نیاز کردیتا تھا۔ پہلے گروپ میں شامل افراد کی اوسط عمر 43 سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ان لوگوں کو بغداد، کربلا اور بصرہ جیسے شہروں میں اہم سرکاری دفاتر اور حساس اداروں کے ہیڈ کوارٹرز کی نگرانی اور حفاظت کا ٹاسک ملا۔ ان کے لیے کھلی سڑکوں پر نکلنا اور عام شہریوں سے رابطہ ضبط رکھنا ممنوع تھا۔

مقبوضہ عراق میں چلی گوریلوں کی کارکردگی خاصی متاثر کن رہی۔ بلیک واٹر نے جلد ہی ان گوریلوں کو عراق بھجوانے سے پہلے اپنے ہیڈ کوارٹر میوک میں ان کا امتحان اور ٹیسٹ لینے کی شرط اور پابندی ختم کردی۔ اب وہ پیزارو کی نگرانی میں چلی سے براہِ راست عراق پہنچنے لگے تھے۔ پیزارو کا کام خاصا بڑھ گیا۔ چلی گوریلوں کی عراق میں مانگ بڑھنے لگی، جس کی وجہ ایک طرف اگر ان کا اعلیٰ پیشہ ورانہ معیار اور کارکردگی تھی تو دوسری طرف ان کی اُجرت بھی کم تھی۔ بلیک واٹر کو جتنی قیمت میں ایک امریکی گوریلا پڑتا تھا، اتنی قیمت میں چلی کے چار اور بسا اوقات پانچ گوریلے مل جاتے تھے۔ پیزارو نے دو سال ایک ماہ کی مدت میں بلیک واٹر کے علاوہ عراق میں موجود دوسری کمپنیوں کو چلی کے 756 گوریلے فراہم کیے۔

چلی کے اندر صورتِ حال زیادہ حوصلہ افزا نہ تھی۔ عراق گوریلے بھجوانے کا مسئلہ میڈیا میں کچھ زیادہ ہی اچھل گیا اور عوامی سطح پر بھی بہت غم و غصے کا اظہار ہوا۔ لوگوں کی اکثریت ان گوریلوں کے بارے میں کوئی بات سننے کی روادار نہیں تھی۔ جنرل پنوچیٹ کے دور میں عوام نے ان کے ہاتھوں بہت دکھ اور تکلیفیں اٹھائی تھیں اور غم سے تھے کہ جن کی یاد آج بھی ان کے رونگٹے کھڑے کردیتی اور خون کے آنسو رُلاتی۔ بہت سے خاندان تو آج بھی اپنے ان پیاروں کی راہ دیکھ رہے تھے جنہیں جنرل کے دور میں اس کے ان سفاک کارندوں نے اغوا کر کے غائب یا قتل کردیا تھا۔ خود حکومت کی پوزیشن یہ تھی کہ چلی سرکاری سطح پر سلامتی کونسل کے ایک ROTATING رکن کی حیثیت سے عراق میں جنگ کی مخالفت کرچکا تھا۔ اب حکومت کس طرح عراق میں امریکی جارحیت کے استحکام کے لیے اپنے ہاں سے کرائے کے سپاہی بھجوانے کی حمایت یا وکالت کرتی۔ 92 فیصد عوام بھی عراق میں کسی قسم کی امریکی جارحیت کو رد کرچکے تھے۔ صورتِ حال خاصی گمبھیر تھی۔ پیزارو نے چلی میں قانونی پیچیدگیوں اور اُلجھنوں سے بچنے کے لیے اپنی فرم کی رجسٹریشن یوروگوئے میں کرالی اور بلیک واٹر کے ساتھ اس کے معاملات یوروگوئے کی NESKOWIN نام کی گھوسٹ کمپنی کی آڑ میں چلنے لگے۔ تب پیزارو نے کہا، ہم بلٹ پروف ہو گئے، اب ہمیں یہ نہیں روک سکتے۔ تاہم چلی میں اس موضوع پر گرما گرمی چلتی رہی۔ چلی کے ایک ادیب رابرٹو مینزی کوئز نے لکھا۔ ”بلیک واٹر کے

www.pkdigest.com

لیے کام کرنے والے چلی کے گوریلے بیرونِ ملک محض اس لیے پسند کیے جارہے ہیں کہ وہ چلی کے نہتے اور بے بس عوام کو ایک آمر کے دور میں اغواء، قتل اور انہیں نت نئی اذیتیں دینے کا وسیع اور بے مثل تجربہ اور مہارت رکھتے ہیں جو ہمارے ملک اور قوم کے ماتھے پر ایک بدنما داغ سے کم نہیں۔ اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہورہا ہے کہ امریکیوں کے نزدیک انسانی حقوق اور اقدار کی کوئی اہمیت نہیں لیکن ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم خود چلی میں عدل و انصاف کی کوئی روشن مثال قائم کرنے میں ناکام رہے۔ آمر کے دور میں عوام کے قتل، اغوا میں ملوث اور عقوبت خانوں کے نگرانوں کو قرار واقعی سزائیں مل جاتیں تو آج وہ یوں آزادی سے بیرونِ ملک دندناتے اور اپنے ماضی کے جرائم کیش کراتے نظر نہ آتے اور ملک اور قوم کو شرمندگی کا یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“

تمام تر حکومتی اقدامات، اعلانات اور عوامی احتجاج اور دباؤ کے باوجود بلیک واٹر کے ساتھ پیزارو کے معاملات خوش اسلوبی سے چل رہے تھے۔ 2006ء تک تین ہزار چلی کے گوریلے بھرتی کرلینے کا ٹارگٹ تھا، جو ماضی کی کارکردگی کے پیش نظر کچھ زیادہ مشکل نظر نہیں آتا تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں تدبیر کنندہ بندہ، تقدیر زند خندہ۔ انسان سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ ہے۔ ایسا ہی معاملہ پیزارو کے ساتھ پیش آیا۔ 2004ء کے اواخر میں جبکہ بلیک واٹر کے ساتھ اس کے تعلقات پورے عروج پر تھے، پیزارو سے اندازے کی ایک بڑی سنگین غلطی ہوگئی۔ بلیک واٹر کی ایک حریف کمپنی ٹرپل کینوپی نے انہی دنوں سکیورٹی گارڈز کے لیے اُسے چلی کے سابق چھاتہ بردار بھرتی کر کے بھجوانے کی درخواست کی اور پیزارو نے اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے لیے ٹرپل کینوپی کو چار سو افراد بھرتی کر کے بھجوا دیے۔ بلیک واٹر اور ٹرپل کینوپی میں سخت کاروباری رقابت تھی، جس کی شدت کا پیزارو صحیح اندازہ نہ لگا سکا اور بلیک واٹر کا اعتبار اور اعتماد کھو بیٹھا۔ گیری جیکسن نے اسے سخت سست کہتے ہوئے نہ صرف اس کے ساتھ اپنے تمام معاہدے فی الفور ختم کردیے بلکہ آئندہ کے لیے بات چیت کے تمام دروازے بھی بند کردیے۔ بلیک واٹر کے بعد پیزارو نے ٹرپل کینوپی اور بوٹس اینڈ کوٹس کے ساتھ مل کر کام کرنے کی کوشش کی۔ بوٹس اینڈ کوٹس ٹیکساس کی ایک کمپنی تھی، جو تیل کے کنوؤں میں لگنے والی آگ بجھانے کے حوالے سے خدمات انجام دینے کے لیے مشہور تھی۔ اس کمپنی کے لیے پیزارو نے چلی کے جو سابق فوجی بھرتی کر کے بھجوائے، وہ بلیک پینگوئن کہلائے، تاہم بوٹس اینڈ کوٹس کے ساتھ معاملہ زیادہ عرصہ نہ جم سکا۔ اس اثنا میں عراق میں تعمیرِ نو شروع ہوئی تو بہت کم ایسے پروجیکٹ باقی رہ گئے جن کی سکیورٹی کے لیے مہنگے تربیت یافتہ فوجی ضروری ہوتے۔ بلیک واٹر نے چلی کے گوریلوں کو فارغ کر کے چوکیداری اور نگرانی کے لیے مزید سستے افراد بھرتی کرنے شروع کردیے۔ اب مقابلہ سلواڈور، پیرو، نائیجیرین، اردنی اور فجی سے آنے والے لوگوں کے درمیان تھا، جو چلی کے گوریلوں کے مقابلے میں تین گنا زیادہ سستے تھے۔

2005ء میں جیفری بیبی، جو ماضی میں ایک دوسری امریکی سکیورٹی ایجنسی ڈائن کارپ انٹرنیشنل کے ساتھ وابستہ رہا تھا، اس نے کولمبیا کے سابق فوجیوں کی عراق میں مارکیٹنگ شروع کی۔ یہ فوجی

Pdf by Roadsign

دہشت گردی کے خلاف تقریباً 41 سال سے جنگ لڑتے آ رہے تھے۔ جیفری سپی نے اپنی ویب سائٹ میں لکھا تھا۔ امریکہ کا اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اب سکیورٹی کی مد میں زیادہ خرچ کرنے کے موڈ میں نہیں لگتا اور تنخواہیں بھی خاصی کم کر دی گئی ہیں، اس لیے اس نے عراق میں سکیورٹی کا خلاء پُر کرنے کے لیے تیسری دنیا کے لوگوں کا انتخاب کیا ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق بلیک واٹر نے اس کی وساطت سے کولمبیا کے ایک سو بیس فوجیوں کی خدمات حاصل کیں لیکن گیری جیکسن کی طرف سے اس دعوے کی کوئی تائید یا تردید سامنے نہیں آئی۔

جیفری سپی کی طرف سے عراق کے لیے کولمبیائی گوریلے بھرتی کرنے کا اعلان ہوا تو بگوٹا میں اس کے دفتر کے باہر امیدواروں کی قطاریں لگ گئیں۔ چار ہزار ڈالر ماہانہ تنخواہ کی بات کی گئی تھی لیکن جلد ہی پھڈا پڑ گیا۔ ٹریننگ کے بعد امیدواروں کو بتایا گیا کہ انہیں صرف ستائیس سو ڈالر ماہانہ ملیں گے۔ اس پر بھی کئی لوگ راضی اور خوش تھے کہ کولمبیا میں ملنے والی اجرتوں کے مقابلے میں یہ پھر بھی زیادہ تھی۔ خرابی اس وقت ہوئی جب بغداد میں قدم رکھنے کے بعد تنخواہ کا یہ ہندسہ سکڑ کر صرف ایک ہزار ڈالر رہ گیا۔ یعنی 34 ڈالر یومیہ۔ اس پر احتجاج اور شور ہوا تو کمپنی نے ان کے پاسپورٹ اور ٹکٹ اپنے قبضے میں کر لیے اور اعلان کیا کہ جو نوکری چھوڑنا چاہتا ہے بے شک واپس چلا جائے لیکن واپسی کا بندوبست اسے خود کرنا پڑے گا۔ پردیس میں یہ ناممکن سی بات تھی۔ کولمبیا کے ہوائی ٹکٹ کے لیے 12 ملین پیسو کون دیتا۔ معاملہ اخبارات تک پہنچا لیکن بلیک واٹر کی انتظامیہ کا مؤقف تھا کہ کمپنی نے اجرتوں پر نظر ثانی کر کے نئی اجرتیں مقرر کی ہیں۔ اب موجودہ اجرتیں ہی لاگو ہیں۔ تاہم جو کارکن کام کرتے رہیں گے، انہیں معاہدہ ختم ہونے پر کمپنی واپس بھجوانے کی پابند ہے۔

عراق اور افغانستان میں امریکی جنگوں کے نتیجے میں کرائے کے سپاہیوں کی عالمی سطح پر بولی لگنی شروع ہوئی اور انہیں پزیرائی ملی تو بہت سے ایسے خفیہ تربیتی اور آپریشن کیمپوں کے وجود پر سے بھی پردہ اُٹھ گیا، جو اب تک عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے۔ ستمبر 2005ء میں ایک خفیہ ٹریننگ سنٹر کی خبر نکلی، جو ہینڈراس کے دُور افتادہ علاقے میں لیپاٹریک کے دشوار گزار پہاڑی سلسلے میں ٹیگوس گالپا کے مغرب میں پندرہ میل کے فاصلے پر قائم تھا۔ اسے شکاگو کی ایک فرم ایک سابق امریکی فوجی کی نگرانی میں چلا رہی تھی۔ 1980ء میں اس آرمی میں سی آئی اے کے اہلکار نکاراگوا میں آپریشن کے لیے ٹریننگ کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد یہ ایک عرصے تک بدنامِ زمانہ بٹالین 316 کا ہیڈکوارٹر رہی۔ یہ بٹالین امریکہ کی سرپرستی میں قائم ''ہنڈراس کا ڈیتھ اسکواڈ'' تھی، جس کے بارے میں یہ بات عام تھی کہ 1980ء کے دوران وسیع پیمانے پر ہونے والی سیاسی قتل وغارت گری میں اس اسکواڈ کا ہاتھ تھا۔ ان دنوں جان نیگرو پونٹے ہنڈراس میں امریکہ کا سفیر ہوا کرتا تھا۔ اب دو عشروں کے بعد اسے ایک پرائیویٹ کمپنی ہنڈراس کے فوجیوں کی تربیت کے لیے استعمال کر رہی تھی، جنہیں تربیت کی تکمیل کے بعد عراق میں امریکہ کے لیے کرائے کے سپاہیوں کے طور پر اس کے لیے جنگ لڑنی تھی۔ لیکن جلد ہی ہنڈراس سرکار کو بڑھتے ہوئے عوامی احتجاج اور مخالفت کی وجہ سے

اپنے فوجی عراق سے واپس بلانے پڑے۔ اور اس دوران عراق میں نئے امریکی سفیر کے طور پر نیگرو پونٹے کے نام کا اعلان ہوا۔ ستمبر میں انکشاف ہوا کہ ہنڈراس میں واقع ٹریننگ کیمپ میں مقامی فوجیوں کے ساتھ چلی کے بھی دو سو فوجی زیرِ تربیت تھے۔ چلی کے یہ سابق فوجی ٹورسٹ ویزا پر ہنڈراس میں داخل ہوئے تھے۔ راز کھلنے پر ہنڈراس کے وزیرِ خارجہ ڈینیل راموس نے ان سب کو ملک چھوڑنے کا حکم دیا کہ ہنڈراس کا آئین اپنی سرزمین غیر ملکی سکیورٹی اور آرمی فورسز کی ٹریننگ کے لیے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور ساتھ میں اس کمپنی پر بھی 25 ہزار ڈالر جرمانہ عائد کر دیا گیا، جو اُن کو تربیت دینے کی ذمہ دار تھی اور آئین شکنی کی مرتکب ہوئی تھی۔ تاہم جرمانے کی وصولی کا موقع اور نوبت نہ آ سکی کہ اس دوران کمپنی کا مالک ملک سے راہِ فرار اختیار کر چکا تھا۔

✿✿✿

دریائے فرات کے پُل پر لٹکی بلیک واٹر کنٹریکٹرز کی جلی ہوئی لاشیں ابھی ہوا میں جھول رہی تھیں کہ دنیا بھر میں ان کے قتل کی خبریں گردش کرنے لگیں۔ فلوجا میں مشتعل ہجوم نے چار امریکی سپاہیوں کو مار ڈالا، پھر پٹرول چھڑک کر انہیں آگ لگا دی اور اب ان کی جلی ہوئی مسخ شدہ لاشیں دریائے فرات کے پُل پر لٹک رہی ہیں۔ فلوجا سے باہر فوجی چھاؤنی کے میس میں بیٹھے ایک نوجوان کیپٹن ڈگلس نے ٹی وی پر ہوا میں جھولتی لاشیں دیکھیں تو حیرت سے اُچھل پڑا۔

''اوہو! امریکیوں کے ساتھ یہ سلوک..... نہیں، ہرگز نہیں۔''

میس میں موجود زیادہ تر فوجی اس سے لاتعلق بیٹھے گپ شپ میں مصروف رہے کہ شاید ان کے نزدیک فوجیوں کا ہلاک کیا جانا یا مرنا کوئی انوکھا واقعہ نہ تھا یا پھر اس لیے کہ مرنے والے پرائیویٹ کنٹریکٹرز یعنی کرائے کے سپاہی تھے، باقاعدہ امریکی فوج کا حصہ نہ تھے۔ یہ بات بھی تھی کہ اسی صبح پانچ امریکی میرینز فلوجا کے قریب سڑک کنارے نصب ایک بم پھٹنے کے حادثے میں ہلاک ہو چکے تھے۔

پرائیویٹ کنٹریکٹرز کی سوختہ لاشیں گھنٹوں پل پر جھولتی صدر بش کے اس دعوے کی نفی کر رہی تھیں کہ عراق کی لڑائی ختم ہو گئی ہے جبکہ لگتا تھا کہ اصل لڑائی تو سقوطِ بغداد کے ایک سال بعد اب شروع ہونے والی ہے۔ صدر بش کی طرف سے نوے دن پہلے عراقیوں کو ان کی خود مختاری لوٹائی جا چکی تھی کہ امریکی فوج نے تمام رکاوٹیں دور کر دی ہیں، اب عراق کا انتظام سنبھالو۔

امریکی فوج کے ترجمان بریگیڈیئر جنرل مارک کیمت نے فلوجا کے واقعے کی سنگینی اور شدت کم کرنے کی کوشش کی اور غیر ملکی نامہ نگاروں کو بتایا کہ یہ ایک چھوٹا سا مقامی واقعہ ہے، جو مقامی لوگوں کے ساتھ جھڑپ میں پیش آیا۔ اس نے بتایا کہ فلوجا عراق کا نسبتاً ایک خاموش اور پُرامن شہر ہے جس کے شہریوں سے اس طرح کے ردِعمل کا سرزد ہونا ناقابلِ فہم ہے۔ امریکہ پورے عراق میں اسکول، شفاخانے کھول رہا ہے، برقی تنصیبات بحال کی جا رہی ہیں، تیل کی پیداوار بڑھائی جا رہی ہے تاکہ لوگ آرام اور سکون سے رہ سکیں اور عراق میں ترقی اور خوشحالی ہو۔ اس پس منظر میں فلوجا کا واقعہ واقعتاً افسوس ناک ہے۔

اس نے کہا، آج امریکہ میں چار خاندانوں کے

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

دروازے پر کسی وقت دستک ہوگی اور وہ دروازہ کھول کر جو پیغام وصول کریں گے وہ انہیں غم کے سمندر میں ڈبو دے گا، جس سے وہ شاید عمر بھر باہر نہ آسکیں۔ کوشش کریں کہ ہم میں سے کسی کے گھر کے دروازے پر اس طرح کی دستک نہ ہو یا ہم کسی اور کے دروازے پر جا کر اس طرح دستک دیں۔

پال بریمر کے ترجمان ڈان سینر نے اپنی پریس کانفرنس میں اخباری نمائندوں کو بتایا۔ ”جن لوگوں نے ہمارے آدمیوں پر چھپ کر حملہ کیا اور پھر ان کی لاشیں اس حالت میں پل پر لٹکائی ہیں، وہ عراق کے دوست اور خیر خواہ نہیں ہیں۔ ہم بھی یہاں ان کی مدد کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ ایسے شر پسندوں کو ہمیں پکڑنا اور ٹھکانے لگانا ہے تاکہ عراق کے عام شہری ان کے شر سے محفوظ رہیں اور عراق آگے ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

اس کا دعویٰ تھا کہ عراقیوں کی اکثریت صدام حسین کی آمریت سے نجات دلانے پر امریکیوں کی ممنون اور احسان مند ہے۔ ایک مختصر سا ٹولہ مخالف ہے، اسے ہم جلد راہِ راست پر لے آئیں گے۔

فلوجا سے ہزاروں میل دور واشنگٹن میں صدر بش انتخابی ریلی میں مصروف تھا۔ میریٹ وارڈ مین پارک ہوٹل میں بش، چینی کے اعزاز میں ڈنر تھا اور بش کی تقریر تھی۔ حاضرین کو بتایا جا رہا تھا کہ امریکہ کو عراق میں ابھی ٹھگوں اور دہشت گردوں کا سامنا ہے۔ انہیں آمریت سے آزادی پسند نہیں۔ وہ بے گناہ لوگوں کو قتل کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ قاتلوں کا یہ ٹولہ امریکہ کو نیچا دکھانا اور اس کے ارادوں کو توڑنا اور ختم کرنا چاہتا ہے لیکن امریکہ ہارنے والا نہیں۔ ہم انہیں عراق میں ٹھکانے لگا رہے ہیں اور ان کا وجود ختم کر کے ہی دم لیں گے تاکہ امریکہ ان کے شر سے محفوظ رہے اور ان کے ہاتھ امریکیوں تک نہ پہنچیں۔

اور اگلی صبح جب امریکہ بیدار ہوا تو فلوجا میں چار امریکی کنٹریکٹروں کی ہولناک ہلاکت کی خبریں شکاگو ٹریبیون اور واشنگٹن پوسٹ سمیت ہر اخبار میں چیختی چلاتی شہ سرخیوں کے ساتھ صدر بش اور اور امریکی دعووں کا منہ چڑا رہی تھیں اور ماضی میں امریکہ نے صومالیہ میں مقامی آبادی کے ہاتھوں جس عبرت ناک ہزیمت کا سامنا کیا تھا، اس کا تذکرہ ہر اخبار میں ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ موجود تھا۔

❁❁❁

کیمت نے اس حادثے کو شروع میں عام اور معمولی حادثہ قرار دیتے ہوئے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی وائٹ ہاؤس اور پال بریمر کو احساس ہونے لگا کہ بلیک واٹر کنٹریکٹرز کے یوں دن دہاڑے قتل ہونے سے نہ صرف امریکہ کے ناقابلِ شکست ہونے کے بھرم کو زک پہنچی ہے بلکہ اس پروپیگنڈے کا پردہ بھی چاک ہونے لگا ہے جو اب تک دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کیا جا رہا تھا کہ عراق میں امریکہ کے خلاف بڑھتی ہوئی مزاحمت اور نفرت کی خبروں میں کوئی صداقت نہیں، حالات پوری طرح امریکہ کے کنٹرول میں ہیں۔ بعض حلقوں نے تو اس واقعے کو ایک بار پھر 1993ء کی صومالیہ جیسی صورتِ حال پیدا کرنے کی کوشش قرار دیا، جب باغیوں نے وہاں امریکہ کا ایک بلیک ہاک ہیلی کاپٹر مار گرایا تھا اور آٹھ امریکی فوجیوں کو ہلاک کرنے کے بعد ان کی لاشوں کو موغا دیشو کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرے تھے جس پر امریکہ

میں برا شور مچا اور کلنٹن انتظامیہ کو فوری طور پر امریکی فوجی صومالیہ سے نکالنے پڑے۔

صدر بش نے صرف تین مہینے پہلے عراق میں مکمل امن و امان اور سکون قائم کر دینے کا بلند و بانگ دعویٰ کیا تھا اور کہا تھا کہ ملک کا نظم و نسق بھی جلد ہی مقامی لوگوں کے حوالے کیا جا رہا ہے، لیکن زمینی حقائق صدر بش کے تمام تر دعووں کی نفی کر رہے تھے۔ عراق میں ایک طرف اگر قابضین کے خلاف مزاحمت بڑھتی جا رہی تھی تو دوسری طرف ملک میں بش کی مقبولیت گھٹتی جا رہی تھی۔

پال بریمر نے فلوجا کے واقعے کو دہشت و بربریت کی علامت قرار دیا۔ تاہم اس خیال کو رد کر دیا کہ اتحادی فوجیں فلوجا کو کنٹرول نہیں کر سکتیں۔ وائٹ ہاؤس کی طرف سے اعلان ہوا کہ امریکہ اشتعال کا مظاہرہ نہیں کرے گا اور نہ کسی کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ عراق میں جمہوریت جڑیں پکڑ رہی ہے، واپسی کا کوئی ارادہ ہے نہ کوئی راستہ۔ سینیٹر جان کیری جو ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے صدارتی عہدے کا امیدوار تھا، اس نے کہا کہ اس ہولناک واردات کے آئینے میں عراق کے مستقبل کے چہرے واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ غم کی گھڑی ہے اور ہم غم اور صدمے سے دوچار ہیں لیکن ایسے میں بھی ہمارا یہ عزم ہے کہ ہم ان دشمنوں کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیں گے۔ ایک اور سینیٹر نے کہا۔ ہم شہر سے بھاگنے والے نہیں۔ فلوجا میں کچھ شر پسند اور قانون شکن افراد کی موجودگی ہمیں خوفزدہ نہیں کر سکتی۔

دوسری طرف کیبل نیٹ ورک پر تجزیہ نگاروں اور سیاسی پنڈتوں کی طرف سے گلا پھاڑ پھاڑ کر باغیوں کی سرکوبی کرنے اور انہیں قرار واقعی سبق سکھانے کی باتیں کی جا رہی تھیں۔ فاکس نیوز کے پروگرام میں ایک صاحب نے کہا، فلوجا کے بھوت باتوں سے ماننے والے نہیں۔ حکومت کچھ بھی کر لے، ان کے دل نہیں جیت سکتی۔ یہ بات ثابت ہو گئی ہے۔ وقت ضائع کیے بغیر بہتر ہے کہ فلوجا کو پیوند زمین کر کے ساری جگہ ہموار کر دی جائے۔ دہشت گردوں کو ان کے کیے کی پوری سزا ملنی چاہیے۔ لوگوں کے دلوں میں اپنا ڈر اور خوف بٹھانا ضروری ہے۔ سب کو موت کے گھاٹ اتار دیں تاکہ ان کی سزا دوسروں کے لیے عبرت کی مثال بن جائے اور آئندہ کسی کو امریکہ کے راستے میں آنے کی جرأت نہ ہو۔ صدام حسین نے بھی تو ان لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان پر حکومت کی ہے۔ ایک اور چینل پر سابق ڈیموکریٹک صدارتی امیدوار جنرل ویزلے کلارک نے کہا:

”فلوجا میں مزاحمت ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بڑھ اور پھیل رہی ہے۔ ہمیں اپنی اتھارٹی کے لیے یہ چیلنج اور خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔“

میڈیا نے بھی کئی نئے سوال اٹھائے، جس میں اہم سوال تھا کہ فلوجا کے گرد چار ہزار میرین کی بھاری نفری تعینات ہونے کے باوجود بلیک واٹر کے اہلکار یوں دن دہاڑے کس طرح قتل ہو گئے اور پھر کیوں ان کی جلتی ہوئی لاشیں گھنٹوں پل پر لٹکتی رہیں؟ بند بازار میں دو گاڑیاں جلا دی گئیں، ان سے اٹھنے والے سیاہ دھوئیں کے بادل شہر پر دن بھر چھائے رہے، لیکن کوئی فائر بریگیڈ، کوئی ایمبولینس فلوجا میں کہیں دکھائی نہیں دی، نہ کوئی سکیورٹی والے دکھائی دیئے کہ متاثرین کی مدد کرتے۔ اس بار موقع واردات پر کسی بلیک ہاک نے بھی امدادی کارروائی

www.pkdigest.com

Pdfby Roadsign

کے لیے پرواز نہیں کی اور فلوجا کی گلیوں میں پُرجوش اور مشتعل ہجوم لاشوں کے گرد گھیرا ڈال کر خوشی سے اچھل کود کرتا اور نعرے لگاتا رہا۔

میرین کے ترجمان کرنل مائیکل واکر نے صفائی پیش کی:

''اس وقت اگر ایک ٹینک بھیج دیا جاتا تو ہم چاروں جلی ہوئی لاشیں واپس لے آنے میں کامیاب ہو جاتے! ناممکن تھا۔ مشتعل ہجوم کے منہ میں جانا، موت کے منہ میں جانا تھا۔ ہجوم اور پھر مشتعل ہجوم کی نفسیات بڑی عجیب ہوتی ہے۔ اس طرح کی حرکت مزید خون خرابے کا باعث بنتی۔''

اسی دن سی این این پر کراس فائر کے پروگرام میں میزبان ٹکر کارلس نے کہا:

''میں سوچتا ہوں ہمیں ہر اس شخص کو قتل کر دینا چاہیے جو ان چار امریکیوں کی موت کا ذمہ دار ہے وگرنہ اسے ہماری کمزوری پر محمول کیا جائے گا اور اس طرح کے طرزِ عمل کا خمیازہ ہم 9/11 کی صورت میں بھگت چکے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ ہم نے دشمنوں کی اس طرح کی حرکتوں کا کبھی سنجیدگی سے منہ توڑ جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔''

پہلے دن بریس کانفرنس میں کیمت ایک سوال پر بھڑک اٹھا تھا۔ کسی نے پوچھا تھا کہ کیا میرین بلیک واٹر کنٹریکٹرز پر حملے کے فوراً بعد اس لیے فلوجا میں داخل نہیں ہو سکے کہ وہاں جانا زیادہ خطرناک تھا؟ جواب ملا۔ ''جی نہیں! میرا خیال ہے پورے عراق میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے، جہاں جانے میں اتحادی فوجوں کو کوئی گھبراہٹ محسوس ہوتی ہو۔ جس جگہ ضرورت ہوتی ہے وہ زیادہ یا کم خطرے کی پروا کیے بغیر پہنچ جاتے ہیں۔''

چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر کیمت کا لب ولہجہ بالکل بدل گیا اور اس میں جارحانہ انداز نمایاں ہونے لگا۔ اس نے کہا۔

''ہم اس حرکت کا جواب دیں گے اور یہ پوری قوت اور تیاری کے ساتھ ہوگا۔ ہم جلد فلوجا واپس جائیں گے اور اس کے لیے وقت کا تعین اور مقام کا انتخاب ہمارا اپنا ہوگا۔ ہم قاتلوں کا دنیا کے آخری کونے تک تعاقب کریں گے اور جب تک انہیں گرفتار یا قتل نہ کر دیں، آرام اور سکون سے نہیں بیٹھیں گے۔ فلوجا کو ٹھنڈا کرنا ضروری ہے۔''

پال بریمر نے اس قتل کے بارے میں جب پہلی بار زبان کھولی تو وہ بغداد میں پانچ سو عراقی پولیس گریجویٹس سے خطاب کر رہا تھا۔ اس نے کہا:

''کل کے روز فلوجا میں پیش آنے والے واقعات انسانیت اور بربریت و وحشت کے درمیان جاری جدوجہد میں ایک حیرت انگیز ڈرامائی تبدیلی کا آغاز ہے۔''

اس نے دھمکی دی کہ بلیک واٹر کے آدمیوں کے قتل پر امریکہ چپ نہیں بیٹھے گا۔ مرنے والے کنٹریکٹرز عراق کے لوگوں کی مدد کرنے اور انہیں آمریت کے پنجے سے رہائی دلانے کے لیے آئے تھے تاکہ یہاں الیکشن ہوں اور عراقیوں کو جمہوریت ملے، جو اکثریت کی خواہش تھی۔ ان کا المناک قتل بڑے دکھ کی بات ہے۔ لیکن اس سے عراق میں استحکام اور جمہوریت کی طرف ہمارا مارچ ختم نہیں ہوگا، جس کے لیے ہمارے قدم اٹھ چکے ہیں۔

فلوجا کے بارے میں جتنی اخباری رپورٹیں شائع ہوئیں، ان سب میں اسے ایک سنی تحریک مزاحمت کا مضبوط گڑھ اور مرکز قرار دیا گیا تھا، جہاں غیر ملکی لڑاکا، جنگجو اور صدام کے حامی اور وفادار موجود تھے۔ ان تمام رپورٹوں کا بنیادی اور اہم

نقطہ ایک ہی تھا کہ بلیک واٹر بڑے معصوم شہری کنٹریکٹرز تھے، جو مقامی علاقے میں خوراک اور پانی وغیرہ کی ترسیل اور فراہمی پر مامور تھے لیکن فلوجا کے قصائیوں نے انہیں وحشیانہ انداز میں قتل کر ڈالا۔ فلوجا کے اندر یا عراق میں کہیں بھی اس ایکشن کو ایک دوسرے زاویئے سے دیکھا جا رہا تھا۔

تکنیکی طور پر یہ کہنا کہ بلیک واٹر امریکی فوج کا عملاً حصہ نہیں تھے، درست نہیں اور نہ اس سے واقعے کی نوعیت میں کوئی فرق پڑتا ہے کیونکہ وہ بہرحال امریکہ کی مسلح افواج کے ساتھ کارروائیاں کر رہے تھے اور یہ ان کی غلطی تھی کہ ایسے وقت میں فلوجا شہر میں داخل ہو رہے تھے، جب امریکی فلوجا پر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش میں عراقی شہریوں کا قتل عام کر رہے تھے۔ فلوجا کے شہریوں کے نزدیک یہ ایک بہت بڑا معرکہ تھا، جو انہوں نے امریکیوں کے خلاف جیتا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ بے نشان گاڑیوں میں سفر کرنے والے چاروں امریکی سی آئی اے کے لیے کام کرنے والے ایجنٹ تھے اور ان کا یہی حشر ہونا چاہیے تھا۔

سی این این پر لیری کنگ لائیو پروگرام میں اے بی سی نیوز کے پیٹر جینگ نے، جو بلیک واٹر کنٹریکٹرز کے قتل کے واقعے سے صرف چند دن پہلے ہی عراق سے لوٹا تھا، اس نے بتایا کہ ان لوگوں کی عراق میں موجودگی دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ عراق میں جیسے امریکیوں کی کوئی سیکنڈ آرمی قسم کی کوئی فوج سکیورٹی کنٹریکٹرز کی شکل میں موجود ہے، جس کو عراق میں قریب قریب ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے اور جو ایک اتحادی رکن کے طور پر عراق میں امریکہ کے ایماء پر اس کی مرضی اور منشاء کے مطابق کچھ نہ کچھ کرنے میں بہرحال مصروف ہے۔ یہ سب سے الگ اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ سر سے پاؤں تک جدید ترین اسلحہ سے لیس۔ انہیں دیکھ کر لگتا ہے جیسے سلویسٹر اسٹالون کی کسی ایکشن فلم کے کردار فلم اسٹوڈیو سے عراق کے جنگ زدہ علاقے میں آ نکلے ہیں۔ کچھ لوگوں کے خیال میں یہ امریکیوں کے ہاتھوں اس قتل عام کا ردِعمل تھا، جو حالیہ دنوں میں انہوں نے فلوجا کے شہریوں کا کیا تھا اور جس میں بارہ سے زیادہ شہری، بچے اور عورتیں ماری گئی تھیں۔ اس سے فلوجا کے شہریوں کے دلوں میں امریکیوں سے نفرت بیٹھ گئی اور زیرِ زمین مزاحمت کی باتیں ہونے لگیں۔ چوری چھپے ہینڈ بل تقسیم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ فلوجا میں چار بلیک واٹر کنٹریکٹرز کی ہلاکت اسرائیلیوں کے ہاتھوں حماس کے بزرگ رہنما شیخ احمد یٰسین کی شہادت کا انتقام بھی تھا۔ امریکیوں کے نزدیک یہ سارا عمل خواہ کتنا ہی غیر معمولی ہو، لیکن انہیں اس کا خدشہ اور احساس بہرحال ہونا چاہیے تھا۔ وہ خود جس طرح کی وارننگ کے بغیر اچانک شہریوں کو قتل کرنا شروع کر دیتے ہیں تو خود ان کو بھی اسی طرح بے خبری میں کیوں نہیں مارا جا سکتا تھا۔

عام عراقی تو امریکیوں کے طرزِ عمل اور سلوک کا شاکی تو تھا ہی، سرکاری اداروں اور امریکیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے والے عراقی فورسز کے اہلکاروں کے جذبات اور احساسات بھی ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ امریکی فوجیوں کی تیار کردہ عراقی پولیس فورس کا میجر فیصل حمید مہدی فلوجا کا رہائشی ہے اور 2003ء میں بغداد پر امریکی قبضے کے بعد پولیس فورس میں شامل ہوا۔ اسے شکایت ہے کہ امریکیوں نے ہمارے ملک پر تو قبضہ کر لیا لیکن ہمیں کچھ نہیں دیا۔ جمہوریت کی بحالی اور

www.pkdigest.com

Pdf by Roads.gu

لوگوں کی مدد کرنے کا دعویٰ تو کیا جاتا ہے لیکن عملاً ایسا کچھ بھی نظر نہیں آتا سوائے تباہی، بربادی، قتل و غارت اور ظلم و تشدد کے۔ ایک اور مقامی افسر نے بتایا کہ امریکی آئے تو میں شروع میں بہت خوش تھا کہ اب میرے ملک کی حالت بہتر ہو جائے گی لیکن امریکہ اپنے وعدے پورے نہیں کر رہا۔

انہوں نے بڑی مشکل اور الجھن میں ڈال دیا ہے۔ اب ان کا مطالبہ ہے ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر دو جنہوں نے چار امریکیوں کے قتل میں حصہ لیا ہے۔ لوگ پہلے ہی ان سے نالاں ہیں۔ ان کے ناروا سلوک اور حرکتوں کی وجہ سے مرنے مارنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ سمجھ لیں لوگ بھوکے ہیں اور اگر آدمی بھوکا ہو اور غصے میں جلا بھنا بیٹھا ہو تو پھر اگلے کو کچا ہی چبانے کی خواہش ہوتی ہے۔ مایوسی انتہا کو پہنچ جائے تو پھر نتائج کی پروا ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ فلوجا کی اسٹیج بھی اس وقت کچھ ایسی ہی ہے۔

امریکی حکام ایک طرف تو بلیک واٹر کنٹریکٹرز کے قتل کی مذمت کرتے نہیں تھکتے تھے لیکن دوسری طرف امریکی پالیسی ساز اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب دینے سے کتراتے تھے کہ وہ صدام حسین کے بیٹوں اودھے اور قصی کی مسخ شدہ لاشوں کی سرِ عام نمائش کیوں کرتے رہے ہیں، جن کو جولائی 2003ء میں امریکی فوجیوں نے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔

جس طرح امریکیوں کو بلیک واٹر کے کنٹریکٹرز کے قتل اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی پر غم و غصہ تھا، اسی طرح عراقیوں کو اپنے رہنما کے بیٹوں کے امریکیوں کے ہاتھوں قتل ہونے اور ان کی لاشوں کی دنیا بھر میں تشہیر پر غصہ تھا۔ امریکی میڈیا اور ذرائع ابلاغ فلوجا کے واقعات کو اگرچہ بڑی قطع برید کے بعد اور تصاویر کو غیر واضح کر کے اپنے ناظرین سے چھپا اور براڈ کاسٹ کر رہا تھا..... لیکن دنیا کو بہر حال یہی پیغام جا رہا تھا کہ عراق میں امریکہ کے لیے حالات سازگار نہیں۔ سیکرٹری اسٹیٹ کولن پاول بش انتظامیہ کا پہلا اعلیٰ سطحی رکن تھا، جس نے براہ راست بلیک واٹر کے قتل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ایک جرمن ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ امریکہ میں اتنی طاقت اور صلاحیت ہے کہ وہ عراق میں طویل عرصے تک رک سکتا ہے اور اپنے دشمن سے لڑ سکتا ہے اور اسے شکست دے سکتا ہے۔ ہم عراق سے بھاگیں گے نہیں۔

دوسری طرف اخباری نمائندوں نے یہ سوال اٹھانا شروع کر دیا تھا کہ قتل ہونے والے چار کنٹریکٹرز کون تھے اور وقوعہ کے وقت فلوجا کے عین قلب میں کیا کر رہے تھے۔ اس کا کوئی واضح اور تسلی بخش جواب بغداد میں قابضین کے ترجمان ڈان سینر کے پاس نہیں تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا ہمارا بلیک واٹر کے ساتھ اپنے سفیر بریمر کی سکیورٹی کا معاہدہ ہے۔ وہ اس کی سکیورٹی کے ذمہ دار ہیں۔ اس پر سی این این پر سوال کرنے والے نے پوچھا۔ ''فلوجا کے واقعے کے بعد کیا اب بھی سمجھا جاتا ہے کہ یہ سکیورٹی کمپنی اپنا کام بخوبی انجام دینے کی اہل ہے؟''

''یقیناً.....'' سینر نے کہا۔ ''ہمیں بلیک واٹر اور پال بریمر کی سکیورٹی کا کام کرنے والی تمام ایجنسیوں کی کارکردگی پر مکمل بھروسہ ہے، جو انہیں پورے ملک میں سکیورٹی مہیا کرتی ہیں۔''

فلوجا کے واقعے کے اگلے ہی روز بلیک واٹر انتظامیہ نے معروف اور بااثر ری پبلکن لابنگ فرم ''دی الیگزینڈر اسٹریٹجی گروپ'' کی خدمات حاصل

کر لیں کہ بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو اس کے حق میں سازگار بنائے۔ بلیک واٹر نے پریس کے لیے بھی اس مضمون کا ایک مختصر سا بیان جاری کیا کہ ہم غیر معمولی خطرناک حالات کے باوجود عراق میں رضا کارانہ طور پر عراقی عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اتحادی فوجیں، سویلین کنٹریکٹرز اور انتظامیہ باہم مل جل کر عراقی عوام اور اتحادی ساتھیوں کے لیے روزمرہ کی ضروریات کی بنیادی اشیاء جیسے کھانا، پانی، بجلی اور دوسری سہولیات فراہم کرنے کے لیے کام کرتے ہیں۔ ہمارا کام خطرناک ہے، ہمیں اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کا دلی صدمہ اور افسوس ہے لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ اطمینان اور فخر بھی ہے کہ ہم عراقی لوگوں کی بہتری کے لیے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہمارے آدمیوں نے عراق کی آزادی کے نام پر قربانی دی ہے۔

چیلپن کارنر، بلیک واٹر کے نیوز لیٹر بلیک واٹر ٹیکٹیکل ویکلی کا ایک مستقل کالم نگار ہے۔ فلوجا کے واقعے کے بعد چیلپن ڈی آرسٹیفن نے ایک مضمون لکھا اور قارئین کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ عراقی عوام کو تحفظ اور خوراک فراہم کرنے کی خاطر بلیک واٹر کے ان امریکیوں کی خدمات مستعار لی گئی تھیں۔ کل کا واقعہ بنیاد پرستوں کے دلوں میں چھپی اس نفرت اور حقارت کی نشاندہی کرتا ہے، جو ان کے دلوں میں اپنے مخالفین کے لیے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور ہر وہ شخص، جو ان کا ہم عقیدہ نہیں، اسے وہ اپنا دشمن قرار دیتے ہیں، سفید فام امریکی اور اسرائیلی دونوں ان کے نزدیک قابل گردن زدنی ہیں۔ اسرائیلیوں سے نفرت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ فلوجا میں ہنگامہ آرائی کر کے یہ امریکی فوج کو شہر میں داخل ہونے اور اپنے مقدس مقامات تک پہنچنے سے روکنا چاہتے ہیں، جو ایک سعی لاحاصل سے زیادہ کچھ نہیں۔ مضمون نگار نے اپنے وعظ کی تان قارئین سے اس اپیل پر توڑی کہ اس سے قبل کہ دشمن ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھائے، ہم سب کو مل کر اس کو ایک بھرپور اور منہ توڑ جواب دینا چاہئے کہ ہمیں دنیا میں آزادی اور انصاف کا بول بالا کرنا ہے۔

میرینز کی نئی کمپنی کو فلوجا کی ذمہ داری سنبھالے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ فلوجا میں چار بلیک واٹر کنٹریکٹرز قتل ہو گئے۔ یہ واقعہ بڑے غلط وقت پر پیش آیا۔ اس نے میجر جنرل جیمس میٹھی کا سارا پلان ہی اُلٹ کر رکھ دیا۔ مقامی کمانڈر فلوجا میں اس واقعے کو امن و امان کا مسئلہ قرار دے کر سلجھانا چاہتے تھے۔ اس کے تحت مقامی پولیس کو شہر میں داخل ہو کر مشتبہ قاتلوں کو گرفتار کرنا اور انہیں خاموشی سے وہیں موت کے گھاٹ اتار دینا تھا۔ واشنگٹن اس کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ جان جوکھوں میں ڈالنے والی بات تھی۔ چنانچہ صدر بش نے فوری طور پر رمز فیلڈ اور علاقے میں موجود اعلیٰ امریکی کمانڈر جنرل جان ابی زید کو فلوجا کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کوئی قابل عمل منصوبہ تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ دونوں اس کے لیے پہلے ہی ذہنی طور پر تیار تھے اور جواب بھی موجود تھا..... بھرپور حملہ اور فلوجا پر قبضہ..... بش بھی کچھ ایسا ہی جواب سننا چاہتا تھا۔ فوری حملے کی منظوری دے دی گئی۔ میرین کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل جیمس کینوائے کو اس بارے کچھ تحفظات تھے اور چاہتا تھا کہ پہلے لوگوں کے مشتعل جذبات ذرا ٹھنڈے ہو جائیں، پھر حملہ کیا جائے تاکہ دنیا اسے انتقامی کارروائی نہ سمجھے۔ لیکن رمز فیلڈ اور اس کے

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

دوسرے اعلیٰ ساتھیوں نے اس سے اتفاق نہ کیا۔

صدر بش کی طرف سے حملے کی منظوری کے احکامات فلوجا شہر سے باہر قائم میرین بیس میں پہنچے تو کمانڈر نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ صدر جانتے ہیں کہ اس سے خون خرابہ ہوگا لیکن وہ اس کے لیے تیار ہیں، آپ سب بھی تیار رہیں۔ سارجنٹ میجر رینڈل کارٹر نے سپاہیوں کا مورال بڑھانے کے لیے جوشیلی تقریر کی کہ ہم یہاں عراق کی آزادی اور جمہوریت کی بالادستی قائم کرنے کے لیے آئے ہیں، لیکن فلوجا کا مشن ذرا الگ قسم کا ہوگا۔ اس مشن کا صرف ایک نکتہ ہے...... فلوجا کو راہِ راست پر لانا۔ اور یہ کام ہمیں کر کے دکھانا ہے۔

دوسری طرف شہر کے اندر بھی جنگ کی تیاریاں تھیں کہ مقامی لوگوں کو اس کا کچھ نہ کچھ ادراک ضرور تھا۔

فلوجا پر بھرپور حملہ شروع کرنے سے پہلے بریمر کے ڈپٹی جیم اسٹیل نے چند منتخب لوگوں کے ساتھ فلوجا کا خفیہ دورہ کیا۔ جم اسٹیل عراق میں بریمر کے ساتھ ذمہ داریاں سنبھالنے سے پہلے این رون کمپنی کا ڈائریکٹر تھا لیکن کمپنی میں شمولیت اختیار کرنے سے کئی برس پہلے وسطی امریکہ میں امریکہ کی آشیرباد سے ال سلواڈور اور نکاراگوا میں برپا ہونے والی مختلف شورشوں اور جھڑپوں کے دوران امریکہ کی طرف سے باغیوں کو اسلحہ بارود پہنچانے کی اہم اور بنیادی ذمہ داریاں نبھاتا رہا تھا۔ 1990ء میں جب امریکہ نے مینیول نوریگا کی حکومت کا تختہ اُلٹا تو وہ پاناما پولیس کے ساتھ کام کر رہا تھا۔

جم اسٹیل نے فلوجا میں اپنا خفیہ مشن اپریل 2004ء میں شروع کیا اور لاشوں کی واپسی ممکن بنانے کے ساتھ ساتھ دشمن کی پوزیشن اور طاقت کا اندازہ لگانے کا کام بھی انجام دیا۔ اس مشن کے بعد اس نے بھی تجویز دی کہ فلوجا میں سختی کرنا اور آہنی ہاتھ سے نمٹنا ناگزیر ہے۔ یہ لوگ صرف طاقت ہی کی زبان سمجھتے ہیں۔ نیچے جنوب کی طرف بھی (جہاں شیعہ کمیونٹی میں امریکیوں کے خلاف نفرت بڑھتی جا رہی تھی اور بغاوت کا خطرہ پیدا ہو رہا تھا) ہمیں کسی طرح کمزور نظر نہیں آنا چاہئے۔ ورنہ اس کی شورش اور بغاوتیں عراق میں ہر جگہ شروع ہو جائیں گی...... یوں مسجدوں کے شہر کو محاصرے میں لینے کا پروگرام حتمی شکل اختیار کرنے لگا۔ بریمر کو فلوجا کی صفائی کے بہانے باغیوں کو سبق سکھانے اور اپنی دہشت بٹھانے کا موقع مل گیا۔

اِدھر امریکی کمانڈر جب فلوجا میں اپنی تیاریوں میں مصروف تھے تو اُدھر واشنگٹن میں بلیک واٹر کے ایرک پرنس اور اس کے ساتھیوں کو کیپیٹل ہل میں خوش آمدید کہنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایرک کے بلیک واٹر جلد ہی عراق میں مزاحمت کے دوسرے بڑے مرکز کے دروازے پر دستک دینے والے تھے اور اس بار نیا ہدف مقدس شیعہ شہر نجف تھا۔

31 مارچ کو جب سے فلوجا میں بلیک واٹر کنٹریکٹرز قتل ہوئے تھے، بش انتظامیہ اندر ہی اندر مقتدیٰ الصدر کے خلاف بڑے پیمانے پر کریک ڈاؤن کی منصوبہ بندی میں لگی تھی۔ حکومت نے عراق میں مقامی لوگوں کو انتظامی معاملات میں خود مختاری دینے کے لیے جون 2004ء کی ڈیڈ لائن مقرر کی تھی، جو بڑی تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی لیکن حالات ابھی تک نارمل نہیں ہو رہے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ مقتدیٰ الصدر کی ذات اس میں رکاوٹ ہے۔ مقتدیٰ عراق کے ایک معروف مذہبی رہنما کا بیٹا تھا جو صدام حسین کے دور میں اس کے

www.pkdigest.com

فوجیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور اب مقتدیٰ خود ایک بڑا مذہبی رہنما بن چکا تھا اور مہدی آرمی کا کمانڈر تھا اور عراق میں امریکی قبضے کے خلاف اُٹھنے والی سب سے اہم، توانا اور ہردلعزیز آواز تھی، جس نے ہر عراقی کے دل میں آزادی کی تڑپ اور امریکیوں سے نفرت بھر دی تھی۔ اسے روکنا اور اس کی شیعہ تحریک مزاحمت کو ختم کرنا ضروری خیال کیا جانے لگا تھا۔

اپریل 2004ء میں جب امریکہ نے عراق میں شیعہ اور سُنی تحریک مزاحمت کو کچلنے کے لیے بیک وقت کارروائی کا آغاز کیا تو اس جنگ میں بلیک واٹر نے اہم، بنیادی اور فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ یہ امریکی ذرائع ابلاغ کا کمال تھا کہ فلوجا میں چار بلیک واٹر کنٹریکٹرز کی ہلاکت ایک مدت تک دنیا بھر کے اخبارات کی شہ سرخیوں کا موضوع بنی رہی اور اسے جنگ کا ایک اہم موڑ سمجھا جانے لگا۔ اس کے ٹھیک پانچ دن بعد نجف میں اس سے کہیں زیادہ خونریزی ہوئی اور بے شمار عراقی مارے گئے لیکن کسی نے اس کا زیادہ نوٹس نہیں لیا کہ ساری دنیا فلوجا کا ڈھول پیٹنے میں لگی تھی۔ فلوجا کے برعکس نجف کے معرکے میں بلیک واٹر کا رول کرائے کے سپاہیوں سے زیادہ مرکزی اور ایگزیکٹو کمانڈنگ ڈیوٹی کا تھا۔

پال بریمر کے قیامِ عراق کے دوران اس کے زیرِ صدارت جتنے پالیسی اجلاس اور فیصلے ہوئے ان سے ملک میں امن و امان کی صورتِ حال میں بہتری آنے کے بجائے افراتفری اور انتشار کو ہوا ملی۔ امریکی سپاہیوں نے اپنی حرکتوں سے جنگ کا دائرہ غیر ضروری طور پر پھیلا لیا اور مزاحمت کی کثیر الجہتی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ایک برطانوی جنگی وقائع نویس رابرٹ فسک نے اپنی فلوجا کی ڈائری میں لکھا کہ 1920ء میں برطانیہ نے عراق پر قبضے کے دوران یہاں کی شیعہ اور سنی آبادی کو اپنا دشمن بنانے میں تین سال لگائے تھے، امریکیوں نے یہ کام ایک سال سے بھی کم مدت میں پورا کر لیا۔ عراق کی فوج کو ختم کرنے کے بعد واشنگٹن کے احکامات پر سیکڑوں، ہزاروں عراقی نوجوانوں کو سرکاری نوکریوں سے نکال دیا گیا کہ ان پر بعث پارٹی کا رکن ہونے کا الزام تھا۔ اس طرح فارغ کیے جانے والوں کی بڑی تعداد نے تحریک مزاحمت میں شامل ہو کر قابضین کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔ جنگ کے بعد عراق کی تعمیر نو کے نام پر بہت سی کمپنیوں نے بغداد میں ڈیرے ڈال لیے، جن کے مرکزی دفاتر امریکہ میں تھے۔ عراقی دیکھتے کہ یہ کمپنیاں کس طرح دونوں ہاتھوں سے عراق کی دولت اکٹھی کر کے ملک سے باہر لے جا رہی ہیں تو ان کے اندر مایوسی اور محرومی کچھ اور بڑھ جاتی اور وہ اندر ہی اندر آتش انتقام میں جلنے لگتے کہ خود ان کے اکثر ہم وطنوں کو دو وقت کی روٹی میسر نہ تھی اور ان کی زندگیاں اور عزت قابضین کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی۔ امریکیوں کے مظالم اور جرائم کے خلاف ان کی کہیں شنوائی نہ تھی کہ بلیک واٹر ہر طرح کی جواب دہی سے مستثنیٰ تھی اور اس کے ارکان کو مکمل قانونی تحفظ حاصل تھا۔

ملک بھر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں عام ہونے لگیں اور لوگ قتل اور اچانک غائب ہونے شروع ہو گئے تو مذہبی لیڈروں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے اپنے اپنے حلقہ اثر میں عوام کو سکیورٹی اور سوشل سروسز فراہم کرنے کے لیے ایک پورا نیٹ ورک ترتیب دے دیا۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کے مسائل حل ہوتے اور وہ بالکل غیر محسوس طور پر ان

Pdf by Roadsign

کے جانثاروں اور پیروکاروں کے حلقے میں شامل ہونے لگتے، جس سے مذہبی رہنماؤں کی طاقت اور اثر ورسوخ مزید بڑھ گیا۔ مقتدیٰ الصدر کے منظر عام پر آنے کے بعد اس میں بالخصوص بڑا نمایاں اضافہ ہوا جس نے رفتہ رفتہ قومی تحریک مزاحمت کے مرکزی ہیرو کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔

بغداد کا پس ماندہ علاقہ صدرسٹی صدام حسین کے دورِ حکومت میں بھی بری طرح نظر انداز رہا۔ جنگ کے پال بریمر نے بعث مخالف پالیسی کے تحت معاشرتی رفاہی ادارے ختم کر کے ملک میں افراتفری، انتشار اور خوف وہراس کی ایک فضا پیدا کردی تھی۔ اس میں صدرسٹی میں مقتدیٰ الصدر کے متبادل نیٹ ورک نے مقامی آبادی کو بڑی ریلیف پہنچائی۔ حملہ کے فوری بعد مقتدیٰ الصدر نے اپنے سیاہ پوش پیروکاروں کو ہدایات جاری کیں کہ پسماندہ علاقے میں گشت بڑھادی جائے اور لوگوں کو روٹی، پانی اور اشیائے ضروریہ کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ اس سے غریب اور بے اختیار لوگوں میں سکیورٹی اور تحفظ کا احساس پیدا ہوا، جس کی اُس وقت بہت ضرورت تھی۔ مقتدیٰ الصدر نے قیادت کا خلاء بڑی کامیابی سے پُر کردیا تھا جبکہ دوسرے مذہبی اور سیاسی رہنما نئے امریکی سیٹ اپ میں طاقت اور اقتدار کے حصول کے لیے سرگرداں تھے۔ مقتدیٰ الصدر نے اس حوالے سے ہر امریکی پیشکش ٹھکرا دی اور اقتدار کے اس کھیل میں شامل ہونے کے لیے کبھی آمادگی اور رضامندی ظاہر نہیں کی اور یہی بات عوام میں اس کی مقبولیت کی بنیاد بن گئی۔ اگست 2003ء میں اس کی ملیشیا کی تعداد پانچ سو افراد سے زیادہ نہ تھی، جو اپریل 2004ء میں بڑھ کر دس ہزار تک پہنچ گئی۔

مقتدیٰ الصدر کی عوام میں بڑھتی ہوئی مقبولیت اور امریکی قبضے اور بالخصوص پال بریمر کے خلاف تند وتیز جوشیلی تقریروں نے اسے امریکہ کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ شخص بنادیا تھا اور ضروری ہوگیا تھا کہ جون 2004ء کی ڈیڈ لائن سے پہلے پہلے ایسے ناپسندیدہ اور باغی شخص کی آواز خاموش کرائی جائے اور فلوجا کی سنی آبادی کی طرح نجف کی شیعہ تحریک مزاحمت کو بھی روکا جائے۔ واشنگٹن کا شروع سے یہ خیال تھا کہ نئے عراق میں مقتدیٰ الصدر اس کا پہلا دشمن ہوگا۔ ڈپٹی ڈیفنس سیکرٹری پال ولفوٹز اور عراق میں سینئر کمانڈر جنرل ریکارڈو سانچز نے ہائی کمان سے صلاح مشورے کے بعد مقتدیٰ الصدر کی سرگرمیوں کو روکنے اور محدود کرنے کا فیصلہ کیا لیکن یہ کام کس طریقے سے انجام پائے گا، اس کے لیے کوئی ٹھوس اور حتمی حکمت عملی طے ہونا باقی تھی۔ مارچ 2004ء میں صورت حال ہی بدل گئی۔ پال بریمر نے مقتدیٰ الصدر اور اس کے حامیوں کے خلاف اچانک ہی جنگ کا آغاز کردیا کہ پانی سر پر سے گزرتا جارہا تھا اور اب مزید صبر کی اس کے پاس گنجائش نہ تھی۔ امریکہ کی طرف سے مقامی آبادی کو اختیارات سونپنے کا پروپیگنڈہ کیا جارہا تھا جبکہ مقتدیٰ الصدر زور دے رہا تھا کہ امریکہ عراق سے نکل جائے۔ اس طرح کھلم کھلا امریکی اتھارٹی چیلنج ہورہی تھی۔ لیکن مقتدیٰ الصدر محض ایک عام شیعہ لیڈر یا معمولی شخصیت نہیں تھا۔ وہ پکا قوم پرست تھا، جو عام عراقیوں کی زبان بولتا، انہی کی طرح سوچتا اور انہی کے لب ولہجے میں بات کرتا تھا۔ اس کی تقریر اور وعظ اپنے ثقافتی حوالوں اور ایسی مقامی ضرب الامثال سے بھرے ہوتے جو سننے والوں کے دلوں میں انگارے بھر دیتے اور وہ مرنے

مارنے کے لیے تیار ہوجاتے۔ ابتدا میں واشنگٹن پوسٹ کے مطابق امریکہ میں یہ خیال تھا کہ مقتدیٰ الصدر سے غیر ضروری چھیڑ چھاڑ، اس کی گرفتاری یا اس طرح کی کوئی بھی کارروائی اسے شہید وطن بنا دے گی اور معاملات مزید بگڑ جائیں گے، لیکن بقول واشنگٹن پوسٹ' مارچ کے آتے ہی حالات بدل گئے اور پال بریمر نے مقابلے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ بغداد سے ایک شیعہ ہفت روزہ AL-HAWZA چھپتا تھا۔ 28 مارچ کو امریکی فوجوں نے اس کے دفتر پر چھاپہ مارا، عملے کو زبردستی باہر نکال کر دروازے پر ایک موٹا سا تالا لگا کر دفتر کو سیل کردیا۔ AL-HAWZA گو ایک چھوٹا پرچہ تھا لیکن امریکی حملے اور پال بریمر کا شدید مخالف ہونے کی وجہ سے پڑھنے والوں کا بڑا وسیع حلقہ رکھتا تھا۔ پرچے پر الزام لگایا گیا کہ اس نے پال بریمر کے 14 اکتوبر کو جاری کیے گئے ایک حکم نامے کی خلاف ورزی کی ہے اور ملک میں نقضِ امن پیدا کرنے اور عوام کو اتحادی فوجوں پر حملوں کے لیے اُکسانے کے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ تاہم امریکی کوئی ایسی مثال پیش نہ کرسکے، جس سے ثابت کیا جاسکتا کہ عوام کو کس طرح امریکی اور اتحادی فوجوں پر حملوں کے لیے اکسایا اور ابھارا جارہا تھا۔ ایک مضمون کا حوالہ دیا گیا جس کی سرخی تھی، بریمر بھی صدام حسین کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ پرچے کے خلاف یہ کارروائی بش انتظامیہ کے سینئر لوگوں کے ساتھ صلاح مشورے اور رضامندی کے بعد عمل میں لائی گئی تھی۔ اس موقع پر بغداد میں بریمر کے ترجمان ڈان سینئر کی طرف سے جو وضاحتی بیان آیا، اس میں کہا گیا کہ ہم پریس کی آزادی پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن اگر اس طرح کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کو نہ روکا گیا تو لوگ مارے جائیں گے۔ تشدد کا پرچار کرنے والوں کو کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ نہ ہم کریں گے۔ یہ لوگ کسی نرمی اور معافی کے مستحق نہیں۔ پرچے کے خلاف یہ کریک ڈاؤن پال بریمر کے اندازے کی ایک سنگین غلطی تھی۔ AL-HAWZA کا پس منظر ایک ہزار سال پرانی شیعہ روایات اور تاریخ ہزیمت سے جڑا ہوا تھا جس سے اہلِ عراق کو ہمیشہ غیر ملکی قابضین کے خلاف نفرت، بغاوت اور جدوجہد کی تحریک ملتی رہی۔ 1920ء میں برطانوی قبضے کے خلاف عراقیوں کی تاریخی جدوجہد اسی سلسلے کی کڑی گنی جاتی ہے۔

ہفت روزہ AL-HAWZA کے خلاف کریک ڈاؤن کے بعد نیوز ڈے نے عراق میں اپنے نمائندے محمد بازی کے حوالے سے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ حالیہ برسوں میں مقتدیٰ الصدر کی مقبولیت کے گراف میں کمی دیکھی جارہی تھی، لیکن پال بریمر کی طرف سے پرچے کی جبری بندش اور مقتدیٰ الصدر پر سرکشی اور بغاوت کے الزامات نے نوجوان رہنما کو ایک نئی زندگی بخش دی اور اسے اپنے آپ کو امریکہ کا کٹر مخالف ثابت کرنے کا سنہری موقع مل گیا۔ عوام میں غم وغصہ پہلے سے بھرا ہوا تھا، اس واقعے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا، جس کی شدت بریمر کی طرف سے مقتدیٰ الصدر کو گرفتار کرنے کی قیاس آرائیوں اور افواہوں نے کچھ اور بڑھادی اور اس کی آنچ گرین زون کے دروازوں تک پہنچنے لگی۔ مظاہرین نعرے لگاتے۔ ''مقتدیٰ کا نام لو۔ 1920ء کے انقلاب کی یاد تازہ کرو۔''

شیعہ ہفت روزہ کی جبری بندش سے پورے

www.pkdigest.com

ملک میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ جگہ جگہ شدید شیعہ سنی مظاہرے شروع ہو گئے۔ پرچے کی بندش کے واقعے سے دو دن پہلے امریکیوں نے فلوجا کے نواح میں ایک ایکشن کے دوران پندرہ عراقی قتل کر کے سنی کمیونٹی کو بھی مشتعل کر دیا تھا جبکہ جنوب میں پہلے ہی سینکڑوں، ہزاروں شیعہ مظاہرین سڑکوں اور گلیوں میں اُمڈ آئے تھے۔ 2 اپریل کو نماز جمعہ کے دوران مقتدیٰ الصدر نے اعلان کیا۔

’’میں عراق میں حزب اللہ اور حماس کا جنگی بازو ہوں۔‘‘

ادھر یہ صورتِ حال جاری تھی اور امریکی فوجیں فلوجا کا محاصرہ کرنے کی تیاریاں کر رہی تھیں کہ پال بریمر سے ایک اور حماقت سرزد ہو گئی۔ اس نے مقتدیٰ الصدر کے ایک ڈپٹی شیخ مصطفیٰ یعقوبی کی گرفتاری کا حکم جاری کر کے شعلہ بنی صورتِ حال پر گویا پٹرول چھڑک دیا۔ یعقوبی کو 3 اپریل ہفتہ کے روز امریکی فوجوں نے گرفتار کیا تو مقتدیٰ الصدر کے صبر اور ضبط کا دامن ٹوٹ گیا۔ اس نے اپنے حامیوں کو مکمل تیاری کے ساتھ کھل کر دشمنوں کے خلاف میدانِ عمل میں نکل آنے کی ہدایات جاری کر دیں۔ اس پر ہزاروں لوگ بسوں میں سوار ہو کر بغداد سے نکل پڑے۔ ان کا رخ اپنے رہنما کے روحانی مرکز کوفہ کی جانب تھا، جو نجف کے مقدس شہر کے ساتھ تھا۔ مظاہرین کی اکثریت کا خیال تھا کہ یعقوبی کو گرفتاری کے بعد وہاں رکھا گیا ہے۔ رش کی وجہ سے راستے میں جگہ جگہ ٹریفک جام کی وجہ سے رکنا پڑا۔ یہ سب لوگ جنگ کے لیے نکلے تھے۔

’’بغاوت کا وقت ہم نے نہیں چنا...... نجف میں مقتدیٰ الصدر کے ترجمان فواد طرفی نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ’’اس وقت کا انتخاب امریکی فوج نے کیا ہے۔‘‘

4 اپریل کی صبح طلوع ہونے سے تھوڑی دیر بعد مہدی آرمی نے علاقے میں موجود سرکاری انتظامی اداروں کی عمارتوں اور دفاتر کا کنٹرول سنبھالنا اور اسلحہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ مقامی پولیس کمانڈر نے کسی پس و پیش کے بغیر فوراً ہی اپنے اختیارات سے دستبرداری اختیار کر لی اور کچھ ایسا ہی دوسری سرکاری عمارتوں کے نگرانوں اور ایڈمنسٹریٹروں نے کیا۔

ادھر مظاہرین نے اپنے اصل ہدف کی طرف بڑھنا شروع کر دیا، جو نجف میں قابض فوجوں کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کیمپ گالف تھی اور جس کی حفاظت پر بلیک واٹر والے متعین تھے۔

❁❁❁

4 اپریل 2004ء کی صبح جب مقدس شیعہ شہر نجف کے در و دیوار کو سورج کی روپہلی کرنوں نے چومنا شروع کیا، سات آٹھ بلیک واٹر کنٹریکٹرز مخلوط حکومت کی صوبائی اتھارٹی کے ہیڈ کوارٹر کی چھت پر کھڑے تھے۔ اس عمارت کی حفاظت ان کی ذمہ داری تھی۔ امریکی شہر سے باہر بیس کیمپ میں تھے۔ شہر کے اندر ان کی تعداد بہت کم تھی کہ ان دنوں امریکی فوج کے شیعہ لیڈروں کے ساتھ مذاکرات چل رہے تھے، جن کا مطالبہ تھا کہ امریکی شہر خالی کر دیں۔ بلیک واٹر تحریری معاہدے کی رُو سے عراق میں ایک طرف پال بریمر کی سکیورٹی کی ذمہ داری تھی تو دوسری طرف عراق میں کم از کم پانچ امریکی علاقائی ہیڈ کوارٹرز پر پہرہ دینا اور ان کی حفاظت کرنا تھی۔ ان پانچ علاقائی ہیڈ کوارٹرز میں سے ایک نجف کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ دنیا کے اکثر لوگوں کی طرح بلیک واٹر

السید پکوان
پاکستانی، انڈین، چائنیز اور کانٹینینٹل کھانوں کے ایکسپرٹ
ذائقہ جو مدتوں یاد رہے
تقریب خواہ بیٹی کی ہو یا دعوت ولیمہ یا آپ کے لخت جگر کی سالگرہ
دعوت نیاز ہو یا دعوت حلیم یا پھر افطار پارٹی
آپ کے مہمانوں کی تواضع ہم سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا
ڈسکاؤنٹ کے ساتھ
رابطہ: السید پکوان: اقبال پلازہ فیز 1 ـ 52-C-11
نزد فیاض شیرمال ناگن چورنگی نارتھ کراچی
فون: 021-36932206/0332-3580243
0321-2048430/0300-2830961
نوٹ: ہمارے پاس تمام کھانے حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق تیار کیے جاتے ہیں

Pdf by Roadsofpk

کے ارکان بھی فلوجا میں پیش آنے والے واقعہ اور اپنے ساتھیوں کے انجام سے اچھی طرح واقف تھے۔ نجف میں مظاہرین کی تعداد اور جذبات کی شدت فلوجا سے کہیں زیادہ تھی، اس لیے سب پوری طرح چوکس تھے کہ کسی وقت بھی کچھ ہوسکتا ہے۔

کیمپ گالف کبھی کوفہ یونیورسٹی کا کیمپس ہوا کرتا تھا۔ عراق پر قبضے کے بعد امریکیوں نے یہاں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کرلیا تھا۔ مظاہرین نعرے لگاتے ہوئے کیمپ گالف پہنچے تو آٹھ بلیک واٹر کنٹریکٹرز اور چند ال سلواڈور کے فوجی عمارت پر پہرہ دے رہے تھے اور یہ محض اتفاق تھا کہ اس لمحے عمارت میں چند امریکی میرینز بھی موجود تھے۔

امریکی میرین ٹونی ینگ جنوری 2004ء سے عراق میں تھا اور پیغام رسانی کے شعبے سے منسلک تھا۔ وہ چار اپریل کی صبح نجف میں اس لیے موجود تھا کہ اسے کیمپ گالف میں مواصلاتی آلات لگانے تھے۔ فرنٹ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے باہر سڑک پر مظاہرین کا ایک گروپ دیکھا۔ ان پر ایک سرسری سی نظر ڈالتا ہوا وہ عمارت کے اندر داخل ہوگیا، جہاں مظاہرین سے مقابلے کی صورت میں اتحادی فوجی موجود تھے۔ ینگ اور اس کا ساتھی مقامی قابضین کے کمانڈر، جو ایک ہسپانوی تھا، سے مل کر چھت پر چڑھ گئے، جہاں انہیں نے مواصلاتی آلات لگانے تھے۔ اس دوران کیمپ گالف کے آس پاس احتجاج اور نعروں کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ ینگ نے اس سارے شور شرابے کے باوجود پچیس منٹ میں اپنا کام ختم کرلیا اور نیچے جا کر اپنے ٹرک میں بیٹھ گیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ساتھی نے آواز دے کر بتایا کہ آلات ٹھیک طرح سے کام نہیں کررہے۔ ینگ نے لپک کر اپنے اوزار اٹھائے اور سڑک سے نیچے کودنے لگا تھا کہ زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ سامنے گلی میں مرکز کے پاس رائفل AK-47 سے راؤنڈ فائر ہوئے تھے۔ ینگ بھاگ کر ایک بار پھر عمارت میں داخل ہوگیا اور بھاگتا ہوا چھت پر پہنچا، جہاں آٹھ بلیک واٹر کنٹریکٹرز اور ال سلواڈور کے چند فوجی پہلے سے موجود تھے اور انہوں نے دیوار کے ساتھ مختلف مقامات پر پوزیشنیں سنبھال رکھی تھیں۔ ینگ نے بھی ایک جگہ پوزیشن سنبھال کر اپنی خودکار M249 مشین گن کو تیار کیا۔ نیچے باہر سڑک پر معرکہ گرم ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھ گن کی دوربین پر جما دی اور احکامات کا انتظار کرنے لگا کہ حکم ملے تو مظاہرین پر فائر کھول دے۔ شور تھا کہ ہر لمحہ بڑھتا ہی جارہا تھا، لیکن چھت پر بالکل خاموشی طاری تھی۔ چند سیکنڈ بھی صدیوں پر بھاری محسوس ہورہے تھے۔

اس نے دیکھا کہ ایک ٹرک سے لوگ اترنا شروع ہوئے۔ ایک عراقی نیچے کودا اور اپنے آپ کو تیزی سے زمین پر گرا کر پوزیشن لے لی اور چھت پر کھڑے لوگوں کا نشانہ لے کر چند راؤنڈ فائر کر دیئے۔ ینگ کا کہنا ہے۔ وہ چیخا۔ ایک بلوائی میرے نشانے پر ہے کیا میں اس پر گولی چلا دوں؟ لیکن جواب کون دیتا؟ باقاعدہ امریکی فوج کا کوئی ذمہ دار افسر موقع پر موجود ہی نہ تھا جو اسے فائر کی اجازت دیتا۔ چنانچہ اس دن امریکی میرین ینگ کو موقع پر موجود پرائیویٹ کرائے کے فوجیوں، بلیک واٹر کنٹریکٹرز سے ہدایات اور احکامات لینے پڑے۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد بلیک واٹر نے اسے فائر کرنے کا حکم دے دیا اور خود بھی مظاہرین پر فائرنگ کھول دی۔ ینگ نے اپنی گن کا رخ ٹارگٹ پر فکس کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ عراقی نے

ایک لمبا سفید چوغہ پہن رکھا تھا اور داہنے ہاتھ میں AK-47 رائفل تھی۔ ینگ اس منظر کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ جب میں نے اسے نشانہ بنایا تو وہ پوری قوت سے سامنے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ 5.56 ایم ایم کا برسٹ لگا تو کئی فٹ اوپر اچھل گیا اور پھر میں نے اسے گن کی دوربین سے سڑک پر اوندھے منہ گرتے دیکھا۔ میں چند سیکنڈ کے لیے رک گیا اور گن سے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ سڑک پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور سفید چوغے کے دامن پر ابھرنے والا سرخ دائرہ بتدریج پھیلتا جارہا تھا۔

ینگ اور اس کے ساتھی بلیک واٹر کنٹریکٹرز کا بیان ہے کہ اس دن فائرنگ کا آغاز عراقی مظاہرین نے کیا تھا جبکہ بعض عینی شاہد، جن سے صحافیوں نے انٹرویو کیے، وہ ایک دوسری کہانی سناتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ فائرنگ کی ابتدا ہیڈ کوارٹر میں پہرے پر موجود بلیک واٹر گارڈز کی طرف سے ہوئی تھی۔ انہوں نے مظاہرین کو ڈرا کر منتشر کرنے کے لیے پہلے ان پر ہوائی فائرنگ کی لیکن جب دیکھا کہ مظاہرین کا ریلا رُکنے کے بجائے آگے ہی بڑھتا چلا آرہا ہے تو انہوں نے بدحواسی میں سیدھی فائرنگ شروع کر دی۔ واشنگٹن پوسٹ کے نمائندے انتھونی شاڈید نے لکھا۔

"مظاہرین میں موجود مسلح افراد نے فائرنگ کا جواب راکٹ لانچرز، دستی بموں اور مارٹر گولوں سے دیا۔ ہیڈ کوارٹر سے باہر اس دن اکٹھے ہونے والے مظاہرین کی تعداد دو ہزار سے زائد تھی۔ ایک بار جب فائرنگ کا تبادلہ شروع ہوگیا تو پھر یہ بات بے معنی تھی کہ اس کا آغاز کس جانب سے ہوا تھا۔ بلیک واٹر کنٹریکٹرز اور ال سلواڈور کے فوجیوں اور امریکی میرین ٹونی ینگ نے ہجوم پر اندھا دھند فائرنگ کر کے بے شمار میگزین خالی کر ڈالے تھے اور سیکڑوں 40 ایم ایم گرینیڈ مظاہرین کے درمیان پھینکے۔ لگاتار فائرنگ سے گن کی نال زیادہ گرم ہوجاتی تو ہر پندرہ منٹ بعد فائرنگ روک دی جاتی کہ گن کی دہکتی ہوئی نال ذرا ٹھنڈی ہوجائے۔ ایک موقع پر ال سلواڈور کے چار فوجی مشتعل ہجوم کے ہتھے چڑھ گئے۔ ایک کو موقع پر ہی ہلاک کر دیا گیا، باقی تین قیدی بنا کر پیچھے بھجوا دیئے گئے۔

لڑائی کے دوران ایک بلیک واٹر کنٹریکٹر نے اپنے کیمرے سے اس سارے ایکشن کی وڈیو تیار کرلی تھی، جو بعد میں اس واقعے کی ایک چشم دید اور مستند گواہی قرار پائی۔ وڈیو میں بلیک واٹر کنٹریکٹرز اور ال سلواڈور کے فوجی چھت پر مورچے سنبھالے اور مظاہرین پر فائرنگ کرتے صاف نظر آتے ہیں اور پس منظر میں ہلکے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ بھاری ہتھیاروں کی آوازیں، دھماکے اور لوگوں کا چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو ہدایات دینے کا شور بھی سنائی دیتا ہے۔ اس لڑائی میں تین بلیک واٹر کنٹریکٹرز عراقی نشانہ بازوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ ایک کو جبڑے پر گولی لگی اور اس کا آدھا چہرہ اُڑ گیا۔

آخر کار اسپیشل امریکی فورسز نے نجف شہر میں داخل ہو کر مظاہرین کو منتشر کیا۔ غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق نجف کی اس لڑائی میں بے شمار امریکی مارے گئے جبکہ میرین ینگ کے مطابق مرنے والے عراقی سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ یہ لڑائی کم و بیش ساڑھے تین گھنٹے جاری رہی۔ وڈیو اور عینی گواہوں کے بیانات کی روشنی میں یہ بات صاف ہوگئی کہ اس دن سارا آپریشن بلیک واٹر کنٹریکٹرز انجام دے رہے تھے اور امریکی میرین

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

ینگ کو بھی وہی ہدایات دیتے کہ کب اور کس پر فائر کرنا ہے۔ دوپہر تک عراق میں سینئر امریکی کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ریکارڈو سانچز اور اس کا ڈپٹی بریگیڈیئر جنرل مارک کیمت بھی پہنچ گئے۔ بعد ازاں جب کیمت نے نجف کی لڑائی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تو بلیک واٹر کنٹریکٹرز کا نام لیے بغیر معرکے کی قیادت کرنے والوں کی تعریف کی اور ان کے کردار کو سراہا۔

✿✿✿

مقتدیٰ الصدر اور اس کے حامیوں کے مطابق چار اپریل کو دنیائے اسلام کے مقدس ترین شہروں میں سے ایک شہر نجف میں عراقیوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی جبکہ بلیک واٹر اور میرین ینگ کے نزدیک یہ ایک ایسا دن تھا، جب تمام تر ناموافق حالات کے باوجود انہوں نے ایک ایسے بپھرے ہوئے ہجوم کو روکنے میں کامیابی حاصل کی، جو ان کے خون کا پیاسا تھا اور اس عمارت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، جس کی حفاظت کی ذمہ داری ان کو حکومت نے سونپی تھی۔ اس سہ پہر کوفہ کی مسجد کے لاؤڈ اسپیکروں پر اعلان ہوا کہ کوفہ، نجف، ناصریہ اور بغداد کے علاقے صدر سٹی پر مہدی آرمی کا ہولڈ ہے۔ واشنگٹن پوسٹ کے مطابق کوفہ اور نجف میں داخلے کے راستے کے واحد پُل کی چیک پوسٹ پر ملیشیا کے نوجوان تعینات کر دیئے گئے۔ یہ زیادہ تر وہ پولیس افسر تھے، جن کو امریکہ کی اتحادی حکومت نے بھرتی کیا اور تربیت دی تھی اور جو عراق پر امریکی حملے کے بعد باغیوں سے جا ملے تھے۔ اسی روز پال بریمر نے اعلان کیا کہ اس نے عراقی ڈیفنس اور انٹیلی جنس وزیروں کو تبدیل کر کے ان کی جگہ نئے لوگوں کا تقرر کر دیا ہے۔ اس نے نجف کی لڑائی کے بارے میں کہا کہ آج صبح نجف میں لوگوں کے ایک گروپ نے لکیر پار کر کے شہر میں دنگا فساد کیا ہے، جسے برداشت نہیں کیا جا سکے گا۔ شام سورج غروب ہونے سے پہلے مقتدیٰ الصدر نے بھی اپنے حامیوں کے نام ایک پیغام جاری کیا اور انہیں ہدایت کی کہ ہر قسم کے احتجاج اور مظاہروں کا سلسلہ فی الفور ختم کر دیا جائے، لیکن خاموش نہیں بیٹھنا۔ اپنے دشمن کو دہشت زدہ کرو۔ اس کے دل و دماغ پر اپنا خوف مسلط کر دو اور اسے اتنا ڈراؤ کہ خود بھاگ جائے۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

اسی رات صدر سٹی میں امریکی فوجوں کی نقل و حرکت شروع ہو گئی۔ امریکی جنگی طیارے اور گن شپ ہیلی کاپٹر نجف میں جھڑپ کے ردعمل میں آبادی کو نشانہ بنانے لگے۔ رائٹر ٹیلی ویژن نے تصویروں میں ٹینکوں کو بغداد کی مضافاتی آبادی کی املاک اور گاڑیوں کو روندتے اور کچلتے اور انہیں تہس نہس کرتے دکھایا۔ مقتدیٰ الصدر کا پیغام عوام تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ انہوں نے پیغام پاتے ہی امریکی افواج کے خلاف چھپ کر حملے کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کی حکمت عملی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ صدر سٹی میں بھی ایسا ہی کیا گیا، جہاں سینڈی شی ہان کا بیٹا کیسی، جو امریکی فوج میں اسپیشلسٹ تھا، اس دن مارا گیا۔ اس دن چار اپریل کو صدر سٹی میں آٹھ امریکی فوجی قتل اور پچاس زخمی ہوئے جن میں کچھ عراقیوں کی نامعلوم تعداد بھی شامل تھی۔ صدر سٹی کا یہ معرکہ فرسٹ آرمرڈ ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل مارٹن ڈیمپسی کے مطابق سقوطِ بغداد کے بعد سے سب سے بڑی گن فائٹ تھی۔ مقتدیٰ الصدر کے حامیوں کی طرف سے مجموعی طور پر عراق کے کم از کم آٹھ شہروں میں زبردست

مظاہرے ہوئے۔

15 اپریل کو پال بریمر نے مقتدیٰ الصدر کو قانون سے بھاگا ہوا ملزم قرار دیتے ہوئے کہا وہ ملک میں ایک متوازی حکومت قائم کر کے اپنی اتھارٹی قائم کرنا چاہتا ہے۔ ہم اسے برداشت نہیں کریں گے۔ ہم عراق میں قانون کی حکمرانی قائم کر کے امن بحال کریں گے، جس کے لیے عراقی عوام نے ہم سے توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ چند گھنٹے بعد مقتدیٰ الصدر کے وارنٹ گرفتاری جاری کرنے کا سرکاری اعلان ہو گیا۔ یہ بڑا دھماکہ خیز اور تباہ کن فیصلہ تھا، جس سے شیعہ رہنما کی مقبولیت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ فلوجا میں جاری صورتِ حال کے ساتھ باغی لیڈر کے خلاف کریک ڈاؤن کا اعلان ہوا تو سنی شیعہ دونوں قابض فوجوں کے خلاف گوریلا جنگ کے لیے ایک ہو گئے۔

عراق سے دُور..... واشنگٹن میں ایک نئی بحث چھڑ چکی تھی۔ نجف اور فلوجا کے واقعات میں بلیک واٹر نے جس طرح کھل کر نمایاں انداز میں حصہ لیا، اس نے جنگ کے لیے کرائے کے فوجیوں کی بھرتی اور ان کی بڑھتی ہوئی تعداد پر تنقید کے دروازے کھول دیئے۔ نیو یارک ٹائمز نے اپنے ایک اداریے میں فلوجا میں بلیک واٹر کے چار افراد کے قتل کے حوالے سے لکھا کہ اس طرح کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ امریکہ اپنے دفاع کے لیے اب کرائے کی بندوقوں پر زیادہ انحصار کرنے لگا ہے، جو باعثِ تشویش ہے۔ نجف کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ پینٹاگان عراق میں امن اور استحکام لانے کے لیے اپنی بنیادی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کا مرتکب ہوا ہے۔ ضرورت کے مطابق نئے فوجی بھرتی کرنے کے بجائے کرائے کے آدمیوں سے کام چلانے کا آسان راستہ ڈھونڈ لیا گیا ہے۔

ڈیفنس سیکرٹری رمز فیلڈ کا عہد اور اعلان ہے کہ پینٹاگان فوج کی نجکاری اور دوسرے ذرائع کی تلاش جاری رکھے گا۔ لیکن جب کور سکیورٹی اور جنگ میں مبارزت کا معاملہ ہو تو موصوف کا یہ نظریہ اور دعویٰ محل نظر آتا ہے۔ پینٹاگان کو کرائے کے قاتلوں کی ایک نئی نسل پیدا کرنے کے بجائے اپنے فوجی بھرتی کر کے انہیں ٹریننگ دینے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کرائے کے قاتلوں سے باقاعدہ فوجیوں جیسے رویے اور کردار کی توقع رکھنا عبث ہے۔

کانگریس کی ری پبلکن لیڈر شپ میں بھی یہ موضوع زیر بحث رہا۔ کچھ حلقوں نے بلیک واٹر کو شیر دل قرار دیتے ہوئے جنگ میں اس کے کردار کی تعریف کی اور کچھ نے اسے اپنی حدود سے تجاوز قرار دیا۔ اس سے قبل بلیک واٹر کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں اگر کچھ شکوک و شبہات موجود تھے تو وہ اس بحث مباحثے سے دور ہو گئے اور یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی کہ بلیک واٹر اس جنگ کا ایک بڑا کھلاڑی ہے۔

جس رات نجف سوگ میں ڈوبا ہوا تھا، وہاں سے کئی سو میل دور شمال مغرب میں ایک ہزار سے زیادہ امریکی میرینز نے فلوجا کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا اور بلیک واٹر کے ان چار کنٹریکٹرز کی موت کا بدلہ لینے کے لیے حملے کی تیاریاں کر رہے تھے، جو پانچ روز پہلے فلوجا میں قتل کر دیئے گئے تھے۔

شورش تھی کہ پھیلتی جا رہی تھی۔ اور مختلف شہروں میں شیعہ آبادی مظاہرے کر رہی تھی۔ اس کے باوجود وائٹ ہاؤس سنی فلوجا کو کچل ڈالنے کے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے بضد تھا۔ بلیک واٹر

www.pkdigest.com

Pdf by Roadsign

کے قتل کے واقعے نے انتظامیہ کو اس کا جواز مہیا کیا تھا تو پال بریمر نے بغداد میں اس پر تیل چھڑکتے ہوئے اسے شورش پسندوں کے خلاف ایک بھرپور حملے کے لیے سنہری موقع قرار دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

اس کا خیال تھا، شیعہ سنی شورش پسندوں کے بڑھتے ہوئے حوصلے اور صومالیہ کے واقعات کی بازگشت علاقے میں امریکی افواج اور ان کے اتحادیوں کے لیے باعث تشویش ہیں اور دنیا سمجھنے لگی ہے کہ امریکہ، عراق میں جنگ ہار رہا ہے۔ جبکہ امریکی صدر بش کی طرف سے ہمارا مشن مکمل ہو گیا کا اعلان کر کے بہت پہلے یہ جنگ جیت لینے کا دعویٰ کیا جا چکا ہے۔

پال بریمر اور انتظامیہ کا خیال تھا کہ سُنی فلوجا اور مقتدیٰ الصدر کے خلاف سرجیکل آپریشن سے عراق میں منظم تحریک مزاحمت کی کمر ٹوٹ جائے گی اور یہ دم توڑ دے گی جبکہ واشنگٹن کی تباہ کن پالیسیوں کے نتیجے میں ایک طرف ہزاروں عراقی اور سیکڑوں امریکی مارے جا رہے تھے تو دوسری طرف بلیک واٹر کے کرائے کے قاتل دوستوں کے لیے کاروبار بڑھانے اور منافع کمانے کے نت نئے مواقع اور سہولیات فراہم کی گئیں۔

14 اپریل 2004ء کو امریکیوں نے فلوجا کا پہلا محاصرہ کیا۔ یہ وہی دن ہے، جب بلیک واٹر نے نجف میں خونیں معرکہ لڑا تھا۔ فلوجا کے خلاف حملے کو OPERATION VIGILANT RESOLVE کا خفیہ نام ملا۔ اس رات ایک ہزار سے زیادہ میرینز اور عراقی بٹالین نے ساڑھے تین لاکھ کی آبادی کے شہر فلوجا کو پوری طرح محاصرے میں لے لیا۔ شہر میں داخلے اور باہر نکلنے کے سارے مرکزی دروازے خاردار تار لگا کر بند کر دیئے گئے اور ساتھ ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں کھڑی کر دی گئیں۔

میرینز نے قیدیوں کو بند کرنے کے لیے کیمپ بھی قائم کر لیا اور مقامی ریڈیو پر فوج کی طرف سے اعلانات ہونے لگے کہ شہری فوج کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے مزاحمت کاروں کی موجودگی اور ان کے ٹھکانوں کی نشاندہی کریں۔ عراقی پولیس نے شہر کی مساجد میں ہینڈ بل تقسیم کرائے، جن میں اسلحہ پر پابندی اور شام سات بجے سے صبح چھ بجے تک شہر میں کرفیو کے نفاذ کا اعلان تھا۔ چوراہوں پر بینر بھی آویزاں کر دیئے گئے، جن پر بلیک واٹر کے مبینہ قاتلوں کے حلیے اور خاکے دیئے گئے تھے۔ یہ امریکیوں کے نزدیک انتہائی مطلوبہ افراد تھے۔ شہر کے باہر قبرستان کے ساتھ مورچے تیار کر لیے گئے اور مسجد کی چھت پر ماہر نشانہ بازوں کو بٹھا دیا گیا۔

ان تمام تیاریوں کے بارے میں ایک امریکی کمانڈر کا کہنا تھا کہ ہمیں شہر میں شرارتی لوگوں کی تلاش ہے۔ گھر گھر تلاشی لے کر انہیں ڈھونڈیں گے اور گرفتار کر لیں گے اور کیفر کردار تک پہنچائیں گے۔ میرینز کے ترجمان لیفٹیننٹ ایرک کاپ نے انکشاف کیا کہ امریکی کمانڈروں نے اپنے عراقی اتحادیوں کے ساتھ شہریوں کو پیغام بھجوایا ہے کہ امریکی فوج کے شہر میں داخلے کے وقت مزاحمت نہ کریں اور گھر گھر تلاشی کے دوران سارے افراد خانہ گھر کے کسی ایک کمرے میں جمع ہوں۔ اگر حملہ آور فوجیوں سے کوئی بات کرنا چاہیں تو پہلے ہاتھ بلند کر کے اجازت طلب کریں۔ امریکی محاصرہ اور بھرپور حملہ شروع ہوا تو اس سے پہلے ہی فلوجا کے ہزاروں شہری اپنے گھروں کو خالی کر کے دوسرے

محفوظ مقامات پر منتقل ہو چکے تھے۔

اگلی صبح امریکی فوجوں نے فلوجا میں اپنے آپریشن کا آغاز کیا۔ شروع میں اسپیشل فورسز کے افراد ہائی ویلیو ٹارگٹس کی تلاش اور گرفتاری کے لیے شہر میں داخل ہوئے، اس کے بعد بھرپور آپریشن شروع ہو گیا، جس میں تین بٹالین کے پچیس سو میرینز نے حصہ لیا، جن کی مدد کے لیے ٹینک بھی ساتھ تھے۔

امریکی فوجوں کو جلد ہی عراقی جنگجوؤں کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ اس کا دائرہ پھیلنے لگا تو امریکی میرینز کو فضائیہ کی مدد طلب کرنا پڑی۔

7 اپریل کو عبدالعزیز سامرائی مسجد پر کوبرا ہیلی کاپٹر نے حملہ کیا، جہاں امریکہ کا خیال تھا کہ مزاحمت کاروں نے پناہ لے رکھی ہے اور وہاں سے حملہ آوروں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ مسجد کے مینار کو ایک ہیل فائر میزائل سے نشانہ بنایا گیا اور ایف۔ 16 جنگی طیارے نے پانچ سو پونڈ وزنی بم مسجد کے صحن میں گرایا۔

یہ جنیوا کنونشن کی صریحاً خلاف ورزی تھی، جس کے تحت دورانِ جنگ کسی بھی مسلک کے مذہبی مقامات کو نشانہ بنانے کی ممانعت تھی۔ میرینز کی طرف سے اپنے دفاع میں وضاحتی بیان جاری کیا گیا کہ چونکہ مسجد کے اندر مزاحمت کاروں نے پناہ لے رکھی تھی، اس لیے مسجد کو جنیوا کنونشن کے تحت دیا گیا تحفظ کا حق ختم ہو گیا تھا اور وہ ایک صحیح فوجی جنگی ٹارگٹ تھی۔ عینی شاہدین کے مطابق اس دن مسجد پر امریکی حملے کے نتیجے میں چالیس عراقی مارے گئے اور مٹھی بھر امریکی فوجی شہر میں لڑائی کے دوران ہلاک ہوئے۔

اس دوران فوج نے فلوجا کے بڑے طبی مراکز پر قبضہ کر لیا تاکہ جھڑپوں میں زخمی ہونے والے عراقیوں کو کسی طرح کی طبی امداد نہ دی جا سکے۔ پاور اسٹیشن پر بمباری کر کے اسے شروع میں ہی ناکارہ بنا دیا گیا تھا۔

راہول مہاجن فلوجا میں داخل ہونے والے چند ابتدائی صحافیوں میں سے ایک تھا۔ اس معرکے کے بارے میں اپنی یادداشتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ بتاتا ہے کہ اگلے کئی ہفتوں تک فلوجا میں بجلی کا نظام ناکارہ بنا دیئے جانے کے نتیجے میں اندھیرا چھایا رہا۔ اِکا دُکا مقامات جیسے مساجد اور کلینکس پر جنریٹروں کی مدد سے روشنی کا متبادل بندوبست موجود تھا۔ کھانے پینے کی اشیاء کی قلت پیدا ہو رہی تھی۔ ایک مقامی ڈاکٹر نے بتایا کہ 6 اپریل کو قریبی علاقے میں سولہ بچے اور آٹھ خواتین فضائی حملے میں ماری گئیں۔

فلوجا کا محاصرہ جاری تھا۔ ایک میرین کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل بریسنان بائرن نے کہا، جس کسی نے مزاحمت کی اور ہمارے راستے میں حائل ہوا ہم اس کی گردن توڑ دیں گے۔ ہم انہیں باہر نکال کر دم لیں گے۔ بائرن نے کہا، فلوجا مزاحمت کاروں اور اسمگلروں کی جنت بنا ہوا تھا کہ اس سے پہلے کسی نے ٹھیک طرح سے شر پسند عناصر کا صفایا کرنے کی نہ زحمت کی اور نہ وقت نکالا۔ اور لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اگر امریکیوں کو شکار کا شوق ہے تو فلوجا چلے جاؤ۔ وہ جگہ اس کام کے لیے بہت مناسب ہے۔

بائرن کی بٹالین نے اس لڑائی میں پہلی بار جنگی نفسیاتی حربے آزمائے۔ ایک عسکری مضمون نگار رینگ ویسٹ، جو فلوجا میں امریکی فوجوں کے

www.pkdigest.com

ساتھ تھا، کا کہنا ہے کہ مختلف پلاٹونوں کے درمیان گندی گالیاں اور غلیظ نعرے ایجاد کرنے کا باقاعدہ مقابلہ ہوتا اور پھر ترجمانوں سے کہا جاتا کہ ان گالیوں کا عربی میں ترجمہ کر کے لاؤڈ اسپیکروں پر عراقیوں کو سنوایا جائے۔ یہ گالیاں اور مغلظات عراقی نوجوانوں کو مشتعل کر دیتیں اور وہ غصے سے پیچ وتاب کھا کر مسجد سے نکل کر تیزی کے ساتھ دوڑتے اور اندھا دھند AK-47 رائفلوں سے فائرنگ کرتے ہوئے امریکی مورچوں کی طرف بڑھتے تو تاک میں بیٹھے میرینز انہیں مار گراتے۔ گالیاں دو اور مار گراؤ کی یہ تکنیک رفتہ رفتہ پورے محاذ پر پھیل گئی۔

فلوجا میں تباہی و بربادی اور بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کی کہانیاں اور تصویریں عرب ٹیلی ویژن نیٹ ورک کے ذریعے باہر کی دنیا تک پہنچیں تو احتجاج، مظاہروں اور توڑ پھوڑ کا سلسلہ پورے عراق میں پھیلنے لگا اور امریکیوں کی طرف سے انہیں طاقت کے زور پر دبانے کی کوششیں ہونے لگیں۔ بغداد کے ساتھ ساتھ دوسرے شہروں کی مساجد میں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر خون کے عطیات اور امدادی سامان جمع کرنے کے مراکز قائم ہو گئے۔

8 اپریل تک مقامی اسپتال انسانی مصائب اور المیوں کی ایک دردناک تصویر پیش کر رہے تھے۔ 280 سے زیادہ لوگ مارے جا چکے تھے اور چار سو سے زیادہ زخمی تھے۔ بہت سے لوگ ابھی مختلف مقامات پر ملبوں تلے مُردہ یا زخمی دبے پڑے تھے۔ اس کا علم ہونے کے باوجود امدادی پارٹیوں کے لیے جنگ کی وجہ سے ان تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔

امریکی فوج کو انکار تھا کہ وہ عام عراقی شہریوں کے قتل عام میں ملوث ہے۔ اس کے نزدیک یہ شر پسند مزاحمت کار تھے، جو شہریوں کو ڈھال بنا کر انہیں امریکی گولیوں کا نشانہ بنوا رہے تھے۔ عام شہری اور مزاحمت کار باہم گڈمڈ ہو جائیں تو ان میں اچھے اور برے کی تمیز کرنا اور انہیں الگ الگ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ واشنگٹن پوسٹ کے مطابق کرنل بائرن کا بیان تھا کہ مرنے والے زیادہ تر شر پسند ہی ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ تھا کہ فلوجا کی 80 فیصد آبادی غیر جانب دار یا امریکی افواج کی عراق میں موجودگی کی حامی ہے۔

کرنل کی یہ خوش فہمی زمینی حقائق سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ بے پناہ انسانی قربانیوں کے باوجود مزاحمت کی شدت اور اس میں روز افزوں اضافہ بھی اس کی مکمل نفی کرتا تھا۔ امریکی تمام کوششوں کے باوجود فلوجا کو پوری طرح زیر کرنے میں ناکام رہے۔

واشنگٹن پوسٹ کے رپورٹر تھامس ریکس نے لکھا۔ دشمن کی تیاری توقع سے زیادہ اور مکمل تھی۔ اس نے لڑائی کے حوالے سے جو ڈسپیچ تیار کیا، اس میں میرینز کی اندرونی طور پر تیار کی گئی رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ حملے سے پہلے میرینز کو دشمن کے بارے میں جو اطلاعات اور معلومات فراہم کی گئی تھیں، وہ ناقص تھیں۔ دشمن کی تیاری اور قوت ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ تھی۔ ان کے حملوں میں ہم آہنگی، مشترکہ فائر اور موثر طریقے سے اپنے گولہ بارود اور اسلحے کا استعمال حیرت ناک تھا۔ اس نے حیران کن حد تک ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

(باقی آئندہ ماہ)